



زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوشِ لاہور

منظوم نمبر

۴۹، ۵۰

مرتب
محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو — لاہور

قیمت ڈیپلکس ایڈیشن: 600 روپے

ترتیب

منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں

- ۱ - بانی بانی، ۷
- ۲ - بانی بخت، ۱۰
- ۳ - چاہن کمر، ۱۵
- ۴ - بازش، ۱۹
- ۵ - آتش کے راز، ۲۳
- ۶ - آئینہ، ۲۸
- ۷ - تصویر، ۳۳
- ۸ - ملاوٹ، ۳۷
- ۹ - بس اسٹیشن، ۴۱
- ۱۰ - فیصلہ، ۴۵
- ۱۱ - بدلتی رہی، ۵۰
- ۱۲ - تار و تھانی، ۵۵
- ۱۳ - نواکش، ۵۹
- ۱۴ - پشاور کے لاہور رنگ، ۶۴
- ۱۵ - بکلی پہاڑی، ۶۸
- ۱۶ - ایک ناول اور ایک ناول، ۷۴
- ۱۷ - شیدا، ۷۷
- ۱۸ - چٹا کوٹ، ۸۱
- ۱۹ - زار کی، ۸۵
- ۲۰ - کیشن، ۸۹

منٹو کی منتخب تخلیقات

- ۱ - بک، ۹۹
- ۲ - موزوں، ۱۱۴
- ۳ - مئی، ۱۳۰
- ۴ - باپو کوئی تاتھا، ۱۵۷
- ۵ - کالی مشلوں، ۱۶۸
- ۶ - ٹو پیک سنگھ، ۱۷۹
- ۷ - اس پنڈ حارین، ۱۸۵

۸ - نیا تانوں ، ۲۱۹

۹ - شہید سدا ، ۲۲۵

۱۰ - میا و حاشیے ، ۲۶۱

منشوکا فن

- ۱ - ممتاز شیرویں ، ۲۳۱
۲ - وقار عظیم ، ۲۳۹
۳ - محمد حسن عسکوی ، ۲۵۶
۴ - عابد علی عابد ، ۲۵۵
۵ - ابوالایمٹ صدر الحق ، ۲۵۶
۶ - عبادت بریلوی ، ۲۶۲
۷ - ممتاز حسین ، ۳۱۸

- ۱ - منشو کی نکی نگین
۲ - منشو کا فن
۳ - منشو کا مقام
۴ - منشو فرشتہ
۵ - منشو
۶ - منشو کی حقیقت نگاری
۷ - سداوت حسن منشو کی یاد میں

منشو کی شخصیت

- ۱ - عصمت چغتائی ، ۳۲۶
۲ - اوپندرو ناتھ اشک ، ۳۳۳
۳ - احمد ندیم قاسمی ، ۳۹۴
۴ - ہاجرو مسرور ، ۳۶۶
۵ - ابو سعید قزوینی ، ۳۷۵
۶ - حامد جلال ، ۳۸۴
۷ - غلام عباس ، ۳۹۱
۸ - محمد طفیل ، ۳۹۳

- ۱ - میر دوست میرا دشمن
۲ - منشو ، میرا دشمن
۳ - منشو کی چند باریں پر چند خطوط
۴ - جو پاک ڈسکا
۵ - رحمت و بخت پسند
۶ - منشو ہوں کی موت
۷ - منشو کی موت
۸ - منشو کا ایک خط

شخصیات نمبر کے بارے میں

- میرا حیدر سالک
نائلک رام
کرشمی چندر
خواجہ امجد الدین
شاد مہارانی
ابن انشا
محمد صدیقی

- نیا زنجیدی
رشید احمد صدیقی
مسعود حسن زخمی
امین احمد دہلوی
آغا شرف
نگر تونسوی
جیلانی بانو

- مولوی عبدالغنی
عوشی رام چوہدری
اقشام حسین
ڈاکٹر سید امجد حسین
غلام عباس
مہتاب امتیاز علی
نارغ نجادی

طُلُوع

”یار منظرِ نرنگار“

”جی آ“

”میں کتابوں، نقوش کا منظرِ نرنگار“

”آقا یہ آپ کیسے باتیں —“

”تھکنا خیال ہے کہ میں نقشہ میں ہوں اور کجواس کردہ ہوں“

”آخر اتنی جلدی کیا ہے چھپ جانے کا“

”میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا، کہ پہلے مر کے دکھاؤں پھر نہر چھے“

”مرنے کا نام نہ لیجیے ابھی آپ کی بڑی —“

”آپ جی کہہ رہی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں“

”اچھا یہ بتائیے اس قبر میں کیا کیا ہو گا؟“

”آپ کب شہنشاہِ لیاں لی ہیں، وہ سب سے پہلے نہیں گی۔ اور جتنے ہر قفر نے میری تعریف کی ہے وہ

سب سے آخر میں چھپے گی۔ بچ کر میرے ہی چار منظرِ مظلومہ اسلئے ادا کیے ہوں گے، بہر حال تمیں زیادہ

شوگر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ قبر تمیں میں مرتب کروں گا“

”اگر آپ مرتب کروں گے، تو میں کیا کروں گا؟“

”تم جھک مارنا“

”اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجروح مرتب کر لیں، پھر اسے کتابی صورت میں چھاپ دیں“

”میں چاہتا ہوں، نقوش کا منظرِ نرنگے“

”تو چھ آپ اس قبر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہو گا میں کہہ کی، اسے تک بداشت نہیں کر سکتا،

”تو اپنے آپ کو جھٹا لیا ہے، کیا تو مجھ سے زیادہ قائل ہے“

”کائنات کو چھوڑ دیجئے، یہ معاملہ بنداری کا ہے“

”بندواری کو چھوڑو، یہ معاملہ کائنات کا ہے“

”اس معاملہ میں مجھے آپ کی کائنات سے اتفاق ہے“

”اچھا تو تم پھر میری زندگی بٹاتی چاہتے ہو میری زندگی ہی میں بٹاؤ“

”اگرچہ ہوا تو ایک برس پہلے کا ہے، لیکن میں آج بھی یہ قبر منظرِ زندگی ہی میں شائع کر رہا ہوں۔

اس لیے کہ منظرِ نرنگار کے خیال میں مڑا ہوا تو مڑا ہو، میرے نزدیک نہیں مڑا۔

محمد طفیل

(۱)

منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں

بائی بائی

نام اس کا ناظر تھا بر سب سے چھٹا آگئے تھے۔ باہمال کے درے کے اس طرف اس کے باپ کی بہن چلی تھی جو بڑا سادہ لوح مقرر آدمی تھا۔

دن بھر وہ اس بہن چلی کے پاس بیٹھی رہتی۔ پھاڑ کے دامن میں چھوٹی سی جگہ تھی جس میں یہ بہن لگائی گئی تھی۔ چھٹا کے باپ کو دو تین روپے روزانہ مل جاتے جو اس کے لیے کافی تھے۔ چھٹا اور اجتہاد کو کافی بھگتی تھی اس لیے کہ اس کو بناؤ سنگھ کا شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس بیوی کی طرح زندگی بسر کرے۔

کام کچھ نہیں کرتی تھی۔ بس کچھ گھسی اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بنا دیتی تھی۔ اُس کو اُن سے نفرت تھی۔ اس لیے کہ وہ اُنڈا اُس کی ناک میں گھس جاتا تھا۔ وہ بہت چھینچھوٹی اور باہر مل کٹھنی ہوا میں گھونٹا شروع کر دیتی، یا چناب کے کنارے جا کر اپنا منہ ہاتھ دھوئی اور عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتی۔

اُس کو چناب سے پیار تھا۔ اُس نے اپنی سیٹیوں سے سن رکھا تھا کہ یہ دریا مشرق کا دریا ہے جہاں سورجی میسنر وال ہیرا نکلتا کا مشرق مشہور رہتا۔

بہت خوبصورت تھی اور بڑی مضبوط جسم کی جوان لڑکی۔ ایک بہن چلی کے واسے کی بیٹی شاندار لباس تو سیر میں نکلتی۔ میل شلوں اور چھریاں کرتے۔ دوپٹہ خادو۔

تقریریت گوند سے لے کر باہمال تک اور بعد اسے کشمور تک خوب گھوم پھرتا تھا۔ اُس نے جب پہل بار چھٹا کو دیکھا تو اُسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ جب اُس نے دیکھا کہ چھٹا کے کرتے چھٹے میں ہیں تو اُس کی حیران چھائیاں باہر بھاگ رہی ہیں۔ تقریر نے اس علاقے میں ایک خاص بات فرط کی تھی کہ وہاں کی عورتیں ایسی کیٹھیں یا کرتے پہنتی ہیں جن کے نچلے میں غائب ہوتے ہیں اُس کی کچھ میں نہیں آتا تھا کہ زیادہ دانستہ بنا دیے جاتے ہیں۔ یاد ہاں کے دھوئی ہی ایسے ہیں جہاں کوئی نہ جانتے ہیں۔

تقریر نے جب پہلی بار سیر کرتے ہوئے چھٹا کو دیکھا تو اُس کی ٹھنڈکیں میں دیکھا تو اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ سیر تھی۔ ناک نقوش بہت اچھا تھا۔ عجیب ہے کہ وہ میل ہونے کے باوجود چلتی تھی۔ اُس کا لباس بہت گندہ تھا۔ مگر نذر کہ یہ محسوس ہوا کہ اُس کی فزہر تھی کہ گھٹا رہا ہے۔

تقریر ہاں ایک اتار دہر دیکھ لیتا تھا۔ وہ صرف کشمیر کے دیہات دیکھنے لوہان کی سیاحت کرنے کو آیا تھا اور قریب قریب تین بیٹے سے ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔

اُس نے کشتہ ڈر دیکھا، جہودا دیکھا، کڈھر ٹرٹوں میں کئی مہینے گزارے، مگر اُسے پتا تو اب خلیس کیس نظر نہیں آیا تھا۔

بائٹا لائی بد پر پہل کے باوجود اُس نے پتا تو کچھ جنوں سے بے نیاز نہ کرتے ہیں دیکھا تو اُس کے ہی میں آتی کوئی قیاس کے سارے میں ملے کہ وہ اُس کی خلیس اور پتا تو کڈھر آپس میں غلط برعایتیں، کچھ اس طرح کو دلوں کی کھڑکیوں کو بھی نہ آئے۔

اُس سے ملتا نظر کے لیے شکل نہیں تھا، اس لیے کہ اُس کا باپ، دن بھر گندم، کئی اور جوار پیسے میں مشغول رہتا تھا۔ اور وہ حق بنیں نکمہ۔ ہزاروں سے کھل کر بات کرنے والی، بہت جلد کھڑے ہو جاتی تھی۔ چنانچہ خبر کو اُس کی تربیت حاصل کرنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوتی چند ہی دنوں میں اُس نے اُس سے داد و دم سیدھا کر لی۔

داد و دم تھوڑی دور میں محبت میں تبدیل ہو گئی، پاس ہی جناب، ایسے عشق کا دیا کہتے ہیں اور جس کے پانی سے پتا تو کے باپ کی ہر کچھ کی تھی۔ اس درمیان کے کنارے پتا کو خبری اُس کو پتا دل نکال کر رکھا تھا جس میں سوائے محبت کے اور کچھ بھی تھا۔ پتا کو سنتی — اس لیے کہ وہ اُس کے جذبات کا مذاق اڑانا چاہتی تھی — اسل میں وہ حق ہی محسوس ساری زندگی وہ کبھی دوتی نہ تھی اُس کے اس باپ بڑے غور سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بچی بچیں میں کبھی نہیں دوتی۔

خبر اور پتا تو میں محبت کی عقلیں بڑھتی لیکن خبر پتا کو کو دیکھتا تھا اُسے یوں محسوس ہوتا تھا اُس نے اپنی دُن کو محسوس نہ کیے میں دیکھ لیا ہے۔ اور پتا تو اُس کی گودہ تھی، اس لیے کہ وہ اُس کی بڑی خاطر دی کرتا تھا اُس کو بے چیز — جسے محبت کہتے ہیں پہلے کھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے وہ خوش تھی۔

بائٹا میں تو کوئی اخبار ملتا نہیں تھا اس لیے خبر کو کثرت جان کر پتا تھا۔ وہاں وہ درمیان ٹاک خانے کے اندر بیٹھا رہتا۔ ٹاک خانے کی تو اخبار پر محکمہ کی پرچہ آتا۔ قریب قریب پچھل کا حاصل تھا، مگر خبر اُس کا کوئی خیال نہ کرتا۔ یہ کہتا کہ وہ بڑی ہوشیار ہے جب وہ ہر کچھ کی کہ پاس میں بیٹھا تو پتا کو کسی دیکھ سانسے سے باہر نکل آتی اور دونوں جناب کہ پاس میں بیٹھے ہر خبروں پر غور کرتے۔ پتا تو اُس سے کہتی: "خبر — کج کی خبریں سننا تو۔"

اُس کو خبریں سننے کا غلط تھا۔ خبر اخبار کھڑتا اور اُس کو خبریں سننا شروع کر دیتا، اُن دنوں قوت وادہ رسادات تھے۔ اور اس سے یہ قدر شروع ہوا تھا جہاں سکھوں نے مسلمانوں کے کئی محلے ہلاکے، لاکھ کر دیے تھے۔ وہ یہ سب خبریں اُس کو سناتا، وہ سکھوں کو اپنی گنواؤں میں برا بھلا کہتی۔ خبر کو غامض رہتا۔

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے اور ہندوستان میں پتا کو بر گیا ہے۔ خبر کو کلام واقعات کا علم تھا، مگر جب اُس نے خبر پڑھا کہ ہندوستان نے ریاست مانگوال اور ماناوا در پر بدوستانی قبضہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا، مگر اُس نے اپنی اس پریشانی کو پتا کو پر غماز نہ دیا۔

دونوں کا عشق اب بہت استوار ہو چکا تھا۔ اس کا علم پتا کو کے باپ کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ میری لاکھ ایک معزز زادہ شریف گھر میں پیدا ہے گی۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کی بڑی بیٹا کھڑ نہ بنے، جہاں کا خبر دینے والا تھا اُس کی یہ خواہش تھی کہ خبری اُس کے پاس ہے۔ دولت مند کو یہ ہے — ہر کچھ کی کہ پاس کا فی زمین پڑی ہے۔ اُس پر ایک چھوٹا سا مکان بنانے اور دونوں بیٹیاں پر ہی اُس

ہیں رہیں جب چاہا ایک جھپٹے سر کی ٹوڑی بچ گئے۔ وہاں ایک دو بیٹے رہے، پھر وہاں آگے کبھی کبھار سیالکوٹ میں پہلے گئے کہ وہ بھی اتنی دور نہیں۔

پچھلے کو کے باپ سے مفصل گفتگو کی، وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا، تقریر پڑھا تو بہت خوش ہوئے۔ اُس روز پہلی مرتبہ تقریر نے اُس کے سونے کی ٹوڑی اور خوراک سے ہاتھ سے اُٹھنے کے کرتے میں تین ٹکڑے لگائے۔ دو مشین تقریر نے اپنے دلائل کو کھل دیا کہ وہ شادی کر رہا ہے، کٹھن کی ایک دیواری لڑکی ہے جس سے اُس کی محبت ہوگئی، ایک ماہ تک غلط و کثرت جرتی رہی ہے۔ آدھی روشن خیال تھے، اس لیے وہ مان گئے، مالا مال وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے ناناں میں کرنا چاہتے تھے۔

اُس کے دلائل سے آخری خط لکھا، اُس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ تقریر حاضر کا فوٹو بھیجے تاکہ وہ اپنے دوستوں اور کونکڑاں اس لیے کہ وہ اُس کے حسن کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔

لیکن باہمال جیسے گورا اندازہ دھکتے ہیں وہ پچھلے کو کی تصویر کیسے حاصل کرنا، اُس کے پاس کوئی کیمرو نہیں تھا، اندیاں کوئی فوٹو گرافر، ثروت اور گڑ میں بھی ان کا نام و نشان نہیں تھا۔

اتفاق سے ایک دن سری نگر سے موٹرائی تقریر سڑک پر کھڑا تھا، اُس نے دیکھا کہ اُس کا دوست تقریر سنگھ ڈائریکٹر کرنا ہے اس نے بلند آواز میں کہا، تقریر سڑک ————— ٹھہرو۔

سڑک ٹھہر گئی، دونوں دوست ایک دوسرے سے مل گئے، تقریر نے دیکھا کہ اُس کی موٹر میں کیمرو پڑا ہے، وہ انیس تقریر نے اُس سے کچھ دیر نہیں کہیں، پھر پوچھا، تمہارے کیمرے میں فلم ہے یا

تقریر نے ہنس کر کہا، غلط کیمرو اور خالی بند وقت کسی کام کی ہوتی ہے۔ میرے کیمرے میں سولہ کیمرو موجود ہیں۔ تقریر نے فوراً پچھلے کو کو ٹھہرایا اور اپنے دوست تقریر سے کہا، کیا اس کیمرو میں چار اچھے پڑنے والے اور تین میڈیال ہے سیالکوٹ چار ہے ہر دو اس سے ڈی ویسپ اور پش کر کے مجھے دو دو کاپیاں ثروت کے ڈاک خانے کی معرفت بھجواؤ۔

تقریر نے بڑے غور اور بڑی لگن سے پچھلے کو کو دیکھا، اُس کی موٹر میں ڈوگرہ فوج کے تین چار سپاہی تھے، تقریری ٹاٹ تقریری بندھن لے، تقریر مقام فوٹو لینے کے لیے پش کر کر کے مستحق فوجی اُس کے پیچھے پیچھے برتے، تقریر اُس کے بہنو ہوا ہوتا ہوا ڈوگرہ اُسے روک دیتے، کشمیر میں جڑی رہا تھا، اس کے مصلحتی قریبی کو بھی طرح معلوم تھا کہ جڑی اس پر زیادتی کرنا چاہتا ہے، اگر پاک فوج کی مدد نہ ملے تو فوٹو کے لیے کب تقریر کا دوست تقریر کی موٹر کے پاس آیا تو اُس نے تقریر کی طرف اٹھا اٹھا کر دیکھا، پچھلے کو کے فوجی کی گرفت پر تھی، افسوس! زبردستی موٹر میں ڈالا، وہ پہنچتا تھا، تقریر کو کچھ مدد کے لیے نکلا۔ گورو صاحب تھا۔ ڈوگرہ فوجی سٹیج نہیں تانے کھڑے تھے۔

جب موٹر اشارت ہوئی تو تقریر نے اپنے دوست تقریر سے بڑے عاجزانہ بھیجے میں کہا، تقریر کیا ہو رہا ہے؟ تقریر سنگھ نے جو موٹر چلا رہا تھا، تقریر کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر صوف اٹھا لیا،

مائی جنتے

مائی جنتے سیدہ بیٹھائی آجھستی کچھ اس انداز میں اپنے بیٹے کچھنے میں داخل ہوئی جس کی سب گھبراہٹوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ آج بھی ہے۔ وہ دیکھتی اس گھر پر تھی جو طواغیر کو ہمیشہ مروج تھا، اپنے بیچھے کالی جامداد، ایک چوہا اور دو جوان بچیاں چھوڑ گیا تھا، آدمی پرانی دھن کا تھا۔ جوش بہ دھنیاں نو دس برس کی ہوئیں۔ ان کو گھر کی چار دیواری میں چھاننا اور پھر بھی ایسا کہ وہ کھڑکی تک کے پاس کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ اگر جب وہ اندر کو پہنچا تو ان کو آہستہ آہستہ تھوڑی سی آواز ہی ہو گئی۔ اب وہ ایک چھپ کے ناول میں پڑھتی تھیں۔ اپنے کمرے کے دروازے پر ایک کمرے پر اور ایک چھپ کے ناول میں۔ ان کے پاس روایت کی کسی پرانی انجیا بھی تھیں۔ معلوم نہیں وہ سب کچھ ہی کہاں سے لی گئی تھیں۔ پھر حال ان کا یہ ہے کہ ان کی ماں کو ہمیشہ ایک اپنے غلام کے ساتھ کو بٹول نہ سکی تھی ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ زیادہ تو لڑائی جھگڑ کے علاوہ اور باقی وقت کی غلاموں کی دانتی میں مصروف رہتی اور اپنے مروج طریقہ کی توجہ کو ٹوٹا ہوا چھپائی دیتی۔

گھر میں کوئی مولو کو نہیں تھا۔ مروج کے باپ کی زندگی میں، مروج کے زمانے میں، زمان کی پرائی و شہدائی کا ثبوت ہے۔ عام طور پر ایک یا دو غلاموں سے ہوتی تھیں جو باہر سے سوا سلت بھی لیتیں اور گھر کا کام بھی کرتیں۔

دوسری جماعت خود مروج نے لڑائی جھگڑا کر کڑھا کر اس کو اپنی حق کالچ کی تعلیم کے دو کچھ شکست تھے۔ وہ ان کی فورا شادی کر دینا چاہتے تھے مگر نہ ان کے دل ہی میں رہی۔ ایک دن اچانک خالی گرا۔ اس غمزدی مرض نے ان کے دل پر اثر کیا اور وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی ملک عدم ہو گئے۔

باپ کی وفات سے نو کیاں بہت اُس رہنے لگیں۔ انھوں نے ایک دن ماں سے التجا کی کہ وہ ان کو کس کالچ میں داخل کر دیں پھر جب زیادہ اصرار ہوا اور انھوں نے کئی دن کھانا نہ کھایا تو اُس نے مجبوراً ان کو ایک زمانہ کالچ میں داخل کر لیا۔

مائی جنتے نے وعدہ کیا کہ ہر روز ان کو کچھ کالچ چھوڑ آئے گی۔ سارا وقت وہیں رہے گی اور جب کالچ بند ہو گا تو انھیں اپنے ساتھ لے آیا کرے گی۔ اُس نے اپنی ماں سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اُسے پُر غلوں انداز میں کیا کہ دیکھو با تو مروج خراجہ کر رہی تھیں کی چوہ کی یہ پیشانی خلیں خود اُس کی بیٹی ہیں۔

اُس نے بہو بیٹیوں کو پر دے میں رکھنے کی عادت میں اپنے انداز میں عورتوں کی طرح ایک بیٹی جیڑی تقریبی کی، لیکن پھر یہ کہا، تعلیم بھی ضروری ہے کہ اسلام اس سے منع نہیں کرتا۔ پھر کچھ بھال بہت ضروری ہے جو ان جہاں ہیں۔ ان پر بڑی کڑی لڑائی ہوئی چلی ہے۔ قرائن کے پاس کوئی کھتی بھی نہ چھوڑنے دیں۔ کوئی لیس ویسی شہر مات کریں گی تو وہ کان دھنوں کو بھلا اٹھیں گی اور یاد کریں گی کس بڑھیا سے پالا پڑا ہے۔ لیکن یہ کیوں کرتے لگیں، شریف خاندان کی ہیں۔ — دوڑے نماز کی پابندی —

اور بے کھجور بھی نہیں۔ نیاس وہاں لگی طرح گھسی ہیں۔

دونوں لوگوں میں کوئی نزاع اور فرق نہیں تھا۔ ایک دوسرے کے فرق کے بعد ہی پھول جس کا نام لہری تھا، باہر لے آئی تھی۔ بڑی کامیابی سے لہری دونوں خوبصورت تھیں۔ چہرے سب سے خاص اچھے تھے۔ غزلوں، شکل آپس میں کافی تھی۔ دونوں بہت کشتی کھیتیں۔ مگر دونوں کا زمانہ عمر عمر اور بچا تھا۔ اب جوانی کی شوقوں کے دن تھے۔ کالی میں جاتے ہی انھوں نے پرندے کے نکلے اور وہ صوفیوں کی تیسوں کی طرح جن کو کسی پھول کی تلاش ہو، اور وہ اوس طرح بچہ بچہ شروع کر دیا۔

مائی بھتنے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ کالی کی بڑی عمر پر اس کے ساتھ اس وقت مقیم تھے کہ وہ چارپائی کی کوشش کرتی تھی۔ دونوں ہم عمری کے باعث بہت جلد کڑی سیلیاں بن گئی تھیں۔ جب دونوں ایک ساتھ بیٹھتیں تو ان کے ذہن کے باتیں بچہ جاتیں جب کہ وہ بھی جن باتیں سنیں مگر اس کو کسی لڑکی سے قربت یا محبت نہیں تھی۔

وہ مائی بھتنے کو کڑی پرانی کہانیاں سناتی۔ غلام سن میں اس کو سچ شری ہوئی کہ ان کو لیا تھا جو بڑی شکل سے کراہا گیا۔ پرنسپل صاحب کو اس خبر اور بے رحمت کے لئے کہ اس کا منہ بند ہے۔ ہر سال ایک کھلے ہوئے کو بچہ کھولنے کی باتیں سے روکیات کے مولی صاحب کا کشتی پر گیا، چند بچہ تو تمہارا اس لڑکا کو دلم چیا پر کڑے گئے کہ کالی سے وہاں بھی اور پر قہر دونوں پر اس کے ہاتھوں میں۔ وہ بھی تو بچہ کھلے کی کھلی کی تھی۔ یہی ہے معلوم نہیں اس لڑکی پر کھلے کا کیا بنوا۔ ان میں تو لڑکی باتوں میں وہ سیان ہی نہیں رہتی۔ مجھے کیا فرض پڑی ہے کہ ان لڑکیوں کے کلاموں پر اپنا وقت ضائع کروں؟

مائی بھتنے نے مجھے کی نے سب سے ایک کر دی۔ نہ تو ان میں باتیں نہیں کیا کرتے۔ وہ کیا کہتا ہے کہ کوئی شمسور ہے جو نہیں لگا۔ اور وہ کوئی شمسور ہے جو نہیں لگا۔ خود اچھا بھلا کرے۔ ہم لڑکیوں کو نہ مٹا رہی رہتا چاہیے اور وہ لڑکیاں سے مدد کرنی چاہیے کہ وہ اس کی ہونٹوں کو سب سے کاموں کی طرف نہ لے جائے۔ ان کی حرکت اور اپنے کمر سے بھلا کرے۔

پھر اس میں کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی کہ کشتی ایک عورت ہے۔ اس کو مل ہی میں بڑی ذراست ہوئی کہ اس نے اتنی لڑکیوں کی کھلے کے لئے مدد ان کے ذہن نشا کیے۔ اس نے چند بچہ تو مائی بھتنے سے معافی مانگی اور کانوں کو ہاتھ لگایا کہ آئندہ وہ میں باتوں سے مدد ہی رہے گی۔ کہ لڑکی کے بارے میں اسے کچھ پتہ چھوٹ گیا کہ وہ بڑی زمانہ زندہ کیے گی۔

مائی بھتنے نے اسے بڑی شاباشیاں دیں۔ نتیجہ میں کالی چھوٹ گیا۔ اس نے یہی وہ فسر ہی کہ ساتھ لیا اور گیٹ سے باہر چلا کہ اس نے ان سے کہا، آج تمہیں شام کو یہاں نہیں آنا پڑے گا؟

پر تو ان نے جواب دیا، آج میں تو کسی نے نہیں کہا؟

اصل میں تم دونوں بہت جلد وقت ہو۔ وہ سیان سے بہت متاثر ہو۔ میں انہیں کسی سے پوچھ کر بتاؤں گی، مگر بچہ مائی بھتنے نے ان کے لیے جاتے تیار کی اور بڑی چھوٹ سے بیڑ پر لگادی۔ چھوٹے ان کی اس کے پاس اپنی بیوی لے کر کوئی لڑکی اور چھوٹے میں سے جہاں میں اس کی مرضی تھیں میں وہیں متاثر اس نے آخر میں اس کو لاشرہ واکر پیدل آنا جانا ٹھیک نہیں۔ میرا خیال ہے آپ کسی لڑکے کا بندوبست کر دیں تو ٹھیک رہے۔ پیدل پہلو، تو کوئی فخر نہ کھتا ہی، مگر وہ بچہ میں کے ساتھ۔

انی تھے کو یہ مشورہ پڑا معتدل تھا چنانچہ لٹکے کا بندوبست دوسرے ہی روز ہو گیا۔ — انی تھتے نے ایک ڈانچے والے سے سینچا بھوکا کرایہ لے کر لیا۔

”دوسرے دوسرے روز اپنی مالکی وحیدہ باؤ کو کہ خبر سنائی کہ ٹیڈس میں دیوار کے ساتھ جڑ بکڑ نکالی ہوئی تھی، اس میں نے کرایہ دار آن بیسے ہیں۔“

وحیدہ بانو نے پوچھا، کون لوگ ہیں ؟

تھانے ہانی — ہوں گے کوئی ارے میرے انھو خیرے — میں نے تو کسی سے پوچھا نہیں۔“

ایک دن دوسری طرف سے کوٹھے پر سے کسی شخص نے ایسے ہی جھانک کر ان کے صحن میں دیکھا — ”ایک ہنگامہ مارتے مارتے گیا۔“ انی بٹنے کیس باہر گئی تھی، وحیدہ عظم نے فرما کر ان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کھٹکے کے ایک چھوٹے سے دھکے کو لایا اور کہہ اگر ٹیڈس میں مکان میں جوتے کا پیدہ رہا ہے میں، ان کو اس کوئی شہرت ہو تو ان سے کہو، آپ کی ہمسائی بیگم صاحبہ آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ کھڑکی کے لیے تشریف لے آئیے۔ — بڑی مہربانی ہو گی۔“

لاکھ بیگم نے کہ چلا گیا۔ کوئی آوے گھنٹے کے بعد وہاں سے پرد شک ہوئی، پر وین اور سر میں اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں، اس لیے اس نے خود ہاتھ نہ کھولا — وہیں پر ایک سفید برقع پوش خاتون نکلی تھی۔ اس نے بٹنے کے نام سے بیسے وحیدہ عظم سے پوچھا کیا آپ کی نے مجھے یاد فرمایا ہے ؟

وحیدہ عظم نے سب سے باہمی ہاں — تشریف لے آئیے۔“

وہ اندر چلی آئی، دونوں باہر مجھے برے تخت پر بیٹھ گئیں، وحیدہ عظم کی کچھ میں بیٹیں، آتھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے — دونوں چند لمحات ایک دوسرے کی شکل صورت دیکھ کر بے قراری کا ہاتھ دے رہی تھیں، آخر ہمسائی ہی نے مزاحیہ لڑائی لڑ کر پوچھا فرمائیے آپ نے مجھے روت کٹا میں کیسے بلایا۔“

اس پر وحیدہ عظم کو زنی شکایت کے اظہار کا موقع مل گیا اور اس نے بڑی زبرداری اور تحمل سے سب کا حادثہ بیان کر دیا اور پوچھا تو کون سا جنوے میں جس طرح پرانے ٹھہرینے لاک بھاگ کرتے ہیں ؟

یہ لاکھ بیگم — وہ تو یہاں نہیں — بڑا اثر مٹا ہے — چونکہ ہم نے نئے ٹھہر کر یہاں آئے ہیں اسی لیے اس نے کوٹھے پر چڑھ کر کھانا ہر گاہ کہ اس کو اس کی ہر گاہ — ویسے میں اس کو سننے کی دھڑکی کی خبر دار تم نے بدھ کر کیا، کسی بھی طرف نظر اٹھا کر دیکھا — بڑا اندر دھڑکا ہے — خود میرے علم کی تعمیل کہے گا میں نے اگر اس کے باپ سے آپ کی شکایت کی تو وہ تو اس کو مار مار کے کھال اڑا دیں گے — بڑے سخت گیر ہیں، وہ اس معاملے میں — ویسے مجھے افسوس ہے۔“

”نہیں میں نے صرف آپ کے کافوں تک یہ بات نہ بیان کی تھی کہ بدترنگی نہ ہو — یہ کہ کہ وحیدہ عظم کی اسی اور بکھاری پر وین —“

فہرین، ادھر آؤ خدا۔

دونوں ایک دوسرے کی بات سن لیں، لیکن ایک ناوردہ عورت کو دیکھ کر کھٹک کھٹک گئیں، دوپٹے کے بغیر فوراً اندر بھاگیں اور دوپٹے اور ٹیڈ

”مجھے نسرین کی ایک جھلک دکھا دیجیے — خداداد تصویر ہی سے کیوں نہ ہو“ — اُس کے بچے میں اجتماعی تیسرے خیال چھلک رہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُس کا کوئی فرٹری دکھا دیجیے — آخر وہ کل یا پھر سول پیری ہونے والی ہے۔“
 اس کی ماں کو سلیم کی یہ درخواست ناپسند نہ ہوئی۔ تین پوری کوششیں کروں گی۔“
 عید آگئی مگر تصویر نہ آئی — لیکن سلیم نے کسی شکل کا اظہار نہ کیا۔ نکاح کی دسم پندرہ روزی ختم ہو گئی۔ جب وہ باہر نکلا تو اُس کی ماں نے کوڑا ڈرنا سا کھولا اور اُس کو آواز دی۔ وہ غصہ کر گیا۔ یا تو باہر نکال کر اُس نے سلیم سے کہا یہ خفا ہے لو — دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“

سلیم بھگ گیا — اُس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ اس میں تپ اشتہار کیسے ہوتا۔ اُس نے نفاذ و چین کھڑے کھڑے کھولا — دھڑکتے ہوئے دل سے تصویر باہر نکالی۔ باوجود دھڑکنے اور تصویر پر سلی نظر ڈالنے اُس کا رنگ ہلکی کی طرح نہ ہو گیا۔ تصویر اس کے لاپختہ ہاتھوں سے گر پڑی — اس نے اس سے سانسے والا دروازہ جس میں سے اُس کی ماں نے یا تو نکالا تھا کھولا اور ڈھیلے سیلے سلیم نے اُس کو سیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا مافی، تم یہاں کیسے پہنچ گئیں — وہ تو اُس رات تم ہی —“
 اس نے اس سے باز رہا وہ کچھ نہ کہا اور تصویر زمین پر چھوڑ کر تیز قدموں سے اپنے ایک دوست ٹاکٹر جمیل کے پاس گیا۔ اور ساری بات بتا دی۔ جمیل نے اُس کو ہسپتال میں داخل کرادیا، جہاں اس کے ٹھوٹ ٹھوٹ کے مرض کا علاج ہوتا رہا — آخر ڈاکٹر جمیل نے سلیم کے والد کو بلا کر تجلیکیش کیا کہ یہ شادی نہ ہو۔ آپ کا علاج مدت کے قابل نہیں ہے۔

(۱۲۔ مئی ۱۹۴۷ء)

جان محمد

میرے دوست جان محمد جب میں بیمار تھا میری بڑی خدمت کی۔ ہر وقت سینے میں ہسپتال میں رہا اس دوران میں وہ چٹا ہوا شام کرتا رہا۔ بعض اوقات جب میرے کو کڑھیل جرتے تو دورات کو بھی دیر طے کرتا۔ تاکہ میری ہر گھڑی میں کوئی کوئی نہ ہو۔

جان محمد بہت انکس دوست ہے۔ میں کو یہ کہہ رہا ہوں کہ جب میں بیمار تھا، اس دوران میں وہ آتا — یکنے لگے اس کا علم نہیں تھا جب لگے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان تھا، وہ بولتا تھا اس نے کوہری حالت بہت نازک تھی۔ صبر و صبر میں کوئی ہر گھڑی کہ بات چیت کو سونے کی حالت میں سے لے لیا۔ آپ کو کھانا لے کر کھانا نہیں دیتی؟ میرے اعضا داخلہ طریق ہو چکے تھے، معلوم نہیں تھی کہ میں کئی شے کھانے پینے سے بولنے میں لگاؤ تھا۔ جان محمد — ہیل

اے جان محمد کتنا ہے؟

اس نے طے کر لیا کہ میری بڑی سے گناہ کی زینت کو کڑھیل لگا دے گی۔ — میں صبح تک اٹھ کر باہر نہ گیا۔
زینت کو کڑھیل لگایا اور جان محمد بھی اس نے میرے سارے بدن پر مائل کی۔ قریب قریب ہوا کو گھنٹہ اس کا اس شقت میں سوت ہوا لگے بڑی راحت محسوس ہوئی۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ ہر روز دفتر جانے سے پہلے ہسپتال میں آتا اور میرے بدن پر مائل کرتا — مجھے راحت ضرور ہوتی تھی۔ لیکن وہ اس ضرور سے اپنے ہاتھ چھانک کر میری بڑیاں لگا دے لگنے لگتیں۔ اچانک میں اس سے اکثر شے و شت لے کر میں کہتا تھا جان محمد تم کو میری جان سے لوگے؟

یہ بھی کہ وہ شکر ادا کرتا۔ ضرور صاحب، آپ قریب سے سخت جان ہیں — اس مضمون جانی سے گھبرا گئے؟
میں خاموش ہو جاتا۔ اس لیے اس کی مضمون چلائی میں کوئی جاہل چیز نہیں تھی، بلکہ ستریا مضمون تھا۔
میں سینے ہسپتال میں کاشٹ کے بعد گھبرا گیا۔ جان محمد بہ طور ہر روز آتا رہا۔

میری اس کی دوستی اتنا بڑا ہو گئی تھی۔ ایک روز میں گھر میں بیٹھا تھا کہ ایک ٹاکس کے چھوٹی چھوٹی مرنے والے سال مرنے والے سے بروٹھک دی ہیں جب اس کو اندر کر کے میں داخل کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ میرا رواج ہے۔ ضرور صاحب — میں نے آپ کو صورت اس کے طبیعت دی ہے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے قریب قریب آپ کی سب تصانیف پڑھی ہیں۔
میں نے اس کو سب دیکھنا لیا تھا میں کی طرح شکر یا داکیا تو اس کو بڑی محبت ہوئی۔ ضرور صاحب — آپ کو رسم و رواج کے قائل ہی نہیں۔ پھر یہ کتنے کیوں؟

میں نے کہا کہ وہ اردوں سے بعض اوقات یہ تکلف برکتا ہی پڑتا ہے۔
 جہاں گھر کی عین مرچیں پر سکوٹھٹ نمودار ہوئی۔ مجھ سے آپ یہ تکلف نہ رہتے؟
 چنانچہ یہ تکلف فوراً دُور ہو گیا۔

اس کے بعد جان گھر لے کر روز میرے گھر کا شروع کر دیا شام کو وہ جب دفتر سے خارج ہوتا تو سیدھا میرے یہاں پہنچا کرتا۔
 میری عادت ہے کہ میں کسی دوست کا سبب دریافت نہیں کرنا اس لیے کہ میں اس کی کوئی خصوصیت نہیں سمجھتا۔ میں کوئی
 سے لوں تو اس سے اس کا نام ہی نہیں پوچھتا۔

تسمیہ کا کافی لمبی ہو گئی، مگر میں اس میں اختصار پسند ہوں۔ جہاں گھر پر تک میرے یہاں کا آداب اس کی معلومات خاصی اچھی تھیں۔
 ادب سے بھی اسے خاصا شغف ہے۔ مگر میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ زندگی کے کسی قدر بڑا ہے۔
 مجھے زندگی سب سے زیادہ، دیکھی اس کو اس سے کوئی نسبت نہیں تھی، ہم دونوں جب باتیں کرتے تو وہ کتنا منظر صاحب آپ میرے
 پاس کو دیکھتے ہیں۔ یہ شعور اور تھیں جو پیشانی ہے۔ آپ تھیں انقدرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں گے۔ مگر مجھے اچھے پاس کی کوئی
 خواہش نہیں۔ مجھے کسی خواہش نہ تھی کہ میری خواہش نہیں ہے۔
 میں نے اس سے پوچھا کہ میں؟

تو میں نے اندر پر مڑ کر دیکھی۔ میں نے فریض پر سوتا ہوں۔ نہایت حایات مڑلوں میں کھانا کھانا
 ہوں۔ یہ ہو چکے۔ میرے بھی اتنے بڑے حشر ہوئے ہیں۔ اس میں کشمکش ہو رہی ہے۔ میرے پاؤں ملاحظہ
 فرمائیے۔ وہاں میں لگا کر لکھ رہی ہوں۔ میرے ہیں۔ مگر مجھے ان غلاموں کی کچھ پروا نہیں ہے۔
 میں نے اس کی غلامیوں کے انتقال اس سے کچھ نہ کہا۔ وہ نہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت یہ لکھ لکھ رہا تھا۔ اس کو صفائی کے متعلق کبھی
 خیال ہی نہیں آتا تھا۔

ایک دن جب وہ شام کو میرے پاس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت مضطرب ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔
 کہوں جان مگر کیا بات ہے آج۔ تجھے کچھ سے معلوم ہوتے ہو؟
 اس نے اپنی حیرت بے جا کی ڈوبیا نکالی اور ایک سنگریٹ سنگریٹ جواب دیا تھا کہ وہ جی جاتی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں
 اس کے بعد ہم دو رنگ غالب کی شاعری پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کو یہ شاعری کا شعور بہت پسند آیا۔
 مازہ نوزم بدی ترجمہ رضی غالب
 شعر خود تراشیں آں کو کہ گرو فیما

ہم غالب کی شاعری پر تبصرہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے ایک ہمسائے کی لڑکی میری بیوی سے شہر چلائی تو کہہ دو رو وہ نہیں
 کرتی تھی اس لیے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئی۔ جان گھر نے انھیں جھکا دیں اور خاموش ہو گیا۔
 اس لڑکی کا نام شمیم تھا۔ وہ ایک دینی بیوی تھی اور مجھ سے باتیں کرتی رہی، لیکن اس دوران میں جان گھر اسی طرح انھیں جھکا

خاموش رہا۔ کچھ اس طرح کہ اُسے کوئی سچان نہ لے۔

اس کے بعد دوسرے رات کے دس بجے میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر کو پر سو رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ جان محمد ہے۔ نہایت خستہ حالت میں ہیں بہت پریشان ہنسا اور اس سے پوچھا: کیوں جان محمد — غیریت تو ہے؟

اس کے بڑھتی ہوئی غصے کی سلاہٹ پیدا ہوئی، جس سے میں بالکل نا آشنا تھا، غیریت ہے — مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے میں اُس کے پاس چلا آیا؟

مجھے سخت نیند آ رہی تھی، مگر جان محمد ایسے غصے دوست کے لیے میں اُسے قرآن کرنے کے لیے تیار تھا، مگر جب اُس نے آؤٹ پٹانگ پاؤں شروع کیے تو مجھے وحشت ہرنے لگی۔ اُس کا دماغ غیر متوازی تھا۔ کبھی وہ آسمان کی بات کرنا کہیں زمین کی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہانک اُسے ہر کیا گیا۔

ایک دن پہلے جب وہ مجھ سے ملا تو اچھا بھلا تھا۔ ایک دم اس میں اتنی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟

ساری رات اُس نے مجھ جگنا رکھا۔ آخر صبح میں نے اُس کو غسل کرنے کے لیے کہا۔ اپنے کپڑے سے پھنسنے کے لیے دیے کہ اُس کے لیے چکٹ تھیں۔ پھر اس کو لاریوں کے آگے پرے گیا کہ وہ سیاہ کوٹ اپنے والدین کے پاس چلا جائے۔

غصے میں نے یہ کہی کہ اُس کو لاری میں نہ بٹھایا۔ کراہ و فخر وہ میں نے اُس سے دیا تھا میں مطمئن تھا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے گا، مگر اسی دن رات کے تین بجے دروازے پر بڑے نور سے دستک ہوئی میں باہر صحن میں سو رہا تھا۔ ہڑپا کر اُٹھا، سوچا کہ شاید کوئی تانا یا ہور دروازہ کھولا تو سامنے جان محمد — میرے ادا سان خطا ہو گئے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سیاہ کوٹ کیوں نہیں گیا، اُس نے اس سوال کا کوئی عقول جواب نہ دیا، اُس کا دماغ پہلے سے زیادہ غیر متوازی تھا، فرش پر لیٹ کر اپنی پیشانی پر زور زور سے گھونسنے مارنے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ یقیناً جنونی کی حد تک پہنچ چکا تھا میں نے سر ہا ہیا رحمت سے کام لینا چاہیے چنانچہ بہت دیر تک میں اُس کا سر مسلاتا رہا۔ اس کے بعد اُس سے پوچھا، جان محمد غصے کیا تکلیف ہے؟

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور فرش پر سری پتھروں کے برابر لی پڑے ہوئے تھے، اُن سے کہیلنے لگا، اس کے بعد اُس نے ہزار بل کو سجدہ کیا اور رونے لگا۔

میں نے پھر اُس سے بڑی محبت سے پوچھا، تھیں عمر، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

اُس کی آنکھیں شرخ انگارہ تھیں جیسے کہ دونوں سے شراب کے نشے میں دھست ہے، اُس نے مجھ پر آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا، تم اتنے بڑے تضیبات نگاہ رہتے ہو — کیا یہ نہیں جان سکتے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟

میں اپنی کم ناکی تسلیم کرتا ہوں — اب تم خود بتاؤ۔

جان محمد سسکا یا، مجھے غم ہو گیا ہے۔

”کیا مطلب؟“

اب بھی مطلب پر جتنے ہیں آپؑ
 میں نے اُس سے کہا : جتنی شہیم کوئی بیاری تو نہیں :
 جان محمد بشا : بہت بڑی بیاری ہے مشن صاحب — یہ کئی لوگوں کو بربکلی ہے ۔ اُنکی میں سے میں بھی ایک ہوں —
 پہلے ڈلموزی میں جوتی تھی — اب یہاں لاہور چلی آئی ہے :
 میں بچ گیا — جان محمد کئی برس ڈلموزی میں رہ چکا تھا اور ختم ہو گیا ۔ لیکن میں نے اُس سے کہا : میں بھی ایک نہیں بچا —
 تم اب سو جاؤ — چلو آؤ — اندر صوفے پر لیٹ جاؤ — خبردار جو تم نے شر پھایا :
 وہ اندر پھلایا اور صوفے پر لیٹ گیا — میں بس جلدی اُٹنے کا عادی ہوں ۔ ساڑھے چار بجے کے قریب اُٹھا تو دیکھا کہ
 جان محمد غائب ہے ۔ سات بجے پتہ چلا کہ شہیم بھی اپنے ٹیٹ میں نہیں ہے — کیس غائب ہو گئی ۔
 (۱۳ مئی ۱۹۷۷ء)

سمجھتا تھا۔ مگر اُس نے اس روز بڑی چھانی نگاہوں سے اُن کو دیکھا — دیکھا ہی نہیں، بلکہ اُن کے گھینے بد میں نظر ہی کر رہے کی حالت چمید کرنا رہا۔

تغیر کی عمر اُس وقت میں برس کے قریب ہوگی۔ ناخبرہ کار تھا۔ ذرا غلغلہ میں اُس نے پہلی مرتبہ جواں لڑکیوں کے شباب کو نگلی علی نہیں پہنٹے دیکھا، تو اس نے یوں محسوس کیا کہ اُس کے خون میں چنگاریاں دوڑ رہی ہیں۔

اس نے اُن لڑکیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا چاہا — ورنہ تک وہ غمزدگوار رہا — ایک لڑکی بڑی شریعتی تھی — دوسری اُس سے کم — اُس نے سوچا شریعہ پر ایمان رکھنے کی جواں لڑکیوں کو شرارتوں کا سبق دے سکے۔

یہ شریعتی لڑکی خوبصورت تھی، اُس کے بدن کے مضامین بہت مناسب تھے۔ بارش میں نہاتی بل پر ہی معلوم ہوتی تھی تھوڑی دیر کے لیے تغیر شاموں میں گیا۔ اُس نے کبھی اس طور پر نہیں سوچا تھا۔ لیکن اس لڑکی نے جس کا کُردہ دوسری کے مقابلے میں بہت زیادہ مہین تھا، اُس کو ایسے ایسے شعر یاد کرادیے جن کو بعد جزا معمول چکا تھا۔

اس کے علاوہ ریڈیو پر سننے ہوئے نئی کانوں کی ڈھنیں بھی اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں اور اُس نے ہاتھ کے پیچھے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اشلوک کا مار ہے — دلچسپ کا مار ہے — پھر اُسے کاسنی کو اشل اور غلی حیونت کا خیال آیا — مگر اُس نے جب اُس لڑکی کی طرف اس فرض سے دیکھا تو اُس میں کاسنی کو اشل اور غلی حیونت کے اندر غل نظر آجائیں تو اس نے ان دونوں ایکٹرسوں پر لعنت بھیجی — وہ ان سے کہیں لڑا دے جیسی تھی — اس کے طبل کے کُرتے میں جو شباب تھا، اس کا مقابلہ، اس نے سوچا، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

تغیر نے اُسے اُس سے بند کر دیے اور اُس لڑکی سے جس کا نام پر دین تھا، عشق لڑانا شروع کر دیا۔

شروع شروع میں اُسے بڑی مشکلات پیش آئیں، اس لیے کہ اُس لڑکی ایک دسائی تغیر کا سانی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر اسے اپنے والدین کا بھی ڈر تھا۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اُس سے عظمت ہوگی یا نہیں ؟

بہت دیر تک وہ انہی الجھنوں میں گرفتار رہا — راتیں جاگتا — جھاڑیوں کی پست قد جھاڑ کے پاس جاتا — کُردہ نظر نہ آتی۔ گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا، اور وہ بارش والا منظر جاس نے دیکھا تھا، آنکھیں بند کر کے ذہن میں دہرا کرتا۔

بہت دنوں کے بعد آخر اُس کو ایک روز اُس سے ملاقات کرنے کا موقع مل گیا، وہ اپنے باپ کی کار میں گھر کے کسی کام کی فرض سے جا رہا تھا کہ پر دین سے اُس کی مدد بھیڑ ہو گئی۔ وہ کار اشارت کر کے چکا تھا کہ ساتھ والی گاڑی میں سے تغیر کے بھائی کی شہزادی نکلی، اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ موٹر روک لے۔

تغیر گھبرا گیا — ہر عاشق ایسے موقعوں پر گھبرا جی جایا کرتا ہے۔ اُس نے موٹر کچھ ایسے ہیڈ سے انداز میں روکی کہ اُس کو زبردست دھچکا لگا — اس کا سر فوراً سے اسٹریٹک وہیل کے ساتھ ٹکرایا، مگر اُس وقت وہ شراب کے نشے سے زیادہ غمزدگ تھا۔ اُس کو اُس کی محراب نے خود غلط کیا تھا۔

بدترین کے ہونٹوں پر گہرے شرمخ رنگ کی لپ اسٹک چھٹی ہوئی تھی — اس نے شرمخ مسکراہٹ سے کہا،

معلت فراموشی کا بیشک آپ کو تکلیف دی ————— بارش ہو رہی ہے ————— تاکہ اس دُور دراز جگہ میں داخل ہے ————— اور مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا، آپ میرے ہمسایے ہیں، اسی لیے آپ کو یہ نصیحت دی :

”تو نے کہا، زحمت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ————— میں تو ————— میں تو ————— اس کی زبان کو لاکھڑا کر کے تباہ ہے میرا تعداد تو نہیں، لیکن آپ کو ایک بار دیکھنا تھا۔“

ہمدردی اور شہسوار مسکراہٹوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اور تحریر سے پوچھا آپ نے مجھے کب دیکھا تھا :

”تو نے جواب دیا، آپ کی کوشی کے لان میں ————— جب آپ ————— جب آپ اور آپ کے ساتھ ایک اور دھڑکی باتش میں شمار ہی تھی۔“

ہمدردی نے اپنے گھر سے شہسواروں میں سے جو شخص فانا اور نکالی لہائے ————— آپ کو کھو رہے تھے :

”یہ گستاخی میں نے ضرور کی ————— اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔“

ہمدردی نے ایک ادا کے ساتھ اُس سے پوچھا، آپ نے دیکھا کیا تھا :

یہ سوال ایسا تھا کہ تحریر اُس کا جواب نہیں دے سکتا تھا، آئیں بائیں شاخیں کو کے رہ گیا تھی کچھ نہیں ————— بس آپ کو ————— میرا مطلب ہے کہ دو لڑکیاں تھیں جو باتش میں شمار ہی نہیں اور ————— اور خوش ہو رہی تھیں ————— میں اُس وقت اہم

چوس رہا تھا۔“

ہمدردی کے گھر سے شہسواروں پر شہسوار مسکراہٹ پیدا ہوئی، آپ اہم چوتھے کیوں ہیں ————— کلاٹ کریوں نہیں کھاتے :

”تو نے ٹوڑا اشارہ کر دی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سوال کا جواب کیا دے چلا پھر وہ گولی کر گیا : آپ کو میں کہاں ٹاپ کر دوں۔“

ہمدردی مسکرائی تباہ مجھے کہیں بھی ٹاپ کر دیں، ادھی مری منزل ہو گئی۔“

تو نے یوں محسوس کیا کہ اُسے اپنی منزل مل گئی ہے، ڈاک جرنل کے پہلو میں بیٹھی ہے، اب اُسی کی ہے، لیکن اُس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ اُس کا ہاتھ دبائے، یا اُس کی لکیر میں ایک دو سیکنڈ کے لیے اپنا بازو جمائی کر دے۔

بارش ہو رہی تھی، موسم بہت خوشگوار تھا، اس نے کافی دیر سوچا اور مڑ کر دیکھا اُس کے خیالات کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی تھی

اس نے ایک جگہ سے روک لیا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کو اپنے ساتھ چٹا لیا، اُس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیرست

کر دیے ————— اُس کی یہ محسوس ہوئی کہ وہ کوئی بہت ہی لذیذ اہم چوس رہا ہے، ہمدردی نے کوئی مزاحمت نہ کی ————— لیکن فوراً

تیز کر کے احساس بڑی شدت سے غرا کہ اس نے بڑی ناشائستہ حرکت کی ہے، اور غالباً پردہ کی کاس کی یہ حرکت پسند نہیں

آئی، چنانچہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اُس نے کہا ”آپ کو کہاں جانا ہے“

ہمدردی کے چہرے پر یوں خشکی کے کوئی آثار نہیں تھے، لیکن تحریروں محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ اُس کے خون کی پیاسا

ہمدردی نے اُسے بتا دیا کہ اُسے کہاں جانا ہے ————— جب وہ اس جگہ پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکیوں کا چکر ہے۔

— جب اس نے پتہ دیکر موڑ سکے آتا تو اس کے ہونٹوں پر گہرے لال رنگ کی مسکراہٹ بکھر رہی تھی۔ اس نے کولھے ٹکاکر
 ٹیٹ کے سیروں کے انداز میں اس سے کہا: "شام کو میں یہاں جوتی ہوں — آپ بھی ضرور تشریف لائیے۔"
 تنویر جب بھونپکا ہر کہنی مرثی کی طرف بڑھا، تو اسے ایسا لگا کہ وہ بھی ایک گیسو عورت ہے، جیسے وہ ہر روز پہنا کرتا ہے۔
 اس کی لال جی لب اسٹاک ہے، جو چڑی نے ہونٹوں پر چھپا ہوئی تھی۔
 وہ داپہن اپنی کوٹھی چلاتا یا ————— بادشہ ہو رہی تھی ————— اور تنویر بے حد منہم تھا۔ ————— اس کو ایسا محسوس
 ہوا کہ اس کی آنکھوں کے آئینہ بادشہ کے قطرے بن کے ٹپک رہے ہیں۔

(۴۱ مئی ۱۹۵۲ء)

افشائے راز

”تیری نگہی کسے نہ دیکھی، تے ٹکدی نوں جگ جاندا۔“

”یہ آپ نے گانا کیوں شروع کر دیا ہے۔“

”ہر آدمی گانا اوروں کے لیے — کوئی ناکارہ کیا ہے؟“

”کی آپ غل غلطیوں کی گیت گاتے تھے۔“

”غسل خانے میں تو ہر شے آدمی اپنی استطاعت کے مطابق گاتا ہے — اس لیے گویاں کوئی سننے والا نہیں ہوتا — میرا خیال ہے، تمہیں میری آواز پسند نہیں آتی۔“

”آپ کی آواز تو ماشاء اللہ شرعی لگی ہے۔“

”مجھے جباری ہو — مجھے اس کاظم ہے کہ میں کئی سالوں میں کئی گزشتیں نہیں — کوئی میں اسے چٹے بانس کی آواز نہ کہہ سکتا ہے۔“

”مجھے تو آپ کی آواز بڑی سُریل معلوم ہوتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے — لیکن میں پوچھتی ہوں، ہر وقت یہ پنجابی بولی دروڑ زبان کیوں دہکتی ہے۔“

”مجھے اچھی لگتی ہے — بلکہ تم کو اگر ادب اور شعر سے ذرا سا بھی شغف ہو —“

”یہ شغف کیا بلا ہے — آپ ہمیشہ ایسے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔“

”شغف کا مطلب — میں تو یہ سمجھ لو — کہ اس کا مطلب لگاؤ ہے۔“

”مجھے شاعری سے لگاؤ نہیں ہو — ایسی داریات چیز ہے۔“

”یعنی شاعری بھی ایک چیز ہوگئی — یہ تمہاری بڑی زیادتی ہے — فرصت کے لمحات میں اپنے اندر فوق پیدا کیا کرتے“

”مجھ بچتے پیدا کر چکی ہوں — اب میں اللہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی۔“

”میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا کہ معاملہ ختم ہونا چاہیے، پر تم ہی نہیں مانتی — جو بچے پیدا کر کے تم شک لگتی ہو، تمہارے

بڑوں میں مسز قیوم رہتی ہیں۔ اس کے گیارہ بچے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں بھی گیارہ ہی پیدا کروں۔“

”میں نے یہ کب کہا ہے — میں تو ایک کا بھی قائل نہیں تھا۔“

”ہیں ابھی طرح جانتی ہوں — جب میرے تجھ نہ جوتا تو آپ ایسی بہانے سے دوسری شادی کر لیتے تے۔“
 ”میں تو ایک ہی شادی سے بھر پایا ہوں — تم ساری زندگی کے لیے کافی ہو — میں دوسری شادی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔“

”تھوڑے چٹائی لولی کس لیے گائی جا رہی تھی؟“
 ”جیسی میں کرچکا ہوں کو مجھے یہ پسند ہے — تمہیں پسند ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں — میری نگاہی کسے نہ دیکھی تے ٹھڈی نوں چلک جاؤا۔“

”اُس لولی میں آپ کو کیا لذت محسوس ہوتی ہے؟“
 ”میں اس کے متعلق ووثوق سے کچھ نہیں کر سکتا۔“
 ”آپ نے اب تک کوئی بات وقوت سے نہیں کہی؟“
 ”وقوت نہیں — ووثوق — یہی یقین کے ساتھ۔“
 ”آپ نے ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں کہ جس میں یقین پایا جاتا ہو۔“
 ”لو، آج یہ نئی بات سنی — میری باتوں پر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔“
 ”مردوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیلئے ہے؟“

”تھوڑوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا — گھڑی میں تو وہ گھڑی میں ماشہ — آپ ہی پھاڑتی ہیں آپ ہی رنڈ کرتی ہیں۔“
 ”مجھ میں نہیں آتا یہ آج کی بڑی کس بات پر ہے۔“

”آپ ایسے وہابیات گیت گاتے رہیں اور میں چپ رہوں — اب سے وہ قرآن و مہمان آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے اعتنائی کی — میری مجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو فخر اور گھٹنوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے — ابھی کچھ دنوں آپ مسلسل شعر گنگنا رہے تے۔“

”سننا ہے مر جینوں کو بھی کچھ کچھ
 مروت کے قرینے آرہے ہیں
 مجھے اس پر سخت اعتراض ہے — کوئی شریف آدمی ایسے شعر نہیں گاتا — آپ سے
 تیری ذات ہے اکبری مہوری
 میسری بار کیوں دیر اتنی کری

نہیں گاتے۔“

”لاول ولا — تم بھی کہیں لوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہو۔“
 ”یہ باتیں گرا آپ کے نزدیک لوٹ پٹانگ ہیں؟ — اس لیے کہ پاکیزہ ہیں؟“

”دنیا میں ہر چیز پاکیزہ ہے“

”آپ بھی؟“

”میں تو بیش صاف ستھرا ہوتا ہوں۔ تم نے کئی مرتبہ اس کی تعریف کی ہے۔ میں دوسرے کپڑے بدلتا ہوں۔ سخت سڑی بھی ہر غسل کرتا ہوں۔ تم تو میں چاروں چھوڑ کے نہائی پر۔ تمہیں پانی سے نفرت ہے۔“

”اچھا والدہ! — میں تو ہر پختہ ہاتھ دھو نہائی ہوں۔“

ہر پختہ کا نہانا تو سفید جھوٹ ہے — قرآن کی قسم کھا کے بتاؤ تمہیں خائے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں۔

”میں قرآن کی قسم کھانے کے لیے تیار نہیں — آپ بتاتے، کب غسل کیا تھا۔“

”آج صبح“

”جھوٹ — آپ کا آؤل جھوٹ، آخر جھوٹ — آج صبح تو دل میں پانی ہی نہیں تھا — میں نے ساڑھے نو بجے کے قریب دو چٹکیں منگوائی تھیں۔“

”تو غسل کیا — واقعی آج میں نے غسل نہیں کیا۔“

”آپ کو جھول جانے کا مرض ہے۔“

”جھوٹا انسان کی فطرت ہے — اس پر تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں — چند روز ہوئے تم دس کا نوٹ کیوں رکھو گے جھول گئی تھیں۔ اور پھر برا نام لگایا کہ میں نے چوری کر لیا ہے — یہ کتنی بڑی نیراوازی تھی۔“

”جیسے آپ نے میرے دہکے کپڑے نہیں چرائے — پچھلے مہینے گیری الماری سے آپ نے سورو پے نکالے اور غائب کر گئے۔“

”ہو سکتا ہے وہ کسی اور نے چرائے ہوں — اگر تمہیں پھر رشک تھا تو بتا دیا ہوتا — یہ جلی ملن ہے کہ تم نے وہ سورو پے کا نوٹ کسی محفوظ جگہ رکھا ہو اور بعد میں جھول گئی ہو — کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔“

”کب؟“

”پچھلے سال، اسی مہینے تم نے پانچ سورو پے کے نوٹ اپنے بنگ کے بستر کے نیچے چھپا رکھے تھے اور تم ان کے متعلق بالکل بھول گئی تھیں — پھر پر اسلام لگایا گیا تھا کہ میں نے چرائے ہیں، آخر میں تم ہی تلاش کر کے نکالے اور تمہارے حوالے کر دیے۔“

”کیا پتہ ہے کہ آپ نے چرائے ہوں اور بعد میں میرے غور چلائے ہو یا نہی جیب سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ دیئے ہوں۔“

”میری بکھری تمہاری یہ منطق نہیں آتی۔“

”آپ کی بکھری تو کوئی چیز ہی نہیں آتی — کل میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہی کھانا آپ کے لیے مفید ہے، لیکن آپ نے مجھے راکب پکھڑا دیا کہ وہی فضول چیز ہے۔“

”وہی تو میں ہر روز کھاتا ہوں۔“

”یہ خط میرا ہے — لاؤ اور صبر“
 ”میں کھولتی ہوں — پڑھ کے آپ کے حوالے کر دوں گی۔“
 ”تجسس میرے خط پڑھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔“
 ”میں ہمیشہ آپ کے خط پڑھتی رہی ہوں — یہ حق آپ نے کب سے مجھ سے لیا؟“
 ”اچھا یہ بتاؤ کہ خاکسں کا ہے۔“
 ”آپ ہی کا ہے؟“
 ”کس نے لکھا ہے؟“
 ”آپ کی ایک سہیلی نے — جس کا نام عددا ہے — وہ پنجابی بولی جو آپ گاتے پھرتے ہیں اس کا مذکب پیشانی پر لکھی ہے۔“
 میری لکھی کسے نہ دیکھی دے — تے ٹنڈی نوں جگ جاندا
 یہ ٹوٹ ہی جانے تو بہتر ہے۔
 (۱۵۱ مئی ۱۹۵۲ء)

آمنہ

دُور تک پیسلے ہوئے دھانی کے سترے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ تجھے کافر وہاں رٹا کُتھکتے ہوئے دھان کے پُر اُٹے اٹھا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ گا بھی رہا تھا

دھانی کے پُسلے دھردھر کاغذ سے

بھر بھر رہے

کھیت سنبھلا دھن دولت دے۔

بُندو کا باپ بچا، گاؤں میں بہت مقبول تھا۔ پُر شخص کو معلوم تھا کہ اُس کو کافی پیروی سے بہت زیادہ ہے۔ اُن دونوں کا عشق گاؤں کے ہر شخص کو معلوم تھا۔ ان کے دو بچے تھے ایک بُندو جس کی عمر تیرہ برس کے قریب تھی اور سراجندو۔

سب خوش و خرم تھے، مگر ایک روز اچانک تجھے کی بڑی بیمار لڑکی، امالت بہت نا اگ رہ گئی۔ بہت علاج کیے، ٹوٹے ٹوٹے اُتھاتے، مگر اُس کو کوئی افادہ نہ ہوا۔ جب روض ملک شکل اختیار کر گیا تو اُس نے اپنے شوہر سے بیخوف لہجہ میں کہا، تم مجھے کبوتری کہا کرتے تھے اور خود کو کبوتر۔
 — تم دونوں نے دو بچے پیدا کیے — اب یہ تمہاری کبوتری مر رہی ہے — کہیں جیسا نہ ہو کر میرے منے کے بعد تم کوئی اور کبوتری اپنے گھر لے آؤ۔“

تھوڑی دیر کے بعد اُس بیغیرانی کیفیت طاری ہو گئی۔ تجھے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اُس کی پیروی بوسلمہ علی جا رہی تھی۔ تم اور کبوتری لہو لٹکے — وہ سوچے گی کہ جب تک میرے بچے زندہ ہیں تم اُس سے جنت نہیں کرو گے — چند غمزدہ آن کر ذرا بچ کر کے کھا جائے گا۔“

تجھے نے اپنی پیروی سے بڑے زیادہ کے ساتھ کہا، لیکن، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا مگر تمہارے دُشمن مری۔ تم بہت جلد شیک ہو جاؤ گی۔“

لیکن کے ہوشوں پر مُردہ سہی سکڑا ہٹ نمودار ہوئی، اس کے فوراً بعد اُس کی نوعِ نفسِ منہری سے پیدا ہوئی لڑکی، بچا بہت دوبا۔ جب اُس نے اپنے ہاتھوں سے اس کو دفن کیا تو اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے اپنی زندگی انہوں مٹی کے نیچے گاڑ دی ہے

اب وہ ہر وقت غمزدہ رہتا، کام کاج کام میں اُسے کوئی دلچسپی نہ رہی، ایک دن اُس کے ایک دُعا دار دُعا کرنے اُس سے کہا، تیرا بہت دوست دُفوں سے آپ کی یہ حالت دیکھ رہا ہوں، اب آپ مجھ کی قیادت میں کھانا کھا لیں۔ رات بھر سے غمزدہ رہنے کو کھانا کھا کر آپ اپنے بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اپنی ذمہ داری کی عورت کوئی تو جبر نہیں دیتے — آپ کو اس کا علم بھی نہیں کہنا نقصان ہر

ہوتا ہے :

”چنے نے بڑی بے قرصی سے کہا تم نے دو — مجھے کسی چیز کا مشورہ نہیں۔“

”سہرا — آپ ہوش میں آئے — چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں، ایسا نہ ہو وہ آپ کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر آپ کی زمینوں پر قبضہ کر لیں، آپ سے مقدمہ بازی کیا ہوگی — میری تو یہی غلط فہمی تھی کہ آپ دوسری شادی کریں — اس سے آپ کے غم کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور وہ آپ کے لڑکوں سے بڑا فائدہ دے گی۔“

”مجھے کوئی غصہ آیا، لیکن اس مذکورہ قضیہ کی تم مجھے نہیں کہہ سکتی، اس لیے کیا ہوئی ہے اس کے علاوہ تم یہ بھی تو سوچ رہی ہو گی کہ رُوح کو کتنا بڑا سودر پہنچے گا۔“

”ہست دہن کے حوالہ کے بعد آخر وہ قضیہ اپنے آقا کو دوسری شادی پر راضی نہ کرنے میں کامیاب ہو گیا، جب شادی ہو گئی تو اس نے اپنے لڑکوں کو ایک مختصر مکان میں بھیجا — ہر روز وہاں کوئی کئی گھنٹے رہتا اور چند روز بعد وہاں کوئی آکر رہتا۔“

”نئی بیوی کو بے بات بہت ناگوار گزری۔ ایک بات اور بھی تھی کہ کھانے اور دوا کا بیشتر حصہ اُس کے سر پہنے بیٹوں کے پاس پہنچا جاتا تھا۔ اس سے وہ بہت ملتی، اس کا توجہ طلب تھا کہ گھر بار کے کاموں میں وہ بھی ہیں۔“

”ایک دن تھا جب کھیتوں سے واپس آیا تو اس کی نئی بیوی اور بچے دھڑلے لگی۔ چنے نے اس کو دنا دیا کہ وہ بچے کو اس نے کہا تم مجھے پرنا نہیں کہتے — اسی لیے بچوں کو دوسرے مکان میں بھیج دیا میں اس کی اس عرصہ کو کوئی دشمن تو نہیں ہوں مجھے بہت دکھ رہا ہے۔ جب میں سر جاتی ہوں کہ چہارے کیلے رہتے ہیں۔“

”نمائاں باتوں سے بہت متاثر ہو کر دوسرے ہی دن چنے اور چند لوگ سے آیا اور ان کو سرتیلی ماں کے حوالے کر دیا اس نے ان کو اتنے پرنا محبت سے رکھا کہ اس پاس کے تمام لوگ اُس کی تعریف میں رطب و افسان ہو گئے۔“

”نئی بیوی نے جب اپنے خاوند کے دل کو پوری طرح سمجھ لیا تو ایک دن ایک مرد کو لگا کر کیلے میں اُس سے بڑے داندارانہ لہجے میں کہا، میں تم سے ایک کام ایسا چاہتی ہوں — جو کر دو گے :—

”اس مرد نے اُس کا نام شہزادی تھا، ہاتھ بڑے کھلم کھلا، آپ ماں باپ ہیں — جان تک حاضر ہے :—

”نئی بیوی نے کہا، دیکھو، اکل دیا کہ پاس دست بڑا میلنگ رہا ہے — میں اپنے سر پہنے بچوں کو تمہارے ساتھ بھیجوں گی، ان کو کشتی کی سیر کرانا اور کسی نہ کسی طرح جب کوئی اور دیکھتا نہ ہو انھیں گھر سے باہر میں ڈروں گا۔“

”شہزادی کی ذہنیت غلامانہ تھی، اس کے علاوہ اُس کو بہت بڑے انعام کا لالچ دیا گیا تھا۔ دوسرے روز چند اور چند لوگ اپنے ساتھ لے گیا، انھیں کشتی میں بٹھایا، اُس کو خود کھینچنا شروع کیا، وہ بائیں دھڑ تک چلا گیا، جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا — اُس نے چاہا کہ انھیں دھکا دے کہ ٹھوکر دے، لیکن ایک دم اُس کا منیر جاگ اٹھا۔ اُس نے سر ہٹا، اپنی آنکھوں کو لگا لگا دیکھا — سوائے اس کے کہ ان کی آنکھوں میں سرخی چھائی ہو، سرتیلی ماں کے جسم کو دم پر ہیں۔ جتر بھی ہے کہیں، انھیں کسی شخص کے حوالے کر دیں اور سرتیلی ماں سے جا کر کہہ دیں کہ وہ غور سے ڈوب چکے ہیں۔“

دیر کے دوسرے کدے اڑ کر اُس نے چند اور چندوں کا ایک تاج کے حوالے کر دیا۔ جس نے اُن کو ملازم رکھ لیا۔
 پڑاؤ کا بند کھیل کر کاٹا دیا، محنت و مشقت سے بہت گھبراتا تھا۔ تاج کے اُس سے بھاگ نکلا اور پیدل چل کر دوسرے
 شہر میں پہنچا، مگر وہاں اُسے ایک صورت مند آدمی کے ہاں اس کا نام ملتا دیکھتا تھا یہاں بیٹا بڑی تعلیم دیکھ گیا، اُس نے چاہا
 کہ بتدو کو یہاں آن کر دیکھ لے چنانچہ اُس نے اُس سے پوچھا، رخصت دار کیا تحفہ لوگے۔
 بتدو نے جواب دیا، جناب میں تحفہ نہیں لوں گا۔

تعلیم دیکھ کر کسی قدر حیرت ہوئی۔ وہ شکل و صورت کا اچھا تھا، اس میں گندہری بھی نہیں تھا، اُس نے پوچھا، تم کس خاندان
 کے ہو۔ کس شہر کے باشندے ہو؟

بتدو نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا، پھر رونے لگا، تعلیم دیکھنے اُس سے مزید استفسار کرنا مناسب نہ
 لگا، جب بتدو کو اس کے یہاں رہنے ہونے کا فیصلہ ہو گیا تو تعلیم دیکھنے اُس کی خوش اطواری سے بہت متاثر ہوا۔ ایک دن اُس
 نے اپنی بیوی سے کہا۔ بتدو مجھے بہت پسند ہے۔ میں تو سوچتا ہوں، اس سے اپنی ایک ٹوکی بیاہ دوں۔
 بیوی کو اپنے خاندان کی یہ بات ہنسی لگی، لیکن آخر اس نے کہا، آپ سے اس کے خاندان کے تعلق تو دریافت کیجیے۔
 تعلیم دیکھنے کے کہا، میں نے ایک مرتبہ اُس سے اُس کے خاندان کے تعلق پوچھا تو وہ زار و قطار رونے لگا۔ پھر میں
 نے اس موضوع پر اُس سے کبھی گفتگو نہیں کی۔

بتدو کوئی دس تعلیم دیکھ کے ہاں رہا۔ جب میں برسی ہو گیا تو تعلیم دیکھ نے اپنا سارا کدو بار اُس کے سپرد کر دیا، کافی عرصہ
 گزر گیا، ایک دن بتدو نے بڑے عذاب سے اپنے آقا سے درخواست کی، دیر کے اُس پار ڈور کا ایک گاؤں ہے، وہاں میں چھوٹا سا
 مکان بنوانا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے آپ اتنا دیر پر محنت فرما سکتے ہیں کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے۔
 تعلیم دیکھنے نے اُس کا نام بتدو پر یہ چاہو لے سکتے ہو مثلاً۔ لیکن یہ بتادو کو تم دیر کا دوسرا مکان کیوں بنوانا چاہتے ہو؟
 بتدو نے جواب دیا، یہ دراز آپ پر مضرب کھل جائے گا۔

بتدو اور چندو کا باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں گھٹل گھٹل کے مر چکا تھا، مزاروں کی بڑی باتر حالت تھی۔ اس لیے کہ زمینوں
 کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

بتدو، بہت سا دیر سے کہ اپنے گاؤں پہنچا، ایک پکا مکان بنوایا اور مزاروں کو خوش حال کر دیا۔
 بتدو کا بھائی چندو جس شخص کے ہاں ملازم ہوا تھا، اُس نے اُس کو بیٹا بنایا تھا، ایک دفعہ وہ خطرناک طور پر بیمار پڑ گیا تو
 اس شخص کی بیوی نے جس کا نام سوتھیاں تھا، اپنی بیٹی آمنہ سے کہا کہ وہ اُس کی تیمارداری کرے۔
 آمنہ بڑی نازک اندام حسین لڑکی تھی۔ دن رات اُس نے چندو کی خدمت کی۔ آخر وہ صحت مند ہو گیا تیمارداری کے اس
 دور میں وہ کچھ اس طرح گھٹل مل گئے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔
 مگر چندو سوچتا تھا کہ آمنہ ایک دولت مند کی لڑکی ہے اور وہ محض کنگلا، اُن کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔ اُس کے والدین

بھلا کہ ان کی شادی پر راضی ہوں گے۔ لیکن آئندہ کو کسی قدر یقین تھا کہ اس کے والدین راضی ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ چند کو بڑی اچھی لگا ہوں سے دیکھتے تھے۔

ایک دن چندو گائے عیسوں کے روڑ کو جو ٹھہر پانی پلا رہا تھا کہ آئندہ ورتی ہوئی آئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ نفا ساسینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے خوش خوش چندو سے کہا، ایک بہت اچھی خبر لائی ہوں۔ سچ میری ماں اور آپ میری شادی کی بات کر رہے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ اس لیے تمہیں میرے ساتھ بیاہ دینا چاہیے۔ چندو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے آئندہ کو اٹھنا شروع کر دیا۔

ان دونوں کی شادی جو گئی ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام تھیل رکھا گیا۔

جب چندو اپنے گاؤں میں بھی طرح جم گیا تو اس نے بھائی کا پتہ لیا۔ ہلکے اس سے ۱۵۔ ۲۰ برس بڑے۔ چندو نے اس سے کہا، اب اللہ کا فضل ہے۔ چلو میرے ساتھ اور ویلائی سمجھا لو میں چاہتا ہوں تمہاری شادی اپنی سالی سے کروں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔

چندو نے اس کو بتایا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے۔ سارے حالات سن کر چندو نے اس کو گھایا۔ چندو ایک بے حد دھند آدمی ہے۔ اس کی لڑکی سے شادی کر لو۔ ساری عمر عیش کرو گے۔ آئندہ کے باپ کے پاس کیا پڑا ہے؟ چندو اپنے بھائی کو یہ باتیں سن کر دل میں آگیا، اور دولت مند آئندہ کو چھوڑ دیا۔ طلاق نامہ کسی کے ہاتھ سے لیا اور اس سے ملے بغیر چلا گیا۔

چندو کے بعد ہی چندو نے اپنے بھائی کی شادی تلہدریگ کی چھوٹی لڑکی سے کرادی۔ آئندہ سرن و پریشان تھی کہ اس کا پیارا چندو ایک دم کہاں غائب ہو گیا۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ایک دن چندو واپس آجائے گا۔ بڑی دیر اس نے اس کی واپسی کا انتظار کیا اور اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہی جب وہ آیا تو آئندہ کے باپ نے تھیل کو ساتھ لیا اور چندو کے گاؤں پہنچا۔ اس کی ملاقات چندو سے ہوئی۔ وہ دولت کے نشے میں سب کو قبول چکا تھا۔

آئندہ کے باپ نے اس کی بڑی منت سماجت کی اور اس سے کہا، اور کچھ نہیں تو اپنے اس کم بہن بیٹے کا خیال کرو۔ تمہارے بغیر اس بچے کی زندگی کیا ہے؟

چندو نے یہ کراہا کہ اب دریا میں اپنی دولت اور عزت اس بچے کے لیے چھوڑ سکتا ہوں؟ جاؤ اسے لے جاؤ اور میری نظروں سے دور کرو۔

جب آئندہ کے باپ نے اور ڈاؤن منت سماجت کی تو چندو نے اس بچے کو دھکے دے کر باہر نکلا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بچے کو بھی۔

بڑھاپا پر غم و اندوہ سے چھر گھر پہنچا اور آئندہ کو ساری داستان سنادی۔ آئندہ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ بالکل ہو گئی۔

چندو پر پے در پے اتنے مصائب آئے کہ اس کی ساری دولت اُجر گئی۔ بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ جیوی لڑکھنڈا

اپنے بچے کی گناہ اب اُس کو آسنے یاد آتی۔ وہ اُس سے ملنے کے لیے اس کا بیٹا جیسل، ڈیڑوں کاٹھا چنچر، اس سے گھر کے باہر ملا۔
اُس نے اُس کو پیار کیا اور آسنے کے متعلق اس سے پوچھا۔

جیسل نے اُس سے کہا، آؤ تمہیں بتاتا ہوں، میری ماں آج کل کہاں رہتی ہے۔

وہ اُس سے دُور لے گیا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے یہاں رہتی ہے آسنے اماں۔

(۱۶ مئی ۱۹۵۴ء)

تصویر

”تجے کہاں ہیں؟“

”مر گئے ہیں!“

”سب کے سب؟“

”ہاں، سب کے سب — آپ کو آج ان کے صلق پر چھنے کا کیا خیال آگیا؟“

”میں اٹھا کا باپ ہوں۔“

”آپ ایسا باپ خدا کرے کبھی پیدا ہی نہ ہو۔“

”تم آج اتنی خفا کیوں ہو — میری کچھ ترس نہیں آتا، گٹری میں رقی گٹری میں ماشہ ہر باتی ہو — دفتر سے تھک کر آیا ہوں اور تم نے میرے چہ رخ شروع کر دی ہے — بستر تھاکر میں داناں دفتر کی میں پچھلے کے نیچے آرام کرتا۔“

”پہلکھایاں بھی ہے — آپ آرام طلب ہیں — میں آرام فرما سکتے ہیں۔“

”تھلا گٹر کبھی نہیں جائے گا — میرا خیال ہے کہ وہ چیز تھیں جو میری دل تھی۔“

”میں کہتی ہوں کہ آپ مجھ سے اس قسم کی خرافات نہ بلائیے — آپ کے وعدوں کا تہائی ہی ٹھہل گیا ہے۔“

”یہاں تو سب کچھ ٹھہل گیا ہے — تمہاری وہ جوانی کہاں گئی؟ — میں تو اب ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے سو برس کا ہڈھا ہوں۔“

”آپ کے اعمال کا نتیجہ ہے — میں نے تو خود کو کبھی عمر رسیدہ محسوس نہیں کیا۔“

”میرے اعمال اتنے سیاہ تو نہیں — اور پھر میں تمہارا غم نہ مرتے ہوئے کیا، آج بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ تمہارا شباب اب

”دو پہنچ رہا ہے۔“

”مجھ سے اس زبان میں گفتگو کیجیے جس کو میں سمجھ سکوں — یہ ترو بہ نرالی کیا ہوتا۔“

”چھوڑو اسے — آؤ مجھ سے بیاہ کی باتیں کریں۔“

”آپ نے ابھی زگی تو کہا تھا کہ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سو برس کے بڈھے ہیں۔“

”بھئی دل تو جوان ہے۔“

آپ کے دل کو میں کیا کہوں — آپ بسے بدل کتے ہیں بلکہ — کوئی پڑچھے تو میں ہی کہوں گی کہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جو

اس شخص نے اپنے پیلوں و ہار کا بے اور دھڑکا کرنا ہے کہ اس میں جنتِ نوری برتی ہے ————— آپ جنت کنا کیا پائیں —————
جنتِ اُمرت و حیرت ہی کر سکتی ہے ۔

”آج تک کتنی عورتوں نے مردوں سے جنت کی ہے ————— ذرا تاریخ کا مطالعہ کرو ————— ہمیشہ مردوں ہی نے عورتوں سے
جنت کی اور اُسے نبھایا ————— عورتیں تو ہمیشہ بے وقار ہی ہیں ۔“

”جھوٹ ————— اس کا اول جھوٹ داس کا آخر جھوٹ ————— بے وفائی تو ہمیشہ مردوں نے کی ہے ۔“
اور درجہ انگشتان کے بادشاہ نے ایک معمولی عورت کے لیے تخت و تاج چھوڑ دیا تھا ————— وہ کیا جھوٹی اور فرضی
داستان ہے ۔“

”میں ایک مثال پیش کر دی اور پھر پر حسبِ مثال دیا ۔“

”بھئی اگر خلیہ میں ہی ہزاروں مثالیں موجود ہیں ————— مرد جب کسی عورت سے عشق کرتا ہے تو وہ بھی پیچھے نہیں ہٹتا کہ جنت
اپنی جان تو ران کو دے گا، مگر اگر محبوب کو دوسری بھی ایذا پہنچنے نہیں دے گا تم نہیں جانتی ہو مرد میں جب کہ وہ جنتوں کو فدا کر کے جنتی جاتی ہو تو
نہیں جانتی ہوں ————— آپ نے تو کل اماری کا بھانپنا اور فائدہ بھی نہیں کھل سکا ————— آخر مجھے ہی زور لگا کر کھولنا پڑا ۔“

”دیکھو جانم ————— تم زیادتی کر رہی ہو ————— قہیں معلوم ہے کہ میرے دو بیٹے باندو میں ریج کا اور تھار میں اُس دن دفن بھی
نہیں کیا تھا اور سارا دن اور ساری رات پڑا کر جتا رہا تھا ————— تم نے میرا کوئی خیال نہ کیا اور اپنی سیٹیوں کے ساتھ سینہ دیکھنے پر لگی تھی۔“
”آپ تو بہاد کر رہے تھے۔“

”لا حول وہ ————— یعنی میں بہاد کر رہا تھا، درد کے اسے میرا رُخ حال ہو رہا ہے اور تم کتنی ہو کہ میں بہاد کر رہا تھا —————
صفت ہے ایسی زندگی پر۔“

”یہ صفت مجھ پر بھی لگنی ہے؟“

”تھار کی عقل پر تو چھڑ گئے ہیں ————— میں اپنی زندگی کا دنا اور دیا تھا۔“

”آپ تو بہادرت دوتے ہی رہتے ہیں ۔“

”تم تو ہنستی رہتی ہو ————— اس لیے کہ قہیں کسی کی پرہیزی نہیں۔ بچتے جائیں نہ غم میں، میرا جنازہ نکل جائے ————— یہ مکان
جل کر راکھ ہو جائے، مگر تم ہنستی رہو گی ————— اسی بے دل صورت میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی ۔“

”کتنی عورتیں دیکھی ہیں آپ نے اب تک؟“

”ہزاروں، لاکھوں ————— مگر کون پر تو آج کل عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں۔“

”جھوٹ نہ بولے ————— آپ نے کوئی نہ کوئی عورت خاص طور پر دیکھی ہے۔“

”خاص طور پر سے تھار کا مطلب کیا ہے؟“

”میں آپ کے دادا کھولنا نہیں چاہتی ————— میں اب بڑھتی ہوں۔“

”کہاں؟“

”ایک سیسل کے بیان — اُس سے پتا دکھڑا بیان کروں گی۔ خود دوتوں کی داس کو بھی رلاؤں گی — اس طرح کچھ جی جھکا ہو جائے گا۔“

وہ دکھڑا جو فقیس (یعنی سیسل) سے بیان کرنا ہے، مجھے ہی بتا دو — میں تمھارے نظم میں شریک ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔“

”آپ کے وعدے؟ — کبھی ایسا ہوئے ہیں؟“

”تم بہت زیادتی کر رہی ہو — میں نے آج تک تم سے بڑی وعدہ کیا، پر کیا — ابھی پچھلے دنوں تم نے مجھ سے کہا کہ چائے کا ایک سیٹ لا دو — میں نے ایک دوست سے دس روپے قرض لے کر بہت عمدہ سیٹ خرید کر تمہیں لا دیا۔“

”بڑا احسان کیا بھوپر — وہ تو دراصل آپ اپنے دوستوں کے لیے لائے تھے — اُس میں سے دو روپے کس نے توڑے تھے؟ فوراً یہ تو بتائیے؟“

”ایک بیلا تمھارے بڑے لڑکے نے توڑا — دوسرا تمھاری چھوٹی بچی نے۔“

”سارا الزام آپ ہمیشہ انھیں پر دھرتے ہیں — اچھا یہ بحث بند ہو — مجھے نہادھو کر کپڑے پہناؤ اور بچہ ڈاکر لے۔“

”دیکھو میں نے آج تک کبھی سخت گیری نہیں کی میں ہمیشہ تمھارے ساتھ نرمی سے پیش آتا رہا ہوں، مگر آج میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ باہر نہیں جاسکتیں۔“

”اچی واہ — بڑے آئے، مجھ پر حکم چلانے والے — آپ ہیں کون؟“

”اتنی جلدی بگولائی گئی ہو — میں تمھارا خاوند ہوں۔“

”میں نہیں جانتی، خاوند کیا بڑنا ہے — میں اپنی مرضی کی مانگ ہوں — میں باہر جاؤں گی اور ضرور جلاؤں گی، وہ کچھتی

ہوں، مجھے کون روکتا ہے۔“

”تم نہیں جاؤ گی — بس یہ میرا فیصلہ ہے۔“

”فیصلہ اب عدالت ہی کرے گی۔“

”عدالت کا یہاں کیا سوال پیدا ہوتا ہے — میری سمجھ میں نہیں آتا، آج تم کہیں آؤٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو

”تک کی بات کرو — جاؤ نہاؤ تاکہ تمھارا دماغ کسی حد تک ٹھنڈا ہو جائے۔“

”آپ کے ساتھ رہ کر میں تو مرے — پیر تک ہر منٹ ہر منٹ ہوں۔“

کوئی حرکت، اپنے خاوند سے غرض نہیں ہوتی، خواہ وہ بیچارہ کتنا ہی خراب ہو — اُس میں کیڑے ڈالنا ضرور

کی سرشت میں داخل ہے — میں نے تمھاری کئی خطائیں اور غلطیاں سمات کی ہیں۔“

”میں نے خدا خرامت کو ہی سہی خطا کی ہے؟“

”پچھلے برس تم نے ظلم کی شب دیگ بڑے شحات سے پکالنے کا ارادہ کیا — خام کو رو لے کر ہڈیاں کھو کر تمہیں سونے کو جس

اٹھ کر جب میں باہر چلی خانے میں گیا تو رکھا کر دیکھی میں سدا سے ظلم کرتے بنے ہوئے ہیں۔ ان کو نکال کر میں نے انکی سزا کی اور چائے تیار کی۔ تم سو رہی تھیں۔“
 ”میں یہ کراس منھنے کے لیے تیار نہیں۔“

”اس لیے کہ اس میں جھوٹ کا ایک ذرہ بھی نہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کدورت کو کچ اور حقیقت سے کیوں چڑ ہے۔ میں اگر کہ دوں کہ تمہارا بایاں کمال تمہارے دلیس کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ مٹا ہے، تو شاید تم مجھے ساری عمر بخشتو۔ مگر یہ حقیقت ہے جسے شاید تم بھی ایسی طرح محسوس کرتی ہو۔ دیکھو میرے ویٹ وہیں رکھ دو۔ اٹھا کے میرے سرو سے اور تمہارا تھنول ہوجائے گا۔“
 ”میں نے میرے ویٹ اس لیے اٹھایا تھا کہ یہ آپ کے چہرے کے عین مطابق ہے۔ اس کے اندر جو ہمارے جیسے سے ہیں، وہ آپ کی آنکھیں ہیں۔ اور جو لالہ سی چیز ہے، وہ آپ کی ناک ہے، جو ہمیشہ شرمخ رہتی ہے۔ میں نے جب آپ کو پہلی مرتبہ رکھا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے آپ کی آنکھوں کے نیچے جو گائے کی آنکھیں ہیں، ایک کو کورج اور دوسرے منہ بیٹھا ہے۔“
 ”تمہارا جی ہلکا ہو گیا؟“

”میرا جی کبھی ہلکا نہیں ہوا۔ مجھے آپ جاننے دیجیے۔ خدا و حکمران شاید یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں۔“
 ”جانے سے پہلے یہ تو بتا یا تو کہ یہ جاؤں یا نہیں؟“
 ”میں بتانا نہیں چاہتی۔ آپ تو دل دے کے بے شرم ہیں۔“

”بھئی، تمہاری اس ساری گفتگو کا مطلب یہی نکلی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ معلوم نہیں انھیں مجھ سے کیا مشکلات ایک دم پیدا ہو گئی ہے۔“

”خدا اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالیے۔“

”میرا کوٹ کہاں ہے؟“

”لاٹا ہوں۔ لاٹا ہوں۔“

”میرے کوٹ میں کیا ہو سکتا ہے۔ دیکھی کی بڑی تھی۔ وہ قریب نے باہر ہی ختم کر کے پیٹک دی تھی۔ لیکن ہو سکتا ہے وہ گئی ہو۔“

”بیجے، آپ کا کوٹ یہ رہا۔“

”اب میں کیا کروں؟“

”اس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالیے۔ اور اس لالہ کی انصاف رکھ لے جس سے آپ بالکل مشغول رہا رہے ہیں۔“

”لاحول ولاق۔ تم نے میرے اوسان خفا کر دیے تھے۔ یہ تصور میری جان، میری ہنسی کی ہے جس کو تم نے اٹھایا کہ نہیں دیکھا۔ افریقہ میں ہے۔ کم نے یہ خط نہیں دیکھا۔ ساتھ ہی تو تھا۔ یہ لڑ۔“

”ہائے، کتنی غرور و لڑائی ہے۔ میرے بھائی جان کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔“

۱۹۵۲ء
 ۱۸ مئی

ملاوٹ

امرت سر میں علی محمد کی منہاری کی دکان تھی۔ چھوٹی سی، مگر اس میں ہر چیز موجود تھی، اُس نے پھر اس قریب سے مسلمان رکھا تھا کہ ٹھنڈا ٹھنڈا دکھائی دیتا تھا۔

امرت سر میں دوسرے دکاندار ایک کرتے تھے، مولیٰ محمد چچی نرغ پر اپنا ال فروخت کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ لوگ ٹھنڈے سے اُس کے پاس آتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کرتے۔

وہ غریبی قسم کا آدمی تھا، زیادہ منافع لینا اس کے نزدیک نہ تھا۔ کہلی جان تھی، اس کے لیے ہمارا منافع ہی کافی تھا۔

سلواوی دکان پر بیٹھا گاؤں کی بیڑی لگاتی تھی، اُس کو بعض اوقات افسوس ہوتا جب وہ کسی گاہک کو سلاٹ مسلمان کی ایک ٹیکہ نہ دے سکتا، یا کسی فرخندہ لڑکی کی بولی، مگر نہ کہ یہ چیزیں اُسے محدود تعداد میں ملتی تھیں۔

ایک دن کے بعد وہ خوش حال تھا، اس نے دو عرسوں پہلے ہی ملا کر کتے تھے جہاں تھا۔ ایک مسلمان دکان پر بیٹھے بیٹھے اس

نے سہارا بے شادی کر لینی چاہیے۔ نوے نوے خیال دماغ میں آتے ہیں، شادی کروا کر زندگی میں لطافت پیدا ہو جائے گی۔ بالہ تھے ہر کچھ اُن کی پردہ نش کے لیے میں ہر زیادہ مکمل غلطی کرکھڑا گا۔

اُس کے والدین عرصہ بڑا اللہ کو یاد رہے ہر کچھ تھے، اُس کی کوئی بس تھی نہ بھائی، وہ بالکل کیڑا تھا، شروع شروع میں جب کہ وہ دس برس کا تھا، اُس نے اخبار چھپنے شروع کیے، اس کے بعد غور و فکر کیا، افسوس! یہیں جب اُس کے پاس ایک ہزار روپے جمع ہو گئے تو اُس نے ایک چھوٹی سی دکان کرا لیے پرے کی اور منہاری کا سامان خرید کر بیچ کر گیا۔

آدمی دکاندار تھا، اُس کی دکان تھوڑے ہی عرصے میں مل نکل — جہاں ناکہ آدمی کا تعلق تھا، وہ اس سے بے فکر تھا، مگر وہ چاہتا تھا گھر بسائے، اس کی بیوی ہو، بچے ہوں، اور وہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ کمائے کی کوشش کرے، اس لیے کہ اُس کی زندگی جیسے ایسی بن گئی تھی، صبح دکان کھولنا، گاہک آتے، انھیں سود دیتا، شام کو دکان بند کرنا اور ایک چھوٹی سی کوشٹری میں جہاں نے ضرورت پر وہیں سے لنگھتی تھی، اس جانا۔

گھنٹے کا ہر گھنٹہ تھا، اس میں وہ کھانا کھاتا، صبح ایک وقت، صبح ناشتہ، چھیل گھٹکے کے ٹکڑے میں شام بے سلائی کی دکان میں کرتا تھا، کھانا اور شام تک اپنی گری پر بیٹھا رہتا۔

اس کے اندر شادی کی خواہش شدت اختیار کر گئی تھی، لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملے میں اس کی مدد کون کرے، دوسرے میں اُس کا کوئی دوست یا راجی نہیں تھا، جو اُس کے لیے کوشش کرے۔

وہ بہت پریشانی تھا، شریف پادری کی کڑھڑکی میں رات کو سوتے وقت وہ کبھی غرتہ دیا کہ اس کے ماں باپ اتنی جلد ہی کیوں مر گئے۔
ابھی وار کو نہیں تو اس لیے غرتہ زندہ رہنا چاہیے تھا کہ وہ اس کی شادی کا بندوبست کر جائیں۔

اس کی بھجور میں بیٹیاں آقا تھا کہ وہ شادی کیسے کرے۔ بہت پرنگ سوتے رہا۔ اس دوران میں اس کے پاس تو تین ہزار روپے جمع ہو گئے۔ اُس نے ایک چھوٹے سے گھر کو رہا چھا خاصا تھا کہ اس پرے لیا، مگر رہنا تو شریف پادری سے ہی تھا۔
ایک دن اُس نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا جس میں لکھا تھا کہ شادی کے خواہش مند حضرات ہم سے رجوع کریں۔ ہاں۔ اسے پاکی ٹیڈی ٹاکٹر، قبر قسم کے رشتے موجود ہیں۔ بخل و کثابت کیسے یا خود ا کے لیے۔

آقا کہ وہ وہاں نہیں گھونٹا تھا اُس دن وہ اُس چلتے پر گیا تو اُس کی ملاقات ایک ڈالھی والے بزرگ سے ہوئی۔ علی گھڑا پنا
دعا بیان کیا، ڈالھی والے بزرگ نے بیڑ کا دروازہ کھولی کہ میں تمہیں تھریں نکالیں اور اس کو ایک ایک کر کے کھلے گا کہ وہ ان میں سے
کوئی پسند کرے۔

ایک دکان کی تصویر ملی ٹکر کر پسند آئی۔ چھوٹی ٹھکی اور خوبصورت تھی۔ اُس نے اشاریاں کرانے والے ریجنٹ سے کہا: "جناب۔
یہ لاکھ ملے پسند ہے۔"

ریجنٹ مسکراتا، تمہارے ایک بریل ملے لیا ہے۔"

علی گھڑا ایسا محسوس ہوا کہ وہ لاکھ اُس کی آغوش میں ہے۔ اس نے غلط شروع کر دیا۔ کہیں۔ جناب آپ بات ہی کی کر دیجیے۔"
ریجنٹ سمجھو ہو گیا تو کھو ہر زوردار۔ یہ لاکھ تمہیں ملے گی ہے، ملاوہ حسین ہونے کے بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی
ہے۔ لیکن تم سے زیادہ نہیں نہیں مانگوں گا۔

آپ کی بڑی نوازش ہے۔ میں تم کو ملا دوں گا۔ اگر آپ میرا یہ کام کر دیں تو آپ کو ساری عمر اپنا باپ سمجھوں گا۔"
ریجنٹ کے ہونچھو بھرے ہونچھو پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، جیسے درجہ۔ میں تم سے صرف تین سو روپے نہیں لوں گا۔"
علی گھڑا نے بڑے شکرانہ لکھے میں کہا جناب کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے شکور ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے عجب سے تین نوٹ سو سو روپے کے ٹکٹے اور اُس بزرگ کو دے دیے۔

تاریخ مختصر ہو گئی، اطلاع ہوا، خوشی بھی ہوئی۔ علی گھڑا وہ چھوٹا سا مکان کرایے پر لے رکھا تھا، اب سہا سہا تھا۔ وہ اس میں بڑے
چاد سے رہتی تو اُس نے کو آید، پہلی رات کا قصہ معلوم نہیں، اس کے دل و دماغ میں کس قسم کا تھا، مگر جب اُس نے دوسرے کا گھر ٹھکانے کا چنتے
باتوں سے اُٹھایا تو اُس کو خوش سا آگیا۔

خمارت پر شکل اگرت تھی۔ صبح اس صبح بزرگ نے اُس کے ساتھ دھو کا کیا تھا۔ علی گھڑا کھڑا کر کے سے باہر نکلا گیا
اور شریف پادری سے جا کر اپنی کڑھڑکی میں درنگ سوچا، یاد رہا کہ یہ ہے۔ لیکن اس کی بھجور میں کچھ بھی نہ آیا۔

اُس نے اپنی دکان دیکھ لی۔ وہ ہزار روپے وہ اپنی بھجور کا کافی ہزار روپے تھا تین سو روپے اُس ریجنٹ کو اب اُس کے پاس
صرف سات سو روپے تھے۔ وہ اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اُس نے سوچا شریف پادری سے۔ ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا، آخر

اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ صبح دس بجے اُس نے اپنی دوکان ایک شخص کے پاس پہنچی۔ خیر و بد پہ میں جی اُٹنے پہ نے دھول بچ دی اور ٹکٹ کٹوا کر لاہور چلا گیا۔

لاہور جاتے ہوئے گاڑی میں کسی جیب کترے نے بڑی صفائی سے اُس کے تمام روپے غائب کر دیے۔ وہ بہت پریشانی بردہا لیکن اُس نے سوچا کہ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔

لاہور پہنچا تو اُس کی دوسری جیب میں جو کترے تیس گنی تھی صرف دس روپے اور گیارہ خانے تھے۔ اس سے اُس نے چند روپے ڈالا اور کیا لیکن بعد میں خاقان کی نوبت آ گئی۔

اس دوران میں اُس نے کہیں نہ کہیں ملازم ہونے کی بہت کوشش کی، مگر کام نہ پا۔ وہ اس قدر دلاؤس ہو گیا کہ اُس نے خود کشتی کا کارڈ کر لیا، مگر اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ اس کے باوجود ایک رات وہ ریل کی ٹیبلٹ پر لیٹ گیا۔ ٹرین آ رہی تھی، مگر کاشا بھلا وہ دوسری لائن پر چلی گئی کہ اُسے آدھری جانا تھا۔

اس نے سوچا کہ رات بھی دھوکا دے جاتی ہے، چنانچہ اُس نے خود کشتی کا خیال چھوڑ دیا اور بھری اور بھری چینیے والی ایک ٹرین میں روپے، ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔

یہاں اُسے چھ ہی دن معلوم ہو گیا کہ دنیا دھوکا ہی دھوکا ہے۔ بھری میں پہلی گنی کی ملاٹ کی جاتی تھی اور دوسری میں سُرنگ انجن کی۔ دو برس تک وہ اس ٹرین میں کام کرتا رہا اُس کا ایک ہریسے کم از کم سات سو روپے ماہوار کا تھا۔ اس دوران میں اُس نے پانچ سو پچھپس پس انداز کر لیے تھے۔ ایک دن اُس نے سوچا کہ جب مادی دنیا میں قریب ہی قریب ہے، تو وہ بھی کموں نہ قریب کرے۔

اس نے چند ایک ٹنڈر بھی کئی قائم کر لی اور اُس میں دوسری ملاٹ کا کام شروع کر دیا۔ اُس کی آمدن اب کافی مختل تھی اُس کو شادی کا کتنی بد خیال آیا، مگر جب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس پہلی رات کا نقشہ آؤ تو وہ کانپ کانپ گیا۔

علاؤ خوش تھا۔ اُس نے قریب کاری پوری طرح سیکھ لی تھی۔ اُس کو اب اس کے تمام گڑبگڑ ہر گتے تھے۔ ایک میں حال مرحوں میں کتنی انڈین پین جاپانیس بھری میں کتنی زرد رنگ کی مٹی ڈالنی چاہیے، اور پھر وہاں کا حساب، یہ اب اس کو بھی طرح معلوم تھا۔

لیکن ایک دن اُس کی ٹرین پر پولیس کا چھاپا پڑا بھری اور مرحوں کے نو فو تو قوں میں ڈال کر سر ہند کیے گئے۔ اور جب کھیل اگڑا مینر کی ریپرٹ آئی کہ ان میں ملاٹ ہے تو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔

اُس کا لاہور میں کون تھا جو اُس کی ضمانت دیتا۔ کئی دن حوالت میں بند رہا۔ آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور اُس کو تین سو روپے جرم مانہ اور ایک مہینے کی قید با مشقت سے جگت تباہی پڑی۔ یہ ایک صیفہ اُس کی زندگی میں بہت کٹاؤر

جرمانہ فرامس نے ادا کر دیا، لیکن ایک مہینے کی قید با مشقت اُسے جگت تباہی پڑی۔ یہ ایک صیفہ اُس کی زندگی میں بہت کٹاؤر کٹھن تھا۔ اس دوران میں وہ اکثر سوچتا تھا کہ اُس نے بے ایمانی کیوں کی جب کہ اُس نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنالیا تھا کہ وہ کبھی قریب کاری نہیں کرے گا۔

پھر وہ برسوں کا اُسے اپنی زندگی ختم کو مین چاہیے، اس لیے کہ وہ دھوکا دہاؤ اور کٹاؤ اور مضبوط نہیں، بہتر یہ ہے

کو رہ جائے تاکہ اُس کا ذہنی اضطراب ختم ہو۔

جب وہ جیل سے باہر نکلا تو وہ مضبوط ارادہ کر چکا تھا کہ خود کشی کرے گا تاکہ سارا بھجنیٹ ہی ختم ہو۔ اس غرض کے لیے اُس نے سات روز زہری کی اور دو تھیں روپے چنانچہ پیٹ کاٹ کاٹ کر حج کیے۔ اس کے بعد اُس نے سرجا کوئی ساڑھے چار گواہکارآمد جو سکڑا اُس نے صرت ایک ہی ذہن کا نام اُسنا تھا جو بڑا نا آئی ہوتا ہے۔ سکھیا، مگر سکھیا کہاں سے ملتی؟ اُس نے بہت کوشش کی۔ آخر اُسے ایک دوکان سے سکھیا مل گئی۔ اُس نے عشاء کی نماز پڑھی، عشاء سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ وہ بلدی اور چوں میں طلوت کرتا رہا۔ پھر بات کو سکھیا کھائی اور لٹے ہاتھ پر سو گیا۔

اُس نے سنا تھا سکھیا کھانے والوں کے منہ سے جھانک نکلتے ہیں، لفظی کے دورے پڑتے ہیں، برا کر رہتا ہے، مگر اُسے کچھ بھی نہ خواہ ساری ملت وہ اپنی موت کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی

صبح اٹھ کر وہ اُس دکاندار کے پاس گیا، جس سے اُس نے سکھیا خریدی تھی اور اُس سے پوچھا، بھائی صاحب، یہ آپ نے مجھے کسی سکھیا دی ہے کہ میں ابھی تک نہیں مر رہا۔

دکاندار نے آہ بھر کے بڑے افسوس کے لہجے میں کہا، کیا کموں، میرے بھائی — آج کل ہر چیز نقلی ملتی ہے — یا اُس میں تلاوٹ بہرتی ہے۔

۱۹ مئی ۱۹۵۴ء

بس اسٹینڈ

دو بس اسٹینڈ کے پاس کھڑی اسے ٹوٹ والی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے پاس کئی مرد کھڑے تھے۔ ان میں ایک اُسے بہت بُری طرح گھورتا تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ شخص برے سے اُس کے دل و دماغ میں چھید بندہ ہے۔

اُس کی فکری بیس برس کی ہوئی۔ لیکن اس پندرہ سال کے باوجود، وہ بہت گجرا رہی تھی۔ ہاتھوں کے دن تھے، پر اس کے باوجود اُس نے کئی مرتبہ اپنی چستانی سے پیسہ پرتھیا۔ اس کی بھڑ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کرے بس اسٹینڈ سے چل جائے کر لی ہانگ لے لے۔ یا واپس اپنی سیٹل کے پاس پہلی جائے۔

اس کی یہ سیٹل نئی نئی بنی تھی۔ ایک پارٹی میں ان کی ملاقات ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی گریڈ ہو گئیں۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ اپنی اس نئی سیٹل کے بلاوے پر اُس کے گھوڑی تھی۔

لڑکھار تھا، گھر بہ اس سیٹل نے اتنا مڑ کیا تھا، اور وہ اکیلے ہی اُس کے ہاں پہلی گئی۔ دو گھنٹوں میں گپ ٹوٹی رہی۔ پُرقت بڑے دیر میں کٹا اُس کی سیٹل میں نام شادہ تھا، اس سے جانتے وقت کتا، سلی اب تھادی شادی ہو جانی چاہیے !

سلی شادی گئی۔ کیس باتیں کرتی ہو شادہ — مجھے شادی نہیں کرانا ہے !

”تو کیا ساری عمر کنوادی رہو گی !“

”کنوادی رہنے میں کیا حرج ہے !“

شادہ مسکرائی، بس ابھی ہی کہا کرتی تھی۔ لیکن جب شادی ہو گئی تو دنیا کی تمام تغوش بھی پریشکار ہو گئیں۔ یہی تو عمر ہے سب دلی پوری طرح شادی کی گفتگوں سے مغلغل اندر ہو رہا تھا ہے۔ تم میرا کتا اور — بس ایک دو بیٹھے کنوادی رہو ہی جاؤ — تھا۔ یہ باتوں میں مندی نہیں خود ملاؤں گی !

”شادہ اس چھڑ خانی کو !“

شادہ نے سلی کے گال پر ہلکی سی بہت لگائی تو چھڑ خانی ہے ؟ — اگر چھڑ خانی ہے تو ساری دنیا بیٹھ جاتی ہے — دروازے کا رشتہ سلی فضل ہے — میری بھڑ میں نہیں آتا کہ تم ایک ازلی اورابدی رشتے سے منکر کیوں ہو ؟ — دیکھو گی کہ تم

”نہے بیٹھو کیسے زور ہو گی — خدا کی قسم ہاگ ہو جاؤ گی — ہاگ !“

اچھا ہے، ہر ہاگ ہو جاؤں — کیا ہاگوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں — اتنے سارے ہاگ ہیں، آخر وہ جن توں ہی

نہے ہے جس !

”جوں توں پیچھے میں کیا مڑا ہے۔ ریزاری سٹلی — میں تم سے کتنی ہوں کہ جب سے میری شادی ہوئی ہے۔ میری کامیابی پٹ لگی ہے۔ میرا خاندان بہت پیارا کرنے والا ہے۔“

”کیا کام کرتے ہیں؟“

”مجھ سے بہت کچھ ہیں۔ میں ان کام ہے۔ — کاواہت کچھ ہے۔ میرا خاندانوں نے کبھی تنگ ہونے نہیں دیا۔“

”تکلی نے یوں محسوس کیا کہ اس کا دل تنگ ہو گیا ہے۔ شاہدہ مجھے تنگ نہ کر کے شادی نہیں کرنا ہے۔ مجھے دو سال نفرت ہے۔“

”کیوں؟“

”بس ہے۔“

”آپ میں تم سے کیا کموں — مردوں سے مجھے بھی نفرت تھی، لیکن جب میری شادی ہوئی اور مجھ سے میرے خاندان نے پیار محبت

کہا تو میں نے پہلی مرتبہ پاؤں گروہ عزت کے لیے کٹا لاری ہے۔“

”ہوا کرے۔ — مجھے اُس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

شاہدہ ہنسی سٹلی، ایک دن تم خود اس بات کی مثال برجاؤ گی، کمزور عورت کے لیے لاری ہے۔ اس کے بغیر وہ اسی گاڑی ہے

جس کے پیچھے نہ ہوں — میری شادی کو ایک برس ہوا ہے۔ اس ایک برس میں مجھے شہین خسروں اور لاقیوں سے میرے خاندان نے پہچانی ہیں

میں بیان نہیں کر سکتی — خدا کی قسم وہ فرشتہ ہے۔ فرشتہ، مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔“

سٹلی نے بے سُن کر یوں محسوس کیا کہ جیسے اُس کے سر پر فرشتوں کے پر بٹھ کر اڑا رہی ہیں۔ اس نے سوچا شروع کیا کہ شاہدہ

محبت کے لیے لاری ہی ہو۔ لیکن فوراً بعد اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اُس کی عقل نے اُس کا ساتھ نہیں دیا — مرد کی ضرورت

ی کیا ہے؟ — کیا عورت اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

جیسا کہ شاہدہ نے اُس کو بتایا تھا کہ اُس کا شوہر بہت پیارا کرنے والا ہے، بہت نیک خلعت ہے۔ لیکن اس سے یہ

ثابت تو نہیں ہوتا کہ وہ شاہدہ کے لیے لاری تھا۔

سٹلی جیسے تھی، اب بھر بھر بن، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں کشادہ پیشانی، گھٹنوں تک لمبے کالے بال، ستواں ناک اور اس کی پشنگ

پر ایک سی۔

جب وہ اپنی سیل سے اجازت مانگ کر غسل خانہ میں گئی تو اُس نے اپنے سینے میں غور کر کے غور سے دیکھا، اور اسے بڑی الجھی محسوس

ہوئی، جیسے اُس نے سوچا کہ آخر یہ جسم یہ عظمیٰ، یہ جاکھس لیے ہیں — قدرت کی ساری کارگرانی اکوت جاری ہے۔

”گندم پیدا ہوتا ہے۔ تو اُنک سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اس کی جانی بھی تو کسی کھیت میں اُگی تھی۔ اُگنے سے کوئی کھائے گا

نہیں، تو لگی مٹ نہیں جائے گی؟“

وہ بہت بڑے تنگ غسل خانے میں اپنے کے سامنے سر جھکی، سنا۔ اُس کے ذہن میں اُس کی سیل کی تمام باتیں گونج رہی تھیں

— مرد عورت کے لیے بہت ضروری ہے۔ — !

اس کا خدا اس سے بہت بڑا کرتا ہے ۔

وہ فرشتہ ہے ۔

سلی نے ایک لمحے کے لیے محسوس کیا کہ اس کی شلوار اس کا روپے فرشتوں کے لیے بن گئی ہیں ۔ وہ گھبرائی ہوئی تارخ ہو کر بیٹھ کر نکلی ۔ باہر آدھ سے اس کی کھوپڑیاں جھنڈا رہی تھیں ۔ سلی کو ایسا لگا کہ یہ بھی فرشتے ہیں جو ہمیں بدل کر آئے ہیں ۔

پھر جب اس کی سیٹل اپنی کوٹھی سے ملحقہ باغ میں آئے گئے اور وہاں اس نے چند ترکیاں دیکھیں ، تو وہ جگمگاتے فرشتے دکھائی دیے ۔ یہی اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ ایسے رنگین اور ایسے نچھے شے فرشتے کیسے ہو سکتے ہیں ۔

اُسے بہت دیر تک فرشتے ہی فرشتے دکھائی دیتے رہے ۔ جو اس کے قریب آتے ، اُس سے بڑا دکھتے ، اُس کا سر جگمگاتے ، اُس کے پیچھے پر ہاتھ پھیرتے ، جس سے اُس کو بڑی راحت ملتی ، لیکن ان فرشتوں کے ہاتھ بڑی تندہی سے ایک طرف جھٹکتے تھے اور اسی کے نتیجے میں — پلے جاؤ یہاں سے — تمہارا گھر تو آگ ہو رہا ہے — یہاں کیا کرنے آئے ہو ؟

وہ فرشتے اُس سے کہنے لگے ، ہم فرشتے نہیں ۔ حضرت آدم کی اولاد ہیں ۔ وہی بڑا کہ جو جنت سے نکالے گئے تھے ۔ پر ہم انھیں پھر جنت میں رہنے پر مجبور کر دیتے کہ وہ رہ کوٹے ہیں ۔ پھر ہمارے ساتھ وہاں دودھ کی خرابی تھی ، اور شہد کی بھی ۔

سلی نے نوں محسوس کیا کہ اس کے سینے میں سے آواز کے نچھے شے قطارے نچھے طرز میں آواز کی ہونٹ ٹھاس میں پھنسنے لگی ہیں ۔ شاید وہ اس سے بار بار اپنے خداوند کی تعریف کرتی ، اصل میں اُس کا مدعا یہ تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ سلی کا رشتہ قائم کرے —

گو گھر پر یہ پہلی ملاقات تھی ، اس لیے وہ بالکل کے بات نہ کر سکی ، ہر حال اُس نے اشاروں کی گیارہویں سلی پر یہ واضح کر دیا کہ اس کا خدا نہ جنت شریف اور جنت کرنے والا وہی ہے ، اُس کا بھائی اس سے بھی کہیں زیادہ شریف انھیں ہے ۔

سلی نے خود اشارہ نہ سمجھا ، اس لیے کہ وہ بہت سادہ لوح تھی ، اُس نے صرف اتنا کہ وہ بالکل کے بدلنے میں شریف ہو میں کا دعویٰ کیا ہے ۔ تم خوش قسمت ہو کہ انھیں ایسا خدا مل گیا جہاں ہر آدمی نیک اور شریف ہے ۔

آفسوس ہے کہ اس وقت میرے خداوند گھر میں موجود نہیں ، وہ نہ میں تم سے انھیں ضرور ملائی ۔ ”

”مجھے پھر کس — کیا کام کرتے ہیں ؟“

”ہائے ، انھیں کیا کام کرنے کی ضرورت ہے — لاکھوں روپے کی جائیداد ہے — مکانوں اور دکانوں سے گزاری ہی ہو بیٹھو ہزار کے قریب وصول ہو جاتا ہے — اس کے علاوہ ماشاء اللہ زمینیں ہیں ، وہاں کی آمدن اٹک ہے — آج کی کوئی وقت نہیں — منوں گندم گھر میں پڑا رہتا ہے — چاندی بھی — ہر قسم کی ترکاری بھی ہر وقت میسر ہو سکتی ہے — اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے — اُن کا چھوٹا بھائی جو آج کل لندن میں ہے ، ذرا امت کے متعلق جاننے کیا سیکھ رہا ہے — ایک بیٹے تک دامیں آ رہا ہے —

وہ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہے — تم اُسے دیکھو گی — تو — —

سلی نے گھبراتے ہوئے کچھ میں کہا ہاں ، ہاں — جب وہ انھیں کے توان سے ملے گا اتفاق ہو جائے گا ؟

شاید وہ نے کچھ بڑا شریف لڑکا ہے — بالکل اپنے بڑے بھائی کی مانند ۔

تھی ایں — ضرور، آخر طریقت خدا خان سے تعلق ہے :
 توہ میں اُسے ہی دلا ہے — تم مجھے کوئی ایک تصویر دے دو :
 کیا کرو گی :

”میں خدا ملک چاہا کروں گی :

یہ کہ کر شہزادہ نے سلتی کا سر چوم لیا اور پھر اپنے خداوند کی تعریفیں شروع کر دیں۔ سلتی ٹلک اٹھئی، اُس نے تصویر دیر کے بعد
 کوئی بہانہ بنا کر شخصیت چاہی اور اُس اسٹیٹس پر پہنچ گئی، جہاں اُس نے دلاش کی پس پڑنا تھا۔

وہ جب وہاں پہنچی تو ایک مرد نے، سے بہت بُری نگاہوں سے گفتگو شروع کر دیا — وہ پریشانی ہو گئی۔ جاڑوں کے سن
 تھے، مگر اُس نے کئی مرتبہ اپنا پریشانی سے پسینہ پونچھا۔

اسٹیٹس پر ایک پس آئی، اُس نے اُس کا لہجہ دیکھا اور جب چند مسائل سے تو وہ فرما اُس میں سوار ہو گئی — وہ آہنی بھی اُس میں
 میں داخل ہو گیا، اُس کی پریشانی اور مزاحیہ بڑھ گئی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اُس کے انجین میں کوئی غرابی پیدا ہو گئی، جس کے باعث اُس نے کانپڑا، سب مسافروں سے کہہ دیا گیا کہ وہ
 اُتر جائیں، کیونکہ کہ کوئی دیر تک یہ پس نہیں چل سکے گی۔

سلتی نیچے اُتر کر توہ آدی جر سے بہت بُری طرح گفتگو کرتا تھا، وہ بھی اُس کے ساتھ برا بھلا — سڑک پر ایک کار جا رہی تھی
 اُس نے اُس کے ڈرائیور کو آواز دی، ”امام دین۔“

امام دین نے فوراً ایک دم روک لی، اُس آدی نے سلتی کا ہاتھ پکڑا اور اس سے کہا پیسے — یہ میری کار ہے — جہاں بھی آپ
 جانا چاہتی ہیں آپ کو چھوڑ دوں گا۔“

سلتی اُنکار نہ کر سکی۔ سڑک میں بیٹھ گئی، اُس کو ڈاؤل ٹاؤن جانا تھا، مگر وہ اُسے کیسے اورے گیا — اور — !

× × × × ×

سلتی نے محسوس کیا کہ مودعا قحی حوت کے لیے لازم ہوتا ہے — اس نے اپنی زندگی کا بہترین دین گھڑا — گما اُس نے پیسے
 بہت حیل و چلت اور اخراج کیا، گما اُس آدی نے اُسے رام کر ہی لیا !

تیس چار شخصوں کے بعد جب سلتی نے اُس شخص کا بطور کھول کر پونسی دیکھا تو اُس میں ایک طرف شاہدہ کا نوٹو تھا — اس
 نے پہچانہٹ کے ساتھ پوچھا : ”یہ — — — — — عورت کون ہے ؟“

اُس شخص نے جواب دیا، تیسری پیری :

سلتی کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رو گئی، آپ کی بیوی ؟

شاہدہ کا خاندان مسکراتا، کیا مردوں کی بیویاں نہیں ہوتیں ؟

منہجہ

تلامیوں کے شمار میں پرنسپل اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور طلبہ اور عابدات سے مخاطب ہوتا ہے ۔

یہ رسم جب سے میں اس کالج میں پرنسپل مقرر ہوا ہوں ۔ ہر سال باقاعدہ دہائی کی جاتی ہے ۔ ہر سال اس موقع پر تلامیوں کے شمار کے ساتھ ہر اپنی کرسی سے اٹھتا ہوں اور قریب قریب وہی تقریر کرتا ہوں جو میں نے آج سے دس سال پہلے کی تھی ۔ غرض کہ میرے دل میں وہی ہیبت پیدا ہوتی ہے جو سلسلے کے آغاز میں ہوتے تھے ۔ آج جب میں نے غور کیا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پرنسپل اسٹرومن ڈیوڈ کی پر جڈ تک بہت بڑا ذرا تک نہ تھا ۔ تم سب خطوط ہو جو کہ وہ اس بڈ ٹکسٹورڈ کو اپنے اپنے ٹھکانے پر بنیاد دیے ہائے ہو ۔ تم میں سے کچھ بزرگ ہو جاتے ہیں جس کے باعث تمہارے والدین کو حیرانہ اور کراہنے والے ہوتے ہیں ۔ کچھ غلط رائے کی وجہ سے ابھرتے اور دھڑکتے رہتے ہیں ۔

ہر سال یہ کیمپل ہے بہت دلچسپ ۔ ہر سال امتحانوں کا ایک چکر شروع ہوتا ہے ۔ اس میں کچھ کامیاب ہوتے ہیں کچھ ناام ۔ مسرت اور غم کی لڑائی لڑتی ہیں ہر سال دیکھتا ہوں اس وقت میرے سامنے ایسے کئی چہرے ہیں جو کامیابی کے باعث تمنا ہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ میں چند ایسے چہرے بھی دیکھتا ہوں جو ناامی کے صدمے سے مر جھٹکے ہوئے ہیں ۔ غرض اور یہاں کا یہ پہلا موسم ہر سال آتا ہے اور گزر جاتا ہے ۔ وہ لڑکیاں اور لڑکے جو اب لے کا امتحان پاس کر چکے ہیں یا تو انہی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی بڑے کالج میں داخل ہو جائیں گے یا تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے دوسری کاموں میں مصروف ہو جائیں گے ۔ وہ جو اس امتحان کی دیوار میں پھانسی لگے دوبارہ کوشش کریں گے ۔ جو یہاں سے جا رہے ہیں ان کو میں ان کے والدین کے ساتھ ہر سال ان کی کامیابی زندگی کے لیے دعا کرتا ہوں ۔ جرنئے آنے میں ان کو خوش آمدید کہتا ہوں اور ان کے نام کے لیے کہتا ہوں کہ اس تعلیم کا وہ میں داخل ہوتے وقت ان لوگوں کو ایک غرضو دیکھ میں جو باہر جا رہے ہیں ۔ جو انہیں کے باوجود اپنی کمزوریوں کے باعث یا کسی اور وجہ سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔ ان سے مجھے پوری پوری ہمدردی ہے ۔ خاص طور پر فقیر سے جو محنت کے باوجود اس سال اپنی امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں ۔ خدا کرے آئندہ سال بغیر کامیاب ہو جائے ۔

تقریر ختم کرنے کے بعد جلسہ پڑھا ست ہو جاتا ہے ۔

کالج کی دکانیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں ۔

ذکر ۔ فرخندہ ۔ کیا فقیر ہالی میں موجود تھی ۔

فرخندہ ۔ نہیں تو ۔

ذکر ۔ تو پھر وہ آئی ہی نہیں ۔

فرخندہ - بے چاری ظلم سے نڈھال ہو گئی۔

ذکیہ - ایک بار پھیل ہوئے ہی سے آدمی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ بے چاری تو دوسری مرتبہ پھیل رہی ہے۔

فرخندہ - محنت تو بے سود کرتی تھی۔

ذکیہ - اصل میں سب اُس کے مزاج کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ کسی سے مدد لینے میں کیا مضائقہ ہے، امتحان ہونے سے دوہینے پلے میں نے کئی بار اُس سے کہا، فیچر تم میرے گھر جایا کرو، میں تمہیں ساری لکھنؤ کس ازب کر دوں گی۔ بس یہ سختی ہی جیسے اُس کے سر میں ناک ٹپیں۔ کہنے لگی، تم اپنے آپ کو بہت دیکھنے لگی ہو۔ تمہارے بیٹے کو برا لکھنؤ کس کسی کو آہی نہیں سکتی۔ میں تو گدھی ہوں۔ جو قوت ہوں۔ اب فرخندہ تم ہی بتاؤ کیا یہ فیچر خرابی کے لیے اُس کو اپنی مدد چاہی کی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ لکھنؤ کس میں بالکل منفرج ہے۔ میں داغ ہی جو ایسا لایا ہے، کوئی ابھی بات بھی کرے تو اُسے بُری لگتی ہے۔

فرخندہ - میرے ساتھ جی بالکل ایسا ہی ہوا، میں نے کہا، دیکھو فیچر، ایسا نہ ہو تمہارا سا یہ کھل جی کا رچ کر مردہ جانے، کو تو میں اپنے لیے ہوئے نوٹ دے دوں۔ میں یہ سنتے ہی ہر گز لکھی۔ نوٹوں کی تو اُس کو ضرورت ہوتی ہے جو کتاب کے کچھ نہ کچھ لکھے۔
وہ بے بازار میں عام کہتے ہیں، کوئی اتنی بڑی رقم خرچ نہیں ہر تھی۔ یعنی دونوں اس آج کا وہی میری زبان چلے جو میں نے پھر اُس سے ایسی بات کی ہو۔

جمیلہ - کسی کو کیا پڑی ہے جو۔

ذکیہ - پڑی دڑی کی بات نہیں جمیلہ۔ ہمارے دل چتر کے تو نہیں، اُس کو دیکھ کر کہے ذکیہ نہیں جوتا۔ اور ایسے کلمات میں مُند سے ہمدردی کا کوئی ٹکڑا نکل ہی جاتا ہے۔

فرخندہ - ہمارے تو ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں۔ کاشے کو دڑاتی ہے اگر اُس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہہ دیا جائے۔
ذکیہ - جانے اُس کے مزاج میں تلخی کہاں سے آگئی۔

جمیلہ - اسے تلخی کا چھوٹا سب کو معلوم ہے کہ بے حد غصہ ہے، لیکن اگر اُس سے کہو، فیچر تم ہر روز میرے سارے ہی کھول بیٹنی ہو تو بڑا جواب دے گی میرے پاس ایک نہیں، ایسی کئی ساڑھی ہیں، مجھے یہ رنگ پسند ہے۔

فرخندہ - مرتبہ تیل ایسا ڈالتی ہے کہ اُس کی بدلتے ناک جھٹ جاتی ہے۔ اُس سے پوچھو تو یہی کہے گی، یہ خاص تیل ہے، اس سے بال لہجے ہوتے ہیں۔

جمیلہ - لیے ہاں کی ہجٹی۔

ذکیہ - نہیں قید، ایسا نہ کہو۔ اس کا دشمن یہی دُش ہو جائے تو اُس جیسی اچھی سیل تھیں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر ہی نہ۔

لو ذکیہ دیکھیں یہ باتیں جو رچی تھیں کہ ایک لڑکا اگر دُش سے گھبراہٹ کا کافی

خوبصورت تھا، اُس نے سب سے پوچھا کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

ذکیہ۔ ہم فیملی کا ذکر کر رہے تھے — آپ دوستوں وغیرہ سے مل چکے۔

انور۔ دوستوں وغیرہ سے تو نہیں ملا۔ ابھی فیملی سے مل کے آ رہا ہوں۔

فرخندہ۔ کہاں ہے وہ ؟

انور۔ باہر مٹا میں۔

ججیلہ۔ چلو ذکیہ چلیں۔

انور۔ نہیں اس وقت آپ اس کے پاس نہ جائیں اس کی طبیعت بے حد غموں ہے — کسی نے اس کو ذرا بھی چھیڑا تو آفت برپا ہو چکی

ذکیہ۔ یہ بڑی طبیعت ہے۔ اب اگر کوئی اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہے تو کیا کرے۔

انور۔ میں خاموش رہے

ذکیہ۔ کیسے۔

انور۔ باطلیری عرج — بائیس کی عورت میرا گندہمرا تو میں نے دیکھا کہ وہ بیچ پریشی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں —

میرے قدم ڈک گئے — اس نے میری عورت دیکھا اور میں نے اس کی عورت اس کے نامکمل آنسو ٹپکلی کی آنسوؤں سے ترپانے —

اور میں یہاں چلا آیا۔

ذکیہ۔ تو مجھے اس کے پاس نہیں جانا چاہیے ؟

انور۔ وہ اس وقت غضب ناک حالت میں ہے۔ ناکیوں کا اثر ایسے آدمیوں پر اسی قسم کا ہوتا ہے، انہیں ضرورت سے زیادہ غور پر

اعتماد ہوتا ہے — واصل میں کوشش کے باوجود فیملی کو نہیں بھروسہ کیا۔

ذکیہ۔ لیکن اس میں اس سے آپ کا سلوک ویسا ہی تھا جیسے ایک باپ کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔

انور۔ لیکن اس کے باوجود وہ میری شفقت ٹھکانا تو میری ہمدردی کو دینا ہی دیتی — کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس ولی کا اظہار کیا ہوگا۔

تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر ذلیل ہو گئی ہے اس کی ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں — میں اکثر سوچتا ہوں ایک دن وہ اپنی زندگی کے

پورے سفر کا زبردستی واپس آتی رہ جائے گی۔

یہ کہہ کر انور نے ذکیہ کی طرف سے رخصت لے کر چلا گیا — اس کے قدم بغیر رازداری

طور پر اسے بائیس کی عورت سے گئے۔ فیملی بیچ پریشی تھی۔ انور اس کے پاس نہ گیا۔

انور۔ فیملی — کیا میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں ؟

فیملی۔ نہیں کس نے دیا ہے۔

انور۔ تم یہاں بہت دیر کی بیٹی ہو۔

فیملی۔ کہتے ہو تو اٹھ کر چلی جاتی ہوں۔

انور۔ یہ کیسی باتیں کرتی ہو — میں پوچھتا ہوں تنہائی میں تم کیا باطل نہیں سمجھتی ہو۔

فیصلہ: کیسی تنہائی — میں اہل تنہا نہیں

انور: ہاں۔ اب تم تنہا نہیں ہو۔
فیصلہ: اس سے پہلے بھی تنہا نہیں تھی — تم چلے جاؤ گے تو پھر بھی تنہا نہیں ہوں گی — تم بیٹھ لگے غلط سمجھنے — ہے — تم کیا سب کے سب — مجھ میں کیا نقص ہے — کیا عزائی ہے جو دوسروں کے دل میں غراؤ غراؤ جمہوری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے — جمہوری — جاؤ اس جمہوری کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

انور: تم غمناک شروع کر دیا۔

فیصلہ: مجھ کو بولتے ہو تم — میں تو نہیں رہی ہوں — تم کہتے ہو کہ میں تنہا ہوں ہے یا وہ مدعا ہوں — اسی لیے تم مجھے اپنی جمہوری کے شریک بنائے ہو — میں یہ جھبک نہیں بیٹھا چاہتی — جاؤ — جاؤ — یہاں سے چلے جاؤ۔
انور: محسوس کرتا ہے کہ اگر اس نے اس موضوع پر مزید غفلت کی تو شاید فیصلہ کو اپنی آواز میں نہ جگہ دے، اس لیے وہ غامضی سے بھا جاتا ہے۔ فیصلہ جھوٹ جھوٹ کے وہاں شروع کر دیتی ہے، مگر کوئی آواز پیدا نہیں کرتی۔
انور اپنے گھر چلا گیا۔ وہ اکثر فیصلہ کے بارے میں سوچتا اس نے کئی بار اس کو خط لکھے، مگر اس کو اس کا پتہ نہیں معلوم نہیں تھا۔ اس لیے بھاڑ دیا۔

ایک دن وہ باہر آئے اس میں میٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ نوکر ایک خط لایا — یہ فیصلہ کا تھا جس میں صرف ایک سطر تھی —
مظفر انور — میں مرنے کے قریب ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔

انور سخت گھبراہٹ میں اٹھا اس کا سارا جسم لڑخا تھا اس نے اپنے باپ کی موٹر لے بیٹھ میں اٹھ کر بس موجود تھا وہاں پہنچا۔
نوحہ اور غیظ سا کرو تھا — انور کو کچھ نظر آیا۔

انور: فیصلہ، فیصلہ — کہاں ہو تم۔

فیصلہ: آ جاؤ — ابھر میرے پاس آ جاؤ۔

اب انور میرے میں انور کو بھائی دینے لگا تھا اس نے دیکھا کہ ایک شکستہ سی چار پائی پر فیصلہ کی ڈیڑھ کا ڈھانچہ بیٹھا ہے۔ انور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

فیصلہ: تمہیں حیرت ہو رہی ہے اس غیظ کو کہہ کر دیکھو — اسے دو دیکھو یہاں جس شے کو بھی دیکھو گے، تمہیں حیرت ہوگی — سب سے بڑی حیرت انور پر تو میں ہوں — مجھے دیکھو اور جتنا حیرت زدہ ہونا چاہو ہو۔

انور: یہ کیا ہو گیا تمہیں؟

فیصلہ: انور میری کشش پاش پاش ہو چکی ہے — پینڈے اور چرائوں کے بغیر کسی کھیر میں نمکدار میں کھیتی رہی ہوں۔ اب میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی — انور — کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی؟ — تم بولتے نہیں۔

انور: میں سہا ہوں۔

فیہمہ میں رہی اس ٹوٹی ہوئی کشتی کے لیے بادِ مہل و صحرے پہنچنے کے اگلے کر کے بادِ بان بناتی رہی۔ لیکن طوفان نے بڑی بے لگی سے ان کو چیر پھاڑ دیا۔ اوردے لہجے بتاؤ۔ یہ طوفان اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟
اوردے طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں فیہمہ۔

فیہمہ۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بہت تکلیفیں برداشت کیں، صحت اس لیے کرنی لے کا امتحان پاس کروں اور خود کلمے کے قابل ہو جاؤں۔ لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمہارے سامنے پڑیوں کے ڈھانچے کی صورت میں لیٹا ہے۔
فیہمہ کی آواز آہستہ آہستہ دم ہوتی جا رہی تھی۔ اوردے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

فیہمہ۔ میں مرد ہی ہوں اوردے تو تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اب ایسا کرنا کہ میری یہ دو سینہ ساڑھیاں جو اسٹول پر پڑی ہیں اور یہ ساری کتابیں اٹھا کر میرے ساتھ کیا وطن کو دینا۔ ممکن ہے وہاں یہ چیزیں اور بھی فرواد ہو سکی ہیں۔ میں نے بڑی میسٹری سے خریدی تھیں۔ اور دیکھو کسی اور کو میری موت کی خبر نہ ہو۔ مجھ سے اب زیادہ بولا نہیں جاتا۔ میرا خیال ہے مجھے اور بھی کچھ کہنا تھا۔

اوردے نے دیکھا کہ اس پر حالتِ نزاع طاری ہے۔ اس نے زار و قطار دونا شروع کر دیا۔ فیہمہ نے جس کی آنکھیں بند رہی تھیں بڑی مشکل سے کرٹ بدلی اور اوردے کے آنسو اپنے میلے دھپے سے روچنے اور کہا مجھے یاد آ گیا ہے۔ جو مجھے تم سے کہنا تھا۔
اوردے کیا کہنا تھا۔

فیہمہ سکوئی آہ ایک بے وقوفی کی بات ہے۔ اپنے ہونٹ میرے نرود ہونٹوں کے ساتھ لگا دو۔
اوردے اس کی تعمیل کی۔ فیہمہ کو جو حسرت حاصل ہوئی وہ اس کی تاپ نہ لاسکی اور اپنا آخری سانس اس بوسے کے پڑو کر دیا۔
(۲۱ مئی ۱۹۵۲ء)

بد تمیزی

”میری بھوس نہیں آنا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔“

”جب کوئی بات بھوس نہ آئے تو اس کو کھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔“

”آپ تو بس ہر بات پر گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ آپ نے یہ تو لڑچھ لیا ہوتا کہ میں آپ سے کیا کہنا چاہتی ہوں۔“

”اس کے ٹوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بس فقط لڑائی کرنا چاہتی ہو۔“

”لڑائی میں کرنا لینا چاہتی ہوں کہ آپ۔۔۔ سارے ہمسائے لڑی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑتے کھڑکتے رہتے ہیں۔“

”خدا جھوٹ نہ بولائے تو ایک برس عکس میں تم سے کوئی کج بات کی ہے نہ شیریں۔“

”شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی کہاں نہ آتا ہے۔۔۔ لڑکھاؤ دودھ کر جوں کے تو سارے گلے کو پتہ چل جائے گا کہ آپ

آئے گریں سے چاک کرنا بد ہمتی ہیں۔“

”میرے پاس بد ہمتی ہی نہیں۔۔۔ ویسے میں غریب نہ کہتا ہوں، مگر اس کو پہلنے کا کہی؟۔۔۔ میں تو پٹاشے سے ڈرتا ہوں۔“

”آپ نیچے نہیں۔۔۔ میں آپ کو ادھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ یہ تو اڈھیر سے ساتھ نہیں چھو گا آپ کا۔“

”اب میں فراموشی گیا؟“

”آپ ہمیشہ فراموش تھے۔۔۔“

”یہ فیصلہ آپ نے کسی وجہ پر نہ کیا۔“

”آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے، تو کیا آپ نے آبا جی کا حیب سے دودھ پے نہیں نکالے تھے؟“

”نکالے تھے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ بھنگی کی ڈال کی ضرورت تھی۔“

”اس لیے کہ وہ بھنگی کی ڈال تھی۔۔۔ بہت بیمار۔۔۔ والد صاحب اگر کاہنا آؤ، کبھی ایک پیسہ بھی اُسے نہ دیتے

میں نے اسی لیے سب سمجھا کہ ان کے کوٹ سے دودھ پے نکال کر اس کو دے دوں۔۔۔ یہ کوئی گناہ نہیں۔“

”جی ہاں۔۔۔ بہت بڑا ثواب ہے۔۔۔ باپ کے کوٹ پر چھاپا کہ آپ تو اپنے خیال کے مطابق جنت میں رضی مسٹنگ

کر چکے ہوں گے، لیکن میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ اس کی سزا آپ کو اتنی لڑی ملے گی کہ آپ کی طبیعت صحت ہو جائے گی۔“

”طبیعت تو میری ہر روز صاف کی جاتی ہے — اب اتنی صاف ہو گئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس طبیعت کو کچھ میں لٹ پت کردوں، تاکہ تھارہ منظر چہاری ہو سکے۔“

”کچھ میں تو آپ ہر وقت نظر لے رہتے ہیں۔“

”یہ سراسر بتان ہے۔“

”بتانا کیا ہے — حقیقت ہے — آپ سر سے پاؤں تک کچھ میں دھنسنے ہوئے ہیں — آپ کو کسی نفیس چیز سے دلچسپی ہی نہیں، بات کریں گے تو غلامت کی — نہ تھے آپ نہیں۔“

”غضب خدا کا — میں تو دونوں میں تر رہ نہلا ہوں۔“

وہ بھی کوئی خدا ہے — بدن پر دوڑو گئے پانی کے ٹائے — تو مجھ سے اپنا نیم تنگ جسم پونچھا اور غسل نہانے سے باز نہ لیا آئے —

”دوڑو گئے تو نہیں، کم از کم میں ہوتے ہیں۔“

”تو ان سے بھی کیا جڑا ہے — کیا آپ نے آج تک کبھی صابن استعمال کیا ہے؟“

”میں تم سے کئی بار کہ چکا ہوں کہ صابن چلنے کے لیے بہت مضر ہے۔“

”کیوں؟“

”اُس لیے کہ اس میں ایسے تیزرائے ملائے جوتے ہیں جو چلنے کا ستیا نامس کر دیتے ہیں۔“

”میری چلنے تو آج تک ستیا نامس نہیں ہوئی — آپ کی چلنے بہت ہی نازک ہو گئی۔“

”نازک ہونے کا سوال نہیں — یہ ایک سائنٹیفک بحث ہے۔“

”میں سائنٹیفک و آئیٹھنٹک کچھ نہیں جانتی — بس میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟“

”بھئی، تمہیں بتا چکا ہوں کہ مضر ہے۔“

”تو آپ خدا تے کس طرح ہیں۔“

”نہانے کا سہل ایک ہی طریقہ ہے — پانی ڈالتے گئے اور نہاتے گئے۔“

”جسم پر آپ کوئی چیز نہیں لگتی — یہ مطلب ہے، صابن نہیں تو کوئی اور چیز۔“

”طا کرتا ہوں۔“

”کیا؟“

”بیس۔“

”وہ کیا جڑا ہے؟“

”اُسے، بھئی، چھنے کا آٹا۔“

”آپ کی جرات ہے، عزائی ہے — میں تو آپ ایسے سکی سے خدا قسم تلک اٹھتی ہوں — میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں جاؤں۔“

”اپنے بچے پر ہل جاؤ — وہاں تمہیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔“

”میں کیوں جاؤں وہاں — میں یہیں رہوں گی۔“

”میں نے تم سے کچھ ہی کہا — اس لیے کہ تم کو مزہ ملے یہ دھکی دیتی رہی ہو کہ میں پہلی جاؤں گی اپنے بچے۔“

”مجھے جب بلانا ہو گا پہلی جاؤں گی۔“

”آج تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟“

”آپ مجھے پڑھانے کی کوشش کریں کر رہے ہیں؟“

”میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی — اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں، تو یقیناً تو تمہیں ناگسے کا شیشہ پہنچا دوں گی۔“

”کوشش کر کے دیکھ لیجیے — میں یہاں سے ایک پہنچ نہیں ہٹوں گی — یہ میرا گھر ہے۔“

”آپ کا سہ — آپ کے باپ دادا کا سہ — لیکن یہ تو بتائیے۔“

”میرے باپ دادا کا نام مت لیجیے — ان بچاؤں کا کیا قصور تھا؟“

”قصور تو سارا میرا ہے — لیکن بیگم، تم بھی کسی آقاؤ غلاموں کے ساتھ رہ کر رہیں گے — آخر تمہیں کون سا جانی یا مالی نقصان پہنچا رہا ہے کہ

تم اٹھ کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔“

”لڑ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے — میں تو اسے اٹھا بھی نہیں سکتی۔“

”تم بڑے سے بڑا گڑا کھا سکتی ہو — تم ایسی لڑکیوں میں جا کی قوت ہوتی ہے — تم عقاب ہو — تمہارے پہلنے

تو میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔“

”باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے — آپ چڑیا ہیں — سبحان اللہ جب کوئی اور کہتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے

کہ شیر دھار رہا ہے۔“

”اس شیر کو پہلے ایک غلام دیکھ لو۔“

”کیا دیکھوں؟ — پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔“

”یہ خاکسار شیر ہے کیا؟“

”شیر ہے، مگر خاک میں پٹا ہوا۔“

”اس تقریب کا شکریہ — اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کہاں کیا چاہتی تھیں۔“

”آپ اتنے فائق خائف بنے پھرتے ہیں — مجھے کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔“

”تمہاری باتیں نہ صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے — میں کیا سمجھوں گا۔“

”خدا اگر چاہے میں کیوں لاتے ہیں۔“

”خدا اگر چاہے میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔“

”بٹسے آتے ہیں آپ خدا کو مانتے رہے۔“

”خدا کو قریں ہمیشہ سے ماننا آیا ہوں۔ وہ طاقت جو دنیا پر کنٹرول کرتی ہے۔“

”کنٹرول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں۔“

”کس قسم کا؟“

”ہر قسم کا۔ میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکی۔ کپڑے پہنا ہوں، تو اس میں آپ کی مرضی کو

داخل ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد سر میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے۔ آج بچے، کل وہ بچے۔“

”اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟“

”اعتراض نہیں۔ میری اگر کبھی چاہتا ہے کہ او جھڑی کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔“

”او جھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے۔“

”آپ کیا جانیں، کتنی مرید مار جرتی ہے۔ چوتھے میں ٹال کر اُسے صاف کر لیا جاتا ہے، اس کے بعد بھی طرح لگی ہیں

کھانا ہے۔ اللہ قسم خرا آ جاتا ہے۔“

”لا حول ولا۔ میں ایسی غلط چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔“

”اور ٹینڈے؟“

”بکس میں۔ ہسٹری کی سبب بڑی توڑ میں ہیں۔ ان میں کوئی دس ہوتا ہے۔ لذت۔ بس فقط ٹینڈے ہوتے ہیں

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پیدائش غرض کے لیے کیے گئے تھے۔ نہایت دواہیات ہوتے ہیں۔ میں تو اکثر دوا

مانگا ہوں کہ ان کا وجود سرے ہی سے خائب ہو جائے۔ بڑے بے جاں ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کتو بدتر جا بتر ہے

حالا کہ وہ بھی مجھے سخت ناپسند ہے۔“

”آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟“

”ہر کچھ چیز میں آپ کیلئے ڈالتے ہیں۔ جھنڈی آپ کو پسند نہیں کہ اس میں

میںں ہرتی ہے۔ گر بھی آپ کو نہیں بھائی کہ اس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہرتی ہے۔ لٹاڑ آپ کو اچھے نہیں لگتے،

اس لیے کہ اس کے چھلکے ہنسم نہیں ہوتے۔“

”تم ان باتوں کو چھوڑ دو۔ ٹینڈے، گر بھی لٹاڑ یا نیمہ جنم میں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کتنا کیا چاہتی تھیں۔“

”کچھ بھی نہیں۔ بس ایسے ہی آگئی۔ میں نے دیکھا کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے، تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔“

”بڑی نوازش ہے آپ کی۔ لیکن کچھ کچھ تو ضرور کتنا ہر گا آپ کو۔“

”آپ سے اگر کچھ کہہ بھی دیا تو اس کا حاصل کیا ہر گا۔“

”جو آگے آپ کو حاصل ہوتا رہا ہے، اُس حساب سے آج بھی حاصل ہو جائے گا۔“ آپ یہاں سے کچھ حاصل کیے بغیر
 نہیں گئی کیسے؟“
 ”میں آپ سے ایک خاص بات کہنے آئی تھی۔“

”کیا؟“

”میں — میں یہ کہنے آئی تھی، کہ میری جگہ میں نہیں آتا، میں آپ کو کیسے بھجواؤ؟“
 ”آپ کیا بھجانے آئی تھیں مجھے؟“

”آپ کو تو خدا بھجائے گا۔“ میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتھروں میں ہیں کہ اُس کے ٹخنوں بالکل ہی میں بند کیا کریں۔ ہسپتالوں کو
 سخت اعتراض ہے۔ یہ بہت بُری بات تھی ہے۔“

۲۲ مئی ۱۹۵۲ء

فتاد اقصائی

عیدن بائی اگرے وال چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی ماں زہر و جان نے اُس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہر و جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی۔ بڑی دُور دُور سے دیکھنے والے اُس کا بھڑا گانے کے لیے آتے تھے۔

کسا جاتا ہے کویر لڑکے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں گھولتا تھا، اُس سے محبت ہو گئی۔ اُس نے چنانچہ اس جذبے کے ماتحت اپنا بیٹا چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا، اُس کی ماہوار تنخواہ منسوخ کر دی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب۔ چھٹے عشرہ قمریہ اس کے پاس آتا اور بات غلط صحیح سیر سے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہر و جان کو چاہتے ہیں اور اگرے کے رہنے والے ہیں۔ ان کا یہ بیان ہے کہ اُس کا چاہنے والا ایک بڑا عصبی تھا۔ مگر وہ آج مزہ نہیں لگاتی تھی۔ وہ بے چارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار بیٹے کے بعد روپے بیچ کر زہر و جان کے پاس جاتا۔ گروہ اُسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اس نے عصبی کو زہر و جان سے منعقل نظر کرنے کا موقع مل گیا۔ پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اُس پر اپنی محبوبہ کے عشق کا غریب طاری تھا، لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد برات سے کام لیا اور اُس سے کہا،

”زہر و جان — میں غریب آدمی ہوں، مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن دانے گھاسے پاس آتے ہیں اور تھکادی ہر آدمی پر سیکڑوں روپے بچھا کر دیتے ہیں — لیکن تمہیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے — میں تم سے محبت کرتا ہوں — معلوم نہیں کیوں؟“

زہر و جان ہنسی، اس ہنسی سے بڑا عصبی کا دل بھرج ہو گیا۔ تم ہنستی ہو — میری محبت کا مذاق اڑاتی ہو، اس لیے کہ یہ کھیلنے کی محبت ہے جو کلڑیاں چکر کرائی دیتی ہیں، کھانا ہے — یاد رکھو، یہ گھاسے لاکھوں میں کھیلنے والے تھیں، دو محبت اور یہاں نہیں دے سکتے، جو میرے دل میں تھا اسے لیے ہو جو ہے؟“

زہر و جان اُٹا گئی۔ اُس نے اپنے ایک میراثی کو بلوایا اور اُس سے کہا کہ عصبی کو باہر نکال دیا۔ لیکن وہ اس سے چھٹی چلا گیا۔ ایک برس کے بعد عیدن پیدا ہوئی — اس کا باپ عبداللہ تھا یا کوئی اور، اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو میٹر کے گھٹے سے ہے — کسی کے گھٹے سے بھی ہو، مگر بلا کی خوبصورت تھی۔ اُدھر زہر و جان کی عمر ڈھائی تھی، اُدھر عیدن جوان ہوئی تھی۔ اُس کی ماں نے اُس کو مستحق کی بڑی اچھی تعلیم دی۔ لڑکی فریبن تھی، کچھ استادوں سے اُس نے سبق لیے اور اُن سے راز و مول کی۔

زہرہ جان کی کمراب چالیس برس کے قریب ہوئی۔ وہ اب اُس منزل سے گزرنی لگی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے۔ وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدن کے سہارے بیٹھ رہی تھی۔ ابھی تک اُس نے اُس سے مجرا نہیں کرایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی دلیر نواب کرے۔

عیدن باقی کے شخص کے چرچے عام تھے۔ خود وہ دمک عیاشی دُشمنوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ وہ اپنے انجمنوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدن کی فحشی اُٹارنے کے لیے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے، مگر اُس کو اتنی جلدی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے۔ اُس کی لڑکی لاکھوں میں ایک تھی۔ سائے شمر میں اُس جیسی جیسے لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔

اُس کے شخص کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جمعرات کی شام کو اُس کے ساتھ پیدل باہر سر کر جاتی۔ عشق پیشہ مرد اس کو کھینچتے تو دل تمام تمام لیتے۔

پچھلی پچھلی چولی میں گود لایا ہوا جرم، سٹول بانٹیں، خردلی انگلیاں جن کے ناخنوں پر سیاہ جیتکا ہو، ایسا رنگ ٹھکاسا قدر گھٹکرایا بال — قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی۔

آخر ایک روز زہرہ جان کی اتید بر آئی۔ ایک نواب عیدن پر ایسا متوہنا کر دیا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی پیش کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ کئی دلیلیں پلاؤ اور متوجہ کی چڑھائی لگیں۔

شام کو نواب صاحب اپنی نگہی میں آئے۔ زہرہ جان نے اُن کی بڑی آؤ بھکت کی — نواب صاحب بہت خوش ہوئے۔ عیدن دوسری بی بی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اُس کا بھر شروع ہوا — پھٹ پڑے والا شباب تھا جو نغمہ سرائی تھا۔

عیدن اُس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ہر جنبش، ہر اور، اُس کے گانے کی ہر سر زہرہ جان کی تھی۔ نواب صاحب گونگے گانے کا سارا لیے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ آج رات وہ رخت کی سیر کر گئے، جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے انگم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بہت گھبرائی۔ وہی بڑھئی تھا — اس کا عاشق راز بہت سیچے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو بہت نفاست پسند تھے اب انہیں آئے لگیں۔ انھوں نے زہرہ جان سے کہا: یہ کون بدلتیز ہے؟

بڑھئی مسکرایا، حضور میں ان کا عاشق ہوں۔

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ کدھر ہو گئی۔ زہرہ جان، نکلا اس حیران کو باہر۔

بڑھئی نے اپنے قہقہے سے آدھی نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کی کچک کر اُس کی گردن پر تیزی سے چلا اور شروع کر دی

نواب صاحب اور بی بی وہاں سے بھاگ گئے۔ عیدن بے ہوش ہو گئی۔

بڑھئی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور لوہو بھری آدھی اپنے قہقہے میں ڈال کر سیدھا خانے گیا اور قہال بزم کر لیا۔

— کہا جاتا ہے کہ اسے غرقیت کی سزا ہو گئی تھی۔

عید کی کوئی مہمان کے قتل کرنے کے لیے اس قدر مدد نہ ہوا کہ وہ دو اڑھائی مہینے تک سیر کر رہی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ اندر نہیں رہے گی، مگر ہسپتال ہسٹا اُس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اُس کی تیمارداری صرف اُس کے استاد اور میزبان ہی کرتے تھے۔ وہ فوٹو اب اور ریس جو اُس پر اپنی بانی چھڑکتے تھے، چھوٹے سے بھی اُس کو لپٹے چھنے کے لیے نہاتے — وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی۔

وہ اگرچہ چھڑک رہی تھی مگر اُس کی طبیعت اتنی اُس میں تھی کہ اُس کا جی قطعاً بھرا کر نہ دے گا۔ اُس کے پاس نہیں بچکے ہیں ہزار روپے کے زیورات تھے، جو میں دیکھنے اُس کی مقبول ماں کے تھے۔ وہ انہیں بیچتی رہی اور گزاری کرتی رہی۔

حالت کو زور دے عزیز ہوتے ہیں، اس کوڑا کو کھڑا کرتا تھا جب وہ کوئی چوڑی آنکھس لٹھلٹھ بننے والی ہوتی تھی — لیکن آخر کیا کرتی؟ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ راگ رنگ کی مٹھلیں قائم کرے۔

اس دنوں پاکستان کے قیام کا مطالبہ بڑے دنوں پر تھا۔ آج ایک دن یہ اعلان ہوا، جو عید نے اپنے بھائی واپس لایا۔ شاہد ہندوستان کے دو حصے ہو گئے، اس کے فوراً بعد مذاکرات شروع ہو گئے، ہندو مسلمانوں کو ملنے، مسلمان ہندوؤں کو — جب عالم تھا یونانی سے بھی اڑھا ہوا تھا۔

مسلمان دھڑا دھڑا پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی بھانجی محفوظ رہیں، عید نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ انہیں نہیں رہے گی، لاہور چلی آئے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کئی زیورات سونچ کر وہ لاہور پہنچ گئی۔ لیکن راستے میں اُس کی تمام پیش گوئی تباہ ہو گئی اور وہ اپنے زیورات کے اپنے بھائی مسلمانوں ہی نے غائب کر دیے۔

جب وہ لاہور پہنچی تو وہ کئی مٹی تھی — لیکن اُس کا سن ویسے کا ویسا تھا۔ وہی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں چرائی ہوئی لٹھلیں نے اُس کی طرف دیکھا، مگر اُس نے بے اعتنائی برتی۔

وہ جب لاہور پہنچی تو اُس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہوگی؟ اُس کے پاس تو چھ لٹھلیں کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے لیکن لڑکی نہیں تھی سیدھی اُس کو بچہ بنی، جہاں ان کی ہم پیشہ رہتی تھیں۔ یہاں اُس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔

ان دنوں لاہور میں دوبارہ عام تھا۔ ہندو جو کچھ یہاں چھڑ گئے تھے، مسلمانوں کی لیکٹ بن گیا تھا، ہر مندر کے دروازے بند تھے۔

عید کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اُس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اُس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی خواہشیں پوری کرنا پڑیں۔

صبح بار بجے کے قریب جب کہ اُس کی آواز جواب نہ ملتی تھی، وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی اور اُنہیں سے کہتی تھی کہ چلو، چلو، چلو

یہ سلسلہ قریب قریب ڈھائی برس تک جاری رہا — عید ان اس کے بعد ایک عرصہ کو کٹا کر دیے پرے کو دیا، اُنہوں نے چوکھڑا

وہ ختم تھی، اُس ناگہان سے اپنی آدمی آمدت دیکھ کر بڑی تھی۔

جب اُس نے منظر دیکھا کہ اُسے کٹھے پر بھرا کر شروع کیا تو اُس کی آنکھوں میں غماز ہو گیا۔ اب اُسے ہر قسم کی فرحت حاصل تھی، سو

نے کئی زور نہ لیا، کپڑے بھی لپچے سے اچھے تیار کر لیا۔

اسی دور میں اُس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو ٹیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا، اُس نے کم از کم دو کروڑ روپے کا گئے تھے جو بصورت تھا، اُس کے پاس تین گاڑیاں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدین کے جشن سے اس قدر متاثر ہو گیا کہ اُس نے اپنی کھلی سفید بیکار ٹاس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم دو روٹیاں سرور پہ اُس کی خدمت پر رکھتا۔ ایک شام وہ ایک توپا بندی کسی قدر مٹی تھی اُس نے عیدین سے پہنچا، کیا بات ہے، آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے۔“
عیدین نے ایک اور کے ساتھ جواب دیا۔ آج کل ٹھکانا ملتا ہے؟
دوسرے دن اُس ٹیک مارکیٹ بادشاہ نے چالیس تھانے مٹھے کے گجرا دیے۔ اس کے تیسرے روز بعد اُس نے ٹوٹائی بڑا روپے دیئے کہ عیدین اپنے گھر کی آمدات کا سامان خریدے۔

عیدین کو کچا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا، جب وہ اگر کسی اور کو دے دیتا تو اسے عموماً گوشت نہیں ملتا تھا، مگر وہیں اُسے قاتلا تصانی بہترین گوشت میاں کرتا تھا۔۔۔ بخیر بیٹے کے۔ ہر کوئی اس کو دیتی تھی جیسے رشک کی بیوی۔
”کاش پریشا شاد بھاکر تورا جی سوربے آتا اور تورا جی سرور گوشت جس کی کوئی کوئی چنگ رہی ہو، عیدین کے قتل کے وقت اُس سے وہر تک باتیں کرتا جتا اور عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں باتیں۔

ٹیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام غفر شاہ تھا، عیدین کے عشق میں بہت بُری طرح گرفتار چکا تھا، اُس نے ایک شام عیدین کے کاکہ کو اپنی ساری چاندنی مشغور اور غر مشغور اُس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے، اگر وہ اس سے شادی کرے۔ مگر عیدین نے مافی غفر شاہ بہت دیر میں ہنسا۔

اُس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدین اُس کی ہر جائے، مگر ہر بار اُس سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھرے سے خارخہ ہر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب غفر شاہ اپنا غم غلط کر کے — یعنی شراب پی کر بیڈل ہی چلا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں — کے گچے کے باہر عیدین ایک نہایت بد نما آدمی کے پاؤں پر کڑے اتار رہی ہے کہ خدا کے لیے جو پُر نظر کرم کرو میں دل دجان سے تم پر نثار ہوں — تم اتنے ظالم کیوں ہو — اور وہ شخص جیسے خود سے دیکھنے پر غفر شاہ نے پہچان لیا کہ تورا تصانی ہے، اُسے دھمکانا ہے بجا — ہم نے آج تک کسی کبھری کو نہ نہیں گھایا — مجھے تنگ نہ کیا کر
تورا اُسے ٹھوکر مارا، اور عیدین اسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔

خودکشی

نواب صوف نام ہی کا زہد نہیں تھا۔ اُس کے زہد و فقرے کے سب تال تھے۔ اُس نے میں بھیجی برس کی عمر میں شادی کی۔ اُس نے اُس میں اُس کے پاس دس چار ٹپے کے قریب تھے۔ شادی پر پانچ ہزار روپے جو گئے، اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔

نواب بہت خوش تھا۔ اُس کی چری بڑی خوش خلعت اور خوبصورت تھی۔ اُس کو اُس سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ وہ بھی اُس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد اُس کے ایک لونگی پیدا ہوئی جو ماں پر تھی۔ بسنی دوسری اتنی جیسے بڑی بڑی خلعتیں، اسی طرح پٹلیں، میں اب رو چھوڑا مناسب دیں۔ اس لونگی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ فراداد اُس کی چری کو دوسروں کے تجویز کیے ہوئے نام پسند نہیں آئے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ خود نواب نام بنائے۔

نواب دیر تک سوچتا رہا، لیکن اُس کے دماغ میں ایسا کوئی مفرد و مناسب نام نہ آیا اور وہ اپنی ٹانگی کے لیے منتخب کرتا۔ اُس نے ریشمی پیری سے کہنا: اتنی جلدی کیا ہے — نام رکھ دیا جائے گا۔

پیری ٹھہر گئی کہ نام خود رکھا جائے۔ میں بد بختی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی۔

وہ کہتا: اُس میں کیا حرج ہے — جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گلی کو تھی کے ساتھ نام لگ دے گا۔
پیر میں اسے کیا کہ کر چکھلاؤں؟ — مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

”فی الحال بیٹا کہہ دینا کافی ہے۔“

”یہ کافی نہیں ہے — میری بیٹا کا کوئی نام ہونا چاہیے۔“

”تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔“

”یہ کام آپ کا ہے، میرا نہیں۔“

تو تھوڑے دن انتظار کرو — میں اُندو کی گنت کرتا ہوں — اُس کو پہلے منے سے آخری منے تک غور سے دیکھوں گا — یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا۔

”میں نے آج تک یہ کہیں نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں کی پیریوں کے نام انکشتروں سے نکالتے ہیں۔“

”نہیں میری جان نکالتے ہیں — میرا ایک دوست ہے۔ اُس کے جب بچہ پیدا ہوئی تو اُس نے فوراً اُندو کی گنت نکالی اور اُس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔“

”کیا نام تھا۔“

”نکلت۔“

”اُس کے منہ کیا ہیں۔“

”نوشہرہ۔“

”بڑا اچھا نام ہے۔ نکلت ————— یعنی خوشبو۔“

”تو میں نام رکھ لو۔“

زادہ کی بیوی نے زینب کی کوہوسو رہی تھی ایک منظر دیکھا اور کہا، نہیں ————— میں اپنی بیٹیا کے لیے پرانا نام نہیں چاہتی ————— کوئی نیا نام تلاش کیجیے ————— جیسے ڈاکٹری لے آئے۔“

زادہ مسکرایا لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔“

زادہ کی بیوی بھی مسکرائی، تیرہ برس الماری میں ڈھسے، اُس میں جتنے روپے آپ کو چاہیں، نکال لیجیے۔“

زادہ نے بہت بہتر گما اور الماری کھول کر اُس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک نوٹ لے کر زادہ کو دے دیا۔

ہر ایک کو نکتہ خوردی۔

وہ کئی شنب فروش دکانوں میں گیا ————— کئی نکتہ دیکھے۔ بعض تو بہت قیمتی تھے جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے

ناقص ————— آخر اُس نے ایک نکتہ جس کی قیمت دو تین تھی خرید لیا اور اسے تین اُس کی دکان میں لے کر آیا، ہمارا نام کا مسئلہ حل ہو جائے۔

جب وہ انکانہ کی گلی سے گزرا تو اس کو ایک دوست مل گیا۔ وہ اُسے اپنی برائوں کی دکان میں لے گیا ————— وہاں

اُسے قریب قریب ایک گھنٹے تک بیٹھا پڑا کر دیکھتا رہا۔ دوسرے کے بعد اُس سے ملاقات ہوئی تھی جب اُس کے دوست کو وہاں گھنٹو

میں پڑھ کر آباد کے ہاں لاکھ ہوائی سے تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجدد کی میں سے گیا وہ روپے نکالے اور زادہ سے کہنا یہ اُس کی کوہوسے دینا، انکانہ

تھا جسے بچانے دیئے ہیں ————— نام کیا رکھا ہے اُس کا؟

زادہ نے نکتہ کی بات دیکھا جس کی جلد اول رنگ کی تھی ابھی تک کوئی اچھا نام نہ سنا تھا۔

اُس کے دوست نے جیسے کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا، یا زادہ! تم نے دقت ہی کیا پیش آتی ہے، شینہ ہے،

شامینہ ہے، نسرین ہے، الماس ہے۔“

زادہ نے جواب دیا، یہ سب بکواس ہے۔“

اُس کے دوست نے جواب دیا، تو اب جو بکواس تم کرو گے، وہ بھی تم میں ہیں گے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے اُس سے زادہ کو گئے

سے نکلا۔ خدا اس کی عزت و آزر کرے ————— نام ہونا ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

زادہ جب دکان سے باہر نکلا تو اُس نے سوچا شروع کیا کہ وہ نام میں کیا رکھے۔ خیر ان کو یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی عزت

کرتا ہے۔ جتنی کیا ہے ————— اور گھسیٹا ————— کیا اُسے لوگ گھسیٹا شروع کریں ————— اور یہ دلوں ————— شہزادی؟

اُس کے جی میں آئی کہ گفت کسی گندی موری میں پھینک دے اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے "میری جان، نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس بدو عا کو کہ کچھ کی فکر دوا زہر۔"

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا۔ لیکن مطمئن نہیں کیوں اُس کا دل غیر معمولی طور پر متحرک رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پرانے خیالی کا باعث ہے۔ قصہ ڈی دُور پہلے کے بعد اُس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُن کو گھر پہنچے اور خود کچھ کیہ مشاغل دیکھے۔

بغل میں نفٹ تھی۔ اس کو اُس کو کئی بار دیکھنے کی کوشش کی، مگر اس کا دل دواغ متوازن نہیں تھا۔ اس نے تیز تیز پتلا شروع کر دیا۔ مگر قصہ خالص طے کرنے کے بعد ہی بہت بُری طرح ہانپنے لگا اور ایک ڈکان کے قطرے پر مڑ گیا۔ اتنے میں ایک خالی ٹانگہ آیا، اُس نے اُس کو کھڑا کیا اور اس میں بیچ کر تانگے وائے سے کامیاب طور پر لٹکے۔ لیکن جلدی پہنچاؤ کے وہاں ایک بڑا ضروری کام ہے۔

مگر گھر بہت ہی سخت رفتار تھا۔ یا شاید زائد کر ایسا محسوس ہوا کہ اُس کو غفلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچا جاتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ تانگہ وائے سے سخت سخت الفاظ کے جوہر برداشت کرنا گئے۔ آخر جب اُس کی برداشت کا یہ زبردستی ہو گیا تھا اُس نے زائد کر تانگے سے آگے دیا۔ ہائی کورٹ کے قریب، اُس نے زائد سے کو ایسا طلب نہ کیا۔ زائد اور زائد پریشان ہوا، وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ درجہ کم کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پشاور ہی آگے آیا، اس میں بیٹھ کر وہ مزنگ پہنچا کر آیا اور کیا اور گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً جسمانی تھیں۔ وہ دروازے کے پاس رگ گیا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی، مشکل ہی سے بچے کی بچاوی۔ قسطنجی کے یہ دُور سے بڑے خطرناک ہیں۔ زائد ان عورتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے وہاں زائد رہا جگا اور اُس کے کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اُس کی بیوی رہتے تھے۔ زائد داخل ہوتے ہی اُس نے اپنی بیوی کی ننگ شکلات جینج سنی۔

اُس کی شیا دم توڑ چکی تھی۔ اور اُس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ زائد نے اپنا سر بیٹا شروع کر دیا۔ جسمانی طور پر وہ کوشش کر رہا تھا۔ زائد نے اُس کو زائد رہا کر اُس کے کمرے سے باہر نکال دیا۔

ایک جسمانی کے شوہر کے پاس موٹر تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر لے آیا، اُس نے زائد کی بیوی کو ایک دوا انجکشن لگائے جن سے وہ ہوش میں آگئی۔

زائد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اُس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں مستقل ہو گئی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا، بغل میں نفٹ دبائے غلامیں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ اپنی کچھ کے بے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

بچہ کو دفعتاً لے کر آتا تھا۔ زائد ہا ہوش ہو گیا۔ اُس نے کوئی آئینہ نہ دیکھا۔ کفن میں پڑی کچھ کی کوشش اور اپنے دوستوں اور مسابروں کے ہوا قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی سے تیار کر لی گئی تھی۔ اس میں اُس نے خود اُس سے لایا اور اُس کے ساتھ

طقت رکھ دی۔

لوگوں نے سمجھا، قرآن مجید ہے، انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ نوروں کے ساتھ قرآن کو نطق کرتا ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے۔
 ایکس ان میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا۔ بس آپس میں کھسکے پھرتے رہے۔
 ہنسی کو دھاگر جب گھڑایا تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے۔ سر سام کی کیفیت ہے۔
 قرآن کو ٹکڑا کر بٹایا گیا۔ اس نے ابھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا حالت بہت نازک ہے۔ — میں علاج تجویز کیجے دیتا ہوں، لیکن میں صحت کی بجائی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

زاہد کو ایسا غصوں ہوا کہ اس پر پہلی آن گری ہے، لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا۔ تکلیف کیا ہے؟
 ڈاکٹر نے جواب دیا۔ بہت سی تکلیفیں ہیں۔ — ایک تو یہ کہ انھیں بہت صدمہ پہنچا، دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے۔ — تیسری یہ کہ انھیں ایک سو پانچ ڈگری بخار ہے۔
 ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کیے۔ دو لٹھے پلانے والی دواؤں کے ٹکے اور پھلایا گیا۔
 زاہد فدا یہ سب چیزیں لے آیا۔ ٹیکے لگاتے۔ دوا میں بڑی مشکل سے مطلق میں پہنچائی گئیں۔ — لیکن مریضہ کی حالت بہتر نہ ہوئی۔

دس پندرہ روز کے بعد اسے تھوڑا سا ہوش آیا۔ ہڈیاں کی کیفیت ابھی دور ہو گئی۔ زاہد نے لطیفان کا سامس لیا۔ اس کی پیادہ کی حسین بیوی نے اسے بلایا اور بڑی نیچت آواز میں کہا تیرا اب آخری وقت آگیا ہے۔ — میں چند گھنٹوں کی صاف جہاں —

زاہد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ — تمہیں خدا غنا ستہ اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا۔
 زاہد کی بیوی نے ہنسی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ — میں مرنے، بل دوسری آجائے گی۔ — خدا آپ کی لڑواؤں کے — اور — اور —

اس نے چنگلی اور ایک سیکڑے کے اندھا اندھ اس کی توجہ پورا کر گئی۔ — زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کے گھٹنوں میں سے خارخاں جو کہ وہاں کو گھر سے باہر نکلا اور دیر لمبے تا تم ٹھیل دیکھ کر ریلوے لائن کا رخ کیا۔
 رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب ایک گاڑی آئی تھی۔ وہ منسل پورہ کی طرف روانہ ہو گیا، تاکہ وہاں پٹری پر ریٹ چلے اور اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ گاڑی آئے گی تو اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ — مجھے لمبی عمر کی کوئی خواہش نہیں۔ — یہ جتنی جلدی مختصر ہو، اتنا ہی اچھا ہے۔ رہا اب اور زیادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی میٹھاں پر ہوتی ہے دکھائی دی۔ — لیکن ابھی وہ دھند ہی تھی اس نے انتظار کیا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پٹری پر ریٹ جائے گا۔
 تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آ گئی۔ — زاہد اُگے بڑھا، مگر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا تھا اور

ہشٹری کے مین درمیان کھڑا ہو گیا۔ گاڑی بڑی تیز رفتار سے آرہی تھی۔ اور قریب تھا کہ وہ آدمی اُس کی جھپٹ میں آجائے۔ وہ جھری سے پھٹا اور اُس آدمی کو دھکا دے کر ہشٹری کے اُس طرف گرا دیا۔ گاڑی دندنائی ہوئی گزر گئی۔

اِس آدمی سے زائد کئے کیا تم خود کشتی کرنا چاہتے تھے؟

اُس نے جواب دیا جی ہاں۔

”کیوں؟“

”بس — مددے اُٹھاتے اُٹھاتے اب پیچھے کر ہی نہیں پاتا تھا۔“

زائد نامہ صحیح بن گیا، بجائی میرے، زندگی زندہ رہنے کے لیے ہے۔ اس کو اچھی طرح استعمال کرو، خود کشتی بہت بڑی

بزدلی ہے — اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلندی ہے — اُٹھو، اپنے مددوں کو قبول جاؤ — انسان کی زندگی

میں مددے دہری ترغیثوں سے کیا حقد اُٹھائے گا — چلو میرے ساتھ۔“

(۲۵۔ مئی ۱۹۵۷ء)

پشاور سے لاہور تک

دو انٹر کلاس کے زمانہ ڈبے سے نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایچ کیس تھا۔ جاوید پشاور سے دیکھنا چلا رہا تھا۔ روپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زمانہ ڈبے کے پاس سے گئی مرتبہ گذرا۔

لاکی جیسے تھی۔ جاوید اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اُس کی ناک کی ٹھنچا پر چھوٹا سا آبل تھا۔ لاکوں میں منتھے منتھے گرٹھے تھے جو اُس کے ہر سے پرست بچلے لگتے تھے۔

روپنڈی اسٹیشن پر اُس لاک نے کھانا منگوا دیا۔ بڑے اعلیٰ مقام سے ایک ایک نو لاکھا کا اپنے منہ میں لٹا رہی۔ جاوید فوراً کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُس لاک ہی چاہتا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ بیٹھ جائے اور وہ دنوں کی رکھنا کھا لیں۔

وہ یقیناً اُس کے پاس پہنچ جائیگا مصیبت یہ تھی کہ ڈبہ زمانہ تھا۔ لوگوں سے بھل بھلا رہی وجہ ہے کہ جرات نہ کر سکا۔ لاک نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے، جو بہت اڑک تھے، جیسی ایسی خریدی انگلیاں، جیسی کو اُس نے اُنھی طرح صاف کیا اور ایچ کیس سے تویہ نکال کر اپنے ہاتھ پر بچھے۔ پھر اعلیٰ مقام سے راشن سیٹ پر بیٹھ گئی۔

جاوید گاڑی چلنے لگا۔ اُس کی موت دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا اور اُس لاک کے خیالوں میں غرق ہو گیا۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ بڑے اچھے گھرانے کی ہے۔

دولوں کلاز محلہ میں قریب قریب بارہ بارہ سولے کی چوڑیاں ہوں گی۔ کالوں میں ٹاپس بھی تھے۔ دو انگلیوں میں، اگر میرا اندازہ غلط نہیں، ہر سے کی انگریزیاں ہیں۔ لباس بہت عمدہ۔ سائٹ کی شہوار۔ نقیہ کی نہیں۔ مٹھنوں کا دوپٹہ۔

حیرت ہے کہ گھٹیا اور جے میں کیوں سفر کر رہی ہے؟

پشاور سے آئی ہے — وہاں کی عورتیں تو سخت پردہ کوئی ہیں — لیکن یہ برقعے کے مفید ہاں سے گاڑی میں سوار ہوئی۔ اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں — نہ کوئی عورت۔ کیسی سفر کر رہی ہے۔ آخر یہ قصہ کیا ہے؟ میرا خیال ہے۔ پشاور کی رہنے والی نہیں — وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہوگی — گھر کیسی کیوں؟ کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اُٹھا کر لے جائے گا کوئی — ایسے تنہا شخص پر تو ہر مرد چھپٹا مارا چاہتا ہے۔

پھر جاوید کو ایک اندیشہ ہوا — کہ شادی شدہ تو نہیں؟

دو دراصل وہ ایسی خبیثہ کہ چکا تھا کہ اس لاک کو بھیجا کرے گا اور وہاں لاک کو اُس سے شادی کرے گا۔ مگر کامیابی کا بالکل خیال نہیں تھا۔

منی اسٹیشن آئے اور گھڑ گئے۔ اُسے صرت داول پنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اس کا گھر تھا، مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔

ایک اسٹیشن پر چکیٹک ہوئی، جس کے باعث اُسے جبراً ادا کرنا پڑا، مگر اُس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ ٹکٹ چیک کرتے ہوئے چچا، آپ کو کہاں تک جانا ہے؟

جاؤیدہ مسکراتی تھی، ابھی تک معلوم نہیں۔ آپ لاہور کا ٹکٹ بنا دیجیے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے۔ ٹکٹ چیک کرنے سے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا۔ روپے وصول کیے اور وہ سرے سے اسٹیشن پر اتر گیا۔ جاؤیدہ بھی اتر کر ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرا تھا۔

ساتھ والے کپارٹمنٹ کے پاس گیا۔ وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی راتوں میں خنک کر رہی تھی۔ جاؤیدہ کی طرف جب اُس نے دیکھا تو اُس کے دل و باغ میں ہیرنیاں دوڑنے لگیں اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے۔ کچھ گئی ہے کہ وہ بدادہ صوفے سے ہی دیکھنے آتا ہے۔

جاؤیدہ کو دیکھ کر وہ مسکراتی اُس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر جاؤیدہ غریب جذبات کی وجہ سے فرادہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور دوا لڑکی کو نینا کی سیر کرنے لگا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے پاس کی تمام چیزیں مسکرا رہی ہیں۔

ٹرین کا پچھلا مسکرا رہا ہے۔ کھڑکی سے باہر تار کے کچھ مسکرا رہے ہیں۔ ابھی کی سٹی ٹسکرا رہی ہے اور وہ بدادہ صوفے سے مسافر اُس کے ساتھ بیٹھا تھا، اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ہے۔ اُس کے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی، لیکن اُس کا دل مسکرا رہا تھا۔

اگلی اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کپارٹمنٹ کے پاس گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اُس کا دل جھٹک سے رہ گیا کہ کہاں چلی گئی؟ — کیوں پچھلے اسٹیشن پر تو نہیں اتر گئی جہاں اُس نے ایک ٹسکراہٹ سے مجھے نوازا تھا؟ — نہیں نہیں غفل تھا میں ہو گیا۔

وہ بدادہ صوفے سے ہی میں تھی، ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاؤیدہ کو دیکھ کر ٹسکراتی اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو بلایا۔

جاؤیدہ کا پتہ لڑنا کھڑکی کے پاس پہنچنا اُس لڑکی نے بڑی عین اور سُریل آواز میں کہا ایک تکلیف دہنا چاہتی ہوں آپ کو۔ مجھے دو سیب لاد دیجیے۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنا پرس نکالا اور ایک دوپے کا ٹوٹ جاؤیدہ کی طرف بڑھا دیا۔

جاؤیدہ نے جو اس غیر متوقع کلام سے قریب قریب برق زدہ تھا، ایک دوپے کا ٹوٹ پکڑ لیا، لیکن فوراً اُس کے ہونٹوں میں برقرار ہو گئے۔ نوٹ دہاں دے کر اُس نے اُس لڑکی سے کہا، آپ یہ رکھیے۔ میں سیب لے آتا ہوں۔ اور میٹ خاموش رہی کہ اس کی طرف دوڑا جس میں جھل بیچے جاتے تھے۔ اُس نے جلدی جلدی چھو سیب خریدے۔ دیکھو دیکھو سلی ہو گئی تھی۔

وہ لڑکا دوڑا وہ اُس لڑکی کے پاس آ رہا، اُس کو سیب دیے اور کہا سلامت کیجیے گا۔ دسل ہو رہی تھی اس لیے میں

اچھے سیب بچے نہ سکاٹا۔ وہی دل غریب مسکراہٹ۔ گاڑی حرکت میں آئی۔ جاوید اپنے کپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو کانپ اٹھا۔ لیکن بہت غرض تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کو دلوں جہاں لگے ہیں اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ اس کی لذت سے لطف اٹھوڑ رہا تھا۔ اس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ اس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خشک رہا ہوں۔ آج سلام خدا ہے کہ محبت انسان کو کتنی تروتازہ بنا دیتی ہے۔ وہ سیب کھا رہی ہوگی۔ لیکن اس کے گال تو عمدہ سیب ہیں۔ میں نے جو سیب اس کو دیئے ہیں کیا وہ ان کو دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔

وہ میری محبت کے اشاروں کو سمجھ گئی، ابھی تو وہ مسکرائی، اور اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بٹھایا اور کہا کہ میں اُسے سیب لادوں۔

پھر سب سے اگر وہ کبھی گاڑی کا رخ پلٹ دوں تو میں خدا کی قسم اس کی خاطر بڑھی کر بیٹا۔ گو مجھ میں اتنی طاقت نہیں لیکن محبت میں آدمی بہت بڑے بڑے کام سر انجام دے سکتا ہے۔ فرماؤ نے شیریں کے لیے پانچ کاکٹ کر نہیں کھودی تھی؟ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی پوچھ لیا ہوتا کہ تمہیں کہاں تک جانا ہے۔ خیر میں لاہور تک کا ٹکٹ تو خریدا چکا ہوں۔ ہر اسٹیشن پر دیکھ لیا کروں گا۔

وہ ہے وہ اب مجھے ہی بتائے جلتے گی بھی نہیں۔ شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ میرے ہندو محبت نے اُسے کافی متاثر کیا ہے۔ سیب کھا رہی ہے کاش کریں اس کے پاس بیٹھا ہوتا۔ ہم دونوں ایک سیب کو یک وقت اپنے دانتوں سے کاٹتے۔ اس کا منہ میرے منہ سے کتنا قریب ہوتا۔

میں اس کے گھر کا پتہ لوں گا۔ خدا اور باتیں کروں، پیر دل پندری پہنچ کر اتنی سے کموں گا کہ میں نے ایک لڑکی دیکھ لی ہے، اس سے میری شادی کر دیجیے۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔ بس ایک دو بیٹنے کے اندازہ زنا شادی ہو جائے گی۔

اگلے اسٹیشن پر جب جاوید اُسے دیکھنے گیا تو وہ پانی پی رہی تھی۔ وہ حضرات کر کے آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیے۔

لڑکی مسکرائی۔ وہ غریب مسکراہٹ۔ ”مجھے سگریٹ لاد دیجیے“

جاوید نے بڑی حیرت سے بڑھایا، آپ سگریٹ پیتی ہیں؟

”ہاں لڑکی پھر مسکرائی بھی نہیں۔ یہاں ایک عورت ہے، پردہ دار، اس کو سگریٹ پینے کی اجازت ہے۔“

”اوہ!۔۔۔ میں ابھی لایا۔۔۔ کس برانڈ کے سگریٹ ہوں؟“

”میرا خیال ہے، وہ گولڈ فلیکس پیتی ہے۔“

”ہیں ابھی حاضر کیجیے دیتا ہوں نہ یہ کہہ کر جاؤ اور اسٹال کی طرف دوڑا۔ وہاں سے اس نے دوپکٹ لیے اور اس لڑکی کے حوالے کر دیے۔ اُس نے غلے میں سرمدت کی طرف سے ادا کیا جو سگریٹ پیچنے کی عادی تھی۔

جاؤ یہ اب ہمدردی غرض تھا کہ اُس لڑکی سے ایک اور حادثات ہو گئی۔ مگر اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا اس نے کئی مرتبہ غور کر کے اس کا نام نہیں نہ پوچھا۔ اتنی باتیں ہوتی ہیں ایسی کہ وہ اُس سے بتا بھی نہ سکے گا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ اُس نے آزاد کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اُس سے نام ضرور پوچھے گا۔ اسے نہیں تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی، کیونکہ اُس میں جفا سمیت ہی کیا تھی۔

اگلا اسٹیشن بہت دور کے بعد آیا، اس لیے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاؤ یہ کو بہت کوفت ہو رہی تھی، اُس نے کئی مرتبہ ناظم ٹیلی دیکھا، گھڑی بار بار دیکھی۔ اُس کا ہی چاہتا تھا کہ ابھی کوئی ٹرک ہاٹیں، تاکہ وہ ڈاکر جلدی اگلے اسٹیشن پہنچ جائے۔ گاڑی ایک دم رک گئی معلوم ہو کر کہ ابھی کے ساتھ ایک جھینس ٹھہر گئی ہے۔ وہ اپنے کیا ڈسٹ سے اُڑ کر ساتھ رہنے ڈبے کے پاس پہنچا، مگر لڑکی اپنی سیٹ پر سو جہ نہیں تھی۔

مسافروں نے وہی کئی ہوئی جھینس کو پٹری سے ہٹانے میں کالی دیڑھ گاڑی دھکے میں دو لڑکیوں کو غائبانہ دوسری طرف تھامنا شروع کر دیا۔ یہ مشکل تھی، آئی اور اُن کی سیٹ پر پہنچ گئی۔ جاؤ یہ جب اُس کی نظر اُن کی طرف سے اٹھ گئی۔ وہی اظہار ہو سکتا ہے۔ جاؤ یہ لڑکی کے پاس گیا، مگر اُس کا نام نہ پوچھ نہ سکا۔

لڑکی نے اُس سے کہا یہ جھینس میں کون کی گاڑی کے نیچے آجاتی ہیں؟

جاؤ یہ کو کوئی جواب نہ سوسجھا۔ گاڑی پہننے والی تھی، اس لیے وہ اپنے کیا ڈسٹ میں چلا گیا۔

کئی اسٹیشن آئے مگر وہ نہ اُترتا۔ آخر وہ ہر جا گیا۔ پیٹ کا نام پر جب گاڑی رکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔ لڑکی ہمدردی سے جاؤ یہ نے اپنا سامان نکال دیا اور اُس نے جس نے ہاتھ میں لپی کس پر لڑا ہوا تھا کہا کہ تیرے یہ لڑکی کیس مجھے دے دیجئے۔

اُس لڑکی نے لڑکی کیس جاؤ یہ کے لئے کر لیا۔ اُن نے جاؤ یہ کا سامان اٹھایا اور دو لوگوں باہر نکلے تاکہ جاؤ یہ نے اس کو چھاپ کر کہاں جاتا۔ لڑکی نے بڑے نرم و نازک میجر میں جواب دیا جی، راوی روڑ۔

پچھلے میں آپ کو وہاں کچھ نہ آتا ہوں۔

بہت بہت شکریہ۔

تاکہ راوی روڑ سے گزر رہا تھا۔ جاؤ یہ نے اُس لڑکی سے پوچھا کہاں جائیے گا اب آپ؟

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلچسپ مسکراہٹ پیدا ہوئی تھی جیسا مٹھی۔

جاؤ یہ کو کھلا مسکایا کیا آپ وہاں رہتی ہیں؟

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ — جی ہاں۔ میرا مکان دیکھ لیں۔ آج رات میرا بھرا سنے ضرور آئے گا۔

جاؤ یہ پشاور سے نکلا کہ جسٹس اپنا بھروسہ تھا کہ اُس اس لڑکی کو کچھ نہ اُڑا دے گا جس سے یہ لڑکی اُس سے نہ اُڑا دے گا۔

نے اُس نے اُس عورت سے کہا ماما، مجھے شرمندہ نہ کرو ——— جانو، اپنی بیٹی کے دامن و نیز کا انتظام کرو ——— اُس کو میری اشیر یاد دینا۔“

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا خندہ اور بد معاش ہے جو دروازہ دوسرے ایک ایسی عورت کو کچرستان ہے اور جسے وہ جانتا نہیں۔ دو تہزار دوسرے پکڑا دیتا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا فحش ہے۔ ہر بیٹھے ہزاروں دوسرے دامن کے طور پر رہتا ہے۔ مجھے چونکہ اُس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس لیے میں نے کافی جھانک لینے کے بعد کچلی پتلوان کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں۔

مغل بازار کی اکثر دکانیں اُس کی تقیوں پتلوانی کی دکان ہے، ہزار کی دکان ہے، شربت بیچنے والا ہے، شیشے فروخت کرنے والا ہے، ہندو ہے، غرض کہ اس سرے سے اُس سرے تک جہاں وہ ہزار کی دکان میں بیٹھا تھا، اُس نے ایک لاش آف کیرنیکیشن“ تمام کر رکھی تھی۔ تاکہ اگر پوس چھاپہ مارنے کی غرض سے آئے تو اسے فوراً اطلاع مل جائے۔

دراصل اُس کی دو پیشگوئیاں ہیں ہزار کی دکان کے باطل سامنے تقیوں، بہت بھاری تھا ہوتا تھا۔ ہر روز ہزاروں دوسرے نال کی صورت میں اُسے وصول ہو جاتے تھے۔

وہ خود بڑا نہیں کھیلتا تھا نہ شراب پیتا تھا مگر اُس کی پیشگوئیاں میں شراب ہر وقت مل سکتی تھی۔ اس سے بھی اُس کی آمد کافی تھی۔ شہر کے چھتے بڑے بڑے خندے تھے، ان کی اُس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا، مین ہفتہ دیر تقیوں ان کے مہرے کے مطابق نکلتا ہوا جاتا تھی میرا خیال ہے، اُس نے یہ سلسلہ بطور فعلی اقدام شروع کیا تھا کہ وہ خندے بڑی خطرناک قسم کے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ وہ خندے سب کے سب سلطان تھے، زمانہ تو باقی دروازے کے۔ ہر پختے بکلی پتلوان کے پاس جاتے ہوا ہتھی تختہ وصول کریتے ——— وہ ان کو گنجی نامید نہ دیتا، اس لیے کہ اُس کے پاس دوسرے عام تھا۔

میں نے سنا کہ ایک دن وہ ہزار کی دکان پر جب معمول بیٹھا تھا کہ ایک ہندو بیٹا جو کافی مالدار تھا، اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی پتلوان جی، میرا لڑکا خراب ہو گیا ہے ——— اُس کو خشک کر دیجیے۔

پتلوان نے ٹسک لگا کر اُس سے کہا میرے دوا کے ہیں ——— بہت خریف۔ لوگ مجھے خندہ اور بد معاش کہتے ہیں، لیکن میں نے انھیں اس طرح پالا ہوسا ہے کہ وہ کوئی بڑی حرکت نہ کر سکتے۔ مگر بڑی یہ آپ کا قصور ہے، آپ کے بڑے لڑکے کانیں۔“

جیسے نے ہاتھ جوڑ کر کہا پتلوان جی ——— میں نے بھی اُس کو اسی طرح پالا ہوسا ہے، پر اُس نے اب چوری چوری بہت بڑے کام شروع کر دیے ہیں۔“

بھلی نے اپنا فیصلہ سن کر دیا اُس کی ضاوی کردو۔“

اس واقعے کو میں دد گنسے تھے کہ بکلی پتلوان ایک نوجوان لڑکی کی بہت سی گرفتار ہو گیا، حالانکہ اُس شخص کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کی عمر ستر و ستر دس کے لگ بھگ تھی اور بکلی پتلوان سے اُن پر ہر گز آدمی باہر دلا دلا تھا۔ لڑکی کے والدین ماضی ہو گئے چنانچہ

ضادوی ہو گئی۔

اُس نے شہر کے باہر ایک عالی شان کوٹھی بنائی تھی۔ وہ اس کو وہ جب اس میں سے کر گیا، تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام بھاڑ اور ٹانوس اندر چڑھ گئے ہیں۔

لوگ بہت خوبصورت تھے۔ پہل رات بھی پہلوان نے کسرت کرنا چاہی، مگر نہ کر سکا، اس لیے اس کے دماغ میں اپنی پہلی پیری کا خیال کوٹھیں سے رہا تھا۔ اُس کے دو جوان لوگ تھے جو اس کوٹھی کے ایک کمرے میں سو رہے تھے، یہاں تک کہ وہ اُس نے اپنی پہلی پیری کوٹھیں باہر بھیج دیا تھا، اُس کو اس کا اتفاق علم نہیں تھا کہ اُس کے ہاتھ نے دوسری ٹانوی کر لی ہے۔

بھل پہلوان سوچا تھا کہ اُسے اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی پیری کو مطلع کر دینا چاہیے تھا۔

ساری رات نئی پہلی دوں میں کمرے میں بیٹھ رہا، جس کے لیے وہ چھپ چھپ کر گھبراہٹ میں تھا، پہلوان کی اُٹھ پٹاٹک باتیں سن کر وہی اُس کی کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ ٹانوی کیا ہے، کیا اُسے ہر روز اسی قسم کی باتیں سننا ہوں گی۔

"کیا میں تمہارا ہے؟ اس بڑا کھڑا اور ڈاؤن گا؟"

"تم ہی سسر ہو؟"

"میری کھاؤ گی، یا پھر؟"

"اے سار اٹھو کچھ کھا لیا ہے؟"

"اگر کوٹھی میں تمہارے نام لکھ دیں گا؟"

کتنے لوگ چاہتے تھے کہ ایک منٹ میں ان تمام ہو جائے گا۔

"میرے دو جوان لوگ ہیں، بہت شریف۔ تم ان سے جو کام لینا چاہو سکتی ہو۔ وہ تمہارا علم مانیں گے۔"

دو دن ہر روز اسی قسم کی باتیں سن کر وہی جتنی کچھ چاہتا تھا۔ پہلی پہلوان وہی بدی اُس کی محبت میں غرق ہو گیا۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے نقش و نگار دیکھتا تو اپنی ساری پہلوانی بھول جاتا۔

اُس کی پہلی پیری بد شکل تھی۔ ان سب میں کُما میں کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ ایک عام کھڑائی تھی جو ایک چرچہ بننے کے بعد ہی پہلی ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس کی یہ دوسری پیری بڑی شہر تھی۔ اس بچے پیدا کرنے کے بعد پہلی وہ ثابت و مسلم ہو سکتی تھی۔

پہلی پہلوان کا ایک روبرو دوست تھا۔ اُس کے پاس دو کئی دنوں سے جا رہا تھا۔ اُس نے پہلی کو نہیں دیا یا کہ اب کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں۔ سب خفیہ ہو جائے گا۔

پہلوان خوش تھا۔ وہ کہہ ہاں سے کہہ اُس نے کئی ایک میں تیار کیں۔ اس سفر میں ٹھانی خریدی۔ سونے کے دو ٹرسے بڑے خوشگوار ٹرسے لیے۔ بارہ فیصوں اور بارہ فلوادوں کے لیے بہترین کپڑا قیمت، ایکے بغیر حاصل کیا، اس لیے کہ وہ لوگ جو دکان کے مالک تھے، اس سے خوب تھے اور قیمت لینے سے انکار ہی تھے۔

شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں گیا۔ دیکھا تو وہاں اُس کی دوسری پیری نہیں تھی۔ اُس نے سوچا، شاید یہ نسل خانے میں ہو گی۔ چنانچہ اُس نے اپنا بوجھ میرا مطلب ہے وہ تھا ان غریب و غنک پر دیکھ کر نسل خانے کا

سُج کیا، مگر وہ خالی تھا۔

بھلی پہلوان بڑا متحیر ہوا کہ اُس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اُس کے دماغ میں اُسے گھروا کوئی تجربہ ہاں مذکر سکا اُس نے وید کی دی ہوئی گویاں کھائیں اور پٹنگ پر بچھ گیا کہ اُس کی بیوی آجائے گی، آخر اُسے جانا کہاں ہے؟ وہ گویاں کھا کر جنگ پر بیٹھا، قبیعوں کے کپڑوں کو انگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اُسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا اُٹھ کہ اُس کے کمرے میں کیا ہوا اُس نے اپنے بڑے لڑکے کو سے دکھا تھا۔ اندر سے اُس کی بیوی اور اُس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔

اس نے دستک دی ————— لیکن دودانہ نہ کھلا، چھر بڑے نعرے سے پتلا نا شروع کیا کہ دودانہ کھلو۔ اُس وقت اُس کا خون کھول رہا تھا۔

دودانہ پھر بھی نہ کھلا ————— اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کمرے کے اندر اس کی بیوی اور اُس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کر دیا ہے۔

بھلی پہلوان نے بڑے کمرے میں جا کر کمر کھینچ کر زبان میں ایک دو تھکھا جس کی عبادت اُردو میں کچھ یوں ہو سکتی ہے۔

یہ کوٹھی اب تمھاری ہے ————— میری بیوی کو اب تمھاری بیوی ہے خوش رہو۔

تمھارے پیچھے تھنے لگا ہوا تھا، وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔

یہ دو تھکھ کر اُس نے ساٹھ کے تھکان کے ساتھ ٹانگ دیا۔

(۲۷ مئی ۱۹۵۲ء)

ایک زاہد، ایک فاحشہ

جاوید محمود سے میرا اتنا گہرا دوستا نہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اُس کی مرضی کے خلاف اٹھانے میں سکتا تھا۔ وہ مجھ پر شہ تھا۔ میں اُس پر۔ ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ ساتھ تھوڑے جتے۔

وہ اپنے دوستوں سے خوش نہیں تھا۔ اس لیے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی کُڑائی کرتا اور کتنا سنگ باش، براؤنر جی باش، اور کبھی کسی گھنٹوں خاموش رہتا، جیسے علامہ میں دیکھ رہا ہے میں ان کے ان لمحات سے تنگ اگر جیب زور سے پکڑتا، بھائیو! یہ کیا بے ہودگی ہے؟

وہ ایک دم چوکتا اور صفحت طلب کرتا اور ————— سلامت بھائی معاف کرنا ————— اچھا تو یہ کیا ہوتا؟
وہ اُس وقت بالکل غلط انداز میں ہوتا ————— میں کتنا بھی جاوید دیکھو ————— مجھے تعارف دینا تو فرما معلوم نہیں کی گزرتی
میں کھو جاتا بالکل پسند نہیں ————— مجھے تو ڈر لگتا ہے، ایک دن تم بالکل مر جاؤ گے؟

یہ سن کر جاوید بہت ہنسنا پال کر مزاحمت مشکل ہے سلامت —————
لیکن بہت آہستہ اُس کا غلا میں دیکھنا بڑھتا گیا اور اُس کی خاموشی طویل سکوت میں تبدیل ہو گئی، اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اُس کے ہنرؤں پر ہر وقت کھیلتی رہتی تھی، بالکل چھٹی ہو گئی۔

میں نے ایک دن اُس سے پوچھا، آخر بات کیا ہے ————— تم بغیر پانی ہی گئے ہو ————— جہاں کیا ہے تعین؟ ————— میں
تھکا دوسٹ ہوں ————— خدا کے لیے مجھ سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ۔

جاوید خاموش رہا۔ جب میں نے اُس کو بہت لمبی طعن کی تو اُس نے اپنی زبان کھولی، میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔ اُس وقت تعین ہو کر چھٹا ہو گا، بتا دوں گا۔

وعدے کے مطابق وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے حد خوبصورت، اُس میں
نفسانیت کی جھلک تھی، پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے میں آوارہ گرد تھا۔ لیکن وہ ہاتھ دنگ کے ساتھ تعلیم حاصل
کر رہا تھا۔

میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب میں نے اُس کو سگٹ پیش کیا تو اُس نے مجھ سے کہا تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا
چاہتے تھے؟

میں نے کہا مجھے معلوم نہیں ————— روگ ہے یا سوگ، بہر حال تم نازل حالت میں نہیں ہو ————— تعین کوئی ڈکڑی دہی

تھوٹ ضرور ہے۔

وہ مسکراتا ہے۔ اس لیے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

جنت! — میں بڑھکلا گیا۔ — حاترید کی ہر شکل اشعار ہر س کی ہر گئی۔ — خود ایک غریب لڑکی کے اندر اس کو کس لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے دیا ہو گئی ہے۔ وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شرمیلا اور لڑکچہ تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا، تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک دہستانی و خوشنر ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقہ فلم دیکھا ہے۔ آج وہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے، مگر اس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا، ایسا ملتا تھا کہ نگر کی اٹھاؤ گھر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر میں نے پوچھا، کس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے تھیں؟

اُس نے کوئی بھی نہ محسوس نہ کی، ایک لڑکی ہے زائدہ۔ — ہمارے پردوس میں رہتی ہے، میں اُس سے محبت ہو گئی ہے۔ عرصہ برس کے قریب ہے۔ بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی۔ چہرہ کا چھپے اُس سے کئی ٹانیاں ہر گئی ہیں۔ اُس نے میری محبت قبول کر لی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا تو پھر اس ادا سی کا مطلب کیا ہے جو تو بہ ہر وقت چھانی رہتی ہے۔ اُس نے مسکراتے مسکراتے، تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو۔ — محبت ادا سی کا دوسرا نام ہے۔ ہر وقت ادا سی کھو یا کھو یا سارہتا ہے، اس لیے کہ اُس کے دل و ماغ میں مروت خیال پارہتا ہے۔ میں نے زائدہ سے تعارف کر لیا اور ادا اُس سے کہا کہ تمہارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست و ساتر ہے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟

”میں، میں نے کہہ دیا۔ — اور زائدہ نے بڑا شکیانہ بھرا کر کہا کہ میں تھیں اُس نے لڑکی سے میری دوستی ہے جو میں پسند کرتا ہوں۔ — رو، پہلو کے اپنی بھالی کر دیکھنے۔“

میری سمجھ میں کونہ آیا کہ اُس سے کیا کہوں اُس کے پتے پتے نازک برٹوں پر فقط بھالی جتنا نہیں تھا۔

”میری بات کا جواب دو۔“

میں نے سرسری طور پر کہہ دیا چلیں گے۔ — ضرور چلیں گے۔ — یہ کہاں؟

”اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل شام کو پہلے بجے کسی ہالے سے لائسنس گارڈن آئے گی۔ — آپ اپنے پیارے دوست کو ضرور ساتھ لے جائے گا۔ — اب تم کل تیار رہنا۔ — بلکہ خود ہی پہلے بجے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا، ہم جمنا گلاب کے اس طرف لائیں ہیں تمہارا انتظار کرتے ہوں گے۔“

میں انکار کیسے کرتا، اس لیے کہ مجھے باقرید سے بے مہربان تھا، میں نے وعدہ کر لیا، لیکن مجھے اُس پر کچھ توں آ رہا تھا میں

نے اُس سے اچانک پوچھا لڑکی شریف اور پاک باز ہے نا؟

اور میں گارڈنز میں داخل ہوتے وقت یہ عجیبہ روزگار موٹر دیکھ لی تھی۔ میں نے اس سے کہا: ”آؤ چلو ہائیں۔“

لیکن وہ رضا منہ نہ ہوا، مجھ سے کہنے لگا: ”تم ایسا کرو۔“ بائزرگٹ پر جاؤ۔ ایک ”ٹانگہ آگے گا، جس میں ایک آدمی بیٹھ کر سیاہ برقع پہنے ہوگا تم ”ٹانگے“ والے کو ٹھہرا لینا اور اس سے کہنا: میں بائزید کا دوست سعادت ہوں۔ اس نے مجھے تھامے اور استقبال کے لیے مجھ پر ہے۔“

مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔“

”لا حول ولا۔۔۔ جب تم نام نہاد ہو گے تو اسے چوک کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوگی۔۔۔ خدا ہی برأت کا سوال ہی کیاں پیدا ہوتا ہے۔۔۔ یاد زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہوتی چاہیے، جسے بعد میں یاد کر کے آدمی مظلوم ہو سکے۔۔۔ جب زمانہ سے میری شادی ہو جائے گی تو ہم آج کے اس واقعے کو یاد کر کے خوب ہنس کر سن گے۔۔۔ جاؤ میرے بھائی۔۔۔ وہ اس آپ آتی ہی ہوگی۔“ میں بائزید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادل خواستہ چلا گیا اور گلیٹ سے کچھ دور کھڑا رہ کر اس ”ٹانگے“ کا انتظار کرنے لگا جس میں بائزید اکھل کا رہے رہتے ہیں جو۔

اُدھر سے کھٹے کے بعد ایک ”ٹانگہ“ داخل ہوا جس میں ایک لڑکی کاسے ریشمی برقعے میں دوسرے پچاسشت پرٹا لگیں پیسے اتے بیٹھی تھی۔

میں بھیچہ پتیا، کشتہ، ڈرنا، آگے بڑھا اور ”ٹانگہ“ والے کو روکا۔ اس نے فوراً اپنا ”ٹانگہ“ روک لیا میں نے اس سے کہا: ”سواری کہاں سے آئی ہے؟“

”ٹانگے“ والے نے فوراً سختی سے جواب دیا ”تھیں اس سے کیا مطلب۔۔۔ جاؤ پنا کا کم کرو۔“

برقع پوش لڑکی نے ہمیں سہی توڑ میں ”ٹانگے“ والے کو ٹھاسا ”تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے۔“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی ”آپ نے ”ٹانگہ“ کیوں روکا تھا جناب۔“

میں نے ہنسنے کے جواب دیا ”جاؤید۔۔۔ جاؤید۔۔۔ میں بائزید کا دوست سعادت ہوں۔ آپ کا نام یاد ہے نا۔“

اس نے بڑی تیزی سے جواب دیا ”جی ہاں!۔۔۔ میں آپ کے متعلق اُن سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں۔“

”اس نے مجھ سے کیا تھا کہ اس آپ سے اسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح بیٹھتی آتی ہیں۔۔۔ وہ ادھر

جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے حقے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“

اس نے اپنی نقاب اٹھائی۔ ابھی خاصی شکل صورت تھی مسکرا کر مجھ سے کہنا ”آپ، اگلی نشست پر بیٹھ جائیے۔۔۔ مجھے ایک

ضروری کام ہے۔۔۔ ابھی چند منٹوں میں لوٹ آئیں گے۔ آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس پر نہیں بیٹھا پڑے گا۔“

میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوہر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ”ٹانگہ“ اسی رال کے پاس سے گذرا تو میں نے ”ٹانگے“ والے

سے کہا ”بھائی صاحب یہاں کوئی سگرت والے کی دکان ہو تو ذرا ور کے لیے ٹھہرنا میرے سگرت تم تم گئے ہیں۔“

”فورا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگرت پان والا بیٹھا تھا۔ ”ٹانگے“ والے نے اپنا ”ٹانگہ“ روکا میں اترا، تو زائدہ نے کہا ”آپ کیوں

تکلیف کرتے ہیں۔ یہ تانگے والے آئے گا :

میں نے کہا : اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟ اور اُس ہان گھٹ والے کے پاس پہنچ گیا۔ ایک بڑے گوند ٹلیک کی لی ایک ماچس اور دو پان۔ جب پانچ کے نوٹ سے باقی ہے لے کر ٹٹا تو کوچان میرے پیچے کھڑا تھا۔ اُس نے اپنی پانچ تھمتے کہا : حضور اس عورت سے بڑھ کر ہے گا :

میں بڑا حیران ہوا کیوں ؟

کوچان نے بڑے و لڑکے سے کہا : حاضر ہے۔ اس کا کام ہی یہی ہے کہ شریف اور رفیعان لوگوں کو جانتی رہے۔ میرے تانگے میں اکثر جھٹتی ہے :

یہ سن کر میرے اوصاف خطا ہو گئے۔ میں نے تانگے والے سے خدا کے لیے تم اسے وہیں چھوڑاؤ، جہاں سے لائے ہو کہو دنیا کر میں اُس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ میرا دوست وہاں لاؤس گاؤں میں انتظار کر رہا ہے :

تانگے والا پہلا گیا۔ معلوم نہیں اُس نے زائدہ سے کیا کہہ دیا۔ ایک دو سرتانگہ لیا اور سیدھا لاؤس گاؤں میں پہنچا۔ وہاں جاوید ایک نو بھورت لڑکی سے محو گفتگو ہے۔ بڑی شرمیلی اور لڑکی تھی۔ میں جب پاس آیا تو اُس نے فوراً اپنے دوپٹے سے سر چھپا لیا۔ جاوید نے بڑی خوشی آمیز پیچھے میں پھرتے سے کہا : تم کہاں غارت ہو گئے تھے۔ تمہاری بھابی کب کی آئی یہ بھی ہیں :

بھر میں نہ آیا کیا کہوں۔ سخت بوکھلا گیا۔ اس بوکھلاہٹ میں یہ کہہ گیا تو وہ کوئی تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں ؟

جاوید جیسا مذاق رکھتا ہے۔ بڑھ چلاؤ اور لڑکی بھابی سے باتیں کر رہی ہے۔ یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں :

میں بڑھ گیا اور کوئی سیٹھ کی بات نہ کر سکا۔ اس لیے کہ میرے دل دو ماغ پر وہ لڑکی اور عورت مستطہ ہو گئی تھی جس کے متعلق تانگے والے نے مجھے بڑے غلوں سے بتا دیا تھا کہ ناخوش ہے۔

(۲۸ مئی ۱۹۵۵ء)

شیدا

رشتہ سے کتنے متعلق امرتسر میں پڑھتے تھے کہ وہ چٹان سے بھی گھر لے سکتا ہے۔ اُس میں بجائی پُرتی اور طاقت تھی۔ کوئی دوش کے لٹاؤ سے وہ ایک کڑوا دھنساں، مکھائی دینا تھا۔ لیکن ہر تھر کے سارے ٹھٹھے اُس سے غوث کھاتے ہیں اُس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

فریڈ کا چوک معلوم نہیں فسادات کے بعد اُس کی کیا حالت ہے عجیب و غریب جگہ تھی۔ یہاں شام بھی تھی۔ ٹیٹا کٹر اور گریبی، مری اور جگہ ہے، جی۔ اری اور پتہ حاش، نیک اور پرچہ گار بھی یہاں بیٹے تھے۔ ہر بات کما گئی رہتی تھی۔

جیتے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوئی تھیں۔ یعنی وہ اپنے علاقوں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا جس پر اُس کے نئے دلوں کو اعتراض ہو۔ اُس نے جتنی طرہیاں گزریں، دوسرے غنڈوں کے محلے میں۔

وہ کہا کرتا تھا اپنے غنڈوں کی دوسرے محلے کے غنڈے سے ملا نامزدی کی نشانی ہے۔ — مزاح سے کہہ گئے کہ اُس کی اپنی جگہ پر مارا جائے۔

اور یہ سچ تھا۔ ایک بار پٹرنگوں سے اُس کی ٹھٹھی گئی۔ وہ کئی مرتبہ چوک فریڈ سے گزری۔ — جیٹیں مارتے، نعرے لگاتے جیتے گا گایاں دیتے۔ وہ یہ سب سن رہا تھا، مگر اُس نے اُن سے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رمانا نامزدی کی راہیں میں بیٹھا رہا۔

لیکن وہ گھنٹوں کے بعد وہ پٹرنگوں کے محلے کی طوت دوا نہ بڑا۔ اکیلا — بالکل اکیلا اور بچہ پتر سنگ۔

وہاں جا کر اُس نے ایک تنگ شکلات نعرہ جتہ کر لیا اور پٹرنگوں کو کہہ دیے کام میں مصروف تھے ٹکٹا، اظہار باہر — تھادی

دس پندرہ چترنگ لاشیاں لے کر باہر نکل آئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے، شیدا گئے اور نعرے لگاتے رہے۔ پڑا لاشیاں برساتی گئیں، لیکن اُس نے ایک بھی منبر اپنے پر نہ گھنوی۔ ایسے مینبرے بد فائدہ یا پٹرنگوں کی ٹھٹھی گم ہو گئی۔

آخر اُس نے ایک پٹرنگ سے بڑی جاکہ تھی سے لاشی جھینسی اور تھک آؤں کو مار مار کے اُچھٹا کر دیا۔

دوسرے روز اُسے گرفتار کیا گیا — وہ برسرِ تیرد با شققت کی سزا ہوئی۔ وہ چیل چلا گیا، جیسے وہ اُس کا اپنا گھر ہے۔

اس دوران میں اُس کی ڈیڑھی ماں وٹا فوٹا ملاقات کے لیے آئی رہی۔

وہ شققت کرتا تھا، لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ چلو وٹش جو رہی ہے، صحت ٹھیک رہے گی۔

اُس کی صحت باوجود اس کے کہ کھانا پڑا بیات ہوتا تھا، پھلے سے بترقی اُس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ لیکن وہ بعض اوقات مغموم ہوتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری رات جاگتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر پنجابی کی یہ بولی ہوتی ہے

کی چکیے تیسری باری
مہناں مہناں ہو کے ٹٹ گئی

ایک برس گزریا، مشقت کرتے کرتے — اب اُس کی مسروگی کا اندر شروع ہوا۔ اُس نے مختلف بولیاں گانا شروع کر دیں مجھے ایک قیدی نے بتایا جو اُس کے ساتھ والی کوشٹری میں تھا کہ وہ بولیاں گایا کرتا تھا۔ سہ
بھو جان کے یار گوا ہے
ٹھیکے نے نے تھان دے

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنا گم شدہ محبوب مل جائے گا اگر تو دریا کے ساحل پر کشتیاں پھلانے کا شیکہ لے لے۔

گڈڑی کوٹ جاندی مہناں دسی بریم والی
مٹھلے نے جاندے کو نہاں دی تھوڑکٹ کے

یعنی جی کی محبت کا تھک کر جاتا ہے تو رٹ کے بائے بڑا شور مچانے میں اور ان کی ذور ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔

میں اب اور بولیں گاؤں نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان سب کا جو تیدے کے ہونٹوں پر ہوتی تھیں، ایک ہی قسم کا معلوم ہے۔
اُس قیدی نے مجھ سے کہا ہم گھوم گئے تھے کہ شیدا کسی کے عشق میں گرفتار ہے۔ کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اُسے آہیں بھیجنے لگی
دیکھا — مشقت کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی اور دنیا کی سیر کر رہا ہے — تھوڑے تھوڑے
دفتوں کے بعد ایک بسی آہ بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں گھوس جاتا۔

ڈر جو برس کے بعد جب شیدا خود کشی کا ارادہ کر چکا تھا، اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ زندگی مذکورہ سے گڑے گڑے
اطلاعات کی ایک جہان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے، اُس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کن ہو سکتی ہے، اُس کی تو صرف ماں
ہی ماں تھی جو اُس سے اپنی مٹا کے باٹھ ملنے آ جایا کرتی تھی۔

ملاقات کا انتظام ہوا۔ شیدا سلاخوں کے نیچے کھڑا تھا، اُس کے ساتھ مستعربا ہی، لڑکی کو بلایا گیا۔ شیدے نے سلاخوں
میں سے دیکھا کہ ایک بھر پور پوش محنت آئندہ بھرے کی طرف بڑھ رہی ہے، اُس کو کھلی تک یہ حیرت تھی کہ یہ عورت یا لڑکی کن ہو سکتی ہے۔
سفیدہ واقع تھا جب وہ پاس آئی تو اُس نے نقاب اٹھائی — شیدا چیخا تم — تم کیجئے —۔۔۔۔۔

زیخا جو کہ چڑھوں کی لڑکی تھی، زارہ تھا، رونے لگی، اُس کے حلق میں لفظ ایک ایک گئے تھے، تم سے ملنے آئی ہوں —
لیکن — لیکن مجھے صاف کر دینا، کئی ورے کے بعد آئی ہوں — تم — خدا معلوم — اپنے دل میں میرے متعلق کیا
سوچتے ہو گے :

شیدے نے سلاخوں کے ساتھ سر ہٹا کر کہا نہیں میری جان — میں تمھارے متعلق سوچتا ضرور ہوں — لیکن میں جانتا تھا کہ تم مجھ پر
فرمانے دیتے ہوئے کیا میں واقعی مجبور تھی — لیکن آج مجھے موقع ملا کہ میں آگئی، سچ کہتی ہوں میری دل کسی چیز میں نہیں لگا تھا۔
یہ موقع تھیں کیسے نہ لگا بہ

زینحاک انگھوں سے آنسو دیاں تھے تیرے آبا کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل اُن کا چا بیسواں تھا۔
 شیدا مرحوم سے اپنی ساری نیا صحت قبول کیا، خدا اعلیٰ رحمت بخشے۔ — مجھے یہ خبر سن کر کڑا افسوس ہوا۔ یہ کتنے بڑے
 اُس کی انگھوں میں آنسو گئے تبصر کوڑیا تھا۔ — اس کے سوا اور کوئی ہمارہ نہیں؟

زینحاک نے اپنے سفید برقعے سے آنسو کو پچھنے میں نے بہت مہر کیا ہے۔ شیدہ سے اب اور کتنی دور کرنا پڑے گا۔ — تم
 یہاں سے کب نکلو گے؟

بس چھ بیسویں گئے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بہت پہلے ہی پھوڑا فرس گئے یہاں کے سب فرنگی پرصر ہاں میں
 زینحاک کی آواز میں جست کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا جلدی آؤں یا رہے۔ — مجھے اب تمھاری جوئے میں دوکنے والا کوئی
 نہیں۔ خدا کی قسم اگر کسی نے تمھاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اس سے پٹے لوں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر بھی نصیب
 میں گرفتار ہو جاؤ۔

سفری نے کہا کہ وقت ختم ہو گیا، چنانچہ اُن کی ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ زینحاک کی والدہ کی اپنی والدہ شیدا اور اس میں سرت
 میں آنسو بے جیل کے اندر پھل گیا، جہاں اُس کو شفقت کرنا تھی۔ اُس دن اُس نے اتفاقاً کام کیا کہ میلہ رنگ رہ گئے۔

دو بیسویں کے بعد اُسے دہا کر دیا گیا۔ اس دوران میں زینحاک دوسرے اُس سے ملاقات کرنے آئی تھی۔ اُس نے آخری ملاقات
 میں اُس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس انداز کو سب سے باہر نکلے گا چنانچہ وہ نکلے گا اس وقت پہنے کڑی تھی۔ دونوں فریڈ میں اُنسو ہانے لگے۔

شیدہ نے نے انگریز۔ دونوں اس میں سوا ہوئے اور شہر کی جانب چلے۔ لیکن شیدہ سے کی بھر میں نہیں آتا تھا کہ وہ زینحاک کا
 لے جائے گا۔ زینحاک میں کہاں جانا ہے؟ زینحاک نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں۔ — تم جہاں لے جاؤ گے، وہیں چلی جاؤں گی۔

شیدہ نے کچھ دیر سوچا اور زینحاک سے کہا نہیں۔ — یہ ٹھیک نہیں۔ تم اپنے گھر جاؤ۔ — دنیا مجھے گھڑے کستی ہے لیکن
 میں تمھیں جانو طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ — تم سے باتا دھ شادی کروں گا۔

زینحاک نے پوچھا کب؟

”بس ایک دو بیسویں تک جائیں گے۔ میں اپنی جوئے کی جینک پھر سے قائم کروں۔ اس طرح میں آزاد رہا کھلا ہو
 جائے گا کہ میں تمھارے لیے زور کر کے خرید سکوں۔“

زینحاک بہت متاثر ہوئی تم کتنے اچھے فریڈ سے۔ — بتی در تم کو لگے ہیں اُس گھڑی کے لیے انتظار کروں گی جب میں تمھاری ہو جاؤں گی۔

شیدا اور زینحاک کی ہو گیا تانی۔ تم اب بھی میرا ہو۔ — میں بھی تمھاری ہوں۔ — لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ کام ہر طور طریقے سے ہو۔

میں اُن لوگوں سے نہیں جو دوسروں کی جان کو تھام کر دلاؤں کہ وہ بڑے ہیں۔ — مجھے تم سے بہت ہے جس کا سبب بڑا ثروت ہے کہ تمھارا

خاطر میں نے اسکا کی اور قریب قریب دو برس پہلے میں کاٹے۔ خدا تمھارے کام کے کتنا ہوں، ہر وقت میرے بڑوں پر تمھارا نام تھا؟

زینحاک نے کہا میں نے کبھی نام نہیں پڑا تھا لیکن تمھارے لیے میں نے ایک مہائی سے سبکی اور بلاناغہ پانچوں وقت پڑھتی

رہی۔ — ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ خدا تمھیں ہر وقت سے محفوظ رکھے۔

شیتے نے ٹھہر بیٹھے ہی دوسرا انگڑے لیا اور زچہ سے جدا ہو گیا، تاکہ وہ اپنے گھر جانے اور وہ اپنے۔
 شیتے نے ٹیڑھا ماہ کے اندر اندر ایک ہزار روپے پیدا کر لیے۔ ان سے اُس نے زچہ کے لیے سونے کی چڑیاں اور
 انگریزیاں بنوائیں۔ گئے کے لیے ایک مجلس بھی لیا — اب وہ اور سی طرح میں تھا۔
 ایک دن وہ اپنے گھر میں اُپر بڑھ کر پریشا کھانا کھانے لگا تھا کہ نیچے سے کسی عورت کے میں کہنے جیسی آواز آئی۔ وہ اُسے
 پکار رہی تھی اور ساتھ ساتھ کہتے ہی دے رہی تھی۔
 شیتے نے اُٹھ کر کھڑکیوں سے نیچے جھانکا، تو ایک بڑھیا تھی، جو اُس کے محلے کی نہیں تھی۔ اُس نے گردن اُٹھا کر دُور
 دیکھا اور پوچھا کیا تم ہی شیتے سے ہو۔

”ہاں۔“

”خدا کرے زور ہو اس دُنیا کے غصے پر — تمہاری جوانی ٹوٹے — تو پر ہل کر رہے۔“
 شیتے نے کسی قدر غصے میں بڑھیا سے پوچھا بات کیا ہے؟
 بڑھیا کا بھر اور زیادہ تلخ ہو گیا تو میری جی ٹم پر جان چڑ کے اور تھیں کچھ بتا رہی نہیں۔“
 شیتے نے حیرت سے اُس بڑھیا سے سوال کیا، کون ہے تمہاری جی؟
 ”زلیخا اور کون؟“

”کیوں کیا جہاں اُس کو؟“

بڑھیا روٹنے لگی وہ تم سے ملتی تھی، تم غصے ہو، اس لیے ایک تھانیدار نے زبردستی اُس کے ساتھ زنا کرنا لایا۔
 شیتے کے جوش و جاس ایک محلے کے لیے نائب ہو گئے، مگر سبھی کو اُس نے بڑھیا سے پوچھا کیا نام ہے اُس تھانیدار کا؟
 بڑھیا کا نائب رہی تھی کرم دادو — تم یہاں اُپر پرزے میں بیٹھے ہو، بہت بڑے غصے بنے پھرتے ہو — اگر تم میں
 تھوڑی سی غیرت ہے، تو جاؤ اور اس تھانیدار کا سر گٹھا سے سے کاٹ کے رکھ دو۔“
 شیتے نے کچھ نہ کہا، کھڑکی سے بہت کو اُس نے ٹوٹے ایلٹان سے کھانا کھایا، بیٹ بھر کے، دو گلاس پانی کے پیے
 اور ایک کوٹے میں بھی جوتی کھانڈی لے کر باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد اُس نے زچہ کے گھر وادارے پر دھک دی۔ وہی بڑھیا باہر نکل — شیتے کے ہاتھ میں
 خون آلود کھانڈی تھی۔ اُس نے بڑے پُر سکون بیچوس اُس سے کہا ماں — جو کام تم نے مجھ سے کھاتا کر لیا ہوں —
 زچہ سے میرا سلام کہتا — میں اب چلتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ سیدھا کو تو لایا گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

پر جب میں آرنی سے فائز ہو کر بھول گیا۔ سارے رات کو بہل گیا۔ بڑی صغیر تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اگر تم اس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیش نظر رکھتے تو یہی سمجھتے کہ اس کے ہاتھ قبل دولی کے تھوڑے ہیں تھے۔ اس کی انگلیاں اتنی ہلکی ہیں گی جیسے کسی درخت کے پتے۔ اگر میں دوست اس کے ہاتھ بڑے نرم نازک تھے۔ اس کی انگلیاں، لمبے گھڑے کو چھاتی کی کوئی نالی تصویروں کی عروزلہ لڑی نہیں۔ مگر تلی آبی تھیں۔ میں تو اس پر زبردستی ہو گیا۔ چند صدی کا تالور میں اس کی سرے تعلقات بے تکلفی کی مدد کب بڑھ گئے۔

میاں کب پہنچ کر پہنچ کر گیا۔ ایک نیا پیگ گلاس میں لٹا ہوا سوڈا، کارٹنا خنٹ پی گیا تو ایک اور کو یہ تھوڑے تھوڑے میں نے اس سے کہا گفت صاحب، آپ نے خودی تو شروع کیا تھا۔

اس نے ہاتھ پر تیری جھاکری طوفان کیا۔ ایک اور پیگ اپنے گلاس میں، تیس چار پیگ عروزلہ میں باقی رہ گئے تھے۔ اختلاف یہ تھا کہ اس میں ڈالے اور خود سوکھی جیسے انگریزی میں فیٹ کتے ہیں پی گیا اور کھانسی کھانسی کر اپنا برا حال کر لیا۔ سخت جو تم پر! یعنی یہ کیا سو تو تھا بھر لعنت بھیجے گا۔

اس کی کھانسی اب بند ہو گئی تھی اسدو دھال سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا کچھ نہ چھو میری جان — دوسرے روزات کو کرنا صاحب کے ذاتات جرتی۔ انہوں نے بڑے طنز سے کہا، کو سا جو سوئے مجھے بڑا سمجھتے ہو۔ وہ تم نے ضرب لٹل نہیں گئی — نیا ایک دن اچھا سوئی — میں نے ان سے عرض کی، کرنا صاحب، آپ کا میرا کیا مقابلہ — مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ گفت اس حقیقت سے اب تک داخل ہے کہ قبر میں پاؤں ٹکائے بیٹھا ہے اور حشر فرما رہا ہے۔

میں تو خدا کی قسم جس سے ہر کوئی کہوں گا تو خود کشتی کر لوں گا — اس منہ کے ساتھ جس میں آدھے دانت مصنوعی ہیں، میری آنکھوں پر ٹکا ہوا بیٹھا ہے۔ کرنا ہر کا تو، اپنے گھر میں اس کے کبھی چھو اس کی بات کی تو ایک ایسا گھونسا بھاؤں گا اس کی سوکھی گردن پر کہ ٹکا باہر آجائے گا۔

دو رنگ اس ہڈ سے کھوسٹ سے آرنی — نہایت ہی سیاری آرنی کے تعلق باتیں ہوتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔ دس کی کچھ تھا دھڑل رہا تھا۔ میں نے اپنے جوتوں پر بڑی ذرا نیا لٹم کی مسکراہٹ پیدا کی اور اس سے کہا کہ کرنا صاحب جو آپ کو بڑھا کے، وہ خود بڑھا ہے۔ آپ تو شاء اللہ وہ جان پاؤں ہیں۔

یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت غور میں تھا، آرنی نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے روز غلاں ملاں ہو گا میں شام کو سات بجے ملے گی۔ اس میں تو میری کمر اجازت تھی۔ آدہ تھا، اس سے میں دودی کے بجائے تایت اٹھا ٹیوٹ ہیں کو وہاں پہنچا۔ سات بجے میں ابھی نو مشٹ باقی تھیں۔ میں ٹاٹنگ بال میں داخل ہوا، تو میرے پاؤں وہیں کدو ہیں ہم گئے۔ کرنا شمالی صاحب اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے داخل آئی کاٹا لبا بوسے رہے تھے۔ مجھے ایسا غصہ ہوا کہ میں اس کرنا سے کہیں زیادہ بڑھا کھوٹ ہی گیا ہوں۔

انارکلی

نام اُس کا سلیم تھا، مگر اُس کے بارہ دست اُسے شہزادہ سلیم کہتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ اس کے اندر خالِ خلعت تھے۔ خوبصورت تھا۔ چال وصال سے دلہنوت چمکتی تھی۔

اُس کا باپ بی بی ڈی ایس کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ سو پچھلے تو گی، مگر ٹیسٹ ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ مگر خدمت کھا آغا بی بی دہرے کہ سلیم اچھے سے اچھا پکڑا پینٹا جیب خرچ بھی اُس کو لایا تھا، اس کے کدو اپنے والدین کا اکوڑا لڑکا تھا۔ بست بنی غصے کے رہتا۔ اُس کے پاس کئی شلے، کئی قمیصیں تھیں، جمود بدل بدل کے پینٹا، شترنگم، اڑکھیں کے قریب ہوں گے۔ جب کالج میں تھا تو کئی لڑکیاں اُس پر جان چڑھتی تھیں۔ مگر وہ بے اعتنائی رہتا، آخر اس کی اڑکھ ایک شترنگ لڑکا لڑکی جس کا نام نیسا تھا، لڑکھی سلیم نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا! اُسے قمیصیں تھا کہ وہ اس کی اہتمام حاصل کرے گا۔ نہیں وہ تو یہاں تک جیسا تھا کہ سیما اس کے قدموں پر گر پڑے گی! وہ اس کی مہزون دستکش جو کی کہ اُس نے بہت کن نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سکیم نے سیتا سے پہلی بار محاب جو کہنا آپ کہاں کا آنا بوجھ اٹھائے ہوئی ہیں — لایئے مجھے
وے دیجیے — میرا تانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں گا؟
سیتا نے اپنی بھاری بھر کمکتا یہی فعل میں راجتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں
— بہر حال شکریہ ادا کئے دیتی ہوں۔“

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سہارہ ہینچا۔ چند لمحات کے لیے وہ اپنی خفشت شاد آ رہا اس کے بعد اس نے سیتا سے کہا تلوت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے جہت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا؟ سیتا کا بھراؤ اور زیادہ خشک ہو گیا تلوتوں کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہو گی۔ مگر فی الحال مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں۔ اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟ یہ کہہ کر سیتا چل گئی۔ شہزادہ سلیم ہر انا کی کے خواب دیکھ رہا تھا، آنکھیں جھپکے تارہ گیا، اس نے بہت بڑی مرنے لگست کھائی تھی اس سے قبل اس کی زندگی میں کوئی لڑکیاں آپ کی تھیں، ہر اس کے اہلکارے پر مطلق تھیں۔ مگر یہ سیتا کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غریب صورت ہے جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ حسین ہے، مگر مجھے ٹھکرا دینا۔ یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ میں خود اس سے بد دل ہوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

خضرہ تسلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی آہکیں بنائیں۔ مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں، اس نے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ دیے۔ وہ یہ جرم کر چٹا، مگر اسے یہاں تک پھرتا رہا کہ بہت پسند آئی۔ کوئی ٹرسے سے بڑا مستور بھی اس ناک کا قصور نہیں کر سکتا تھا۔

تسلیم تو اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوا، مگر تقدیر نے اس کی مدد کی، اس کی والدہ نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہ انتخاب آخر تیار ہو گئی تو اس کی سہیلی کی سہیلی کی لڑکی تھی۔

بات یہی ہو گئی، مگر تسلیم نے انکار کر دیا۔ اس پر اس کے والدین بہت ناراض ہوئے۔ گھر میں دس بارہ روز تک جنگاں مچا رہا۔ تسلیم کے والد ذرا سخت طبیعت کے تھے، انھوں نے اس سے کہا دیکھو، تمہیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہو گا۔
تسلیم ہٹ دھرم تھا، جواب میں یہ کہتا آپ کا فیصلہ کوئی باقی کوڑ کا فیصلہ نہیں — پھر میں نے کیا جرم کیا ہے جس کا آپ فیصلہ دینا چاہتے ہیں۔

اس کے والد کے من کر لیں، آگیا تھا راجہ جرم کر گمنا خلع ہو — اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول ملے کر نہ ہو، میں تمہیں باقی کروں گا۔

تسلیم کا ہوش تھوڑا سا ٹھنڈا ہو گیا لیکن ابابا جان میری شاہی مرضی کے مطابق تو مرنی چاہیے؟
”بتاؤ، تمہاری مرضی کیا ہے؟“

”اگر آپ ٹھنڈے دل سے نہیں تو میں عرض کروں۔“

”میرا دل کافی ٹھنڈا ہے — تمہیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہ دو — میں فریاد دیر انتظار نہیں کر سکتا۔“

تسلیم نے ناک ناک کے کہا — مجھے — مجھے — ایک لڑکی سے محبت ہے۔

اس کا باپ گرجا کس لڑکی سے؟

تسلیم تھوڑی دیر بیچکھڑکھڑایا، ایک لڑکی ہے۔

”کون ہے وہ؟ — کیا نام ہے اس کا؟“

”سیتا — میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔“

میاں افتخار الدین کی لڑکی؟

جی ہاں، اس کا نام سیتا افتخار ہے — میرا خیال ہے وہی ہے۔

اس کے والد بے تحاشہ جھنجھنے لگے، خیال کے پیچھے — تمہاری شادی اسی لڑکی سے قرار پائی ہے — کیا وہ تمہیں

پسند کرتی ہے؟

تسلیم ہلکا سا لگا — یہ مسئلہ کیسے ہو گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیوں اس کا باپ محض تو نہیں بول رہا تھا؟

— تسلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اس کے والد کو نہیں ملا تھا، چنانچہ انھوں نے مزید کہ کر پوچھا، تسلیم مجھے بتاؤ کیا سیتا

”تھیں پسند کرتی ہے؟“
”ستیم نے کہا جی نہیں۔“

”تم نے یہ کیسے جانا؟“

”اُس سے — اُس سے ایک بار میں نے مختصر الفاظ میں — محبت کا اظہار کیا — لیکن اُس نے مجھے —“
”تھیں وہ غور اعتنائے سمجھا۔“

جی ہاں — بڑی بے کرمی برتی۔“

ستیم کے والد نے اپنے گئے سر کو تقوشی ویر کے لیے کھولنا اور کٹا تو پھر یہ داشتہ نہیں ہونا چاہیے — میں تمہاری ماں سے
کتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کہ لا کارضا مند نہیں۔“

ستیم ایک دم جذباتی ہو گئی نہیں، ابا جان — ایسا نہ کیجیے گا، شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا میں اُس
کے محبت کرتا ہوں، اور کسی کی محبت اکارت نہیں جاتی — لیکن آپ لوگوں کو — میرا مطلب ہے یہ سنا کو پتہ نہ لے دیکھیے کاش
کا بیاد مجھ سے ہو رہا ہے جس سے وہ بے وفائی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے۔“

اُس کے باپ نے اپنے گئے سر پر ہاتھ پھیلا دیے، اس کے متعلق سوچوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ چلے گئے کہ اُنھیں ایک فزیکل ریسرچر سے دشمنی و مصروفیت کرنا تھی، اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے مسئلے میں۔

شہزادہ ستیم، جب رات کو چٹک پر سونے کے لیے بیٹھا تو اسے انار کی کلیاں ہی کلیاں نظر آئیں، ساری رات وہ ان کے خواب
دیکھتا رہا۔

گھوڑے پر سوار باغ میں آ رہا ہے — شاہانہ لباس پہنے، اس پر تازی سے اُنکر باغ کی ایک روش پر جا رہا ہے

کیا دیکھتا ہے کہ ستانار کے فوٹے کی سب سے اونچی شاخ سے ایک لوزیئر کی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے — اُس کی بھاری بھر کم کتابیں
زمین پر پھری پڑی ہیں — اُنھیں اُلٹی ہوئی ہیں، اور وہ اُنکے آپک کر اُس شاخ تک پہنچا تو پتہ چلنے کی کوشش کر رہی ہے، مگر ہر بار ناکام
رہتی ہے۔

وہ اُس کی طوط بڑھا، انار کی بھانڈی کے پیچھے چھپ کر اُس نے اُس شاخ کو پکڑا اور جھکانا، ستانے وہ کلی توڑ لی جس کے پیوہ
اتنی کوشش کر رہی تھی — لیکن فوراً اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ شاخ کے نیچے کیسے جھک گئی۔

وہ ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ شہزادہ ستیم، اُس کے پاس پہنچ گیا، ستانہ پکڑ لیا، لیکن ستیم نے اپنی کتابیں اُٹھائیں اور بغل
میں داب ہیں، انار کی اپنے جڑوں سے اُس کی اور نہ خشک الفاظ کہہ کر وہاں سے چل گئی آپ کی امداد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں —

بہر حال شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔“

تمام رات وہ اسی قسم کے خواب دیکھتا رہا، ستانہ اس کی بھاری بھر کم کتابیں، انار کی کلیاں اور شادی کی دھوم دھام۔

شادی ہو گئی، شہزادہ ستیم نے اس تقریب پر اپنی انار کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پائی تھی وہ اُس لمحے کے لیے تڑپ رہا تھا

جب ریتا اس کی نقوش میں ہوگی۔ وہ اُس کے انٹری پارے کا کوہِ ٹنگ اُگر دنا شروع کر دے گی۔

سیرم کو دینے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ اُس کا یہ فلسفہ تھا کہ ریت جب دوری ہو تو ریت جیسے ہو جاتی ہے۔ اُس کے افسہِ جسم کے قطروں کے مانند ہوتے ہیں جو مرد کے جذبات کے پتھر لوہے پر چپکتے ہیں جن سے اُسے ایسی راحت، ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔

رات کے دس بجے دو مہن کو جلد عروسی میں داخل کر دیا گیا۔ سیرم کو بھی اجازت لی گئی کہ وہ اُس کمرے میں جا سکا ہے اور کونسل کی پھر چھاننا اور رسم و رسوم صبح ختم ہو گئی تھیں۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔

پتھروں سے، بکی ہوئی مسہری پر دو مہن گھوٹ کاٹھ سے ریشم کی گھڑی سی بی بی تھی۔ شہزادہ سیرم نے خاص اہتمام کر دیا تھا کہ پتھر، انار کی کلیاں ہوں — وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرت بڑھا، اور دو مہن کے پاس بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ رخصتی ہوئی سے کوئی بات نہ کر سکا — اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی نظر میں کتابیں ہوں گی، جن کو وہ اٹھانے نہیں دے گی۔ آخر اُس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہنا سہا —

یہ نام جیتے ہی اُس کی زبان خشک ہو گئی۔ لیکن اُس نے پھر حیاتِ فراہم کا ادنیٰ ہی دو مہن کے چہرے سے گھوٹ اٹھا دیا اور بھونچکا رہ گیا — یہ ریتا نہیں تھی، کوئی اور ہی لڑکی تھی — انار کی ساری کلیاں، اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ مڑھیا گئی ہیں۔

(ایکم جون ۱۹۵۴ء)

کیش

دروازہ کھلتا ہے۔ چوہدری تین مرتبہ فرش پر اپنی لاشی سے آواز پیدا کرتا ہے اور
اعلان کرتا ہے۔

چوہدری۔ بااوب، بالامحظ ہوشیار، فطری، کوہو، شہنشاہِ عالم، منج کے لیے تشریف لارہے ہیں۔
شہنشاہِ عالم کے تدبیروں کی بجا رہی چاب سناٹی دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ
تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ ہیڈ ٹیکر کہاں ہے ؟

چوہدری ایک بست بڑی دوش پر سے سر پوش اٹھاتا ہے ہیڈ ٹیکر چپک کر باہر نکلتا
ہے اور فرشی سلام عرض کرتا ہے۔

ہیڈ ٹیکر۔ غلام سیلوٹ بجاوا ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ دسترخوان پر بابدولت کے کیا کیا چیز حاضر ہے ؟

ہیڈ ٹیکر۔ گوشت پلاؤ۔ مائی پلاؤ۔ مٹر پلاؤ۔ نارنگی پلاؤ۔ پنجنی۔ بریانی۔ زردہ۔ دوغن جوغن۔ تورمر۔ ٹماٹر گوشت۔ بھنئی گوشت۔
مٹر گوشت۔ پائے کا شوربہ۔ قہیر۔ بھیا چکن کٹکس۔ پوٹو کٹکس۔ چکن چا پس۔ مٹن چا پس۔ پوٹو چا پس — اور خدا
جہاں پناہ کو سلامت رکھے — اور ہر کی دال۔

شہنشاہ۔ (غصے میں) اور ہر کی دال بابدولت کو داخل پسند نہیں۔

ہیڈ ٹیکر۔ یور مجسٹی — آج پنج پرتین اشتراکی ولایتوں کے وزیر اعظم مدعو ہیں — اس لیے —

شہنشاہ۔ (خوش ہو کر) بابدولت تمہاری فراست کی داد دیتے ہیں اور خوش ہو کر تمہارا مشیر ہوتوں سے بھر دیے کا حکم جاری کرتے ہیں
ہیڈ ٹیکر۔ میری سائنس رگ جائے گی عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ (مسکرا کر) تم بہت فرہیں ہو — (چھدا بابدولت تمہیں سر کا خطاب عنایت فرماتے ہیں۔

ہیڈ ٹیکر۔ جہاں پناہ کی اس قدر افزائی نے دتے کو آداب بنا دیا۔

شہنشاہ۔ اور کس صفائی سے — پیٹنگ ملی نہ پھٹکڑی

ہیڈ ٹیکر۔ غلام سیلوٹ بجاواتا ہے یور مجسٹی۔

شہنشاہ۔ مطلق ہو فرمادی۔ دودھ کے یہ دو قطرے بھی ٹپکھ کر کے دکھا دیے جائیں گے۔ بار۔ بے خوف و خطر ہو کر بروکر تھیں کس نے ایذا پہنچائی ہے۔ کیا کلک عالم کے بقول سے تمہاری بیوی.....

فریادی۔ نہیں عالی جاہ۔ کلک عالم کے پستول سے میری بیوی ڈک نہیں جوتی۔
شہنشاہ۔ تاریخ نے اس کا مطلب ہے خود کو نہیں دہرایا۔ یہ مٹی ایک بہت بڑی بات ہے۔ بروکر کام کیا کرتے؟
فریادی۔ عالم نہاد کے سامنے اس غلام نے ایک بہت بڑی لائبریری کھول رکھی ہے۔
شہنشاہ۔ کپڑے گھاس پر تم دھوتے ہو؟

فریادی۔ نہیں عالم نہاد۔ یہ فریل کام میں نے دوسروں کے پھوکر رکھا ہے۔

شہنشاہ۔ ایسا ہی جڑا پنا ہے۔ اب تمہیں کیا ڈک پہنچا ہے؟

فریادی۔ جہاں پناہ۔ مجھے بہت لڑاؤ دکھ پہنچا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو میں بیان کر سکوں۔

شہنشاہ۔ ہوں اتھوڑی دیر غور و فکر کرنے کے بعد، فریادی تم کوئی فکر نہ کرو۔ ہم الفاظ کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ یہاں ٹپکرا۔
ہیڈ ٹیکر۔ غلام حاضر ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ جھوڑا ہی عرصہ بھرا ہم نے سر کے خطاب سے تمہیں سرفراز کیا تھا۔

ہیڈ ٹیکر۔ غلام اس قدر انفرادی کا حکم دے گا کہ یہ ادا کر چکا ہے۔

شہنشاہ۔ اب خود کو اس قدر انفرادی کا حق دار ثابت کرو۔ ہم تمہیں وزیر انفاق کا تہ بنجھتے ہیں۔ تاکہ تم اس فریادی کی فریاد کو سب و موزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

ہیڈ ٹیکر۔ غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

شہنشاہ۔ تم مطلق ہو فرمادی؟

فریادی۔ میں باطل مطلق ہوں عالم نہاد۔

شہنشاہ۔ وزیر انفاق جاؤ، فریادی کی فریاد رپورٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ ٹیکر۔ کام کی ادیت کے پیش نظر غلام ایک ماہ کی مہلت کے لیے درخواست کرتا ہے۔

شہنشاہ۔ مہدولت دو ماہ کی مہلت غلط فرماتے ہیں۔

ہیڈ ٹیکر۔ شکریہ!

فریادی۔ شکریہ۔

دوا زہ کشکتا ہے چہ بدتر میں ترش ترش پانی لاطعی سے آواز پیدا کرتا ہے اور

اعلان کرتا ہے۔

چوہدرار۔ بابوب۔ بالماحظہ۔ ہرشیار۔ ————— نظریں گروہو۔ ————— شہنشاہ عالم دومینے کے ہندو لائڈری والے کیس کے متعلق بیڈٹلر
الحدوت وزیر اعظم کی رپورٹ سننے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

شہنشاہ عہدہ کے میں تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ وزیر اعظم۔ لائڈری والے فریادی کی رپورٹ موزوں و مناسب الفاظ میں تیار ہوئی۔

بیڈٹلر۔ دو جینے کی مسلسل محنت و مشقت اور عرق ریزی کے بعد یہ محفل ایک کروڑ الفاظ کی رپورٹ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا
ہے جو بیگ کی آگہی کے لیے حکام کی پرسوں میں چھپ رہی ہے۔

شہنشاہ۔ فریادی۔ ————— وزیر اعظم کے اس کام سے کیا تم مطمئن ہو؟

فریادی۔ قطعی طور پر عالی جاہ۔ ————— کام بڑے سلیقے سے ہو رہا ہے۔

شہنشاہ۔ وزیر اعظم۔ ————— ہم قصورے عرصے کے لیے تمہیں وزیر خلاصہ بنا کر اس رپورٹ کا مختصر ڈھنچنا چاہتے ہیں جو بیگ
کی آگاہی کے لیے پرسوں میں چھپ رہی ہے۔

بیڈٹلر۔ رپورٹ کا اصل خلاصہ یہ ہے عالم پناہ۔ ————— فریادی ایک بہت بڑی لائڈری کا مالک ہے۔ اس لائڈری میں تمام
کپڑے صابن سے نہیں کسی اور ہی چیز سے دھوئے جاتے ہیں جس کا آخر صوف فریادی ہی جانتا ہے۔

فریادی۔ یہ نسخہ سینہ سینہ چلا رہا ہے عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ خوب!

بیڈٹلر۔ ڈرائی کلیننگ کے کام میں بھی فریادی پٹرول استعمال نہیں کرتا۔

فریادی۔ تمام پٹرول کا ساڑا گواٹ ایک مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔

شہنشاہ۔ بہت خوب۔

بیڈٹلر۔ فریادی کی لائڈری میں ساڑھے سات سو دھوئی کام کرتے ہیں۔ ان کو سینہ بہ سینہ پھیننے والے اصول کے مطابق
تختہ لگتی ہے جو منیبلہ بادشاہوں کے عہد میں دھو جیوں کو ملا کرتی تھی۔ فریادی نے چار جینے ہوئے عہدس کیا کر اس

کے یہ تختہ ہانسنے والے اس کا صابن کھا رہے ہیں۔

شہنشاہ۔ فریادی نے یہ کیسے عہدس کیا۔

فریادی۔ ان کا رنگ۔ دن بدن اُجلا ہو رہا تھا جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ درست!

بیڈٹلر۔ انھوں نے صابن کھانے ہی پر اکتفا نہ کی۔ ————— اس غریب کا پٹرول پینا بھی شروع کر دیا۔

شہنشاہ۔ فریادی۔ ————— پٹرول پینے کے متعلق کیسے معلوم ہوا؟

فریادی۔ عالم پناہ۔ ————— ان کی دھواں دھار تقریروں نے غمازی کی۔

فصل اول در بیان کلیات

بیٹہ ٹکڑا۔ اپنے مخمراہ پانے والے ملازمین کی اس بلاغوری اور بلاغوشی سے تنگ آکر فریادی نے ایک اور کپڑے سکھانے کے لیے اُن کو اُس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں شہنشاہیاں پانیا دے سکتی ہیں۔

شہنشاہ۔ (مکرمند ہو کر) والا اشیان شہزادوں نے ان بے گناہوں کو جلاک کر دیا ؟

ہیڈ ٹیکر۔ ایسا ہی جہاں پناہ — شہزادوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ ساڑھے سات سو روپے تنگی انسانوں کی روکیکھپ
جو لاشیں شہزادوں کا نشانہ درست کرنے کے لیے ہر پختہ فراہم کی جاتی ہے۔

شہنشاہ۔ دھویوں اور مثل انسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہیٹلر بطور عالم فناء کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔۔۔ ساڑھے سات سو صدیوں کے راقضیں چنانچہ فریادی کو ان کی ہلاکت کا فہمراؤ کر رہے ہیں۔

فریاد کی غلامی کا قصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کو اس نے تنگ بگڑائی کو اس میدان کی طرف پیچھ دیا جہاں وہ لاشوں کی شہنشاہیاں
نشانہ دور ست کرنی ہیں۔۔۔ لیکن اس کی افسوسناک ہلاکت کے بعد جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ فریاد کی طور پر اس غلام
نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک بہت ہی اچھا موقع فراہم کر دیا ہے۔

شہنشاہ و غور کو نے کے بعد بادشاہت بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ — تاریخ میں اس سے پہلے جہانگیر کا ایسے عرصے سے دو چار بڑا ہوا تھا۔ لیکن ہم محمد جدید کے شہنشاہ ہیں۔ — جہانگیری مدنی زمانہ کوئی حقیقت نہیں کہتا۔ —
عزلی کا مدعا صریحاً غلطی ہے۔

میڈیکلرز کیا حال ااشان شہزادیاں، خاکم بدہمن۔۔۔

مفتی شہادت وزیر اعلیٰ ہمیں ایسا فرض ہوا کہ نے دور۔

چند بار تین مرتبہ فرش پر لاٹھی سے آواز دے کر مارتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چو بدار با ادب با ملاحظہ، پوشیدار — نظری نمود — ملک عالمیک سواد آتی ہے۔

ملکتِ حادیہ کی سواری بال کھوئے ہوئے آتی ہے

حکمر: چہاں نہاد — یہ میں کیا کھڑی رہی ہوں۔

شہنشاہ : تُوں کا بدلہ خون — ہماری ملکیت کے ہر دو دوہارے سے ہی صدا آ رہی ہے۔ خون کا بدلہ خون۔ کہیں نہیں ہانپا جاوے گا۔

ملک کے یہاں پناہ دے

[illegible]

قربادی۔ ساڑھے سات سو دس برس کے گھمسی پناہ، خون کا بدلہ خون نہیں چاہتے۔ فی دھرمی پنج روپے کافی ہیں۔

شہنشاہ نہیں — مابودت اپنے دامی عدل پر چھاگیر کی طرح کوئی وجہ نہیں کہنے دے گے — خون کا بدلہ توں ہے —

خون بہا نہیں۔۔۔ وزیر اعظم والا شانِ شہزادیوں کی تعداد کیا ہے ؟

سید ٹیکر۔ پچھلے برس کے اعداد شمار کے مطابق والا قدرِ شہزادیوں کی تعداد ایک سو بیس تک پہنچی تھی۔
ملکہ۔ ان میں میری کوئی دختر شامل نہیں۔۔۔ پھر صی جاں پناہ سے درخواست کرتی ہوں کہ۔۔۔
شہنشاہ۔ جس اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو ملکہ۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے۔

فریادی۔ جہاں پناہ۔۔۔ اُن سارے سات سو دھویوں میں خون کا سرت ایک قطرہ تھا۔
شہنشاہ۔ نہیں مجھے معلوم ہے ؟

فریادی۔ ان کا سارا خونِ نچر ذکر میں نے سرت ایک ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا تاکہ ان میں زندگی کی دق باقی رہے۔
شہنشاہ۔ ابدیت کی نگاہِ عدل میں خون کے قطرے اور خون کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پیشتر کہ رحمت پسند
قوتیں ہیں گراہ کریں۔ مملکت کے طول و عرض میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم لاٹھری
داے کے کسی کا فیصلہ کرنے میں اپنی مثالی غیر جانبداری برتیں گے۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے۔۔۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ وہاں شانِ شہزادیوں کی دگوں میں ہمارا نیلا خون دھڑکا ہے۔ لیکن اسے دھویوں کے سرخ خون
کا بدلہ دینا ہوگا۔۔۔ ہر چار اکانات اعلان کر دیا جائے کہ ابدیت نفساں سنگین مقدسے کا فیصلہ مرتب کرنے
کے لیے ایک کمیشن بنادیا ہے۔

سید ٹیکر۔ کمیشن ؟

ملکہ۔ کمیشن ؟ ؟

فریادی۔ کمیشن ۶۶۶

شہنشاہ۔ ان۔۔۔ کمیشن۔۔۔ یہ کمیشن ملک کے چار ٹرے دھویوں۔ وہ سب سے بڑے ڈرائی کلیئروں
اور چھ خطاب یافتہ سرکاری لوگوں پر مشتمل ہوگا۔۔۔ سید ٹیکر جس کرم نے پہلے سر کا خطاب منایت فرمایا تھا اور
بعد میں وزیر اعظم بنا دیا تھا۔ اس کمیشن کا صدر ہوگا

سید ٹیکر۔ نظام سے اتنا بڑا کام سرانجام نہیں دیا جاسکے گا اور مجھٹل۔

شہنشاہ۔ ابدیت کو اس کا علم ہے۔۔۔ تمہاری مہارت میں تحقیقاتی کمیشن جو اپنی رپورٹ مرتب کرے گا۔ عوام
کو کافی تشفی کے لیے ابدیت اس کمیشن پر ایک اور کمیشن بنادیں گے تاکہ عدل و انصاف کی نگاہ سے کوئی
گرتہ کرتی کو نہ پوشیدہ نہ رہے۔

سید ٹیکر۔ عاثر پناہ عوام کی تشفی پھر بھی نہیں ہوگی۔۔۔ انکار ان کی سرشت میں داخل ہے۔

شہنشاہ۔ (نکد مند ہو کر) عوام کی تشفی بہت ضروری ہے۔۔۔ سب سے مقدم ہے۔ ہم اُس وقت تک کوئی
فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب تک اس معاملے میں ہماری تشفی نہ ہو کہ عوام ہماری طرف سے بالکل مطمئن ہیں

_____ ہوا شافی کہ کہ چنا پھر ہم سب سے پہلے سب سے ضروری کمیشن بٹھاتے ہیں۔ اس کا نام
شافی کمیشن ہوگا۔

سیڈ بیلر۔ عالم پناہ زندہ باد۔
حکمر۔ عدل و انصاف زندہ باد!!
قریادہی۔ شافی کمیشن برائیدہ باد۔

(۲۱ جون ۱۹۵۴ء)

سیاہ حاشیے

قصائد کے بارے میں منٹو نے جی جی لطیف باتوں کو دیکھا اور سنا انہیں بھی کہیں نہ کر سکتا تھا۔

مُجُتَا

ہجوم نے رنج بدلا اور سرگنگھلام کے بُست پر پل پڑا۔ کاشیاں برسائی گئیں۔ منٹو اور چتر چھپکے گئے۔ ایک منہ پر تار کو لٹایا۔ دوسرے نے بہت پرانے جوتے جمع کیے اور ان کا بار بٹا کر بُست کے گچے میں ڈالنے کے لیے آگے بڑھا۔ اور پطیس آگئی اور گویاں چٹنا شروع ہوئیں۔ جوتوں کا بار پٹانے والا زخمی ہو گیا۔ چٹا پنہر مریم پتی کے سے آسے سرگنگھلام ہسپتال لے گیا۔

حلال اور حلیٰ

”میں نے اس کی شدت پر پتھری رکھی۔ ہوسے ہوسے پھیری اور اس کو حلال کر دیا۔“

”یہ تم نے کیا کیا؟“

”کیوں؟“

”اس کو حلال کیوں کیا؟“

”مزا آتا ہے اس طرح۔“

”مزا آتا ہے کے پچھے، تجھے جھٹکا کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح۔“

اور حلال کرنے والے کی گردن کا جھٹکا ہو گیا۔

رعایت

”میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔“

”چلو اسی کو مان لو۔ کپڑے آتار کر ہانک دو ایک طرف۔“

آرام کی ضرورت

”موانہیں — دیکھو ابھی جان باقی ہے۔“

”رہنے دو بار — میں تھک گیا ہوں۔“

(۲)

منٹو کی کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کا انتخاب

(یہ انتخاب بھی منٹو کا ہے)

جب میرے اوٹھٹو کے وہ بیان منظرِ برہمچا پنے کی بات چیت ہوئی تھی تو
 میں نے کچھ منتخب تخلیقات کی شمولیت پر بھی اندر دیا تھا۔ اس وقت انہوں
 نے جی جی کہانیوں کے نام بتائے تھے، وہی پیش کی جا رہی ہیں۔ سُنئے
 ”نیا قانون“ ”شید ساز“ اور ”سیاہ حاشیے“ کے چند لطیفوں کے۔
 (محمد طفیل)

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اور بیٹھے ہی سو سکتی تھی۔ میریپل کیٹی کا دلدادہ خد صغافی جسے وہ پہلے کے نام سے پکارا کرتی تھی وہی ابھی اس کی بڑیاں پسلیاں چھینچھوڑ کر شراب کے نشے میں چڑا لٹک کر وہاں گیا تھا۔ وہ دلات کو یہاں بھی شہر جاتا مگر اسے نئی دھرم چینی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پرہیز کرتی تھی۔

وہ دو پہلے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بعد اس دلدور سے وصول کیے تھے اس کی خستہ اور تھوک بھری ہری کے نیچے سے اُپر کو اُبھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے آثار چڑھاؤ سے پانڈی کے یہ کتکے کھٹکھٹانے لگتے اور اس کی کھٹکھٹاہٹ اس کے دل کی غیر آسناک دھڑکنوں میں گھل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکڑوں کی پانڈی پھلجھل کر اس کے دل کے فوی میں پناہ دے رہی ہے! اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گری کچھ تو اس برادری کے باعث تھی جس کا ہوا دارو غراپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس پر ہوتا کا تہہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے ہائی لاک کر لیا تھا۔

وہ سالکان کے لیے اور چڑے چکسے راونڈ سے منسلک تھی۔ اس کی باپیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پٹنگ کی اس کانپ کی طرح پھیل جاتی تھیں جو اس میں بیٹک جاتے کے باعث پتکے کا قد سے جدا ہو جاتے۔ دائیں بازو کی نعل میں لٹکی ہوئی کھڑکی اور دست اُچھاڑتا تھا جو بار بار دھڑکنے کے باعث نئی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے جیسے جاتی تھی اس کی کھال کا ایک کڑا وہاں پر کھڑا گیا ہے۔

کمر بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار ٹوکے طرے پٹنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر زبرد کھ کر ایک خارش زدہ کتا سودا تھا اور فینڈ میں کسی غیر مرئی چیز کا زبرد چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال بالک بک بک سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے، خود سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پر تو چھینے والا پھانا ناٹا دو ہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طوط چھوٹے سے دایا گیر پر سناگارا سا مای رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی مڑی ہر مڑی کی مڑی تھی چاؤ ڈنگلی اور لوہے کے پر جو وہ غالباً اپنے جڑے میں لٹکایا کرتی تھی۔ پاس ہی مٹی کی کوٹی کے ساتھ سبز طرے کا بیخود لٹکا رہا تھا جو گھون کو اپنی بیخود کے بالوں میں چھپانے سودا تھا بیخود کچھتا مود کے ٹکڑوں اور لگے ہوئے سنگڑے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسی بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کاک رنگ کے ٹھٹھیا یا پتنگے اُڑ رہے تھے۔

پٹنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت مڑھکنے کے باعث بے حد میل ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہنرنا مشرڈو اس کا چوڑے اپیل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر سنڈھے ہوئے کائے پڑے

کی بہت بُری حالت تھی۔ رنگ اور سوسائیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اُپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں بڑی تھیں۔

ان تصویروں سے خدا بدھ رٹ کہ ایسی دھماکے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گینڈی جی کی نشونگ رنگ تصویر تھی جو تازہ اور سُرخے ہوئے چھوڑوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے آنا کر فریم میں جڑاؤ لائی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیو دیگر پر جو کہ بے حد چمکا ہوا ہاتھ اور تل کی ایک پیرالی دھری تھی جو دینے کو روشنی کرنے کے لیے وہاں دھکی گئی تھی۔ پاس ہی دیوار پر تھا جس کی کوہو ایندھنوں کے باعث ماتھے کے ٹک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار میں دھوپ کی چھوٹی بڑی موڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کو قتی تھی تو دوسرے گینڈی جی کی اس موت سے وہ بے چھٹا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ ٹکا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اُس کی چھاتیاں چونکہ کافی اُبھری ہوئی تھیں، اس لیے وہ جتنے وہ بے چھٹا کر اپنی چولی میں دھکتی، محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پُرنے کے پٹے پٹے کے آقا سے اپنے کچھ روپے چنگ کے ہانے کے لیے اسے اس چھوٹے سے کڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے وہ بے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سونگندھی کو رام لال لال نے بتایا تھا۔ اُس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پُرنے سے آکر سونگندھی پر دھماکا ہوتا ہے تو کہا تھا — اس سالے کو کوڑے بک سے مار بتایا ہے — یہ بڑی انوکھی ماشق معشرتی ہے! — سالالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور ترے ساتھ ترے آٹا تارتا ہے۔ ترے الگ رہے خود سے کچھ لے بھی مرتا ہے — سونگندھی! مجھے کچھ دال میں کا لاکا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے — سات سال سے یہ دھندلا کر رہا ہوں۔ تم چھو کر یوں کی مساری کڑوایاں چانتا ہوں۔“

یہ کہہ کر رام لال لال نے بربہنی شمر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سرہیس چھوڑ کر کا دھندلا کر آٹھا۔ سونگندھی کو بتایا — سال اپنا دھن یوں نہ برباد کر — تیرے ٹک پر سے یہ کپڑے ہی آنا کر کے ہانے گا۔ وہ تیری ماں کو مارا — اس چنگ کے ہانے کے نیچے چھوٹا سا کھٹا کھٹا کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کہ اور جب وہ یاد دلا کر اسے تو اُس سے کہا کہ — تیری جان کی قسم مادھو آج مج سے ایک دھیلے کا ٹنڈ نہیں دیکھا۔ باہر داسے کہ کہ ایک کوپ چلے اور ایک اطلاعوں بلکے تو تنگا، نمبرک سے میرے پیش میں چ ہے دوڑ رہے ہیں — کبھی ۹ بہت آنا کہ وقت آگیا ہے میری جان — اس سال کا انگریس نے شراب بند کر کے بازار باطل مندا کر دیا ہے پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پیٹنے کو مل ہی جاتی ہے۔ جھگڑا تم جب تیرے یہاں بھی راست کی خالی گلی ہوئی تو کہ دیکھتا ہوں اودھو کہ اس سونگندھی میں تو ہی چانتا ہے تیری بھن میں چہا ہاؤں۔“

سونگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سبز پسند تھا۔ ایک بار چلتے اُس سے کہا تھا۔ نیچے سے اسی بپ کے گروں کو ہاتھ کے رکھا کہ آگیا پنا کہ لے گی تو ان کی سٹائی ٹھیک رہے گی۔“

سونگندھی پر شکر ہنس دی۔ سبنا تو سب کو اپنے سر کی گھنٹی ہے۔ اس روپے میں دگ تیری روٹیاں تو ڈاکر چنے جاتے ہیں۔ تو تو بھن

جہ کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی جوتا ہوگا۔ کوئی مڑاٹا کے تو ایسی دلیسی جگہ ہاتھ۔۔۔ اسے ہاں کی بات تھجے سناؤں
 رام اللہ رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے ملے بھاب۔ جب سونے کے تو میں نے تہی بجا دی۔۔۔
 اسے وہ توڑنے لگا۔۔۔ منتھی ہو جانا پتیری ختم اندھا ہوتے ہی اُس کا سارا ٹھکانہ کرکڑا ہو گیا۔۔۔ وہ ڈوٹ گیا ابیں نے کہا،
 پتیلو پر کیوں کرتے ہو میں بچنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا۔۔۔ بھو۔۔۔ دوشی کرو۔۔۔ دوشی کرو۔۔۔
 میں نے کہا، یہ دوشی کیا کرتا۔۔۔ بولا لائٹ۔۔۔ فائٹ!۔۔۔ اس کی پٹنی ہوئی آواز سن کر مجھ سے سنسی ڈر کی، پٹنی میں تو لائٹ نہ
 کروں گی اُ۔۔۔ پھر کہہ کر میں نے اس کی گشت بھری رات کی شکل لی۔۔۔ تڑپ کر ٹھٹھکا اور لائٹ اون کر دی میں نے ٹھٹ
 سے چار روٹھ لی، اور کہا، تنجے شرم نہیں آتی مردو سے آ۔۔۔ وہ پٹنگ سے رات میں اٹھی اور ایک کلاٹ بچھا دی ا۔۔۔ وہ
 پچھلے گھڑنے لگا۔۔۔ پتیری ختم ہوتے سے میں رات کئی، کبھی اندھا ہوا، کبھی اچھا لکھی اچھا، کبھی اندھا ہوا۔۔۔ رام کی کٹھن ہوئی
 تو ٹھکانہ و تلوں میں کروٹا پڑھا گا۔۔۔ سالے نے تیس روپے سے میں بیتے ہوں گے جو میں مفت دے گیا۔۔۔ جتا، تو باطل اندھا
 ہے، اڑے بڑے گڑا دیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لیے!

سو گندھی کو ان تہی بہت سے گڑا تھے جو اُس نے اپنی ایک دو سیلوں کو بتائے میں تھے، رام خود پر وہ یہ گڑس کو بتا لکھی
 "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ بائیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب خیراتیں کرو، ان کی گنت باتیں کرو، اسے خیرات دلا، اس کے
 گندھی کرو، اُس سے کہلو۔۔۔ اگر وہ اچھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کلکی کرتے کرتے وہ چار بال بھی نکل آویٹ، ہزاروں تو خیرات
 اُس کو اتنی ملت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔۔۔ وہ خوش خوش چاہئے گا، اور ہم بھی ہوں گی۔

ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں میں۔۔۔ ہڈی سیلی تو نہ دیتے ہیں اگر ان کا دوا چل جائے!

سو گندھی اتنی چالاک نہیں تھی، اپنی خود کو نکالنا ہو کر تھی، اُس کے گاہک بہت کم تھے، غایت دھندہ بلیاؤں کی تھی، وہی درجہ کہ
 وہ تمام گڑا سے زیادہ تھے اس کے دماغ سے جس کراس کے ریٹ میں آجاتے تھے جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی بکیریں پڑ گئی تھیں
 ان بکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اُسے ایسا لگا تھا کہ اُس کے غماش زود گتے لے پائے پینے سے یہ نشان بنا دیے ہیں۔۔۔ جب
 جب کوئی گتیا بڑی بچہ، غنائی سے اُس کے ہاتھ گتے کے پاس سے گزرتا جاتی تھی تو وہ شرمندگی دود کرنے کے لیے نرمیں پر اپنے پنجوں سے اس
 قسم کے نشان بنا کر آتا تھا۔

سو گندھی دماغ میں زیادہ دہشت تھی، لیکن جو خسی کوئی نرم و نازک بات۔۔۔ کوئی کڑی بول۔۔۔ اس سے کتا تو جھٹ
 پھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی، گوشت اور جوت کے جسمانی ملاپ کا اس کا دماغ بالکل نفعلی جھٹا تھا، مگر اُس کے جسم
 کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہت نرمی طرح نکلتے تھے، وہ تھکی چاہتے تھے۔۔۔ اس تھکی جہاں میں جھنجھوڑ کر۔۔۔ انہیں
 مار کر سلائے پر بٹھو کر دے، ایسا سینڈ جوتھک کر چڑاؤر ہونے کے بعد اُسے اکتھی مزیدار ہوتی ہے۔۔۔ وہ بے وحشی جو مار مار کر بند بند
 ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، اکتھا آندہ ہوتی ہے!۔۔۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں
 ہو! ایسا ہونے اور نہ ہونے کے درمیان میں کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ تم ہو یا میں بہت آواز کی جگہ ملتی ہوئی ہو، تو پر جوں کی بھرا، داییں

پھر بانگیا ہے! بنا ہی کیوں دیں! — برکھدی سے جب آدھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا: تجھے راج نہیں آتی چنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟ — اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ — جی بگڑ گئی — دس روپے اور سیلک تو کتنی ہے ڈھائی دوپے وصال کے، باقی رہے ساڑھے سات روپے، ساڑھے سات — اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا دھن دی ہے جو تودے ہی نہیں سکتی اور میں اس چیز لینے آیا ہوں جو میں نے ہی نہیں سکتا — مجھے عزت چاہیے پر مجھے کیا اس وقت، اس گھڑی مرد چاہیے؟ — مجھے تو عزت ہی بھا جانے کی پر کیا میں مجھے چٹا ہوں — تیرا بیڑا ناظر ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں — بس یہ دس روپے بھی مجھے نہ ڈھائی وصال میں پہلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر کچھ جائیں گے تیرے اور میرے بیچ میں بٹا رہے ہیں — تو مجھی ان کا بھٹاؤں مری ہے اور میں بھی تیرا میں کچھ اور سوچتا ہے میرا اسی کچھ اور — کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری — پونے میں حلالا ہوں — بیٹھیں ایک بار آیا کیوں گا میں چار دن کے لیے — یہ دھندلا چھوڑ — میں تجھے خرچہ دیا کروں گا — کیوں بڑا ہے اس گھوڑی کا — ؟

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر دس قدم زدہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حلالا دینی مجھے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اُس کمرے کی کھجری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھیں تھیں اور منگنی تصویر پر جو سوگندھی نے اپنے سرانے چھوڑا تھا کہیں، بتا دیا ہے مجھے پچاڑی تھیں اور کہا تھا: ”سوگندھی بھلی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا۔“ اور پانی کا گھڑا — دیکھا، کتنا میلا ہے اور یہ — یہ پیٹرے — یہ چندیاں — اُن کتنی بُری باس آتی ہے، — اُٹھ کے باہر صینک اُڑا — اور تو نے اپنے ہاتھوں کا کیا نتیجہ اس کر رکھا ہے — اور — اور — ”تجھے کتنے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں غصے لگ گئے تھے اور سوگندھی کو تو یہ محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حلالا کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چھتیروں، جیلے گھڑے اور منگنی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اُس کو محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اُس کا ایک کمرے جس میں گھروہیں آسکتا ہے لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے بغیر بے ہاتھ تھے کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا: ”یو کچھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کیوں زکام نہ ہو جائے تجھے — شہر میں تیرے واسطے دوا داتا ہوں۔“ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اُس کی ہر بات، ہر قول اور ہر بات تو آتی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اُس نے سوگندھی کو — اسے محسوس ہونے لگا کہ اُسے مادھو کی ضرورت ہے چنا بھاؤ ان دونوں سے سمجھ رہا ہو گیا۔

جیسے میں ایک بار مادھو پڑنے سے آتا تھا اور وہاں جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا: ”دیکھ سوگندھی! اگر تُو نے پھر سے اپنا دھندلا شروع کیا تو بس تیری بیری ٹوٹ جائے گی۔“ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے میاں ٹھہرا لیا تو بٹلیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا — دیکھ اس بیٹے کا خرچ میں تجھے پُرا نہ پہنچتے ہی مٹی اڑا کر دوں گا — ہاں کیا بھلا ہے اس گھوڑی کا۔۔۔۔۔۔“

زادہ سونے بھی تو نہ سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھند باندھ کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا بڑا ہے۔
 نہ سوگندھی نے بھی ادا سونے سے کہا تھا۔ "تو ریز کر کیا کرتا ہے، ایک پٹوٹی کوڑی ہی دی ہے کبھی کوڑے ۱۰ اور زادہ سونے کبھی
 سوگندھی سے پوچھا تھا۔ "تو مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے۔ جب کرم گچھو دیتا ہی نہیں۔" — دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں
 ایک طبع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے۔ — لیکن سوگندھی خوش فہمی جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ طبع کیے ہوئے گھنوں
 کی پر راضی ہو جاتا کرتا ہے۔
 "ختم اس وقت سوگندھی تنگی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا فقر جسے آفت کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اوپر شک رہا تھا۔
 اس کی تھوڑی سی اُس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ — رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آدھ کانوں میں دستک کی
 آواز بھنبھناہٹ ہی کر پھٹی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی۔ — وہ بی بی شراہوں اور دانتوں کی دھڑل
 میں پھنسے ہوئے چھل کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا عذاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کیسا اور لیسدار تھا۔ دھوکے کے قوسے
 اُس نے یہ بد بو اور عذاب صاف کیا اور آنکھیں مٹے گئی۔ پلنگ پر وہ ایسلی تھی۔ چمک کر اُس نے چٹنگ کونچے دیکھا تو اُس کا گتتا
 سٹو کھے ہوئے چپوں پر بند رکھے سو رہا تھا اور بند میں کسی غیر مرئی چیز کا نہ چڑھا رہا تھا اور طولاً پیٹھ کے بالوں میں سر دے سڑا تھا
 دروازے پر دستک ہوئی سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر دھکے مارے پٹا باندھا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اُس
 نے کھلی کی اور دوسروں کا گتتا غلطیوں کر اُس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ "دام لال؟"

دام لال جواہر دستک دیتے دیتے تنک گیا تھا جتنا کہنے لگا۔ "جیسے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹہ)
 سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا۔ کہاں گئی تھی؟ — پھر آزاد واکر اُس نے جوئے سے کہا۔ "آند کوئی ہے تو نہیں؟"
 جب سوگندھی نے کہا۔ "نہیں۔" — تو دام لال کی آواز پھر اُٹھی ہوئی۔ "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ — ابھی مد ہو گئی ہے۔
 کیا نہیں پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھو کر آتا رہے میں دودھ گھٹنے سر کیا کر لڑے تو میں اپنا دھند اگر چکا۔ — اب تو سر نہ کیا دیکھتی
 ہے۔ جیسٹ ہٹ یہ دھوکا آتا کہ وہ پھروں والی ساڑھی پہن، پونڈ وڈر لگا اور پل میرے ساتھ۔ باہر بیٹھیں ایک سیڑھی چلتی رہا
 اٹھا رکھ رہے ہیں۔ — چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی دام کو سر پر بیٹھ گئی اور دام لال آہینے کے سامنے اپنے بالوں میں کھٹکی کرنے لگا۔
 سوگندھی نے چال کی طرف ہاتھ رکھا یا اور دام کی شیش اٹھا کر اُس کا ڈھکن کھولتے ہوئے کہا۔ "دام لال آج میری اچھا نہیں۔"
 دام لال نے کھٹکی دو دو گھر پر دو دو اور سر کر کہا۔ "تو پہلے ہی گھر رہا تو تھا۔"
 سوگندھی نے ماتھے اور پیٹ پر رام ملے ہوئے دام لال کی غلط فہمی ٹھکر کر دی وہ بات نہیں دام لال یا — ایسے ہی میری
 اچھا نہیں۔ — بہت ہی گہنی۔

دام لال کے منہ میں پانی بھرتا رہا۔ تھوڑی سی پی ہو تو لا۔ — تو اب بھی منہ کا مڑا ٹھیک کر میں۔

سوگند میں نے اہم کی پیشکش تیار کر رکھ دی اور کہا۔ بچائی ہوئی تو یہ خیر امر میں جلد ہی کہوں ہوتا۔ — دیکھو رام لال! وہ جو باہر موڑ میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔

رام لال نے جواب دیا۔ نہیں سہی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ بیٹھیں تو ان کی پس اور توڑ کر رکھ لی کہ اگر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔
— تو کچھ دیر سے دھڑکے ہوئے اندر والی کی کھڑک سے چل — سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ساتھ ساتھ دو بچے کا سودا تھا۔ سوگند میں اس حالت میں جبکہ اس کے سر میں شدت کا درد پورا تھا کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اسے وہ بچوں کی سست ضرورت تھی اس کے ساتھ والی کھول میں ایک دوسری عورت بیٹھ گئی جس کا نالہ نہ مڑنے کے لیے آکر گیا تھا۔ اس عورت کو تو ان دکان کی صحبت اپنے وطن جانا تھا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ جی نہیں تھا اس لیے وہ کسی پر سہ کی حالت میں بیٹھ گئی تھی سوگند نے اہل بیٹا اس کو مڑا دیا۔ وہ بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ بیٹھ کر یہ مڑنے سے آزادی ملا ہے جس میں اس سے کچھ دیر کے لیے کڑے بچے کا بندوبست کر دیں گی۔ تاہم پوچھا اسے کہ وہ لانا مڑو دیوں گا بندوبست تو سوگند میں ہی کو کرنا تھا چنانچہ وہ اٹھی اور جلد ہی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھاتی آنکڑیوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر مخرج پونڈرک کا تیار ہو گئی کھڑے کے ٹھنڈے پانی کا آب اور ٹونڈنگ لکیر یا اور رام لال کے ساتھ چلی۔

اہل جاگ چھوٹے ضرور کے بانہ سے بھی کچھ بڑی تھی، بالکل خاموش تھی۔ کیس کے دو بچے جو کھمبوں پر بڑے تھے۔ پہلے کی فہست بہت دھندلے روشنی سے رہے تھے جنک کے باٹ اُن کے پیشوں کو گدگد کر رہا تھا اس انداز میں روشنی میں اہل کے آخری سر سے پر ایک موڑ نظر آ رہی تھی۔

کوئی دھنکی میں اس سیاہ رنگ کی موڑ کا سایہ غور کا سایہ کے پھیلنے پر کی جھپٹوں پر ہی خاموشی۔ — سوگند میں کو یہ سنا کہ اس کے سر کا درد فضا پر ابر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کیبل پر اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برقی اور پیر کی باس سے وہ وہی برقی ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موڑ کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگند کی موڑ کے پاس پہنچ گئی تو وہ رام لال نے ایک عورت پر ہلکا کر دیا۔ بچے وہ گئی۔ — جی رہی چھوڑی ہے تھوڑے ہی دیر میں اسے دھندلے شروع کیے۔ پھر سوگند میں سے مخاطب ہو کر کہا۔ سوگند میں دوسرا، سیٹھ جیہ کاتے ہیں؟

سوگند میں ساڑھی کو ایک کنارہ اپنی آنکھ پر لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ آگے اُٹھ کر سوگند میں کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے پیروں کے پاس روشنی کی ایک مچے کے لیے اسے اس روشنی نے سوگند میں کی غماز کو آنکھوں میں چکا چور کر دیا۔ جس دینے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بج کر گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے آواز آئی۔ پھر ایک دم موڑ کا اچھی بھر پور اور کاروبار چلا دیا۔ ...

سوگند میں کچھ سر پہنے ہوئی تھی کہ موڑ پر مل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا اس آواز کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں جھینسا رہی تھی کیا؟
..... کیا؟

دائم قاتل و قاتل کی آواز سنائی دیتی۔ پسند نہیں کیا تجھے۔ اچھا بھئی میں چلتا ہوں دو گھنٹے صفت جی میں برابر کیجے۔
 یہ اُس کو سونگندھی کی ناگوں میں، اُس کی ہانسی میں، اُس کے ہاتھوں میں، ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ
 موٹر۔ کہاں ہے وہ سیٹر۔ تو آؤ نہ، کامطلب یہ تھا کہ اُس نے مجھے پسند نہیں کیا۔ اُس کی.....
 گاٹی اُس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آکر نکلی گئی۔ وہ آخر کمال کے رتی رتی موٹر تو جا چکی تھی۔ اُس کی دم کی
 سرخ جتنی اُس کے سانسے بازار کے اندھیا رے میں خوب رہی تھی اور سونگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال ہلال انگارہ آؤ نہ ہے
 جو اُس کے سینے میں برے کی طرح اتر چکا جا رہا ہے۔ اُس کے جی میں آئی گند سے پکا رہے۔ اوسیتھ۔ اوسیتھ۔ ذرا
 موٹر دو کتا اپنی۔ بس ایک منٹ کے لیے۔ یہ پروہ سیٹر تھری ہے اُس کی ذات پر بہت دودھ نکل چکا تھا۔

وہ مسلمان بازار میں کھڑی تھی۔ خبروں والی سائٹیں جو۔ خاص خاص ہوتیوں پر پناہ کرتی تھی رات کے چھپے پہر کی ہلکی چٹکی
 ہوا سے لہو رہی تھی یہ سائٹیں اور اُس کی شیشیں سرسبز سائٹ سونگندھی کو کتنی بڑی معلوم ہوتی وہ چاہتی تھی کہ اس سائٹ میں کچھ بیٹھے
 اُٹھو اُسے کیڑا کر سائٹیں ہوں میں اور اگر آؤ نہ، آؤ نہ، گوری تھی۔

گاہوں پر اُس نے پتھر لگا کر اٹھا اور خوں پر مٹھی جب اسے خیال آ کر کہ یہ سنگ لگا اُس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے
 کیا تھا تو خرم کے مارے اُسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دودھ کرنے کے لیے اُس نے کیا کچھ نہ سوچا۔ میں نے اس مرنے کو دکھانے
 کے لیے تصویر ڈی اپنے آپ کو بچا یا تھا یہ تو میری عادت۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے۔ پر۔ پر۔
 یہ رات کے دو بجے اور دائم قاتل و قاتل اور۔ یہ بازار۔ اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک۔ یہ سوچتے
 ہی دشمنی کے دہجے اُس کی تھوڑا سا نک نضا میں ادھر ادھر ترانے لگے اور موٹر کے دھن کی پھر پھر ہٹ اُسے ہوا کے ہر
 جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اُس کے ہاتھ پر بام کا لپ جو سنگ لگانے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا پسینہ آنے کے باعث اُس کے مسامروں
 میں داخل ہونے لگا اور سونگندھی کو پناہ تھا کہ اُس کا لپ تھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اُس کے حلق آؤ نہ تھے کے پاس
 سے گزرا تو اُسے ایسا لگا کہ سردیوں میں کانٹا کاٹ کر اُس کے ہاتھ کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں دودھ ایسے کا دیسا ہوا
 تھا مگر خیالات کی بیڑ جھاڑ دھان کے شور نے اس دودھ کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا سونگندھی نے کئی بار اس دودھ کو اپنے خیالات کے
 نیچے سے نکال کر ٹوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اُس کا الگ الگ دیکھنے لگے۔ اُس کے سر میں دودھ ہو،
 اُس کی ناگوں میں دودھ ہو، اُس کے پیش پیش میں دودھ ہو، اُس کی ہانسی میں دودھ ہو، ایسا اور دودھ کہ وہ صرف دودھ کا خیال
 کرے اور سب کچھ قبول جائے یہ سوچتے سوچتے اُس کے دل میں کچھ ہوتا۔ کیا یہ دودھ تھا؟ ایک لمحے کے لیے
 اس کا دل سڑا اور پھر پھیل گیا۔ کیا تھا؟..... صحت! یہ تو وہی آؤ نہ تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سوتا تھا اور کبھی چھٹی تھی۔

گھر کی طرف سونگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رگ گئے اور وہ شکر کر سوچنے لگی۔ دائم قاتل و قاتل کا خیال ہے کہ اُسے ہر شکل
 ہی پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اُس نے نہ کوئی پسند کیا اُس نے تو یہ کہتا تھا سونگندھی تجھے پسند نہیں کیا! اُسے۔ اُسے۔ صوف میری شکل ہی

پسند نہیں آتی۔۔۔۔۔ نہیں آتی تو کیا جزا ہے۔۔۔۔۔ مجھے کئی تو کئی آدمیوں کی عقل پسند نہیں آتی۔۔۔۔۔ وہ جو اوس کی بات کو اڑا تھا کتنی نرمی مثل نئی اس کی۔۔۔۔۔ کیا میں نے ناگ جوں نہیں چڑھا لی تھی جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے لگتی نہیں آتی تھی؟۔۔۔۔۔ کیا مجھے اوبکلیں آتے آتے نہیں دکھائی تھی؟۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے پر سو گندھی۔۔۔۔۔ تو نے اُسے دھککا دیا نہیں تھا، تو نے لٹکایا نہیں تھا۔۔۔۔۔ اس بوڑھے نے سچوٹے تو میرے منہ پر تھوکا ہے۔۔۔۔۔ ادھر۔۔۔۔۔ اس آدھے اٹھارہ طلبہ ہی کیا ہے؟۔۔۔۔۔ یہی کلاس پیچھو نہ کہ میری پینٹیل کا تڑپ۔۔۔۔۔ ادھر۔۔۔۔۔ یہ منہ اور مسر کی دال۔۔۔۔۔ اسے نام لال تو یہ چھوٹا کلاس سے بڑا کرے تو ہے۔۔۔۔۔ اس لائبریری کی انتہی تعمیرین کر رہا ہے تو۔۔۔۔۔ دس دوپے اور یہ عورت۔۔۔۔۔ بچہ کیا بُری ہے۔۔۔۔۔ سو گندھی، سوچ رہا تھا اور اُس کے کپڑے کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک۔۔۔۔۔ گم میری دھڑلہ تھی۔۔۔۔۔ اُس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی نام لال، دلال، پیرس نے رات کے دو بجے اُسے بے آرام کیا۔۔۔۔۔ لیکن خود ہی دونوں کو بے تصور پاکر وہ سیدھا کواخیال کرتی تھی اُس خیال کے آتے ہی اُس کی آنکھیں اُس کے کالں، اُس کی بائیں، اُس کی ناگیاں، اُس کی کاسب کچھ خراب تھا کہ اُس سیدھے کو کبھی دیکھ پڑے۔۔۔۔۔ اُس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ کچھ ہو چکا ہے ایک بار چہرہ۔۔۔۔۔ صوف ایک بار۔۔۔۔۔ وہ جو بے بوٹ کی طرت بڑھے، بوٹ کے اندر سے ایک ہاتھ جیلری نکلے اور اُس کے چہرے پر روشنی پھینکے، تانہ کی آواز آئے اور وہ۔۔۔۔۔ سو گندھی۔۔۔۔۔ اندھا اندھا رہنے دونوں بیچوں سے اُس کا منہ زبانا شروع کر دے۔۔۔۔۔ روشنی ہائی کی طرح جیسے اور۔۔۔۔۔ اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اُس نے موجودہ پیش کے مطابق بڑھا رکھے تھے اُس سیدھے کے گالوں میں گاڑ دے۔۔۔۔۔ بالوں سے پکڑ کر اُسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑکتے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے۔۔۔۔۔ جب تھک جائے تو وہ شروع کر دے۔

دو تھے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار ٹپے بڑے آنسو بہ رہے تھے۔ ایک اکی سو گندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا تم بدلہ کیوں ہو؟ تمہیں کیا جواب دے کر بچنے کی مراد ہے۔ — آنکھوں سے کیا تم سوال چند لمحات تک؟ ان آنسوؤں میں تیز تر اور اجاب پاکوں پر کانپ رہے تھے سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیکھ کر اس خلا کو گھورتی رہی۔ جدھر سینٹ کی مراد گئی تھی۔

پشتر پشتر میٹر — یہ تو اداؤں کا اس سے آئی ؟ — سو گندمی نے چہ کہا کہ وہ حرد و صو رکھا، لیکن کبھی کو نہ پایا۔ اسے یہ تو اس کا دل پشتر پشترایا تھا، وہ دگنی نمی مرز کا بچہ اور ہے — اُس کا دل — بہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو ! — آج ہی ۔
روک گیا تھا اسے — ابجا بندہ جتنا پیٹا ایک جلورنگ کرد و مرز و مریوں کرتا تھا — بالکل اس لمحے جو بے ریکشا دکھانے پر جو سوائے کے نیچے ایسا جلر آئے رنگ جا تھا تا کہ کئی لگی تارے کہنا کہتا تھے اسے کہ رٹ نکارتا تھا۔

آسمان تاروں سے ڈاٹا ہوا تھا، سو گندمی نے اُس کی طرف دیکھا اور کہا: "کتنے سندر ہیں" — وہ چاہتی تھی کہ وہ سندر میں سے کسی ایک طرف چٹوڑے پر چبٹا اُس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اُس کے دماغ میں گودا دیا یہ تارے سندر ہیں، تو کتنی بھونڈی ہے — کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو بھٹکا لیا ہے؟"

سوگند ہی بد صورت تو نہیں تھی۔ بیخیال آتے ہی وہ تمام مجلس ایک ایک کے کھسک کر اُس کی گھٹوں کے سامنے آئے گئے جہاں پہنچے برسوں کے دوران میں ہوا دیکھتے تھے دیکھ کر کچھ تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ ٹوپ باپ وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام گھڑوں سے آگاہ اپنے باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بد صورت تو نہیں ہو گئی تھی اس کی شکل و صورت ان تمام گھڑوں کا اسی تھی جو اس دن مراد گاندے گاندے گھوڑے دیکھ کر دیکھ کر کہتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگند ہی کے خیال میں ہر سو اس صورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اُسے ایک دودھ لائیں میسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جو اب تھی۔ اس کے اندر استقامت صاحب کچھ بھی نہ دے دقت جب اُس کی نگاہیں اپنی دائوں پر پڑتی تھیں تو وہ خوراک کی گراہی اور دنگ رہاٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش غلط تھی اپنی پانچ برسوں کے دودھ لائیں شلید ہی کوئی آدمی اُس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔ بڑی ہلسا دھاتی، بڑی زخمی دھاتی، کچیلے دھنوں کو سس میں جب وہ گول میچ میں مدد کرتی تھی، ایک فوراً اس کے پاس آ کر تھا۔ سچ اُٹھ کر جب اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر گھنٹی سے پہانگ کر ٹھکانا تو ٹھوڑا غائب پایا۔ سوگند؟ کا ٹوکریہ مٹھ لے آ رہا تھا۔ بے جا بدست پریشان ہوا، چٹھیاں گدھانے کے لیے حیدر آباد سے چلی آ کر تھا اب اُس کے پاس واپس جانے کے لیے نام تھے۔ سوگند ہی نے قوس کھا کر کہے اُس کے دس دوپے واپس رہے دیے تھے۔ — تجھ میں کیا بگائی ہے ؟ سوگند ہی نے یہ سوال پہلوس چہرے سے کہا جو اُس کے سامنے تھی۔ گیس کے انار سے پمپ، دھوبے کے کچے ہارٹ، اندھے کے ٹوکریہ چھوڑ اور عڑک کی اکھڑی ہوئی بھری۔ — ان سب چیزوں کی طرف اُس نے بار بار بار بار دیکھا، پھر سنان کی طرف لگا دیں اُٹھائیں جو اُس کے ٹوکریہ تھا۔ اگر سرگند ہی کو لگتی تھی۔ — نہ لا۔

جواب اُس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بڑی نہیں رہی ہے، پر وہ جانتی تھی کہ کوئی اُس کی ناپائیدار کشتی کوئی — کوئی — اُس وقت کوئی اُس کے کانوں پر اور اُنہوں کو کہہ سکتا تھا کہ، دوسرے سو گندھی اُن کوئی کہتا ہے، تو بڑی ہے، وہ تجھے بڑا کہے۔ وہ اُس کا ہے۔ — نہیں، یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، کسی کا اُن کا کہنا کہ اُن کی ناپائیدار کشتی کوئی تو تھیں، اچھی ہے؟ وہ سوچنے لگی کہ وہ کبوں جانتی ہے کہ اُن کی ناپائیدار کشتی کوئی تو تھیں، اُن کے پاس سے پہلے اُسے اُن کی ناپائیدار کشتی سے ضرورت تھی، محسوس نہ ہوئی تھی، آج کیوں وہ ہے، جہاں چھوڑ کر گئی، ایسی غفلتوں سے۔ کہ نہیں ہے، جیسے اُن پر اپنے اچھے سمونے کا لہجہ، اور اُن کی بڑا جانتی ہے اُس کے خیم کا فائدہ دہہ کیوں ملتی تو نہ رہتا۔ — وہ اب کی کوئی کوئی نہ رہنے کو اپنی گندھیوں میں سے کہنے کی ہے کیوں نہ رہا، جو رہی تھی؟ — اس کا کیا کیوں جانتا تھا کہ اس نے دے گیس کے آئینہ کیجئے کے ساتھ چھٹ جائے اور اُس کے سرور ہے پر اپنے گال ٹکڑے دے۔ — اپنے گرم گرم گال اور اُس کی ساری ساری موی نہیں ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندر سے میپ، اوپر کے کھلبے، فطرتِ پاک کے جو کوہِ قیصر اور ہر وہ طے جو
دلت کے ستارے میں اُس کے اُس پاس تھی بعد وہی کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے اور اُس کے اندر یہ عجیب و غریب آسمان بھی جڑھیلے
دکھائی دیتا ہے۔ سوئی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اُس کی باتیں سمجھتا تھا اور سو گندھی کو بھی ایسا ملتا تھا کہ
وہ تاروں کو ٹھٹھاتا سمجھتا ہے۔ — لیکن اُس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟ — وہ کیوں اپنے اندر اُس قسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو
بادش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔ اُس لاجی چاہتا تھا کہ اُس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے، اور یہ سمجھتا کہ اندر ابل رہا

ہے ان کے رستے باز نکل پائے پیرے کیسے جو — کیسے جو ؟

سوگندھی کے نگاہ پر خند ٹوٹنے والے لال چپکے کے پاس کھڑی تھی — ہوا کے تیز چھوٹے سے اس چپکے کی آنکھیں زان چو اُس کے کھٹے جوئے منہ میں لگی رہتی ہے ، اور کھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں ایک ایک اُس طرف اٹھیں جب وہ موڑ لگتی تھی گنا سے کچھ نظر نہ آتا — اسے کتنی زبردست آواز دہی کر وہ موڑ پھر ایک بار آئے اور — اور —

”آئے — بلا سے — میں اپنی جان کیوں بیٹا کر لٹکاں کروں — گھر چلتے ہیں اور سلام سے لمبی بات کر سوتے ہیں ، ان جگہوں میں رکھا ہی کیا ہے ، محنت کی دوسری ہی تو ہے — چل سوگندھی گھر چلی —“ غدارے پانی کا ایک ٹونڈا لپکا اور دوا تصور اس راہم آ کر سر جا — فٹ کلاس سینڈ آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا — سیدھا ہوا اُس موڑ کی رستہ نشی — یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا برو جھوٹا ہوتا جیسے وہ کسی شخص سے تلاب سے سنا سو کر باہر نکلے ہے جس طرح کچا کرف کے بعد اُس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا گھر کی طرف چلتے گئی تو خیالات کا برو جھوڑ ہونے کے باعث اُس کے قدم کی بار بار کھڑائے ۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹھوس کے ساتھ بچہ نظام واقعہ اُس کے دل میں اٹھا اور دود کی طرح اُس کے ذہن میں ڈھکیا چھایا — قدم پھر پھر چل کر گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ کمرے کا کراہنا اور اس میں مگر پردہ نشی کا چائنا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی شک کی ہے ۔ یہ خیال آیا تو اُس نے یہی فیصلہ کر لیا کہ کسی کے سخت اٹھوٹے عموں کیسے پیچھے کر لے لے بیٹھ کر مری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بالی بالی میں — اُس بیٹھنے — پر تھا کہ ۔۔۔۔ سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بد عادتے مگر سوچا ، عداوت کا دینے سے کیا بنے گا خرا تو بپ تھا کہ وہ سامنے بڑا اور وہ اُس کے جوہر کے ہر فرد سے پڑ اپنی لعنتیں لکھ دیتی — اُس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کھینچ کر لگادی جہر بے چین رہتا — کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے لگی ہو جاتی اور کتنی بھی پیچھے آیا تھا تو وہ — بے دام دے پئے پناے جا اسے — پڑ پڑ کچھ میں ہوں ، کچھ میرے اندر بچھا ہوا ہے وہ تو کیا تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا —“

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آرہے تھے ، اگر اُس سیڑ سے ایک بار — صرف ایک بار — اُس کی ٹانگہ بیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے ، نہیں ، یہ نہیں یہ کرے — یوں اُس سے انتقام لے ، نہیں یوں نہیں ، یوں — لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیڑ سے اُس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اُسے ایک چھوٹی سی کالی دیوہی برف کو دھنسی لیتی تھی — بس صرف ایک چھوٹی سی کالی ، جس اُس کی ناک پر چکر کھنکی کی طرح بیٹھ جاتے اور ہوشیار ہیں ہی رہے ۔

اسی آدھڑ ٹہن میں وہ دوسری منزل پہنچی کھول کے پاس پہنچ گئی چو لہ میں سے چائی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چائی تہہ ہی میں گھٹوم کر رہ گئی ، اٹکٹے سے بین تالا نہیں تھا ، سوگندھی نے کواثر اندر کی طرف دباے تو لگی سی چڑچڑاہٹ پیدا ہوئی ، اندر سے کسی نے کٹھڑی کھولی اور دھواڑ سے نے بجائی لی ، سوگندھی اندر داخل ہو گئی ۔

آدھو تو آنچوں میں مہنا اور دواڑہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا آج تو نے میرا کامان ہی لیا — صبح کی سیر

تحدوتی کے لیے بڑی بھی ہوتی ہے۔ ہر دو ناس عروج میں اٹھ کر کھوٹے جایا کرے گی تو تیری ساری شستی خود مر جائے گی اور وہ تیری
کر کا اور بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو نے دی شکوت کیا کرتی ہے۔ — دکھو یہ کارڈوں تک تو برائی مر گی تو؟
— کیوں؟

سرگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ دھوٹے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب ملو صحبت کیا کرتا تھا تو اس کا
مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سرگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سرگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ وہ
اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کڑک پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے چل کے چلے سے جو نے سر نے میل کا ایک بہت بڑا وجہ بنا
دکھا تھا اور ڈانٹا ڈانٹا کہہ کر اپنی منہجیوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سرگندھی ہنسناک پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی میں آج تیرا انتقام ہی کر رہی تھی۔

مادھو بڑا ہنسیا۔ "انتقام؟" — تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آئے والا ہوں؟

سرگندھی کے بچے ہوئے لب کلمے۔ "اپنی پر ایک پیل مسکراہٹ خودادھوئی" — "کیا نے رات تجھے پہنے میں دیکھا تھا؟"
— "نہی تو کوئی بل نہ تھا، سوچنے نے کہا چلو کہیں باہر گھر آئیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔"

مادھو غوش ہو کر بولا۔ "اے جی، کیا۔۔۔۔۔" — "بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی ہی ہوتی ہیں، اسی نے شبک کہا ہے، دل کو
دل سے راہ ہے۔" — تو نے یہ نہیں دیکھا؟

سرگندھی نے جواب دیا۔ "تیار بیگے کے قریب؟"

مادھو کہہ کر اسے اٹھ کر سرگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ "اور میں نے تجھے دیکھ پٹنے میں رکھا۔۔۔۔۔" — "جیسے تو پتھروں کی"

سائمنی — اور؟ — "انگریزی سائمنی پہنے میرے پاس کھڑی ہے، تیرے ہاتھوں میں — کیا تھا تیرے ہاتھوں میں؟"

— "ہاں تیرے ہاتھوں میں دوپٹوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا، "مادھو، تو پتھرا"

کیوں کرتا ہے؟ — "میرے تھیلے — اور تیرے سر سے دوپٹے کیا وہ ہیں؟" — "سرگندھی تیری جان کی قسم"

فریاد اٹھا اور شکٹ کتا کا اور کارڈ کیا — "کیا مٹاؤی بڑی پریشانی ہے؟" — "بیٹھے جٹائے ایک کیس ہو گیا ہے۔"

اب میں تیس دوپٹے ہوں تو — "ایک شکر کی شکر گرم کر کے چھکارا دے۔" — "تھاک تو نہیں گئی تو؟ یہیٹ جا میں تیرے سر"

دباؤں۔ میری عادت نہ ہوتی تھیں ہر ہی جایا کرتی ہے۔ — "ادھر میری طرف تیرے کیسٹ جا۔"

سرگندھی کیسٹ گئی۔ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ مادھو اس میچ میں جڑاس کا پتہ نہیں تھا۔

مادھو سے کہنے لگی۔ "مادھو، یہ کس ٹوٹے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟" — "بیل ریل کا ڈھیر تو مجھ سے کہہ دے۔" — "میں نہیں"

کیا سربکاس بھی ایسے موقعوں پر پڑیس کے ہاتھ میں تھا وہ بے جا نہیں تو نہ اندہ اپنا ہی ہے۔ — "جان بچی لاکھوں پائے —"

بس بس اب جانے دے، تنکس کچھ زیادہ نہیں ہے۔ — "منہی چاہی جھوڑا وہ مجھے ساری بات سنا۔" — "کیس کا نام سننے"

ہی یہ راول ایک دھک کرنے لگا ہے۔ ————— واپس کب جائے گا تو؟
 مادھو کو سو گندھی کے تختے سے شراب کی باس آئی۔ اُس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا: دوپہر کی گاڑی تھی پس
 جانا پڑیگا۔ ————— اگر شام تک سبسا پکڑ کر سو پچاس دھنٹے تو ۱۰۰۰۰۰ زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس
 میں کام چل جائے گا۔“

”پچاس آپ یہ کہہ کر سو گندھی بڑے آدم سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی۔ جلدیوار پر ہلک دہی تھیں۔
 بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے چٹوڑوں واسطے ہرے کے آگے لکھ کر یہ وہ ڈوڈوں والوں پر اپنے ہاتھ
 رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھیں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تیناں پر دو مٹی مٹی کنڈیاں تھیں۔ تصویر اتار دیتے وقت تصویر اتار دینے کا
 خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اُس کی ہرٹھے تصویر سے باہر نکل نکل کر گلابدار دہی تھی۔ جہاں توڑا توڑے گا۔ جہاں توڑا توڑے گا؟
 یکسرے کی طرف مادھو تنگیوں چھاڑ بھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توڑا توڑا دیتے وقت اسے بہت تکلیف
 محسوس ہوتی۔“

سو گندھی ہلکے لاکھٹیں پرٹھی۔ ————— اس کی ہنسی کچھ ایسی تھی اور نرمل تھی۔ کہ مادھو کے سونیاں تھیں۔ چنگ پر سے
 اٹھ کر وہ سو گندھی کے پاس گیا۔ اُس کی تصویر دیکھ کر اس نے دھندلے سے ہنسی ہے؟
 سو گندھی نے بائیں ہاتھ کی پل تصویر کی طرف اشارہ کیا جو منہ پٹی کے دائرہ فغان کی تھی۔ اُس کی ————— خوش پالٹی
 کے اس دائرہ کی ذرا دیکھ تو اس کا قصور تھا۔ ————— کتنا تھا، ایک دانہ پھر پر جاتی ہو گئی تھی۔ ————— انا نہ! یہ نہ
 اور سرور کی دال: یہ کہہ کر سو گندھی نے فریم کو اس اندر سے کھینچا کہ دو اور میں سے کیل بھی پھینک دیا۔ اٹھا۔
 مادھو کی حیرت ابھی دھند نہ ہوئی تھی کہ سو گندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ وہ منروں سے یہ فریم نیچے زمیں
 پر گر اور کراچ ٹوٹنے کی جھنکار مٹانے دی۔ سو گندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا: ”دانی جھٹک کر اٹھانے آئے گی تو میرے اس
 راجہ کر بھی سے جائے گی۔“

ایک مار جھرا سی لیکلی اور تکیجی ہنسی کی جھوڑ سو گندھی کے ہرٹھوں سے گنا شروع ہوئی جیسے وہ اُن پر چا توڑ پھری
 کی دھار تیز کر رہی ہے۔ ————— مادھو بڑی شکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا۔ ہی ہی ہی
 سو گندھی نے دوسرا فریم بھی فوج لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس مائے کیاں کیا مطلب ہے؟ —————
 جھوٹی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا۔ کیوں مادھو؟

مادھو پھر بڑی شکل سے مسکرایا اور پھر ہنسا۔ ہی ہی ہی“

ایک ہاتھ سے سو گندھی نے پکڑی والے کی تصویر اتار دی اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو
 کا فوٹو بٹھا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سو گندھی کے
 ہاتھ میں تھا۔

زور کا قبضہ لگا کر اس نے "اونٹ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو خنزروں سے جب فریم زمین پر گرے اور کالٹی ٹوٹنے کی آواز آئی تو دھوکہ دیا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی شکل سے اس نے ہنس کر آنا کہا: "جھاکا؟" — مجھے بھی یہ نوٹ پسند نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ سرگندھی ماحول کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ تجھے یہ نوٹ پسند نہیں تھا۔ — پر میں پرچھتو ہوں تجربہ میں ہے ایسی کوئی چیز کسی کو پسند آ سکتی ہے۔ — یہ تیری پوشا لسی تاکہ، یہ تیرا بالوں بھرا تھا، یہ تیرے شرے ہوئے تختے یہ تیرے شرے ہوئے کلن دیر جیسے منتر کی اس۔ یہ تیرے بدن کا میل ہے۔ — تجھے اپنا نوٹ پسند نہیں تھا، اوندہ..... پسند کیوں، ہوتا تیرے عجب جو چھپا رکھے تھے اُس نے..... آجکل زمانہ ہی ایسا ہے جو عجب چھپائے ہوئے ہیں۔ — ماحول مجھے ہٹا گیا، آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں اندر پیدا کر کے کہا۔ دیکھو سرگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندلا شروع کیا ہے۔ اب تجھ سے آخری بار کہنا ہوں....."

سرگندھی نے اس سے آگے ماحول کے بھیجے میں کنا شروع کیا۔ اگر تو نے پھر سے اپنا دھندلا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کس کو اپنے یہاں شمل یا تھیلے سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔ — اس مینے کا خرچ میں تجھے پکڑنا چھینچنے ہی میں مٹی اٹھ کر دوں گا۔ — ہاں کیا جاتا ہے اس کوولی کا؟ ماحول پکڑ گیا۔

سرگندھی نے کنا شروع کیا۔ میں بتاتی ہوں۔ — ہندو دہریہ جاتا ہے اس کوولی کا۔ — اور دس دہریہ بھاتا ہے میرا۔ — اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی دوپے دو لال کے، باقی رجبے سات، سات، رجبے سات سات سات، ان سات سات دھریوں میں میں نے لسی چیز دوپے کا دھری دیا تھا، جہیز میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو لسی چیز لینے آیا تھا جو تو نے ہی نہیں سکتا تھا۔ — تیرا زمانہ آج کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ بس وہ دس دوپے تیرے اندر سرخ پانی میں رکھے تھے۔ سوہم بدوں نے لالی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور تجھے تیری۔ — پہلے تیرے دھریہ میں دس دوپے بچتے تھے، آج پچاس رکھے ہیں تو بھی ان کا بچنا نہیں، ہاں ہے اور میں بھی ان کا بچنا نہیں رہی ہوں۔ — یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا استیفاء کر رکھا ہے؟ یہ کہہ کر سرگندھی نے ماحول کی ٹوپی انگلی سے ایک حرکت اٹا دی۔ یہ حرکت ماحول کو بتا دیا اگر اگر وہی اُس نے بڑے کڑے جیسے میں کہا۔ سرگندھی! —

سرگندھی نے ماحول کی جانب سے ماحول نکال کر شوٹھا اور زمین پر پھینک دیا۔ یہ تیرے، یہ تجھ ہیں۔ — اُن کتنی بُری ہاں آتی ہے، اُن کے باہر پھینک ان کو..... ماحول پکڑا۔ سرگندھی!

سرگندھی نے تیرے میں کہا۔ سرگندھی کے بچے تو یا کس لیے ہے یہاں؟ — تیری اس رنجی ہے اس جگہ تجھے دیکھ دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گھوڑا جو ہے جس میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں..... تجھے، کیئے، گھر پر عجب کا مشتاق ہے؟ میں تیری

دلیل ہوں کیا ؟ ————— جبکہ مسئلے تو اپنے آپ کو سمجھ کر کیا بیٹھا ہے ؟ ————— میں پوچھتی ہوں تو ہے کون ؟ ————— چہرہ لگائے گئے تھے ؟
————— اس وقت تو میرے مکان میں کون کیا آیا ہے ؟ ————— بلاؤں پوچھیں گو ؟ ————— پوچھنے میں جگر پر ٹھیس جڑ نہ ہوں یہاں تو کچھ
بر لگ کر کیس کھڑا کر گئے ہوں ————— “

ماہر مسم گیا۔ بے ہوش تھے میں رو بہ موت اسی قدر کہ سنا "سو گندھی" تھے کیا ہو گیا ہے؟

تیری ماں کا سر — تو بڑا گلیں ہے مجھ سے ایسے سوال کر نہ والا — جہاں گ یہیں سے، ورنہ — سو گندھ کی
 بلند آواز سن کر اس کا خدشہ نہ ہوتا جو سن کر ہوتے چہلپوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑٹا کر اٹھا اور باوجود کی طرف متناہٹ کر بھونکا شروع
 کر دیا۔ کشتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سو گندھ ہی نہ زور سے سننے لگی۔

ماتھو ڈر گیا۔ گری ہوئی لڑپا اُٹھانے کے لیے دوہ جھکا تو سونگھدی کی کرج سنائی دتی۔ خبردار — پڑی پہنچے دے وہیں —
 — توجا تیرے چہرے پہنچتے ہی نہیں اس کوٹھی آؤ، ڈر کر دوں گی۔ تیرے کہہ کر وہ اوندھ سے بنی اور شیشی بستی بیسکی کرکسی پر بیٹھ گئی، اُس
 کے خدش زدہ کتھے نے جھونک جھونک کر ماتھو کو کرکے سے باہر نکال دیا۔ میٹر حیاں آنا کرکے سب گناہی خندہ منہ ملے، آنا سونگھدی
 کہ پاس واپس آیا اور اُس کے قدموں کے پاس میٹر کو کان پھر پڑنے لگا تو سونگھدی چونکی — اُس نے اپنے چاروں طرف ایک
 جواہر کا منظر دیکھا — ایسا سننا آج اُس نے پہلے کب نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے — پیسے مسافروں
 سے لہی ہوئی ریل گاڑی سب اشیائیں پر سا فراتار، کراب، لوہے کے شیشیوں، بالکل کہیں کھڑی ہے۔۔۔۔۔ یہ غلغلہ چراچا ناک
 سرگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اُس نے کافی روز تک اس غلغلہ کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ
 ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونسنے لگی مگر بالکل چھینٹ کر اس کا حساب تھا۔ اور دماغ کو بڑھاتی تھی۔۔۔۔۔ وہ وہ
 خالی چراچا تھا۔

بیت و رنگ۔ وہ بیدار کڑھی پر مٹی رہی۔ سرخ بیکار کے بعد بھی جیب اُس کو اپنا دل پر چالنے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کئے کو گود میں اٹھایا اور ساگراں کے چوڑے پٹنگ پر اُسے پہلو میں لٹا کر سو گئی !
(منشوق کے افسانے میں سے)

منوچل

”نور تجی نے پہلی مرتبہ — چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو مسلمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلے سماں میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اٹھائی چمیز کے ٹیبلر میں رہ جاتا یا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری غبار کی طرح ساری ایئر پر تپتا ہوا تھا۔ جو نظر نہ کر سکا۔
تیباں روشنی تھیں۔ ہر طرف کی ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑک رہے ہوں گے۔ جو رات کے اندھیرے میں
بڑے بڑے دھڑک معلوم ہوتی تھیں، اب تک گئے ہیں اور چنگیزوں کی طرح ٹھنڈا رہے ہیں۔

ترجمہ کے لیے یہ بالکل ایک نیا قریب، ایک نئی کیفیت تھی۔ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے غیث میں قید و بند قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم، قریب قریب نہیں بچے تھے۔ ہوا بے حد بلی ٹھیکل تھی۔ ترجمہ جیسے کی میکانی ہوا کا عادی تھا جس کے سارے دھڑ کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ محسوس کرتا تھا۔ رات بھراس کو مار پٹایا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرت کی ہوا میں اس کے جسم کا وہاں وہاں، ترو تار لگی جو اس کو خوش ہر دم تھا جب وہ اُپر لڑا تھا تو اس کا دل دیرِ باغِ خلعت مضطرب اور بچوان زدہ تھا۔ ایک بار سے گھنٹے بھر میں وہ اضطراب اور بچوان ہراس کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ کسی حد تک ٹھنڈ ہو گیا تھا اور اب صاف طور پر سوجھ سکتا تھا۔

کراپال کو دوا دیاں کاسا دا خاندان — محضر میں تھا۔ چونکہ مسلمانوں کا مذہب یہ تھا کہ مسلمانوں کو آگ لگسکی تھی۔ کئی جانیں تکلف ہر چک تھیں۔ تر لہجی ان سب کو لے آیا ہوتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ فریاد نہ کر گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا غائب اڑتا بیس گھنٹوں کا — اور تر لہجی لاڈا منسوب تھا اس پاس سب مسلمان تھے، بڑے غورناک مسلمان تھے۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ پھریں آرہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم دھارہ ہے ہیں۔ کوئی بھی بات تھ — مسلمان ہاتھ بٹری آسانی سے نرم دھار کہ کراپال کو لگائی پکڑو حکومت کے کفر میں کی طرف سے جاسکتا تھا۔

کراہاں کی ماں اندھ تھی۔ باپ بے مغز۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیوالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تئذ تازہ لیے برے ٹھیکے کی دکان بھال کرنا تھی۔

قرآن مجید کا کربال کے جہانی ترنگوں پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس جہے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندہی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیتا تھا اور مصائب انقلاوں میں کس دیر لگتا۔ مزاج میں یہ ٹھیکہ دیکھے ابھی رہ جندو۔ ہم ایک بہت ہی اذکار شہیدانہ سب سے پہلے نقوش ہی میں چھپا تھا۔ بشرط کہ غماخوہ انسانوں کی صورتوں میں اسے دوبارہ نقوش میں پیش کیا جاوے۔

دند سے گندہ ہے میں تھلا کرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہاں سے اُٹھ جانا اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چکر کم ہے لیکن عیبت کے دنوں میں آدمی کسی دیکسی طرح گزار کر لیا کرتا ہے۔ مگر وہ نہلا۔ اس کا تالیاں ایک پھر تین کو صرف دہی تھی تو کچھوں میں مشکوایا تیار، تم غلامی وہ ٹھکر کرتے ہو۔ میں نے یہاں ایسے کئی خفا دیو کچے ہیں یہ نہ تسمیرا اور نہیں۔ جیسے ہے۔ بچے تھیں یہاں آنے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔ بارہ برس ہے؟

جانے ترخیں ہمیں کو کیا گھستا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں ایسا شعر ہے۔ اگر خفا دریا بھی ہوں تو ان کا ترخو ترخو زائل ہو جاتا ہے، جیسے اس کے پاس چھوڑ کر ہے۔ یاد وہ کہا نہیں کہ کوئی ایسا قلم ہے جس پر کوئی انت نہیں سکتی۔ مگر تو چکر کم کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ۔ قلم بالکل محفوظ نہیں وہ تو چکر کم کے خفا میں میں ہی پڑے سننے کے لیے تیار تھا کہ کراپال کو روک اس کے ان باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کراپال کوہ کے مظلوم باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ رہتا تھا کہ کراپال کوہ پہنچ جاتی تو ترخوں کے لیے اچھا تھا۔ وہاں وہ لوہا لوہیں اس کا جانی ترخیں بھی مارا جاتا تھا وہ بھی اچھا تھا کہ ترخوں کے لیے میدان صاف ہو جاتا خاص طور پر ترخیں اس کے دستوں ایک روٹا ہی نہیں رست بڑا کھٹکھٹا تھا، چنا ترخہ جب کبھی کراپال کوہ سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے ترخہ ٹھکر کی بجائے ٹھکر ٹھکر مٹھ کر لیتا۔

صبح کی ہوا صبر سے دھیرے دھیرے تھی۔ ترخوں کا کھسوں سے بے نیاز مرضی بڑی خوشگوار ٹھنڈی محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹھکر رہے تھے۔ کراپال کوہ تھی اسی کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہاں تو جتنے کھٹکھٹے ٹھکر کی ہیں تھی۔ مگر بہت ہی نرم و نازک ٹھکر تھی اس نے دیہات میں وہ خوش دانی تھی۔ وہاں کی کئی گویاں مردوں کی تھیں نہیں مگر اس میں وہ سختی وہ کٹھاؤ۔ وہ مردانہ نہیں تھا، جو دیہات کی عام سکھ لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے بھی ناقص ہیں چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند لوتھیں پڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لوگوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گرا خفا ٹھکر سے ٹھکر کی طرح، اور بدن چمکا تھا جس طرح سرخ و نرنگ پٹری سے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد ترسلی تھی۔

ترخوں اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پائری سے نکل کر جب وہ ٹھکر کی ہائی اسکول میں گیا تو اس پھر وہیں کا جو کہ وہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ وہ قندلور تہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کراپال کوہ کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افرا تفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد وہاں سے ختم ہونے۔ کالج کا زمانہ بہت نیچے رہ گیا تھا۔ اڈوہانی پھر تھکے ٹھکے اور ٹھکر کی عمارت میں قندلور میں اس کا فاسل تھا اور اسے فاسل ترخوں کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے ترخا تھا۔ برا، سنگاپور، اچانک کانگ۔ پھر بڑی جہاں وہ چار برس سے تھیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کا سماں کی ٹھکر کی تھی جو بڑی نہیں تھی۔ خاکستری رنگ کے تنہ کی چھت میں ہزار ہا دیتے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ٹھکر کی تھی۔

کربال کو کاسر چنے سوچتے ہو تو بڑیل کے شعلے سر چنے لگا اس پر وہی لڑکی کے بارے میں جو ٹوٹاؤنی چیزیں میں بتی تھی اس سے تو اچھے لوگوں کے گڑے گڑے عشق ہو کر اٹھا ایسا عشق جو اس نے اپنی ہینتیں برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس نے ان کو ادا کی چیز میں اپنے ایک سیانہ دوست کی معرفت دوسرے کے پریشانی اسی دن اس کی ڈیڑھ گھنٹہ موقوف سے ہوئی حوصلہ غمزدہ کیے پر اسے خود کار پر روانہ معلوم ہوئی تھی۔ کئے ہوئے شہر کے ہاں اس کے سر پر پریشان تھے۔ بعد پریشان ہر نواز پاپ اسٹاک میں بھی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہیں ٹکڑے کے چٹائی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ ادا کیا سفید چتر پہنے تھی۔ جس کے کئے گریبان سے اس کی نعلی بڑی بڑی چھٹیاں چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بائیں چکر نعلی نہیں میں میں ادا سے آئی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلوں سے ہاں کشاکش آئی ہے اور اس کی نعلی میں ہاں ابھی ابھی چکر میں ہیں۔

جہت تھرتھرتے نہیں تھے۔ مگر کمرے غنیمت رنگ کی لہر ایک کچھ اس انداز سے لٹکی گئی تھی کہ وہ مرنے اور بھینے کے کڑک کڑکے صویر تھے۔
ترقیوں کا غنیمت اس کے غنیمت کے باطن سامنے تمام پہنچا ہوا ایک ٹنگ لکی تھی۔ بہت ہی ٹنگ۔ جب ترقیوں اپنے غنیمت میں داخل ہوتے
کے لئے آگے بڑھا تو موزیل بڑھ کر رنگ کھڑا ہوا۔ چنے تھی۔ ترقیوں کی کادیں کڑک کڑک گئیں۔ موزیل نے اپنے پریشانی ہاؤں کی جھنجھوں سے بڑی
بڑی آنکھوں سے ترقیوں کی طرف دیکھا اور ہنسی۔ ترقیوں ہلکوا گئیں۔ جیسٹ جانی نکال کر وہ جلدی سے دھڑا دے کی جانب بڑھا موزیل کی
ایک کھڑا ہوا سینٹ سے چلنے فرش پر پھیل ادا اس کے آؤ آ رہی۔

جبہ تو چونکہ مسند و منزل اس کے اُپر تھی کہ اس طرح کہ اس کا سپر چار پر چڑھ گیا تھا اس کی زندگی - بڑی گڑبگڑ مچ گئی اس کا بھرپور شعور متنبہ ہوا۔ جبہ تو چونکہ اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ دیکھا کہ ہاتھ اس طرح منزل پر لپکتے ہیں کہ وہاں کی طرح اس کے ساتھ ہی بدلی ہو گیا ہے۔

[illegible]

تو چون کہ خیال تھا کہ موزوں سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے ٹھنک لی گئی۔ لیکن ایک بات بھی کہ وہ بہت غور و خوض سے دوچار رہی کہ کبھی خاطر میں نہیں آتی تھی۔ اس سے کہ نہ تھی۔ اس سے کچھ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ سالوں اس کے ساتھ جو عرصہ رہا تھا۔ لیکن جب وہ بائیس اور چونتیس سے کچھ آگے بڑھتا تھا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی کچھ اس طور پر کہ گھر گئی کہ اس کے ساتھ وہ اس کی دہشتی اور موٹھوں میں جکڑ کاٹتے رہ جاتے۔

ترویج کے پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوتی تھی۔ لاکھوں میں برابر میں، سنگاپور میں، وہ لوگ ایسا کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے دو چہرہ لگاتار میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جیسے پہنچے کسی وہ ایک مناسبت اور طریقہ قسم کی سہولتوں کی کے عشق میں کوڑے کوڑے دھنسنے پائے گا۔ وہ اس کے لیے کبھی ٹیپ ٹیپ نہیں کہے، اختلافات اور بے انتقامی ترقی تھی اس کے کھنہ پر نور کا کج بن کر سینا بنانے پر نیا اور جزائی فی حربہ واپسی سیٹ پر بیٹھے تو ایسا اور کچھ اس حد اور کثرت کر دیتا کہ اس کا خاصا سالن آؤں۔ اسے ہندو لائق و ترقی چاہت ہے جیسے بغیر اس کے پہلو میں جا رہی تھی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترجمان نے خاص طور پر متذکرہ کے لیے پُر تکلف کھانے حکوئے ہیں۔ غلام کو کوئی اپنا پڑا کا دوست انکھ آئی ہے اور وہ ان کا چہرہ انکھ کے پاس جھانک رہا ہے اور ترجمان کے ہنسنے پر انکھوں میں دھندلک رہی ہے۔

تو میں بعض اوقات جھٹا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر سمجھ کر اپنے ان چہانے دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ مل جاتی تھی اور کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی مسجد کا مکان کسی بیٹے کی خرابی یا جس کے متعلق ترقی کی کوئی بھی طرح معلوم تھا کہ نور علی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی: "تم سکھو جو —۔ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔"

ترقی میں مل جاتا اور پوچھتا کہ میں بھی نازک باتیں — تمہارے پڑھانے والوں کی پڑ

موزیل دونوں ہاتھ پتھر چڑھ چکے کہوں پر لٹکا کر اپنی کڑی انگلیں پڑی کر دیتی ہو کہتی تیرے تم مجھے ان کے کہنے کیا دیتے ہو

— انا وہ میرے یار ہیں — اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم بڑے ہو تو جانتے رہو۔

ترقی چونکہ دیکھنا نہ داریں پوچھتا: اس طرح تمہاری میری کس طرح نہجے گی؟

موزیل کا لطف نہ تھا کہ "تم کچھ سکھو — ایڈیٹ۔ تم سے کہہ کہ میرے ساتھ نہ جاؤ۔ اگر نہ جانا کہ

ہے تو جانا پنے وطن میں کسی سکھنے سے شادی کرو — میرے ساتھ تو اس طرح چلے گا۔"

۱۰۔ ترقی میں نرم ہو جاتا۔ وہ مل تھیل اس کی زبردست مدد دیتی رہی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہشمند تھا۔ اس میں

کوئی شک نہیں کہ موزیل کی وجہ سے اس کی ترقیوں بہتر تھیں۔ موزیل کوئی سولہ برس کا تھا۔ موزیل کے سامنے بن کر حقیقت میں نہیں لگا

خفیہ جو ناچ رہا تھا۔ گردن سے بھر کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا حشر کر دیا تھا۔

عام طور پر ترقیوں اور شک کا وہ عمل انتہام ہوتا ہے مگر ترقیوں کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس لیے اپنے دل کی بات

سے نکھیں بچتی تھیں اور کئی کانوں میں وہی ٹھوس فی تھی۔ اس کو موزیل پسند تھی — پسندی نہیں جیسا کہ وہ اپنے دوستوں سے کہا

کہ تھا۔ گڈے گڈے اس کے حلق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا بقیہ حشر ہوتی رہے گا ہے

وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جس نے اور نقد ختم ہو۔

وہ اس تک وہ اس طرح خور جو تاپا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ موزیل بڑھا میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں بیٹھ

کر پوچھا: "موزیل — کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موزیل اس کے بازوؤں سے ہٹا دو گئی اور کسی پریش کر اپنے فرار کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے رنج ہوئی ہوئی دیکھیں

اٹھائیں اور گھٹی پلکیں جھپکے کہ ان میں سے کبھی سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترقیوں نے ایسا محسوس کیا کہ موزیل کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دیکھی ہوئی پنکھاریاں دھک دی ہیں۔ اس کے تھ بدن میں ناگ

لگ گئی — "موزیل! تم ہمیشہ میرا مذاق آڑتی ہو — یہ میرا مذاق نہیں میری محبت کا مذاق ہے۔"

موزیل اٹھی اور اس نے اپنے بھروسے توڑے ہوئے ہاتھوں کو ایک دھڑبھٹکا دیا۔ "تم شوکر اداوارا پھرنے کے بل گئے مجھ پر

دو — تو میں شرمندہ لگتی ہوں کہ لوٹے نہیں آ کر لایاں گے۔ تم خود صورت ہو۔"

ترقیوں کے کیسوں میں مزید پنکھاریاں ڈالیں۔ اس نے آگے بڑھ کر نور سے موزیل کو اپنی طرف گھیسٹا اور اس کے خیالی ہونٹوں

میں اپنے کو بچھو بھرے ہونٹ پچھو ست کر دیے۔

موزیل نے ایک دم تپوں پیوں کی اداس کی گرت سے علیحدہ ہو گئی۔ میں بھی اپنے ماتحت پر ہش کر چکی ہوں۔ تم تخلیق نہ کرو۔

ترجمہ چلا۔ موزیل۔

موزیل دیر غمی ایک سے غما سا رنگ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر وہ بڑی ٹھٹھی مپ اسٹیک پڑا۔ میں اٹھی تھیں۔ تمہاری قسم۔ تم اپنی دھڑکیوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ ان کے بال بے باک ہیں کہ میرا نوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔ بس تھوڑا سا پڑول لگانے کی ضرورت ہوگی۔

ترجمہ غصے کی اس آواز سے بچ چکا تھا جہاں وہ باطل شملہ ہو گیا تھا۔ آرام سے سوئے ہوئے تھا۔ موزیل بھی اٹھی اور اس نے ترجمہ کی دھڑکی کو کھینچ کر دیکھا۔ اس میں جو نہیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے ماتحت سے دیا لیں۔ ترجمہ خوبصورت تھا جب اس کے دھڑکی ہو چکی تھیں۔ اکی تو دھڑکی لوگ اس کے کھینچے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر ہنسا لگا رہے تھے کہ وہ کوئی کم تر خوبصورت لوگ ہے، مگر ہاں کے اس انار نے اب اس کے تمام اندوخال بھاڑوں کے اندر اندر چھپا لیے تھے۔ اب اس کا احساس تھا، مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جس سے اس کے مذہب کی ظاہری تشکیل مرقی تھی۔

جب ڈاکٹر ایسی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موزیل سے پوچھا: یہ تم کیا کر رہی ہو؟

وہ اتوار میں نہیں رہے وہ سکوائے تھوڑے بال بہت ملائم ہیں۔ میرا نا اذہ خلع تھا کہ ان سے میرا نوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا۔ ترجمہ۔ تم میرے دل میں انہیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسط کلاس بھرا بناؤں گی؟ اب ترجمہ کی ڈاکٹر میں چنگاریاں پھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موزیل سے مخاطب ہوا۔ میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔ تم کیوں اڑاتی ہو۔ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں یہ بھی بدداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کہتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ کیا نہیں اس کا پتہ نہیں؟ موزیل نے ترجمہ کی ڈاکٹر سے کیلنا بند کر دیا۔ مجھے معلوم ہے۔

”پھر“ ترجمہ نے اپنی ڈاکٹر کے بال بڑی صفائی سے ترکیب اور موزیل کے ماتحت سے نہیں نکال لیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بلو اس نہیں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

”مجھے معلوم ہے۔“ ہاں کو ایک خفیہ سا چٹکاوت کر وہ اٹھی اور دیوار سے ٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔

ترجمہ بھل پڑا۔ سچ؟

موزیل کے منہ میں ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لٹکے کے لیے جھکے۔ ہاں!

تقریباً نے اپنی نصیحت پہنچی ہوئی ڈاڑھی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ پیچھا لیا۔ تو..... تو کب؟
موزیل ایک ہٹ گئی تنجب۔۔۔۔۔ تم اپنے یہ بال کٹا دو گے؟

تقریباً اس وقت جو ہوسو ہو۔ جاتا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا میں کل ہی کٹوا دیوں گا۔

موزیل فریض پر ٹیپ قالس کرنے لگی۔ تم کب اس کو ملے ہو تقریباً؟۔۔۔۔۔ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔

اس نے تقریباً کے دل و دماغ سے مذہب کے رعب سے خیال کو نکال باہر پھینکا۔ تم دیکھ لو گی۔

”دیکھ لوں گی۔“ اور دیر غری سے آگے بڑھی۔ تقریباً کی مچھلیوں کو پکا اقد چھوٹ چھوٹ کر پی باہر نکل گئی۔

تقریباً نے رات بھر کیا سوچا۔۔۔۔۔ وہ کہہ کن آدھرتوں سے گذرا، اس کا تذکرہ فضول ہے۔ اس نے کدو سے ہڈیاں

نے نوٹ ہیں بہت کم کٹا دیے اور ڈاڑھی بھی مٹاوا دی۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ہزار ہا اوروں نے اٹھائیں بیچے۔ جب سارا معاملہ مٹا

ہو گیا تو اس کی آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل کا پتہ نہیں دیکھتا۔ ہا جس پر ہونے کی جیسے سے حسین دھڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے

پر مجبور ہو جاتی۔

تقریباً وہی عجیب و غریب شخص کا محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹرس پر ہر چیز پر مینا

شروع کر دیا۔ جہاں ٹیکسوں اور نلوں کا ایک جرم تھا وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا مستحق اس کے دماغ میں نہ آئے مگر

آگے نہ دیا۔

بال کٹا کر وہ پہلے دن مگر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موزیل کو بھی کر اس کی طبیعت

نا ساز ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آجائے۔ موزیل آئی۔ تقریباً کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ہٹکی بھرتائی ڈارنگ

تقریباً کہہ کر اس کے ساتھ بیٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ حنائی کر دیا۔

اس نے تقریباً کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگیزی وضع کے کٹے جوتے بالوں میں اپنی انگلیوں

سے کھینچی کی اور غری زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔۔۔۔۔ موزیل نے جب

اُسے محسوس کیا تو اپنی سرکٹ کا گھیرا اٹھا یا اور اُسے پوچھنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ تقریباً فرمایا۔ اس نے سرکٹ پی کی اور سرزنش کے

طور پر اس سے کہا۔ نیچے کچھ نہیں تو کیا کرو۔

موزیل پاس کا کچھ اٹھ دھوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اٹھڑی ہوئی لمب اسٹک لے ہر مٹوں سے مسکرا کر اس نے صحت اقبالی

کہا۔ ”کچھ بڑی گھڑی بیٹ ہوئی ہے۔۔۔۔۔ ایسے ہی چلتا ہے۔“

تقریباً کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موزیل دونوں نکلا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گزارنے لگے تھے۔

مسکرا کر اس نے موزیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ ”خدا ہی کل ہو گی؟“

”خیر۔“ موزیل نے تقریباً کی ملائم تھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

مٹے یہ ہوا کہ شاہی چوہے میں ہو۔ چوہہ کھول میری تھی۔ اس لیے ان کو دس پندرہ دن کا لوٹس دینا تھا۔ ملائی کا ڈاؤنی

تھی۔ اس لیے مناسب یہ خیال کیا گیا کہ چوتھے حصے سے پاس ہے اور ترموچن کے وہاں کئی دستگیر گاہیں۔ دوسرے روز انھیں چاروں گاہ کے مطابق پڑھنا پڑھنا پڑھا۔

موزیل حضرت کے ایک مشورے سے سیر کر رہی تھی۔ اس سے کچھ نا اہل پرنسپل اسٹیڈنٹ تھا۔ جس میں موزیل نے اس کو نشانہ کر کے سے کہا تھا۔ ترموچن وقت سفر پر وہاں پہنچا تو یہ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، وہاں چلی گئی ہے اور ایک غیر مہینے کے لیے وہیں رہے گی۔ ترموچن پر کیا گزری ؟ — یہ ایک بڑی ہی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کر کہا اور اس کو قبول کر لیا۔

انہیں اس کی لطافت کو یہال کو دے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موزیل بہت دہیات لڑائی تھی جس کے دل کے ساتھ بھرتے ہوئے ہیں اور جو چیزوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹھکانا دیتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موزیل سے نشاندہی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی موزیل کی یاد ایک ہلکی کے مانند اس کے دل کو کچھ جیتی تھی اور کچھ چھوڑ کر دکھائے۔ مگر غائب ہو جاتی تھی وہ بے جانتی —۔ بے مروت تھی اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترموچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہوا تھا کہ وہ اہل لالہ میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے کئی کئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوہنہ تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موزیل کے کردار کا بخیر علم تھا۔

وہ اس پر سیکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا۔ لیکن اپنی مرضی سے وہ موزیل کو نکلی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترموچن نے اسے سونے کے ٹوہن دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اس مکان میں موزیل چھوٹے اور بڑے کیلے اور سستے سستے آؤروں پر مبنی اور سونے کے ٹوہن چھوڑ کر ترموچن سے شیشیوں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترموچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موزیل کی کس فاشی کی دھمکی ہے۔ کس آپ دھمکی سے جی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھ کر رہتی تھی اس کو جھٹکے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سادہ سادہ مسلمان کی مانند اس کے جسم پر بھر جاتا تھا، مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک اینٹ بٹھانے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑھانے کی خاطر آٹا کر دیتی تھی۔ تم بکھو سو — مجھے تم سے نفرت ہے یا —

ترموچن ابھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موزیل کو اس سے نفرت تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں دیتی ہو جی نہیں تھا۔ وہ کبھی درہم تک اس کی صحبت میں نہ لگتا۔ وہ ایک فیصلہ کر دیتی، مانند اس کو نا پسند تھے۔ اس لیے کہ اسے اس کا نہیں، موزیل تھی۔ ترموچن نے کئی بار اس کو ان کی آمد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم دیا اور اس کو اس نے نہ جبر کبھی نہ پہنچی۔ ترموچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ پڑھائی تھی نہ حیا اور کیا ہو اس ہے — اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو انھیں بند

کر دیکرو — تم مجھے یہ بتاؤ کہ کونسا لباس ہے جس میں کئی خانائیں ہو سکتا — اس میں سے تمہاری نگاہیں پڑھیں جو سکتیں — مجھ سے لڑی ہو اس کا کیا کر — تم بکھو سو — مجھے معلوم ہے کہ تم بھولنے کے لیے ایک سلی سا انداز میں پہنتے ہو جو نیک سے دینا چاہتا

ہے۔ یہ بھی تھا ہی داڑھی اور سر کے بالوں کی فروغ تھا۔ اسے مذہب میں شمال ہے۔ شرم آتی چاہیے نہیں۔ اتنے ہٹے ہوئے ہو اور ابھی تک نہ کی کہتے ہو کہ تھا مذہب اللہ و شرم میں چھپا ہوا ہے۔

تو لوہن کا شرم و شروا میں ایسی آہیں تھیں کہ غصہ آیا تھا۔ اگر بد میں خود کو نہ کرنے ہو کہ کبھی لڑکھ جاتا تھا۔ یہ تھا تھا اور موزیل کی باتیں شاید نا درست نہیں اور جب اس نے اپنے کمری اور داڑھی کا صفایا کر دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا عرصہ میں بچا کہ وہ بیکار اتنے ہی بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھر اس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی شکل کے پاس پہنچ کر تو رچی رک گیا۔ موزیل کو ایک بڑی مٹی گولی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔
— کربال کو۔ ایک پاکیزہ لڑکی جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ غلطی میں تھی وہ ایسے غلے میں تھی جس میں توڑ قسم کے غلے ہوتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن نصیبت یہ تھی کہ اس غلے میں اڑنا بیس لگنے کا گرفت تھا، مگر گرفت کی کوئی پروا نہ تھی۔ اس چال کے مسئلہ اگر چاہئے تو اندر ہی اندر کربال کو وہ اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی سال کے ساتھ صفایا کر گئے تھے۔

تو رچی سوچتا سوچتا پانی کے مرنے کی بد چلی گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کی بعض ٹھاکا کی ایک ہی کا اندازہ پورے کیوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھا کر نہیں چاہتا تھا۔ فوراً ہی ایک بار پر خد وہ اس صفائی سے اسے شرمناک تھا کہ قرشی ہوئی دکان نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لیے اور علامت اس میں اٹھیاں بھریں اور ایک سر دھو بھری۔ اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی حرکت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کہ یہ کون سا حرکت ہے؟ ہلا گیا میں کئی یودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہ پہنچتی تھیں۔ آواز قریب آتی گئی۔ ایک حالت اس نے دوسری شکل کے پاس موزیل کو دیکھا، جو بیڑیوں کی خاص شکل کا ڈھیلو ڈھیلو کا کوڑھنے بڑے زور کی کھڑاؤں سے رہی تھی۔ اس زور کی کھڑاؤں کو محسوس ہوا کہ اس کے اس پاس کی ہوا چل جائے گی۔

تو رچی پانی کے لیے چڑھا۔ اس نے سوچا کہ یہ ایک ایسی کمان سے نمودار ہو گئی۔ اور اس وقت ٹیس میں پر کیا کرنے آتی ہے؟

موزیل نے ایک اور کھڑاؤں کی۔ اب تو رچی کی بیڑیاں چٹنے لگیں۔
ڈھیلے ڈھیلے کڑتے ہیں اس کی مضبوط چھاتیوں و دھڑکیں۔ تو رچی کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چٹے چٹے نیل ابھرائے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موزیل نے ہلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا بیڑی بالکل غیبت تھا۔ کھڑاؤں گمشدہ وہ اس کے پاس آتی اور اس کی تھنی مٹی داڑھی دیکھنے لگی۔ تم پھر سکو ہی گئے تو رچی؟
داڑھی کے بالی تو رچی کو چھبے گئے۔

موزیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت دگڑی اور سکا کر کہا۔ اب یہ برش اس قوال ہے کہ میری یہ بولو سکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو وہیں دیر لالی میں رہ گئی ہے۔

تروچی خاموش رہا۔

موزیل نے اس کے بازو کی چنگلی لی۔ "بولتے کیوں نہیں سرور صاحب؟"

تروچی نے اپنی پھٹی بے وقوفیوں کا اعلاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ٹہکے اندھیرے میں موزیل کے چہرے کو دیکھ کر دیکھا۔ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ پہلے سے کھلم کھلا نظر آتی تھی۔ تروچی نے اس سے پوچھا، "کیا اب بھی یہی نہیں؟" موزیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیت سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو رہی ہے۔"

"میں ڈانٹا گیا کہ ابھی ہوں۔" موزیل پانی کے موٹے ٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔ "تم گویا کہ۔۔۔ اب

بچہ۔۔۔ نئے سرے سے بکھری دھبہ ہو۔"

تروچی نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "ہاں!"

"مبارک ہو۔" موزیل نے ایک کھڑاؤں پر سے اتار لیا اور پانی کے ٹی پر بجانے لگی۔ کسی اور لوگ سے محبت کرنی شروع کر دی۔

تروچی نے بہت سے کہا۔ "ہاں!"

"مبارک ہو۔۔۔ اسی بڈ ٹنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں۔"

"یہ بہت بُری بات ہے۔" موزیل کھڑاؤں پر اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔ ہوشیار کی کو اپنے مسابینوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

تروچی خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھا کر اس کی دائرہ کی کو پڑی پانچوں انگلیوں سے تجڑیڑ کیا۔ اسی لوگ نے تھیں یہ بال بڑھانے کا

مضمرہ دیا ہے؟"

"نہیں۔"

تروچی بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کٹھن کھٹکے کرتے اس کی دائرہ کی کے بال پس ہیں۔ الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے تینین

کہا تو اس کے لیے میں ٹیکھا ہوں تھا۔

موزیل کے ہونٹ پر اپ اسٹاک باہمی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکراتی تو تروچی نے یہ محسوس کیا کہ اس کے گاؤں

میں جھٹکے کی دکان پر تصانی نے پھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔

مسکراتے کے بعد وہ ہنسے۔ "تم اب یہ دائرہ میں ڈاؤن کو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کروں گی۔"

تروچی کبھی میں آتی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باجمعت اور پاک طینت کناری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور

اسی سے شادی کرے گا۔ موزیل اس کے مقابلے میں خاموش ہے، بصورت ہے، بے وقوف ہے، بے عروت ہے مگر وہ اسی

قسم کا گھٹیا ذہنی نہیں تھا۔ اس نے موزیل سے صرف اتنا کہا۔ "موزیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک عیدھی

سادھی لڑکی ہے۔۔۔ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

مونزل سیرج بھارک حادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑکی پر نصف دائرے میں گھوم کر تواریں سے کہا: ”وہ مذہب کی پابند ہے تو غلطی کیسے قبول کرے گی؟“ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کشا کچے ہو؟“ اس کو ابھی تک معلوم نہیں — دائرے میں لے تھارے دیوانہ جانی جانے کے بعد ہی ٹرستانی شروع کر دی تھی — مصلحتی طور پر — اس کے بعد میری کپال کوڑ سے ملاقات ہوئی، مگر میں پچاس سال طریقہ سے باندھنا ہوں کہ سوسوں سے تک ہی اتنی شکل سے جان سکتا ہے کہ میرے نہیں کٹے ہوئے ہیں — مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“ تو میں نے اپنے لیے حاتم باور میں انگلیوں سے لٹکھیں کرنا شروع کی۔

مونزل نے لبا کر تڑاٹھا کہ اپنی گوری ویزوان کچھ لانی شروع کی، یہ بہت اچھا ہے..... مگر یہ کم بہت پتھر نہال ہی ہو رہی ہے — دیکھا کس دور سے کاٹا ہے؟“ تو میں نے دھری طوف دیکھا شروع کر دیا مونزل نے اس جگہ جہاں پتھر نے کاٹا تھا، انگلی سے لب لگائی اور کڑھچھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی جبکہ ہوری ہے تھاری شادی ہے؟“ ”ابھی کچھ پتہ نہیں۔“ یہ کہہ کر تواریں سخت متھڑکے ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموش رہی۔ اس کے بعد مونزل نے اس کے ٹھکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا: ”تواریں — تم کیا سوچ رہے ہو؟“

تواریں کو اس وقت کسی جھڑو کی ضرورت تھی غور وہ مونزل ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اس نے اس کو سارا باہر اُٹا دیا۔ مونزل ہنسی: ”تم اول درجہ کے ایڈیٹ ہو — جاؤ اس کو لے آؤ۔“ اسی کی شکل ہے؟“

”مشکل! — مونزل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں — کسی بھی معاملے کی نزاکت — تم ایک ۱۰ بابی قسم کی ٹولہ ہو — یہی وجہ ہے کہ تھارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے جس کا مجھے ساری عمر افسوس ہے گا۔“

مونزل نے نور سے اپنی کھڑکیوں پانی کے ٹی کے ساتھ ماری۔ افسوس بی ڈیوڈ — سلی ایڈیٹ — تم ہر سوچ کر تھاری اُس..... کیا نام ہے اس کا..... اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے..... تم جیل گئے ہو تعلقات کا دونا

روئے..... تھارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے — تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو — اور بہت ڈرپوک، مجھے بڑھ کر چاہیے..... لیکن چھوڑوان باقی کو..... چلو آؤ، تھاری اس گور کو لے آؤ۔“

اس نے تواریں کا بازو پکڑ لیا — تواریں نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا: ”کہاں سے؟“ ”وہیں سے، جہاں وہ ہے۔“ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں — چلو آؤ میرے ساتھ۔“

”گرسٹو تو — کرنے ہے۔“ ”مونزل کے لیے نہیں — چلو آؤ۔“

وہ تواریں کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دواخانے تک لے گئی تھی جو نیچے میز میں کی عورت کھلتا تھا۔ دواخانہ گھول کر دواخانے

والی قہقہہ لگتی اور تڑجی کی داڑھی کی حرکت دیکھنے لگی۔

تڑجی نے پوچھا: کیا بات ہے؟

موزیل نے کہا: یہ تمہاری داڑھی ————— لیکن خیر شیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔ ————— نکلے سر پہلے تو کوئی نہیں گے گا کہ تم سکھو۔

”نکلے سر! تڑجی نے کسی تردد کو کھلا کر کہا۔ میں نکلے سر نہیں پہاؤں گا۔“

موزیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا: کیوں؟

تڑجی نے اپنے بالوں کی ایک بٹ شیک کی: تم سمجھتی نہیں ہو پیراؤں پر ٹپکی کے بغیر چانا شیک نہیں۔

”کیوں شیک نہیں؟“

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک نکلے سر نہیں دیکھا۔ ————— وہ بھی سمجھتی ہے کہ میرے کپس ہیں میں اس پر یہ دان افشاں نہیں کرنا چاہتا۔“

موزیل نے زور سے اپنی کھڑاں دروازے کی دہلیز پر ماری: ”تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔ ————— مگر تم کیوں کے..... اس کی جان کا سوال ہے۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کو کہ جس سے تم محبت کرتے ہو۔“

تڑجی نے اسے کچھ نہ کی کہ شش کی۔ موزیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ ————— اب اس نے مجھے نکلے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔

موزیل چڑھ گئی: ”اوہ، تمہاری محبت بی ڈیوڈ۔ ————— میں پوچھتی ہوں، کیا سارا یہ سکھ تمہاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں۔ ————— اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ بڑی ضرور پہن لو گے۔ اور شاہد وہ اپنا لٹریچر بھی جو دیکھ سے جاتا تھا ہے۔“

تڑجی نے کہا: ”وہ تو میں ہر وقت پہنتے ہوتا ہوں۔“

”محبت دیکھ کرتے ہو۔ ————— گراں قدر سوچ کہ معاملہ اس کے کسے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے اداکار تھے موزیل۔ ————— تم بڑی پس کر لگے تو میں دنگ کر دیں گے۔“

تڑجی نے دفتر سا جواب دیا: ”مجھے اس کی پروا نہیں۔ ————— اگر میں تمہارے ساتھ ڈاں پہاؤں تو بڑی پس کر جاؤں گا۔ ————— میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

موزیل جھنجھو گئی: ”اس زور سے اس نے بیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیوں آپس میں جڑ جڑ لگیں۔“ گدھے۔ ————— تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے۔ ————— تمہاری وہ۔ ————— کیا نام ہے اسی بھڑی کا۔ ————— جب وہ بھی نہ رہے گی اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔ ————— تم سکھو ہو۔ ————— خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ رہو ہو۔ ————— تڑجی جھٹکا گیا۔ ————— بکواس نہ کرو۔“

موزیل زور سے ہنسی۔ یہی وہی بالوں کے خباہتہ مائی ہوئی یا نہیں اس نے تڑجی کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھجھک کر

کہا۔ ڈارنگ! چلو، جیسے تمہاری مرضی — جاؤ پڑوسی ہیں آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔
یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ تروچن نے اسے روکنا تم کھلے نہیں پنوں گی؟
موزیل نے اپنے سر کو جھٹکنا دیا۔ نہیں — چھوٹا اس طرح۔

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے آئی۔ تروچن بھی منزل کی بیڑیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کو چہرے کی آواز سن رہا۔ پھر اس نے اپنے
لبے بال بال نگہبوں سے نیچے کی طرف سیٹھ اڑنے لگی اور کچھ آنکھوں کے نیٹھ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ گڑی بندھتی بندھتی
دیکھتی تھی اسے ابھی طرح سر پر مایا اور نیٹھ کا دھواڑہ نقل کر کے نیچے آگیا۔

باہر فٹ پاتھر پر موزیل اپنی بھڑکی انگلیں چڑھی کیے سرگرم رہی تھی۔ باطل موزاد انداز میں جب تروچن اس کے نزدیک
پہنچا تو اس نے شہرت کے طور پر ہنسنے لگا۔ وہاں اس کے سر پر سے پردے دار۔ تروچن نے غصے میں کہا۔ تم بہت ذلیل ہو۔
موزیل مسکرائی۔ یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی — اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہ چکے ہیں۔ پھر اس نے تروچن کی گڑی
کی طرف دیکھا۔ یہ پڑی تم نے واقعی بہت بھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔

بھڑا باطل سنسان تھا۔ ایک طرف ہما بیل رہی تھی اور دوسری بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کہ غصے سے خوفزدہ ہے۔
تینوں روشنی تھیں گراں کی روشنی بھاری معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت تینوں پہلی شروع ہوجاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت
بھی بھاری ہوجاتی تھی۔ ابھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شرک پر کرنی انسان گذر رہے ڈگرے لگا۔

موزیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھر کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموش فضا میں ایک بہت
بڑا شور تھی۔ تروچن دل ہی دل میں موزیل کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ وہ سنٹھ میں اور کچھ نہیں تو اپنی داریات کھڑاؤں ہی آواز کوئی دوسری
چیز میں سن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موزیل سے کہے کھڑاؤں آواز دو اور دنگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں سنے گی۔ اس نے غلٹ کر کہا۔
تروچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑاؤں اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موزیل باطل بے خوف چلی جا رہی تھی سگرٹ
کا دھواں اُٹھتا ہی جیسے وہ بڑی بے ٹکری سے چل رہی تھی کہ رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پڑوسیوں میں کی آواز گرجی۔ آگے — کوہر جا رہا ہے۔
تروچن سمجھا۔ موزیل آگے بڑھی اور پڑوسیوں میں کہو پاس پہنچ گئی اور بالوں کی ایک خفیت سمجھنا کہہ کر کہا۔ آؤ، تم
— ہم کو یہ کیا مانیں تم نے — موزیل..... پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ آؤ، اس باج — ہمارے
رجتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔ فٹ کھڑے کو جا رہا ہے.....

سپاہی سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیہ نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر
اس کو دیا۔ اور پھر —

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موزیل نے اپنے منہ سے شگاہٹ نکالا اور اس سے کہا۔ "بیر آؤ لاسٹ!"
سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موزیل نے دماغی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ تروچن کو داری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف

پہل دی — جس میں سے گذر کر انہیں — بچے جاتا تھا۔

ترجمیں خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موزیل کی طرف کی غلات دہری کر کے ایک سلیب دلو بہ قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے — خطروں سے کیلنات اسے پسند تھا۔ وہ جب جو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک عیسیت ہی جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تھی لہروں سے ٹکراتی، بھڑکنے والے ڈونڈ تک نکل جاتی تھی اور اس کو یہ احساس بات کا دھڑکار تھا کہ گریس وہ ڈوب نہ جائے جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوا تھا گلو سے ان کی کوئی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

موزیل آگے آگے تھی۔ ترجمیں اس کے پیچھے پیچھے ڈونڈ کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی فعل میں سے کوئی پھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موزیل رک گئی جب ترجمیں پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا تو لہجہ ڈیز — اس طرح ڈونا اچھا نہیں — تم ڈونڈے تو سوزور کچھ نہ کچھ ہو کے رہ جا — یہ کتنی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔
ترجمیں خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جہاں اس کی طوط نکلتی تھی، جس میں کربال کو رہتی تھی تو موزیل پتے پتے ایک دم رک گئی — کچھ خاصے پر پڑے اظہینات سے ایک ایسا ڈرائی کی نکالی ہوئی جا رہی تھی۔ ایک لٹلے کے لیے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترجمیں سے کہا۔ کوئی بات نہیں — چلاؤ۔

دونوں پتے لگے — ایک آدمی جو سر پر بستہ ٹری پرات اٹھائے چلا آیا تھا تو ترجمیں سے ٹکر لید پرات لگتی۔ اس آدمی نے غور سے ترجمیں کی طوط دیکھا، صاف معلوم ہوا تھا کہ وہ سیکو ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے پیٹے میں ہاتھ ڈالا — کہ موزیل آگئی۔ لڑکھواتی ہوئی پیسے نقشے میں چڑ ہے۔ اس نے دند سے اس آدمی کو دھکا دیا اور غور سے دیکھا کہ اسے کیا کڑا ہے — اپنے بھائی کو مانتا ہے — ہم اس سے شادی نہ لے کر مانگتا ہے۔ پھر وہ ترجمیں سے مخاطب ہوئی۔ کریم — اٹھاؤ، پرات اور رکھو اس کے سر پر۔

اس آدمی نے پیٹے میں سے ہاتھ نکال لیا اور غصہ مانی آنکھوں سے موزیل کی طوط دیکھا، پھر رنگ بڑھ کر اپنی کمری سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹکڑا دیا۔ پیش کر سالی — پیش کر۔ پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔
ترجمیں غر بڑایا، کیسی ذلیل حرکت کی ہے حمزہ سے نے؟
موزیل نے بڑی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ کوئی ذلیل حرکت نہیں — سب چلتا ہے آؤ۔
اور وہ تیز تر چلنے لگی — ترجمیں نے بھی قدم تیز کر دیے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے۔ جہاں کربال کو رہتی تھی۔ موزیل نے پوچھا کہ کس گلی میں جانا ہے؟
ترجمیں نے آہستہ سے کہا۔ تیسری گلی میں — نکڑوالی بلڈنگ۔ آ

موزیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا، اس پاس اتنی گلیاں آباد تھیں مگر کسی بچے تک نہ دھنکے کی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گلوڑوں کو کھانی دی — ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلاٹنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلاٹنگ میں گھس گیا۔ اس بلاٹنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فطی پاتھر پر انھوں نے لڑھکھڑاؤ دیکھا اور بڑی چپکرتی سے دوسری بلاٹنگ میں چلے گئے۔ موزیل ٹھٹک گئی۔ اس نے تروچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا: "تروچن ڈیر — یہ گڑھی آباد رہے؟"

تروچن نے جواب دیا: "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں آتا رہتا؟"

موزیل جھنجھلا گئی۔ "تمہاری مرضی — لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے؟"

سامنے کچھ ہوتا تھا۔ دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا — صاف گلوڑوں کی جھڑپ تھی اور بڑی بڑی اسرار قسم کی۔ دونوں ہاتھ بلاٹنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر لپٹا کر اٹھائے نکلے تو موزیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے ایک کا لباس کاٹھی سیال سے چھڑپک رہی تھی۔ موزیل اپنے جوتے کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سرخ رخی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے تروچن سے کہا: "دیکھو، ایسا کرو — میں جھاگ کر گلوڑوں کی بلاٹنگ میں جاتی ہوں — تم میرے پیچھے آنا — بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا کھینچا کر رہے ہو — سبجے — مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔"

موزیل نے تروچن کے جواب کا انتظار کیا اور گلوڑوں کی بلاٹنگ کی طرف کھڑا ہوا۔ کھٹکھٹااتی بڑی تیزی سے جھاگ کر تروچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلاٹنگ کے اندر تھے — سیڑھیوں کے پاس۔ تروچن کانپ رہا تھا۔ موزیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے تروچن سے پوچھا: "کون سا ملا؟"

تروچن نے اپنے خشک ہنسنے پر زبان چھیری: "دوسرا؟"

"چلو۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تروچن اس کے پیچھے ہوا۔ آخر دونوں پر غلی کے بڑے بڑے دھچکے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کا غلی خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے سالے پر پہنچے تو کوئی ڈھیر میں کچھ ڈور ہمارا کہ تروچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موزیل ڈور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

تروچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی: "منگا سنگھ جی — منگا سنگھ جی؟"

اندر سے صیہن آواز آئی: "کوئی؟"

"تروچن جی؟"

دروازہ دھیرے سے کھلا — تروچن نے موزیل کو اشارہ کیا۔ وہ پک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے —

موزیل نے اپنی فصل میں ایک درہلی پکی لڑکی کو دکھا۔ جو بے حد سی ہوئی تھی۔ موزیل نے اس کو ایک لمبے کے بے غور سے دیکھا۔

تیر نقوش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موزیل نے اس کو اپنے چوڑے پچھلے سینے کے ساتھ لگا

لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھلے کرتے کا دوسرا ٹھکانا اس کی ناک پر لٹکی۔

تو راجن سرخ ہو گیا۔

موزل نے کربال کو اس سے بڑے پیار کے ساتھ کہا: ”درویش، تو راجن تمہیں بیٹے پر ہے۔“

کربال کو اس نے تو راجن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موزل سے اٹلک ہو گئی۔

تو راجن نے اس سے کہا: ”مردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں۔“ اور آج ہی سے ہی ————— لیکن جلدی کوڑا

ابھی جس ٹہر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور جین کا مشتق جودہی ہے۔

کربال کو اس کے حلق سے دہلی دہلی چیخ بلند ہوئی۔ اسے پکڑ لیا انہوں نے آ

تو راجن نے پوچھا: ”کسے؟“

کربال کو جواب دینے ہی والی تھی کہ موزل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی ”پکڑ لیا تو لپٹا

ہوا تم یہ پکڑ کے آنا دو۔“

کربال کو اس کی کچھ سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ موزل نے آٹا کا ٹاس کی قمیص آٹا کر ایک طرف رکھ دی۔ کربال کو اس نے اپنی ہاتھوں

میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور وحشت زدہ ہو گئی۔ تو راجن نے مردوسری طرف موڑ لیا۔ موزل نے اپنا ڈھیلا ڈھیلا کرتے آٹا اور

اس کو پٹا دیا۔ خود وہ ننگ و مٹھانگ تھی جلدی جلدی اس نے کربال کو کا آزار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار آٹا کر، تو راجن سے

کہنے لگی: ”بھائی، اسے لے جاؤ۔“ لیکن ٹھہرو۔

یہ کہہ کر اس نے کربال کو اس کے بال کھول دیے اور اس سے: ”جاؤ۔“ جلدی نکل جاؤ۔“

تو راجن نے اس سے کہا: ”آؤ۔“ مگر فوراً ہی رک گیا۔ پٹ کر اس نے موزل کی طرف دیکھا جو دھوتے دھوتے کی طرح

ننگی کھڑی تھی۔ اس کی ہاتھوں پر میس میس بال مردوسری کے باعث جلا گئے ہوئے تھے۔

”تم جانتے تمہیں نہیں ہر؟“ موزل کے لیچے میں پڑ چڑا رہی تھا۔

تو راجن نے آہستہ سے کہا: ”اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔“

”جھٹم میں جائیں وہ۔“ تم اسے لے جاؤ۔“

”اور تم؟“

”میں آ جاؤں گی۔“

ایک دم آواز کی منزل سے کئی آدمی مٹھڑا مٹھڑے آتے آتے گئے۔ دھواڑے کے پاس آگرا انہوں نے کوٹھا شروع کر دیا،

جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کربال کو اس کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراد رہے تھے۔

”موزل نے کچھ سرچا اور بالوں کو خفیعت جھٹکا دے کر اس نے تو راجن سے کہا: ”سنو۔ اب موت رکب ہی تو رکب میری

مئی

نام اس کا سنرٹیلڈ ایکس تھا کوسب اُسے ہی کہتے تھے۔ دیرپا لے قد کی اور حیرت انگیز حرکت تھی، اس کا خاندان ایکس کھلی کے بچلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی ہنسن ٹیلڈ کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔

وہ بچہ نہیں کیسے آئی کب سے وہاں تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ وہ اس میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق کہی جانتے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی پلیمپ حرکت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات سے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کوئی وابستہ ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ وہ بچہ نہ ہر وقت سے وابستہ تھی، ہو سکتا ہے یہ ایک جنگی جہاز ہو مگر ہرگز میرے لیے وہی بچہ ہے، اور اس کے وہی خدے، اس کے تمام خدے میں ہیں کے ساتھ ہی چند یا وہی منسلک ہیں اور اتنی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات پر نے ہی میں ہوتی میں نہایت شستہ اور جوانی ہوں۔ یوں تو سوویات کی بڑی بڑی انگلیں میرے دل میں موجود ہیں۔ آپ میری باتیں نہیں تو آپ مجھے لاکھوں باتوں پر کچھ چٹکایا جالکی اسی قسم کے نام کی کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لیے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر زیادہ افسوس ہے کہ میں وہ چوٹی سر کر کے وہیں کا ہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے پہلی میں تھا، آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کوسب پر نے گیا تو بچی رہے ساتھ تھی، ایک رات کا ہو کہ اس کو میرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں غریب بچے میں حساب لگاؤں آپ یہ کچھ مجھے کہنا تھا برس سے پہلی میں تھا، مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ گارڈن اور میریزم دیکھنے کی بھی تو فہم نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم چار جانے کے لیے تیار ہو گیا جس فلم کھینچ میں ملازم تھا اس کے بالوں سے ایک نکتی سی بات پر دل میں تلاطمی پیدا ہوئی اور میں نے سر جاکر یہ ٹکڑہ دُور کرنے کے لیے پورا دُور کی۔ وہ بھی اس لیے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے یہ رجحان نہ کہ جانا تھا جہاں میرا غم کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا، شیش کے باہر معلوم تھا کہ یہ جنگ لگائی ہوئی ہے، مگر اس وقت ہم ناگہان سے چکے تھے۔ شستہ کوجیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ مگر میں اپنے دل کے سکوت دُور کرنے کے لیے یہ تھا اس سے مجھے یہ رجحان نہ کہ چننے میں کوئی گھلت نہیں تھی۔ ناگہان بہت دیریات تم کا تھا، اعلیٰ گروہ کے کتوں سے بھی زیادہ دیریات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے، گھوڑا لگے چلتا ہے اور سواروں پر کچھ، ایک دو گروہ سکھنے ہوئے بازار تھا اس خیزاں ملے ہوئے تو میری طبیعت گھبراتی۔

میں نے اپنی جیسی سے حضور کیا اور چھپا کر می صورت میں کیا کہ ناچا ہے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جہاز تانے دیکھے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو یہ دل چاہتا تھا کہ پھانسا ہو کہ اس ساری سے زیادہ تکلیف دہ ہے میں نے اس سے انگوٹھ کا

نہ سمجھا۔۔۔۔۔ دھوپ دہاتی تیز تھی۔

گھوڑا ایک فلائنگ آگے بڑھا ہر گاہ کہ پاس سے اسی جوتی تاپ کا ایک ٹانگہ گزرا میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک لمبائی
چھپا ہوتے غصے کے گھوڑے آ

میں ہج نک پڑا۔ چلتا تھا۔ ایک گھسی ہوئی سیم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ بڑے پیٹھے تھے۔ میں پہلا، دھول انتہائی افسوس کا
تھا کہ پیٹھے کی جابجائی جس کہاں گئی جو اس حال لگائی کے ساتھ جیلے کے ساتھ ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا کہ اس
عورت کی ٹھہریاں پاؤں اور دودھ کی تھوں میں سے بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ آٹا شروع ایک آپ تھا کہ بصارت کو سخت گرفت
ہوئی تھی۔

چٹے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ دوسرا بے تکلف دوست تھا تو بے غصے کے گھوڑے کے جواب میں یقیناً
میں نے بھی کچھ اسی قسم کا غور بند کیا ہوتا، مگر اس عورت کو اس کے ساتھ ساتھ گزری ساری بے تکلفی جھریاں جھریاں ہو گئی۔

میں نے اپنا ساگر دکھایا۔ پیٹھے نے بھی اپنے کو جہاں سے کہا کہ ٹھہریاں۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی
میں کہتی جھٹ نے سنٹ تانگے سے کو کو وہ میری طرٹ دینا تھا بڑھا تے ہوئے بچھا۔ تم بے۔۔۔ تم یہاں کیسے آئے۔ پھر اپنا بڑھا
بڑا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری بے تکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا تھا جی ہاں۔۔۔ آپ نے کمال کر دیا۔۔۔ اس کی ٹھہریاں
آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں۔

میں نے اس سے پوچھا۔ تم جا کہاں رہے ہو بے۔

چٹے نے اُونچے سروں میں کہا۔ ایک کام سے جا رہا ہوں۔۔۔ تم ایسا کرو، سیدھے۔۔۔۔۔ وہ ایک دم پیٹ کر
میرے تانگے طالے سے مخاطب ہوا۔ دیکھو صاحب کو ہمارے گھر سے جاؤ۔۔۔ کرایہ دہانے مت لینا ان سے۔۔۔ دھر سے نوٹاری
تاریخ جو کہ اس نے نیشنل کے انداز میں مجھ سے کہا۔ تم جاؤ۔ نوکریاں ہوگا۔۔۔ باقی تم دیکھ لینا۔

اور وہ ٹھیک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی سیم کے ساتھ چلے گیا جس کا منہ نے لی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گورنر تیسکیں
ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کیسے کہ وہ بوجہ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کا انگریز چل پڑا میں نے اپنے تانگے دالے سے کچھ نہ کہا۔ میں باچار فرلا گنگ چل کر وہ ایک ڈاکہ ہلکا ناظم کی عمارت
کے پاس رکا اور نیچے آتر گیا۔ چلیے صاحب۔۔۔۔۔۔۔

میں نے پوچھا۔ کہاں بے۔

اس نے جواب دیا۔ چٹہ صاحب کا مکان یہی ہے۔

”آدہ میں نے سوائے نظروں سے اپنی بیوی کی طرٹ دیکھا۔ اس کے تیروں نے مجھے بتایا کہ وہ چٹے کے مکان کے
مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو وہ وہ کہہ رہا تھا کہ حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں بیٹھنا پڑے وہاں
دوست مل جائیں گے۔ مگر وہاں نہ لے گا ہمارے چلے ہی سے موجود ہے، اس لیے دن رات اڑے گی۔ میں تانگے سے اتار

لیا۔ چھڑا سا بھی کہیں تیار۔ میں نے اٹھایا اور اپنی جیڑی سے کھڑا چلوں۔

نابا نمودوں سے پہچان گئی تھی کہ سے ہر حالت میں میری نصرت تیری کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے جیل و جنت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ تیری پڑی۔

بہت معمولی کام لگات تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑائی اوں نے ہا بعض طبعی ایک چھڑا سا جنگہ بنایا تھا۔ تھوڑی دیر سے استعمال کیا اور چھڑک کر چھٹ گئے۔ چونکہ اس کا نام ڈراکپا تھا۔ جگہ جگہ سے پسترا کھڑا ہوا تھا۔ اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کھلاوت کا ہو سکتا ہے۔ جو ٹکڑوں کا بیرو ہوا اور اسی پختہ میں لازم ہو جہاں ادا نہ تھا۔ ہر تیسرے سینے ملتی ہے۔ اور وہ بھی کی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو بیوی ہو۔ ایسے گھنے احوال میں یقیناً پریشانی اور گمشدگی محسوس کرے گی۔ مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ پتہ آجائے تو اس کے ساتھ قری پر حیات نگر طبعی گئے۔ وہاں جو میرے خلیوں کا پورا ساتھی رہتا تھا۔ اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے احوال میں میری بیوی تو دوسری برہان دوسری دیتے دن گزار سکتی تھی۔

تو کڑی غیب لا بائی آئی تھا جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے۔ مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آہٹا تو اٹھانے ہماری موجودگی کا کوئی فحش نہ لیا۔ جیسے ہم ساٹھ سال سے وہیں بیٹھے تھے۔ اور اسی طرح بیٹھ جئے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر یہ دیکھے بغیر یا اس سے گذر گیا تو میں کچھ کا شاید کوئی معمولی ایکڑ ہے جو پتہ کے ساتھ رہتا ہے۔

پر جب میں نے اس کے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریعت چڑھ صاحب کے چھینے لازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی دونوں کو یہ اس ملک ہی تھی۔ اس نے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا گلاس لایا۔ اس کے نیچے سے نکلا اور بڑا بڑا بات بات ایک درجی گلاس صاحب نے منگوائے تھے۔ معلوم نہیں کہ حمر گئے۔

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ گلاس کی طرف اشارہ کیا کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں؟

تیل لینے جانا۔ بھئی کا ایک خاص معاملہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی۔ مگر میں پڑی۔ تو کہ کسی قدر کھٹک گیا۔ میں صاحب

..... میں..... تلاش کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔

میری بیوی نے اس کو پانی دے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا گلاس لایا۔ میں اللہ ہی کے نیچے اس انعام سے کھا کر جیسے وہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اور رکھ دیا ہوتا تو یقیناً کھڑا سا نظام درم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غائباً چلے کا تھا۔ اس سے کچھ فوری ہٹ کر دو آرام کر سیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بیل رہی تھی کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ استغنیہ میں چلے آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے صحن میں اور اس کاغذ سے ہماری خاطر داری اس پر لازم تھی کہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی سے اس نے مجھ سے کھلا ہٹ از ویٹ۔ تو تم آگئے اور لڑوائے۔ چلو ذرا اسٹڈیو تک ہوا نہیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوائس ملنے میں آسانی ہو جائے گی۔

..... آج شام کو..... میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھٹکھٹا کر ہنسنے لگا بھائی جان کہیں آپ نے اسے مولوی نہیں بنا دیا۔ پھر دھند سے ہنسا مولویوں کی رسی تھیں، اٹھو منظر۔ بھائی جان یہاں بیٹھی ہیں، ہم ابھی آجائیں گے۔

میری بیوی جل کر چلے کر ذرا فنی تو اب بالکل داکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چٹکے کے ساتھ ہولیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں وہاب کھاروہ سر جانے کی چٹا پھری ہوگا۔ اسٹیڈیو پاس میں تھا، انفرانٹری میں مستحی کے سر چٹکے کے چٹے کے مبلغ دو سو روپے وصول کیے اور پون گھنٹے میں جب وہاں آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کر پیڑھے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا سب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کہ بڑا خندے سے مٹا جلتا تھا۔ اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز نظر پڑی پر ٹوٹی ہوئی تھی کو سب مل کر ایک سالگی اختیار کر گئی تھیں۔

ہر شے کو فنا تو تھی، احساس کی آواز گئی، ایک ضروری ہی تھا، جیسے اس کی مہجلی اس کی کمرے کا بڑی ہنسائی ٹھیل کے چٹاری تھی۔ چٹا سے لے کر فرامی اپنے لڑکے کو دھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا: ٹھیل گئے شہزادے..... وہ تو بڑا تھوڑا کلاس آدم کی ہے آؤ۔ میرا مطلب ہے تھری ایکس ڈم کی اور نصف دہائی کلاس۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف بیٹن ہی کا نہیں، ڈوشکے ہر شے ملک کا شہزادہ تھا۔ چٹا سے کہ زبان پر جس ملک کا نام آ جاتا، وہاں ہی کا شہزادہ ہی جاتا تھا۔ اس وقت کلچر میں کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چٹا سے نئے ٹوٹے ہوئے پیرنگوں والے پنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس ڈم کے استقبال میں چٹا رہتے ہوئے کہا وریٹ ڈوویٹ۔ لڑا فخر آتم اور دھڑکی نکلے۔ لیکن ایک دم منتظر ہو گیا تیار بھائی کا کیا ہے..... وہ تو گھبرا جانے لگی۔

چٹا بغیر بیوی کے تھا، مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہاں کلاس تھا، احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنواری رہنا چاہتا تھا، وہ کہا کرتا تھا: یہ احساس کبھی نہ جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آئے

آؤنا تیکو ہر جاتا ہوں۔ لیکن بعد میں یہ سوچا کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں۔ ساری تیاری کو نہ سٹورج میں ڈال دیتا ہوں۔

آدم فرامی، گئی، کلاس بھی چٹا سے نے پھر منگوائے تھے اور بیٹن کا شہزادہ تین لڑا تھا۔ لڑا بیٹن راستے میں ٹوٹ گئے

تھے۔ چٹا سے نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور خدا کا شکر کیا کہ تو بڑیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس کے کھڑا

گلاسوں میں آدم ڈال دیا۔ کہا: تمہارے پانی نے آٹے کی خوشی میں۔

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیے۔

دوسرا دور شروع کر کے چٹا اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آکر میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت دوس

آیا اور کہنے لگا: تم شہزادہ کا بیویوں کی خیر نگاہی بائے گی۔ پھر ایک کمرے گئے..... شہزادہ۔ پہلے میں چائے منگواتا ہوں۔

یہ کہہ کر اس نے دم کا ایک چھڑا سا گھونٹ لیا اور کہہ کر آواز دیتی چلا کہ شہزادے۔

جیسا کہ شہزادہ فرامی آ گیا چٹا سے نے اس سے کہا: دیکھو جی سے کہ ایک دم نصٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے۔

لڑ کر چلا گیا۔ چٹے نے اپنا گلاس نکالی کیا اور فریفا نہ پکڑا ل کر کہا: "میں فی الحال زیادہ نہیں پیراں گا۔ پہلے چارپکے لگے بہت بدلتی بنا دیتے ہیں۔ تجھے بجائی کو چھوڑنے کی ضرورت ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد چٹے آگئی۔ بہت صاف برقی تھے اور بڑے سیٹھے سے ٹرے میں چٹے ہوئے تھے۔ چٹے نے فی کزی اٹھا کر چٹے کی خوشبو سونگھی اور مرتب کا اٹھا کر کہتی: "اڑنے جھول....." پھر اس نے آنکھیں پکڑ کر شہزادے پر بوسہ فرود کر دیا۔ اتنا شہر چلا کر میرے کان بلبلا اٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھا لی اور مجھ سے کہا: "اؤ۔"

میری پری جاگ رہی تھی۔ چٹے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تھائی پر رکھی اور دوبارہ کہا: "تھا مریے بیگ صاحب! مری مری کو یہ مذاق پسند نہ آیا۔ لیکن چائے کا سامان جو نکڑ صاف ستھرا تھا اس لیے اس نے اٹھا لیا اور وہ پیالیاں پی لیں۔ اس سے اس کو کچھ فرحت ہوئی۔ اور اس نے ہم دونوں سے خطاب بڑا رسمی و نرخیجی میں کیا۔ آپ انہی چائے تو پیٹے ہی پی چکے ہیں۔"

میں نے جواب دیا: "مگر چٹے نے کھجک کر ٹرے دیکھا اور اس طرح کہا: "جی ہاں، یہ اعلیٰ ہم سے سرزد ہو چکی ہے۔ دیکھیں یہیں یقین تھا کہ آپ ضرور صاف کر دیں گی؟"

میری پری مسکرائی تو کھکھکے سے ہنسا۔ ہم دونوں بہت اچھی نسل کے شیر ہیں..... جو ہر ہر جرم شے حلال ہے! پہلے اب ہم آپ کو سب کچھ چھوڑ آئیں!"

میری پری کو کچھ چٹے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چٹے ہی سے نفرت تھی، بلکہ یوں کہیے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی اور چٹہ، بالخصوص اسے بہت کھلاتا تھا، اس لیے کہ وہ بعض اوقات بے تحاشی کی حدود بھی پھاڑ جاتا تھا، مگر چٹے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میری پری نے کہا: اس کے پاس میں سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کی فضول باتوں میں مداح نوحہ کرنا ایک ان ڈنڈہ خیمہ جیسا تھا جو ڈنڈے کیس گناہ لاتی ہے۔ اس نے میری پری کے چلے چکے تھوڑی کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی: "کیا بستان کے شہزادے — ایک عدد ٹانگہ لاؤ۔ دو دروازے اس قسم کا۔"

کیا بستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چٹہ۔ وہ غالباً دوسرے کوسے میں گیا تھا۔ تھخیلے ملا تو میں نے پری کو کھجاکا کہاب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آ ہی جایا کرتے ہیں جو دم و گمان میں نہیں ہوتے۔ ان کو میرے کہنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ان کو گڑبڑانے والے اپنے ایک سپ ٹول اس نے میری اس کیفوشسٹا دعیت کو پاتے نہ بانڈھا اور بڑھاتی رہی۔ اس نے میں کیا بستان کا شہزادہ دو دروازے اس قسم کا لانا لگے کہ آگیا۔ ہم پر بیات مگر دانا ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میری آنکھوں کو پڑا ساستی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی پری تھی، چٹے نے میری پری اس کے سپرو کی اور کہا: "خوبہ از خوبہ سے کہ دیکھ کر رنگ پکڑا ہے۔ میری پری کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے، یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "چلو منٹو، اسٹوڈیو میں تمھارے دوست کو پکڑیں۔"

چٹہ کچھ ایسی افراتفری مچا دیا کہ اتھا کر محافضت تو آؤں تو کچھنے سوچے کہ بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری پری سوچتی ہی رہ گئی: "تاں گیز میں سواد ہو کر چٹے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا: یہ تو ہو گیا"

— اب کیا پروگرام ہے۔ پھر کھٹکھٹا کر ہنسا آتی — گریت تھی؟

میں اس سے پہلے چھٹے ہی والا تھا، یہ تھی کس تو تلخ آہوں کی اولاد ہے کہ پڑے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کیا کہ میرا استغناء بڑھ کر طبیعت میں گہرا۔

”ہانگہ دہیں اس ڈاک جگہ ڈاکو کو بھی پہنچا جس کا نام سعیدہ کا بیٹا تھا، مگر پڑھا اس کو کبیدہ کا بیٹا لکھا تھا، اس لیے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ و خاطر رہتے ہیں، تھانگہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔“

اس کو لکھی میں کافی آدمی رہتے تھے سالانہ کرایہ کی نظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی، سب کے سب اسی غلط فہمی میں ملازم تھے جو چھٹے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں ایک ایک کر کے جب اس کے سامنے سے ہوا تھا، ہوا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ کوئی چھوٹا اسسٹنٹ ڈائریکٹر کوئی اس کا نائب اولی نائب در نائب ہر دوسرا کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی غلط فہمی کی بنیاد پر استعفا دینے کے لیے سرایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک مرد معلوم ہوتا تھا کنٹرول کارخانہ تھا مگر کسی کے پاس ریش کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیز بھی جو تقریباً کسی تکلیف کے بعد سامانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ لوگ بلیکسٹاک سے خریدتے تھے، بیکھر ضرور دیکھتے تھے۔ وٹس کا موسم ہو تو وہیں کھینچتے تھے روز سڑک چیتے خانہ دار تھے، مگر راتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کا بیٹا کی آبادی بہت گھٹان تھی، چونکہ جہانگیرم تھی اس لیے موٹر گراج محمد دانش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایکسٹریکٹر لگی تھی۔ شیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا گھانا وہ شاید محض یکساہت توڑنے کے لیے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نہیں تھا وہ اسی غلط فہمی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈائریکٹر تھا، معلوم نہیں، وہ کب آتا تھا۔ اور کب جاتا تھا، کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں بھی نہیں دیکھا۔ شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کا بیٹا کے نام سے منسوب کیا وقت میں پیرا کرتے، شیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کا بیٹا کا معزز حقیقتہ چلتے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا، یہ دونوں بھی ایکٹر تھے، مگر ہر دو نہیں تھے، ایک سعیدہ تھا جس کا فکلی نام رنجیت کا تھا۔ چٹہ کہا کرتا تھا، سعیدہ کا بیٹا اسی خدات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورزہ اس کا نام کبیدہ کا بیٹا ہی تھا، خوش شکل تھا اور بہت کم گو، چٹہ بھی کبھی اسے کچھوا کہا کرتا تھا، اس لیے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اسے غریب فوڈ رکھتے تھے، جیسا کہ باؤ کے ایک مہتمل گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں یہاں چلا آیا تھا، تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار منظور تھی۔ ایک سو برس ہو گیا تھا ملازم ہونے مگر اس دوران میں اس نے صورت ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لے لیے تھے، وہ بھی پٹے کے لیے کہ اس پر ایک بڑے خوشنود چٹان کے قرض کی ادائیگی لازم ہو گئی تھی۔ ادب لطیف قسم کی عبادت میں غلی کہانیاں کھنسا اس کا شغل تھا کچھ بھی شعری موزوں کر دیتا تھا، کا بیٹا کا شعر نفس اس کا مقروض تھا۔

ٹیکٹل اور مقبیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور ہر ایکس نام خستہ نام زندگی گزارنے کا شریک تھا۔ ایشل کے ایشل کی کوشش میں ہماری مصروفیت رہتی تھی۔

بڑے تھے، میں چٹا، سیدھا اور پیٹ لواز فٹری کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اگلے گراہ میں نہیں جاتے تھے۔ ہر گز سیریکائی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں کا کچھ کے بڑے عکس میں بھی جوتے تھے۔ ایک اگلے گراہ میں چلنا اور کچھ دیر بیٹھ کر عکس میں سے کچھ معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ بالکل اپنے ایشل میں مصروف رہتے۔ جو اسسٹنٹ تھے کے دل تھے وہ عکس کا اگلے گراہ کرتے تھے۔ یہی بات ہے اس کو اس کو سوا سلف لایا۔ کچھ لاٹری میں اس کے کچھ لکھنے سے آئے اور کچھ اس کے مدتے کچھ کھلا دیا۔

ان میں سے کچھ اندر کی گزرتا تھا۔ سب کے سب سیدھے تھے، ایشل اپنی کیمڈی، وہ اپنے حالات کی اسی حالت کا ڈرامہ بھی کہتے تھے تو بڑے شادمان و گرامان۔ اس میں ایک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔ ہم کایک کے کیمڈی میں ایشل ہونے والے تھے کوٹریب لواز صاحب، ابراہم تھے۔ چٹے سے لہان کوٹریب طور سے دیکھا اور اپنی چیمپ میں ایشل کی کوٹریب کا لے لیر گئے اس نے کچھ کوٹریب لواز کو دیکھ اور کہا۔ چار تو تیس اسکا کچھ چاہیں گے آپ چوری کر دیجیے گا۔ بیشی بدو نو بدھے لایا۔ لی جانتے؟

کوٹریب لواز کے جید آبادی ہزٹوں پر گری سائزلی مسکو بیٹھ نورادہ سوتی۔ چٹا کھلکا لواز جیسا اور سری طوط و کچھ کر اس نے کوٹریب لواز سے کہا۔ یہ مشورہ کر نہیں..... لیکن ان سے ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں ملی سکتی یہ نرم پٹے ہیں۔ شام کو اسکا چاہئے تو..... لیکن آپ جانتے؟

کوٹریب نورادہ چل گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چٹے نے زندگی بھائی اور نرم کی بڑی ایشل جو نصف سے زیادہ خالی تھی اس نے مدافعتی میں مقدار کا مسری انداز دیکھا اور نوکر کو وارڈی تھرا آگشتان کے خیر لہے۔ جب وہ نورادہ بڑا تو اس نے اپنے کلاس میں ایک جڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا۔ زیادہ پی گیا ہے کم بخت؟

یہ کلاس ختم کر کے وہ کچھ ٹکوندہ ہو گیا۔ بارہ بجائی کو تو خواہ خواہ یہاں لائے۔ خدا کی قسم مجھے اپنے بیٹے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر اس نے خود ہی اپنے کو ٹیکس دی۔ لیکن یہ خیال ہے کہ لوزر نہیں ہوں گی وہاں؟ میں نے کہا۔ ہاں وہاں رہ کر دوسرے نقل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی۔ اور میں نے اپنے کلاس میں نرم ڈالی جس کا ڈانٹہ ہے ہونے کو کی طرح تھا۔

جس کباب ڈانٹا میں ہم بیٹھے تھے اس میں ملاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جس سے باہر کا فضا آباد محض نظر آتا تھا۔ دوسرے کسی نے آباداز بند چٹا کا ہم نے کہہ رکھا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میوزک ڈائریکٹریں کٹرے سے۔ کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس لسل کا ہے۔ شگولی ہے۔ ہمیشی ہے۔ آئے ہے۔ پایکا بلا ہے۔ کچھ کچھ اس کے کسی خدخال کو دیکھ کر کئی کسی نتیجے پر پہنچے ہی والا ہوتا تھا کہ اس کے تعالیٰ میں کوئی ایسا نقش نظر آتا کہ فوراً ہی اسے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا تھا۔ ویسے وہ

رہنما۔ کوئی اور بھی کیسی ٹھیک ٹھاک کے بجائے اس کے چہرے بڑے حیرت انگیز طریقے پر طرز ہوئی، چینی ٹھیک ٹھیک کے مطابق سروں کے لیے بہت ننھی سی تھی جس کا تعلق ہوا راست ٹھیک سے ہوتا ہے اس نے مجھے دیکھا تو چلا یا منٹو۔۔۔۔۔ منٹو سیٹھ؟

بھڑے نے اُس سے زیادہ اچھی آواز میں کہا: تیس ٹھیک ایسی سی۔۔۔۔۔ جیل اندر آ۔

وہ فوراً اندر گیا۔ رنج حبيب سے اُس نے ہنستے ہوئے دم کی ایک یونٹی نکالی اور بتائی کہ کوئی دیکھ رہی ہیں ساتھ اُدھر کی کپاس گیا۔ وہ بولا: تو ارازیٹہ آئے لا۔۔۔۔۔ میں ہلا سا ہاں پر ہڈی کوڑو ہوئے کو سکتا ہے۔۔۔۔۔ سا لا لا دم نہ تھا سا لا منٹو ہے۔

بھڑے نے دن کترے کے کدو ایسے سر پر ایک وصول ہائی۔ اب چپک کر سنے کے۔۔۔۔۔ تو دم لے آیا۔۔۔۔۔ جس ٹھیک ہے۔ دن کترے نے اپنا سر سولا اور میرا حال گلاس اُٹھا کر اپنے لیے پیگ تیار کیا۔ منٹو۔۔۔۔۔ یہ سا لا آج بتے ہی کہنے لگا۔ آج پینے کو بھی چاہتا ہے۔۔۔۔۔ میں ایک دم کولا۔۔۔۔۔ سوچا کیا کروں۔۔۔۔۔

بھڑے نے ایک اور دھپا اُس کے سر پر بھاپا یا بجھلے جے، جیسے نوے کچھ سوچا ہی ہو گا۔

”سوچا نہیں تو سا لا یہی بڑی ہائی کاس سے آیا۔ تیرے باپ نے دیا ہو گا۔ دن کترے نے ایک ہی جوتے میں دم ختم کر دی۔ بھڑے نے اُس کی بات سنی اُن سنی کر دی اور اُس سے کہہ دیا۔ تو یہ تو جاکر لی کیا ہو گی؟۔۔۔۔۔ پہلی تھی؟۔۔۔۔۔ سوزیل کب آئے گی؟۔۔۔۔۔ اسے ہاں۔۔۔۔۔ وہ ٹیٹم بلونڈ آ۔

دن کترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر بھڑے نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا شروع کر دیا۔ منٹو۔۔۔۔۔ خدا کی قسم کیا چیز ہے۔

”سنا کرتے تھے ایک شے ٹیٹم بلونڈ بھی جوتی ہے۔ مگر دیکھتے کہ اتفاق کی جوتا۔۔۔۔۔ بالی، جیسے چاندی کے میں میں نہ۔۔۔۔۔

گریٹ۔۔۔۔۔ خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ۔۔۔۔۔ لی زلفہ ہاں آ پھر اُس نے تو کوڑو لگا ہوں سے دن کترے کی ہوت دیکھا اور کوئی کر کا کی کترے کے بچے۔۔۔۔۔ غور کیوں نہیں لگاتا۔۔۔۔۔ لی زلفہ ہاں آ۔

پھر سے اور دن کترے دونوں نے لی کتری زلفہ ہاں کے کئی غورے لگاتے اس کے بعد دن کترے نے بھڑے کے سروں کا پیر

جواب دینا چاہا مگر اُس نے اُسے خاموش کر دیا۔ چھوٹو ہاں۔۔۔۔۔ میں جذباتی ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔ اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام

طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں جنہیں کالی کشا سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے۔۔۔۔۔ مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ منٹو۔۔۔۔۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے اُس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں۔۔۔۔۔ چاندی کا رنگ بھی

نہیں کہا جا سکتا۔۔۔۔۔ معلوم نہیں ٹیٹم ہاں کیسا بڑا ہے، کیونکہ میں نے ابھی تک یہ وحشت نہیں دیکھی۔۔۔۔۔ کچھ حبيب ہی سا

رنگ ہے۔۔۔۔۔ فرلا اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے۔۔۔۔۔

دن کترے نے دوسرا پیگ ختم کیا۔ اور اُس میں تھوڑی سی تھری ایکس دم کس کر دی جاتے تے

چپتے نے پھانک کر اس کو ایک قرعہ اُتار دیا گالی دی۔۔۔۔۔ بکواس نہ کہ۔۔۔۔۔ پھر اس نے بڑی دم اٹھیز نظروں سے میری طرف دیکھا

”یار۔۔۔۔۔ میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہ رنگ۔۔۔۔۔ خدا کی قسم لا جواب رنگ ہے۔۔۔۔۔ وہ تم نے

دیکھا ہے۔۔۔۔۔ وہ ہر گھٹنوں کے پیٹ پر جوتا ہے۔۔۔۔۔ نہیں نہیں ہر گھٹن ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پوسٹرٹ بھلی۔۔۔۔۔ اُس کے وہ

کیا ہوتے ہیں؟ نہیں نہیں سارنوں کے وہ نئے نئے کچرے ہاں کچرے بس ان کا رنگ کچرے یہ غلط مجھے ایک ہندو ستوڑے نے بتایا تھا آجی خوبصورت چمڑا اور ایسا دھبہ نام پنہال میں ہم انھیں پھانے کہتے ہیں اس شخص کو چھپناٹ ہے وہی باطل وہی جو اس کے بالوں میں ہے ٹیٹوں نعلی سنیویدیاں معلوم ہوتی ہیں جو ٹٹ نکال رہی ہوں "وہ ایک دم اٹھا، پسوہوں کی دس ٹیس میں جذباتی جرجیا برلیاؤں کترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا۔ وہ گہرا ہوتا ہے؟"

چٹے سے فہرے اب دیا سنٹی غٹل "نیکس تو کیا سمجھ گا، بالائی باجی رات اور ناتا فروریس کی اولاد؟" وہ کترے نے اپنے لیے ایک اور چم بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ سالانہ دہ گھنٹا ہے۔ میں انگلیش نہیں گھنٹا ہوں۔ میٹری کو لیٹ ہوں۔۔۔۔۔ سالامیرا! آپ مجھ سے بہت غارت کرنا تھا۔۔۔۔۔ اُس نے۔۔۔۔۔"

چٹے نے جھڑک کر کہا، "اُس نے مجھے تان سین جتلیا۔۔۔۔۔ تیری ناک موڈ دی کہ کترے سر آسانی سے خیرے دندے نکل سکیں بچپن ہی میں اُس نے مجھے دھڑکا لانا سکھا دیا تھا۔ اور وہ دھڑکے کے لیے تو میں کی ڈڑی میں رو پاتا تھا اور شیشا بکرتے وقت اٹار میں اور تو نے پہلی بات پٹ دیکھی میں کی تھی اور تیرا پ جگت اُتار تھا۔ پھر باؤڑے کے بھی کان کھاتا تھا اور تو آج اس کے کان کا ٹٹا ہے، اس لیے تیرا نام کن کترے ہے؟ اُٹا کہ کہہ مجھ سے مخاطب ہوا، منٹو یہ سالامیرا بھی پٹا ہے، اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے وہ اس سے بات کرتا تھا تو مجھ پر اُس نے یہ احسان کیا ہے اور اُس نے اُسے میٹر کو لیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی لے کی ڈوگری پھال کے پھینک دوں؟"

وہ کترے نے اس پر چھال کی ممانعت کرنا چاہی مگر چٹے نے اُس کو روک دیا تو چپ رہ میں کچرے ہوں کہ سنٹی منٹل جرجیا ہوں ہاں وہ رنگ پوٹریٹ پھیل کے نہیں نہیں سانپ کے نئے نئے کچرے بس انہی کا رنگ "میں نے خدا معلوم اپنی میں پر کوسا رنگ بجا کر اس ناگنی کو باہر نکالا؟" وہ کترے سوچنے لگا، "ٹپٹی حکاؤ، میں بجاتا ہوں؟"

چٹہ کھسکا کر منٹے لگا، "ٹپٹی میٹری کو لیٹ کے چاکر لیٹ اُس نے دم کی بوتل میں سے دم کے باتیات اپنے گلاس میں اٹھائے اور مجھ سے کٹا منٹو، اگر ٹپٹم بلوڈ منٹری تو منٹو ہمارے پار کی کسی اونچی جوتی پر دھرنی مار کر بیٹھ جائے گا؟" وہ اُس نے گلاس خالی کر دیا۔

وہ کترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کو منٹری شروع کی، "منٹری، ٹپٹی ایک دم پنا نکل ہے؟" میں نے کہا، "دیکھ میں گے۔"

"آج ہی آج رات میں ایک پارٹی ہے، ہا ہوں، یہ بہت ہی اچھا ہوا تو تم آگئے اور شری ایک سواٹھ منٹا ہی نے نکھاری وہ جس سے وہ اڑ رہا نہیں ہے دیا، وہ منٹری منٹل جرجا جاتی آج کی رات؟" چٹے نے بڑے ہنسنے سے کہہ دیا کہ "شروع کر دیا۔"

آج کی راست ساز درد نہ چھپے لڑا

وہ کترے پھلر، اُس کی نوا داتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب لوازدہ درخت کھار گئے۔ دونوں کے پاس اسکا کچ کی دو دو تھلیں تھیں۔ یہ انھوں نے میز پر رکھیں۔ درخت کھار سے میرے اچھے خالصے مراسم تھے، مگر بے تکلف نہیں اس لیے ہم دونوں نے تھوڑی سی، آپ کب آتے، آج ہی آیا مایوسی دہی گھٹو کی اور نکلاں ٹکڑ کر چنے میں مشغول ہو گئے۔

چند عوامی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اُس ٹیٹم بلڈ کا ذکر لے آنا تھا۔ درخت کھار دوسری بوک کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ طرب لوازدہ اسکا کچ کے قریب چلے گئے تھے۔ لٹنے کے معاملے میں اُن سب کی سطح ایک ایک تھی۔ میں چھٹکڑیادہ چنے کا عادی ہوں اس لیے میرے جذبات معتدل تھے میں نے اُن کی گھٹو سے اندازہ لگا یا کہ وہ چاندن اس نئی بوک پر بہت بُری طرح نرفتہ تھے جوئی نے کہیں سے بیدار کی تھی۔ اس نایاب والے کا نام فیس تھا۔ بارے میں کوئی ریزٹورینٹ سٹون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اُس کے ساتھ عام طور پر ایک بچہ لڑکا لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب لوازدہ وہاں تک اُس پر گرم تھا کہ وہ جیلز آباد میں آتے تھے کوہا لڑکے پر کڑی اس داؤں پر لگانے کے لیے تیار تھا۔ چڑے کے پاس ترب کا سونہ ایک ہڈا تھا، اچھا بول سورت ہونا اُن کترے کا زم خور خیال تھا کہ اُس کی بیٹی میں کوہری ضرور شیشے میں اُتر آئے گی۔ اور درخت کھار جہاں اُن قدم ہی کو کا گر گھستا تھا..... لیکن سب آخر میں ہی سوچتے تھے کہ وہ کبھی اُس پر ہریان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس ٹیٹم بلڈ کی کس کوہورت جسے میں نے چڑے کے ساتھ ٹانگے میں رکھا تھا، کسی کے بھی اواسے کو سکتی تھی۔

فیس کی باتیں کرتے کرتے چڑے نے اپنا تک اپنی گھڑی دیکھی، اور مجھ سے کہا۔ جنم میں جائے یہ کوٹریا۔ چلو باب.... جہاں وہاں کیا بھری ہوگی۔ لیکن نصیبت یہ ہے کہ میں کبھی وہاں بھی سنسٹیٹل نہ ہوا ہوں.... خیر۔ تم مجھے خیال دینا۔ آجے گا اس کے چند آخری قطرے عقل میں ٹپکا کر اُس نے نوکر کا نوا داتی میوں کے خاکے کے شہنشاہ ہے۔ میوں کے ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا، جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کھوکھا کے اہل نکلا ہے۔ چڑے نے اُس کے چہرے پر دم کے چھینٹے مارے اور کہا، دو عدد ٹانگے لاؤ..... جو دوسری دفعہ معلوم ہوں۔

ٹانگے آ گئے۔ ہم سب ان پر لڑکے پر بھات نگر دانہ برے۔ میرا پانا ٹانگوں کا سا قی برٹش گھر پر موجود تھا۔ اس نمودار جگر پر بھی اُس نے میری چوڑی کی خاطر دلدار اندر میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا تھا۔ پہلے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو ساڑھا۔ کھار تھا، چنانچہ بہت کرا آمد ثابت ہوا۔ میری چوڑی نے غیض و غضب کا اظہار دیا۔ اُس کا رخت وہاں کچھ اچھا ہی کنا تھا۔ برٹش نے جو لوگوں کے نفسیات کا بڑا تھا، بڑی بے تکلف باتیں کیں، اسی طرح میں میری چوڑی سے درخواست کی کہ وہ اُس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جاس۔ نمودار نے دانی تھی میری چوڑی نے بوجھا۔ کوئی کا نا اظہار ہے ہیں آپ؟

برٹش نے جواب دیا جی نہیں۔ وہ کل کا پودا گرام ہے..... میرا خیال ہے آپ کل چلے گا۔
برٹش کی چوڑی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور کھوکھا کھار کا عاجز آئی ہوئی تھی۔ اُس نے نمودار جی میری چوڑی سے کہا۔ انا کا شیک دے گا۔ توہ تو انھیں سفر کی تنگی بھی ہے۔

ہم سب نے ایلیناں کا سانس لیا۔ ہرٹش نے پھر کچھ دیر تک پُر غفلت باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا: چلو بار — تم پہلے سے ساتھ آؤ میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کو بھڑو..... سید صاحب تمہاری کمانی سنا چاہتے ہیں۔“ میں نے ہیری کی طرف دیکھا اور ہرٹش سے کہا: آں سے اجازت لے لو۔“

ہیری سادہ لوح یروی بال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہرٹش سے کہا: میں نے مجھے سے پہلے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکیومنٹ کیس ساتھ لے چلیے، پراخوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں — اب یہ کمانی کیا سناؤں گے۔“ ہرٹش نے کہا: کڑبائی سناؤ گے گا۔ پھر اس نے ہیری طرف یوں دیکھا جیسے کہ رہا ہے کہ ہاں کو جلدی۔ میں نے ایلیناں سے کہا: ہاں ایسا ہو سکتا ہے؟

پڑے نے اس ڈور سے تنگ سیل جج دیا۔ تو سبی ہم چلتے ہیں۔“ اور دو تینوں مٹھو کر سلام فیسے کر کے چلے گئے تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہرٹش نکلے۔ پر جہات ٹگر کے باہر ٹانگے کھڑے تھے۔ پڑے نے جیس دیکھا تو زور کا لغو بلند کیا۔ مابہ ہرٹش چند زورہ بار.....“

ہرٹش کے سوا ہم سب ملی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کو اپنی ایک سیلی سے ملے جانا تھا۔ یہ بھی ایک کالچ فنی شکل وصوت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کالچ جیسی، مگر بہت صاف ستھری جن سے ملی کے سیتے اور فریے کا پتہ پلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر چیز جہاں تھی سبھی ہوئی تھی۔ پر جہات ٹگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی تجربہ نامہ ہوگا، مگر اس ٹگر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی فریاض تھا جیسا کہ ایک اوسلوورجہ کا ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن ملی کی ٹگر کے مقابلے میں وہ جوانی جہاں دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ میک اپ نہیں تھا۔ ہمیں نے ملی کے گھر لوں والے چہرے کو دیکھا تھا۔ جب ملی ڈرائنگ روم میں آئی، تو میں نے سوچا کہ گرد و پیش کی تفتی چیزیں ہیں۔ وہ آج کی نہیں، بہت برسوں کی ہیں۔ صرف ملی آئے گئے کل کو لڑھی ہو گئی ہے۔ اور وہ ویسی کی ویسی بڑی رہی ہیں — اُن کی بو بڑھ چکی، وہ وہیں کی وہیں رہی ہے..... لیکن جب میں نے اُس کے گھر سے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ غرض پیش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گرد و پیش کے ماحول کی طرح پیچیدہ و متعین طور پر جوان بن جائے۔

پڑے نے اُس سے پیر نقد و نظر کر لیا، جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اُس نے ملی کے تعلق مجھ سے یہ کہنا بھی ہے..... وہی گریٹ ملی.....؟

ملی اپنی تعریف میں کہہ سکا۔ اور میری طرف دیکھ کر اُس نے پڑے سے انگریزی میں کہا: تم نے چاہے منگوانی تھی حسب معمول منارت اف تفری میں۔۔۔ معلوم نہیں انھیں پسند ہی آئی ہوگی یا نہیں۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی: ٹیٹر مشنوں میں بہت شرمندہ ہوں..... اصل میں سارا قصہ تمہارے دوست پڑے کا ہے۔ جو میرا قاتل اسلحہ لگا ہے۔“

میں نے مناسب دواؤں الفاظ میں چاہئے کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ ملی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور پڑے سے کہا: رات کا کھانا تیار ہے..... یہ میں نے اس سے کہا کہ تم عین وقت کے وقت میرے سر پر سوار ہو جاؤ گے.....“

چٹے نے لی کو گلے سے لگایا۔ ”یو آؤ بے جہول می..... یہ کھا ادب ہم کھاتیں گے۔“

لی نے چونک کر پوچھا۔ کیا؟..... نہیں، ہرگز نہیں۔“

چٹے نے اُسے بتایا۔ مسز منٹو کو ہم پر بھارتی گر چھڑ آئے ہیں۔“

مٹی چٹائی۔ ”خدا تمہیں غارت کرے۔۔۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔“

چٹہ کھٹکھٹا کر ہنسنا۔ ”آج پارٹی ہو مرنے والی تھی۔“

”وہ تو میں نے مسز منٹو کو بچتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی۔“ مٹی نے اپنا سرٹ سلگا یا۔

چٹے کا دل ڈوب گیا۔ خدا اب تمہیں غارت کرے..... اور ہر سب چلیں ہم نے صورت اس پارٹی کے لیے بنایا تھا۔“

”وہ کرکریا اس زور ہو کر بیٹھ گیا اور کرکے کے ہر قدم سے غائب ہو کر کھٹے لگا۔ کوسار سے خوب عیاں ہو گئے..... چٹٹی لم بلونڈ

..... اونٹ سے سانپ کے خفے خفے کچھو کے جیسے رنگ دانے بال..... ایک دم اُس نے اُٹھ کر لی کو بانڈوں سے بچا لیا۔

کینسل کی تھی۔۔۔۔۔ اپنے دل میں کینسل کی تھی نا..... کوسا پر صاف بنا دیا تھا۔“ اور اس نے لی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت

بڑا صاف بنا دیا اور بار بار بلند پگھلا۔ ہرے۔۔۔۔۔ آ

مٹی مسند توگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چٹے کو دیکھ کر انہیں بچا ہتی

تھی چنانچہ اُس نے بڑی شفقت سے اُس کے ٹال پھینچتا ہے اور کہتا۔ ”تم گم نہ کرو..... میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔“

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔ چٹے نے ٹوشی کا ایک اور ٹوہرہ بند کیا اور وہاں کترے سے کٹا۔ جنرل دن کترے۔۔۔۔۔ جانو

ہیڈ کارٹروڈ سے سادھی توڑیں لے آؤ۔“

دن کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ سعیدہ کلویج بائیکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ توڑیں

لے کر واپس آگیا، ساتھ اُس کے چٹے کا نوکر تھا۔ چٹے نے اُس کو دیکھا تو اُس کا استقبال کیا۔ ”آؤ، آؤ۔۔۔۔۔ میرے کدو قاف

کے شہزادے..... وہ۔۔۔۔۔ وہ سانپ کے کچھو کے جیسے رنگ کے بالوں والی لڑکی آ رہی ہے..... تو ابھی قسمت

آزمائی کر لیتا۔“

دعیت کمار اور عزیز نوادہ دونوں کو چٹے کی یہ صلے عام ہے یا راجی نکستہاں کے لیے، حال بات بہت ناگوار معلوم

ہوتی۔ وہ دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ چٹے کی بہت بے پروگی ہے۔ اس بیرونی کواٹروں نے بہت محسوس کیا تھا۔ چٹہ حسب عادت

اپنی ہاکٹاد اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ کم لی کر ایک دوسرے سے اپنے دلوں کا اظہار کرتے رہے۔

میں بھی کے منتظر سوچتا رہا۔ ڈور انگ روم میں، عزیز نوادہ، دعیت کمار اور چٹہ بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے

چھوٹے بچے ہیں، لیکن ان کا اس باہر کھلنے بیٹھے گی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ چٹہ مطمئن ہے کہ سب بڑھیا اور چھا کھلنا اُسے ملے گا،

اس لیے کہ وہ اپنی اس کا بھیتا ہے۔ بالی دو کاظم جو نگر ایک جیسا تھا اس لیے وہ ایک دوسرے کے محسوس ہی گئے تھے..... ٹرلر

اس ناول میں دو دوسرا معلوم ہوتی تھی اور وہ بیٹھ بیٹھ..... اُس کا قصور ایک چھوٹی سی گڑبا کسا خدا داغ میں آ تھا۔

ہر فدا ہر عامل کی مرضی موسیقی ہوتی ہے..... اس وقت ہر موسیقی میرے دل کے قانون کے پہنچ رہی تھی۔ اس میں کوئی مشد
استعمال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے ماں اور اس کے بچے اور اس کے باپ کی رشتے کی طرح قابل فہم اور یقین بخشی۔

میں نے جب اُس کو سامنے میں چٹکے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جہاں بانی جس کو وہ پہنچا تھا مجھے افسوس ہوا کہ میرے لئے اس
ان دونوں کے عشق و اہیات خیال پیدا ہوئے لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شہوانی یک اپ کیوں کرتی ہے جو اُس کی
تجربوں کی توہی ہے اُس غما کی کشمکش ہے جو اُس کے دل میں چٹکے مغرب نما زانوؤں کترے کے لیے موجود ہے..... اور خدا
معلوم وہ کس کس کے لیے.....

باقوں باقوں میں بڑے سے بڑے نے پرچیا۔ "یارِ معرّے تو تبارِ تمھارا بھی اتنا طوطا خِ میبک اپ کیوں کرتی ہے!"

اس لیے کوئی بار شورش چیز کو پسند کرتی ہے..... تمہارے اور میرے جیسے آقاؤں کو دنیا میں بہت کم ملتے ہیں جو مدغم نہ ہوں۔
 مدغم نہ ہونا پسند کرتے ہیں، جو جوانی کو کچھیں کے نوپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور..... اور جو بڑھاپے پر جوانی کا طبع پسند نہیں
 کرتے..... ہم جو خود کو راشٹ سمجھتے ہیں، ان کے بچے ہیں..... جس شخص کو ایک دلچسپ واقعہ ملتا ہے وہ..... وہ کیا کھیلا میل
 تھا..... تمہارے بہت سے ہیں..... رام باغ کے اس بار میں جہاں کھیلایاں رہتی ہیں..... جاٹ گزردے تھے.....
 ایک صحت مند جوان نے..... خالص دودھ اور کھس پر پلے ہوئے جہاں نے جس کی نئی نئی آس کی مانتی پر پانی
 گری کر رہی تھی، اور ایک کوٹھے کی طرف دیکھا، جس کی تل میں چڑھی ہوئی بھراں، اس کے ماتھے پر بڑے بدنام طریقے پر لگی ہوئی
 خفیں اور اپنے ساتھی کی پیٹوں میں شکرانہ کے کہا..... اونے اٹھاسیاں..... جو رخ اسے اور جو رخ..... اس نے
 پندوہت بھلائی ہی..... ہنری لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا۔ حالانکہ وہ اس مسئلے کا بالکل بالکل نہیں تھا، کھلنے کے جتنے نکال اور
 میرے گلاس میں دم ڈال کر ڈال اس جاٹ کے لیے وہ چڑی ہی اس ذات کوہ تان کی پری تھی..... اور اس کے گاؤں کی سینٹ
 جیل تیار میں ہے ڈول بھی نہیں..... ہم سب چھپر ہیں..... دریا نے درجے کے..... اس لیے کہ اس دنیا میں کوئی
 چیز اول درجے کی نہیں..... نیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی..... لیکن..... لیکن فی سن.....
 خاص الخاص درجے کی چیز ہے..... وہ صاحب کے کھروں.....؟

فون کترے نے اپنا گلاس اٹھا کر میڈے کے سر پر ڈال دیا بکھرے..... بکھرے..... تمہارا سسکا بھر گیا ہے۔
 میڈے نے اچھے پر سے نرم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیے اور یوں کترے سے کہا اے اب سنا
 تیرا! پالا لہجہ سے گفتی بات کرتا تھا..... میرا مانا اب کا ٹھنڈا ہو گیا ہے!

ذنِ نحر سے بہت مجید، ہر کلمہ سے مخاطب ہوا۔ "ہاں گاڑ..... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا..... میں تعیشیں
 اتر رہا تھا کہ اس نے میری شادی نہادی۔"

چند دنوں سے ہنسنا۔ تھیں کارٹون بنا دیا اُس سارے نے..... بھگوان اُسے سُورگ میں کیسٹریکامیٹی کے کرداروں
 بھی اُسے بجا بجا کر تھادی شادی کے لیے کوئی خوبصورت خورد و صوند ڈال رہے۔

”تھاری پہلی کی رسی تھیں..... فی س کی بات کرو..... اس سے زیادہ اور کوئی تو بصورتِ نہیں ہو سکتا۔“ پڈے نے غریب نواز اور نجیت کمار کی طرف دیکھا جو کہنے میں بیٹھے فی س کے حشر کے متعلق اپنی راستے کا اظہار ایک دوسرے سے کرتے رہے تھے۔ ”گئی پاؤ ڈر پلٹ کے بائیں..... سن تو تھاری کوئی سازش کا صاحب نہیں ہوگی۔۔۔ میدان ہڈے کے ہاتھ رہے گا..... کیوں ویلے کے شہزادے؟“

ویر کا شہزادہ آدم کی خالی ہوائی جہاز کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پڈے نے منتظرہ لگایا اور اس کو آدھا نکاس بھر کے دے دیا۔

غریب نواز اور نجیت کمار ایک دوسرے سے فی س کے بارے میں گول لال کے بایں کو کر رہے تھے گوا پیسہ داغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں عظیمہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرزِ گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اب پہلی کے بلب روشن تھے، کیونکہ شام گہری ہو چکی تھی۔ پڈے مجھ سے بیچ کی فلم ڈسٹری کے اڑھ حالات سن رہا تھا کہ باہر رات دس بجے میں ہی کی ٹیریزز آواز سنائی دی۔ پڈے نے تہیہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے نجیت کمار کی طرف اور نجیت کمار نے غریب نواز کی طرف معنی غیر نظروں سے دیکھا، چہرہ دونوں دردناک کی طرف دیکھنے لگے۔

فی س جتنی ہوائی اندر داخل ہوئی، اس کے ساتھ چار پانچ ریٹائرڈ میٹروں کو کیاں تھیں۔ مختلف تعداد میں آدمیوں نے ان کی طرف ڈولی کھینچی، ایلا اور جیلا..... اور وہ بیچڑا تھا لالہ..... اس کو پڈے ہنسی کہہ کر لگا کر تھا۔ فی اس سبب آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی پڈے کے ساتھ اس کا ایک بازو اس پلیٹنم ہوش کی پہلی کمر میں خالی تھا اس نے غریب نواز اور نجیت کمار کا ردِ عمل نوٹ کیا۔ ان کو پڈے کی بیغاشی تختہ انداز حرکت پسند نہ آئی تھی۔

طاہروں کے تازی جوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم امنی انگریزی برسی کہ دن کسے بچری کو پیش اتھان میں کئی بار فیمل ہوا۔ گھر اس نے کوئی پیمانہ نہ کی اور برابر بولتا رہا جب اس سے کسی نے شکایت نہ کرتا تو وہ آجما کی بڑی ہنسی تھا کہ ساتھ ایک صوفے پر راگ جیڑ گیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے نئے کوڑے سیکھے ہیں۔ وہ اور صوفائی ہنکرت اور تھیں تھیں کی دن، مو، تھری جانا کہ اس کو کوڑے بتا رہا تھا، اُدھر چڑھ جاتی لوگوں کے جھگڑ میں انگریزی کے ٹکٹے لنگے لنگے سنار رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں نہائی یاد تھے۔۔۔ می سوڑے کی بوتلیں اور گرگ کا سامان منگوا رہی تھی۔۔۔ نجیت کمار سگرٹ کے کش لگا کر کھینچی ہانڈ سے فی س کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نواز می سے بار بار کہتا تھا کہ وہ بچہ ہونا تو وہ اس سے سنے۔

اسکاج کھلی اور ہلکا نور شروع ہوا۔ فی اس کو جب شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو اس نے اپنے بیٹھنی ہالوں کو ایک خفیہ سا جھک سے کرانٹا کر دیا کہ وہ دسکی نہیں پیا کرتی۔ سب سے اصرار کیا مگر نہائی۔ پڈے نے بدلی کا اظہار کیا تو فی نے فی اس کے لیے ہلکا سا مشروب تیار کیا اور نکاس اس کے مینٹریں کے ساتھ لگا کر بٹسے پیار سے کہا ”بہادر لڑکی نواہی جاؤ۔“

فی اس اظہار کر سکی۔ پڈے خوش ہو گیا اور اس نے اسی خوشی میں میں کچھیں اور لڑک سنائے۔ سب مفرے جیتے رہے۔۔۔

میں نے سوچا، عربانی سے کتاب اگر انسان نے ستر پوش اختیار کی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اکتا کر کبھی کبھی عربانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ بلا تسکین کا وہ عمل یقیناً فاسقہ کی ہے۔ اس فرد کا نفسی طور پر ایک دلکش پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ربات مسل یک، ایٹلی کی کوفت سے چند گھنٹوں کے لیے نجات مل جاتی ہے.....“

میں نے لی کی طرف دیکھا جو بہت جشاش جشاش ہواں لوگوں میں گھل مل چڑھے کے ننگے ننگے لوگ من کر نہیں رہی تھی اور تھمتے لگا رہی تھی — اُس کے چہرے پر وہی ادبیات، میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھڑیاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں..... میں نے سوچا، آخر لوگ کیوں فرار کو کرنا سمجھتے ہیں..... وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اُن کا کیا کر گویا تھا، لیکن ہاں اُس کا بے حد غرور بصورت تھا..... اُس پر کوئی بنا و سنگھار، غلغلہ، کوئی اجٹائشیں تھا۔

پہلے تھی وہ ایک کونے میں رخصت کمار کے ساتھ کھڑی، اپنے نئے فراق کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اُس سے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیار دی سے اس نے بڑے سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کوالی ہے، دو کٹھے تھے جو بظاہر بالکل بیکار و معلوم ہوتے تھے، مگر اب وہ ایک غرور بصورت پر خشاک میں تبدیل ہو گئے تھے — اور رخصت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو نئے ڈیس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اُس سے غلم کہنی سے اتنے روپے کشت ملنے کی بزرگ برکن امید نہیں تھی، ڈول تھی وہ غریب خانہ سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کو یقین دلایا کہ قرض کی کوئی پروا نہ ہے قرض ضرور ادا کر دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ دو پیر حسب محول بھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کے چارہ تھا، قیما لان کرتے سے تاخیر و ناج کے بڑے مشکل توڑے کیسے کی کوشش کر رہی تھی، دن کرتے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اُس کے پیر بھی اُن کے بول و ادائیں کو سیکھ لے، مگر وہ اس کو بتانے جا رہا تھا اور قیما لان بھی اسی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار پانا اور دن کرتے کا ذوق ضائع کر رہی ہے مگر بڑے غرق اور اشناک سے جتنی یاد کر رہی تھی، ایٹلا اور کوئی دھولوں پہے جاری تھیں اور اُس میں کسی آغوش کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلے ریس میں اُن دنوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹیپ دی تھی۔ اور پڑھ لی اس کے سانپ کے کچھرے ایسے رنگ کے بالوں کے گچھلے جوڑے سونے کی رنگ کی اسکرین میں ملا ملا کر لی رہا تھا۔ لی اس کا بیڑہ غنا و دست بار بار جیسے گنگنی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ لی کبھی اس سے بات کرتی تھی کبھی اُس سے، کبھی سوڑا کھلواتی تھی، کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی..... اُس کی نگاہ سب پر تھی اُس کی لی کی طرح، جو بظاہر تو انھیں بند کیے سستاتی ہے، مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا ضرارت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا؟..... لی کا وہ جھڑیلا اور شروع میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔

غائب کتا ہے ۔

قیدِ حیات و بندِ عیشم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی ظم سے نجات پاتے کیوں؟

قیدی حیات اور بندہ فہم چپ اسٹا۔ ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس نجات کے لیے کون ملک، المرن، کا احتیاط کرے..... کیوں آدمی چند لمحات کے لیے خود فیری کے لیے سب کچھ کرے۔ حقہ نہ لے۔

مئی سب کی تعریف میں رطب و افسا ہی تھی۔ اُس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں اس سب کے لیے قناتھی۔ میں نے سوچا شاید اس لیے اُس نے اپنے چہرے پر رنگ ہی بیا ہے کہ لوگوں کو اُس کی اصیت معلوم نہ ہو..... اُس میں شاید اتنی جہاں توت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی مال ہی نہ سکتی..... اس نے اپنی شہقت اور محبت کے لیے چند آدمی ہی جیسے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ مئی کو معلوم نہیں تھا۔ پڑھار ایک بچہ اچانک ہی اُس کو پانچ کا تھا چہرے پر بچے نہیں سب کے سامنے، مگر مئی اُس وقت اندر دہری خانے میں ہی ٹیوٹ پیس تلی رہی تھی..... اُس نے تھیں ہی تھی، بلکہ جگہ سردار میں جس طرح اُس کے پائل کیے ہوئے فواد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ ہلاتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ خون کترے، اچھا کو ٹوڑے سکھا سکھا کلاب اُسے تار ہا تھا کہ اُس کا باب سا اُس سے بہت عجب بت کرنا تھا۔ چاکٹر ڈر میں اُس نے اُس کی شادی بنا دی تھی اُس کی واقف بہت بیرونی تھی ہے..... اور غریب نواز، دلال کو قرض دے کر ٹھہر لیں چکا تھا۔ رنجیت کمار، پوتلی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ اچھا اور کچی دونوں جہاں بھڑکی باتیں کر کے اب تنہا گئی تھیں۔ تپانی کے اور گرد، فی سس، اُس کا بھڑکانا سنا تھا۔ اور مئی بیٹھے تھے۔ چٹا داب بندراتی نہیں تھا۔ مئی اُس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سورا پکھا تھا۔ اُس کو حاصل کرنے کا محرم اُس کی آنکھوں میں صاف موج د تھا۔ مئی اس سے خائل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد مئی اُس کا بیڑہ منادوست اٹھ کر صفر بردار ہو گیا اور اپنے بالوں میں گنگھی کوٹے کرتے ہو گیا۔ غریب نواز اور اچھا اُٹھ کر کہیں چلے گئے۔ اچھا اور مئی نے اُس میں کسی مارکٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے مئی سے رخصت لی اور مئی گئیں..... خون کتر نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور مئی اُس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ پہر تھیں کی طرف مئی اُس کے پاس پہنچی تھی اور اُس کو بازو سے پکڑ کر گاندو کھانے کے لیے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم ہالے کیا ہوا کہ چٹے اور گنگھی گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چٹے کی زبان لڑکھڑاہی تھی وہ ایک اختلاف بچے کی طرح مئی سے بدلتا ہی کرتے لگا۔ اُس نے دونوں میں صافحت کی مبینہ کوشش کی، مگر چٹے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ مئی اُس کو اپنے ساتھ سعید و لاکھ میں لے جانا ہوتا تھا۔ مئی اس کے خلاف تھی۔ وہ اُس کو بہت دیر تک بھجاتی رہی کہ وہ اس ادارے سے ہٹا گئے مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار مئی سے کہہ رہا تھا تم دو اپنی ہو گئی ہو..... بڑھوس دلا..... مئی اس میری ہے۔ پوچھ لو اس سے۔“

مئی نے بہت دیر تک اُس کی گالیاں نہیں سنیں، آخر میں ہٹے بھلنے والے انداز میں اُس سے کہہ چٹم، اائی سن..... تم کہیں نہیں سمجھتے..... شی از رنگ۔ شی از رنگ ا

اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک احتجاجی، ایک سرخس تھی، ایک بڑی پھیلاک نصیب تھی، گرجہ، بالکل نہ سمجھا، اُس وقت اس کے پیش نظر موت فی اس و اُس کا حصول تھا، میں نے فی اس کی طرف دیکھا اور میں نے سہل اندہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی شرکی تھی، بشکل چندہ وہ برس کی..... اُس کا سفید چہرہ، انفریقی باؤوں میں گھبراہٹ اور ش کے پٹے نظر سے کی طرح لوند ہاتھ چڑے تھے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور غلوں کے بیروں کے انداز میں اُسے اپنے سینے کے ساتھ چسپ کیا۔ مئی نے احتجاج کی کراخ بلند کی۔ ”چندہ..... چھوڑ دو..... خور کا ڈر میک..... چھوڑ دو اسے۔“

جب چندے نے فی اس کو اپنے چڑے سے سینے سے جدا کر لیا تو مئی نے اُس کے منہ پر ایک چاٹا مارا، گٹ آؤٹ..... گٹ آؤٹ! چندہ بھونچکا رہ گیا، فی اس کو جدا کر کے اُس نے وہ کھانا دیا اور مئی کی طرف تھراؤ اور نگاہوں سے دیکھنا باہر چلا گیا، میں نے اُٹھ کر رخصت لی اور پٹے سے کپکپاہٹ چلا گیا۔

سعیہ کا بیچ پرچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون قمیص اور بوٹ سمیت، ہتھک براؤنڈ سے منہ لیٹا تھا، میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بٹسے میز پر سر گیا۔

صبح دیر سے اُٹھا، گھڑکی میں دس بج رہے تھے۔ چندہ صبح ہی صبح اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا، میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اُس کی آواز سنی جو گالاج سے باہر زاری تھی میں ٹک گیا، وہ کسی سے کہہ رہا تھا، وہ لاہور رات ہے۔ خدا کی قسم وہ لاہور رات ہے..... ٹو مارکو کو اُس کی عمر کو بیچ کر تم بھی ایسی ہی کر لیٹ کر مارتو۔“

اُس کے بچے میں ایک عجیب و غریب فنی تھی۔ معلوم نہیں اُس کا رخ اُس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اُس شخص کی طرف جس سے وہ غائب تھا۔ میں نے زیادہ دیر وہاں ٹکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا، نصف گھنٹے کے قریب میں نے اُس کا انتظار کیا جب وہ نہ آیا تو میں پر بھارت نگر روانہ ہو گیا۔

بہری بیوی کا رواج مستند تھا۔ ہر ملش گھر میں نہیں تھا، اُس کی بیوی نے اُس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے، ہانے میں کافی قہر بیج ہو گئی تھی، اس لیے میں نے ہر ملش کی بیوی سے کہا کہ میں اجازت دے دی جائے، رسما اُس نے میں روکا جا یا، مگر میں سعیہ کو بیچ ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا وقت میرے لیے ذہنی جنگالی کے واسطے بہت کافی ہے۔ ہم چل دیے..... راستے میں مئی کی باتیں ہوئیں جو کچھ جوا تھا میں نے اُس کو سن دیا، اُس کا تہلیل و تمنا کہ فی اس اُس کی کوئی رشتہ دار ہوگا۔ یادہ اُسے کسی چچی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی، چچی اُس نے چندے سے ملائی کی..... میں خاموش رہا۔ اُس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گذرے پر پٹے کا خط آیا جس میں اُس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا اور اُس نے اپنے متعلق یہ کہتا تھا میں اُس لوند جرواں بن گیا تھا۔ محنت، ہوجھ بھرا۔

میں سینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پورے جہان بڑا سیدھا سعیہ کو بیچ بیچا، چندہ موجود نہیں تھا، غریب نواز سے اُس وقت ملاقات ہوئی، جب وہ گالاج سے باہر نکل کر شیریں کے خورد و سال بچے کو یاد کر رہا تھا، وہ بڑے تپاک سے ملا، چھوڑی رہا۔

کے بعد رنجیت کمار آگیا، کچھوسے کی چال چلتا اور نامواں بیٹہ لایا جس نے اس کے کچھ کو چھپتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چٹہ اس ذات کے بعد ہی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فی اس کو اس نے دوسرے روز بھی اپنے ہاں باپ کے پاس بھیجا دیا۔ وہ اس سچے و وفا لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی مٹی تھی..... رنجیت کمار کو نہیں تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پڑنے میں رہتی تو وہ ضرور اُسے لے کر آتا غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا۔ اُسے موت یہ ہانسوس تھا کہ وہ مر جائیگی۔

چٹے کے متعلق یہ پتہ ہلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت بامعاذ ہے..... بخار دہتا ہے، مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا۔ سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اٹھ کر پہلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا اس کا رخ گیاراج کی طرف تھا۔

میں غریب نواز سے گیاراج والی غریب کے متعلق کچھ پوچھنے کے لیے خود کو تیار کر دیا تھا کہ وہ کتنے سخت کھڑا ہو کر میں داخل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چٹے کو سخت بخار تھا۔ وہ اسے ملنگے میں یہاں لاد رہا تھا کہ اسے بیرونی بیرونی ہو گیا..... میں اور غریب نواز باہر دوڑے، ملنگے والے نے بیرونی چٹے کو سمجھا دیا تھا۔ ہم سب مل کر اُسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر منتر پڑھا دیا میں نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سوچ بچار ہی سے قطعاً کم نہ ہوگا۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلا دینا ہے۔ اس نے کئی کتھے سے ٹھکرے کیا۔ وہ دیکھی آتا ہوں کہ کمرہ چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ہی تھی جو باپ رہی تھی، اندر داخل ہوئے ہی اُس نے چٹے کی طرف دیکھا اور قریب قریب سوچ کر پوچھا کیا ہوا میرے بیٹے کو؟

وہ کتھے نے جب اُسے بتایا کہ چٹا کئی دن سے بیمار تھا تو میں نے بڑے رنج اور غصے کے ساتھ کہا تم کیسے لوگ ہو۔ مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور دن کتھے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چٹے کے پاؤں سسلانے کی دوسرے کو ہتھ دھانے کی اور تیسرے کو ٹیکھا کرنے کی۔ چٹے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، لیکن اُس نے تحمل سے کام لیا اور اکثر ملنگے پڑ گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گیاراج میں کیسے پتہ چلا۔ ملی کے جانے کے بعد فوراً وہ کھڑا ہوا آیا جب اُس نے استفسار کیا تو دن کتھے نے اس کے بیرونی ہونے کا اقرار بیان کر دیا، اور یہ بھی بتا دیا کہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سنی کہ رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک فرو ہو گیا۔

جس نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے، جیسے چٹے کی صحت کی ساری ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی ہے۔ اس کی ہدایات کے مطابق چٹے کے پاؤں سسلانے جارہے تھے۔ میری روت کی کشتیاں ابھی جاری تھیں جب ہی ڈاکٹر نے آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں رہا تھا۔ ڈاکٹر نے سسلانے میں کافی دیر لگائی، اس کے چہرے سے معلوم ہوا تھا کہ چٹے کی زندگی خطرے میں ہے، معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ہی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گیاراج

کے ٹاٹ کا پردہ مل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ملی آئی غریب نواز، لون کٹریے اور زنجیت کمار سے اُس نے فوراََ فودا گما کر گھرانے کی کوئی بات نہیں۔ چلو اب آنکھیں کھول کر دیکھو، دیکھا تھا می کو اُس نے حرکت کی گلا ہوں سے سینوں دیکھا تھا، لیکن وہ آنکھیں می محسوس کر رہا تھا چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ می کیوں اور کیسے آئی ہے تو اُس نے می کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہنا آئی، تو آرگٹ آئی۔
 ملی اس کے پاس پیگس پر بیٹھ گئی وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چٹے کے پتے ہونے لگے، ہر ہاتھ پر ہاتھ پر اُس نے سکوڑتے ہوئے صوفہ لٹا کر تیرے بیٹے..... میرے غریب بیٹے!“

چٹے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہنا نہیں — تمہارا بیٹا اول درجے کا سکاؤٹڈل ہے..... جاؤ اپنے حرم خاوند کا مقبول لاڈلو اور اس کے سینے پر دماغ دو!۔
 ملی نے چٹے کے لالہ پر ہونے سے ظہیر خاں اور انقبض بکواس ذکر و پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔
 سبک خان طلب ہو کر کہا، لوگو — چٹوہ بیابا ہے اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے — کجے؟
 سب بکھر گئے، غریب نواز نے فوراََ ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چٹے کو اٹھا کر اس میں بٹھا گیا وہ بہت کمنا دہا کر اتنی کوشش آفت لگتی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ملی کی کتنی دہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں فدا آرام رہتا ہے۔ چٹوہ بہت خندہ تھا، مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ملی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چٹوہ ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ ملی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے، یعنی پیگس یہ سن کر روبرو اوسان خطا ہو گئے خود ہی بہت پریشان تھی، لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چٹوہ بہت جلد صحت پر جائے گا۔
 علاج ہوتا رہا۔ پانچویں ہسپتال تھا، ڈاکٹروں نے چٹے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر ملی چھوڑ دیا، یہ سب گتیں۔
 اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور بخار چڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے یہی لے جاؤ، مگر ملی نے چٹے کو اسی حالت میں اٹھوایا اور اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پر نے میں نہیں شہر سکتا تھا، واپس اپنی زبا تو میں نے ٹیل فون کے ذریعے سے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پیگس کے حملے سے جان بچ کر ہو سکے گا، مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے، ایک ہفتے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے چند روز کے بعد ڈاکٹر قمری میری نے چٹے کا ایک خط دیا جس میں صوفہ یہ لکھا تھا،
 عظیم المرتبت ملی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچایا ہے۔“

ان چند فقروں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سند تھا۔ میں نے اپنی بری سے اس کا ذکر غلامی حملہ بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صوفہ لٹا کر کہا، اسی عورتیں تمہارا خدمت گزار کر رہی ہیں۔“

میں نے چٹے کو دوسری خط لکھے، جس کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ملی نے اس کو تبدیل کی آپ دوسرا کی جا ملانی ایک کے پاس لانا کر رہی اور تھا۔ چٹوہ وہاں تک کہ ایک سینہ دیا اور کہا کہ چٹوہ آیا جس کو وہ دھوکے سے بچنا اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیٹ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا، گلاس کی ٹو عا پند طبیعت، اسی طرح نوروں پر پتلی پڑی
بیادری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا کہ جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا شکار کرتا ہے، اب کہ وہ جان بوجھ گیا تھا اپنی خطرناک
حالات کے متعلق تفصیلی گفتگو سے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کا بیچ میں جلسے کی غیر حاضری کے دوران میں جوشی جھوٹی تبدیلیاں ہوتی تھیں۔ اہل بلور ان میں جھیل اور ٹیکسٹ کوس
اور اٹھ گئے تھے کیونکہ انہیں اپنی ذاتی فہم کمپنی قائم کرنے کے لیے سعیدہ کا بیچ کی نصیحتا سب دوزخوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان
کی جگہ ایک بنگالی سوزگ ٹاٹر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاسور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا
تھا۔ سعیدہ کا بیچ دے سب اس سے کام لیجے تھے۔ طبیعت کا سب شریف اور خدمت گذار تھا۔ چٹے کے پاس اس
وقت آیا تھا جب وہ ٹی کے کھنے پر لوٹا اور جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رعیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کا بیچ
میں رکھ دیا جائے۔ سین کے کمرے میں جو ٹگر بچہ خالی تھی، اس لیے اس نے وہیں اپنا ٹیڑھ بٹھا دیا تھا۔

رعیت کمار کو کمپنی کے نئے فلم میں حیرت و شجب کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہو تو اس کو
دوسرا فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چٹہ اپنی دہری کی جمع شدہ تنخواہ میں سے بڑا بڑا روپیہ کمیشن حاصل کرنے
میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رعیت کمار سے کہا تھا میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیٹ میں مبتلا ہو جاؤ۔ دوسرا
ڈائریکٹر بننے سے حیرت خیز ہے وہی ہنتر ہے۔“

غریب نواز نا زنا زہ حیدر سے واپس آیا تھا، اس لیے سعیدہ کا بیچ کسی قدر رفع اہمال تھی۔ میں نے دیکھا کہ اگر لڑکے کے باہر
الگ سے ایسی قمیصیں اور شلواریں لٹک رہی تھیں جی کا پلٹا اچھا اور تھیں تھا۔ شہر میں کے خورد و سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔
مجھے پتہ نہیں پندہ دھند پنا پڑا میرا ناظروں کا ساتھ اب نئے فلم کی بیرونی کی بحث میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف
تھا۔ گرڈ دیا تھا۔ کیونکہ یہ بہرہ دہی پنجابی تھی اور اس کا خاندان بڑی بڑی مچھلیوں والا بشتا کٹا مشتقا تھا۔ چٹے نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔
بگھر پروا نہ کرو اس سارے کی..... جس پنجابی ایکٹرس کا خاندان بڑی بڑی مچھلیوں والا بھلون ہر وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں
شانے جیت کر کرتا ہے۔ بس اتنا کہ وہ مسرور ہے فی الحال کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بیس بڑی بڑی ویت قسم کی گایاں
سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص مشغلوں میں بہت کام آیا کرے گی۔“

ہریش ایک بوقت فی گالی کے حساب سے چھ گایاں پنجاب کے مخصوص صب ایسے میں یاد کر چکا تھا۔ گرا بھی ہمک سے اپنے عشق
کے دامن میں کوئی دوسری خاص شکل درپیش نہیں آتی تھی جودہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ٹی کے گھر سب معمولی منہلیں تھیں۔ پری۔ ٹولی۔ کٹی۔ ایٹھا۔ ٹیسلا وغیرہ سب آتی تھیں۔ وہ بھرے بہتور ٹیسلا کو کھٹا کلاؤ
ٹائر لٹا کر کڑا ہاتھیں، اور دھانی ناکت کی ڈون، تو غریب بنا بنا کر بتا تھا۔ اور وہ اسے سیکھنے کی پڑتوں کوشش کرتی تھی۔ طرب نواز سب
تو بھن قرض دے رہا تھا اور رعیت کمار اس کو اب کمپنی کے نئے فلم میں بہرہ و کامیابی دے رہا تھا، ان میں سے کسی ایک کو باہر کھل ہا میں لے
جاتا تھا۔ چٹے کے ننگے لڑک شہن کو اسی طرح قہقہے برپا ہوتے تھے..... ایک صرف وہ نہیں تھی..... وہ جس کے بالوں

کے رنگ کے لیے صحیح تشبیہ ڈھونڈنے میں پٹے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ گلوں مغللوں میں پٹے کی نگاہ میں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی جب پٹے کی نظر میں کسی کی نظروں سے ٹکرا کر جھپک جاتی تھیں تو اس شخص کو اس گلوں میں اس بات کی دہرائی کا احساس ہے۔ ایسا انھوں میں کی یاد سے اس کی تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ جڑ جڑے پٹے کے بعد کسی وقت اس قسم کا جلد اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا۔ پٹہ — یوں اسے ٹوڈ بڑھاتا

یہ سن کر مئی زیر لب مسکراتی تھی۔ جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیعری میں پھیٹ پھیٹ کرے کہہ رہی ہے۔ ٹوڈ ٹوڈ ٹوڈ۔
 دن کترے سے بدستور اس کی منہ چلتی تھی۔ سرور میں اگر جب بھی وہ اپنے باپ کی تعریف میں باورنی پوری کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گلی اسے کاٹ ڈالتا وہ غریب چپ بوجھا، اور اپنا بیٹے کی پیشکش کر کے جیب میں ڈال دیتا۔

کی دہری مئی تھی۔ بدلی کی مئی، ٹوڈ کی مئی، پٹے کی مئی، رخصت کار کی مئی۔ سوڈے کی بوتلوں، گلوں کی چھریوں اور عقل بدلنے کے دوسرے سالو سلمان کے انتظام میں وہ اس پر شفقت و امانت سے حاضر مئی تھی۔ اس کے پیرے کا میک اپ ویسا ہی عادیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اس طرح کے شروع و شنگ تھے۔ خانہ بدو مریخی کی تنوں سے اس کی خبریں اس طرح جھانکتی تھیں۔ گلاب چھیرے مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ انہی مقدس کرپٹیک کے کپڑے ان ٹاس ٹیڈ پٹے کے تھے۔ ڈاکٹر مسٹ کو وہ دیکھ گئے تھے۔۔۔۔۔۔ پٹے کے جسم سے بھی نکل جاتے تھے کہ اس پر ان جہروں کا سایہ تھا۔۔۔۔۔۔ ان مقدس جہروں کا ہر وقت نہایت وریات رنگوں میں لٹری رہتی تھیں۔

دن کترے کی خوبصورت پوری کے جب اس مقام پر آتا تو مئی کی ہر وقت اعلیٰ سے اس کی زبان کی تھی جیسا جب ہندوستانی جس سیکھنے کے حقوق میں مادر کے ایک کھٹک کے جتنے چڑھ گئی تھی اور اس سوڈے میں ایک دھڑ جب اس کو ایک معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو مئی نے اس کو بہت شامنا تھا اور اس کو تھم چھو کر کے بیٹھ بیٹھ کے لیے اس سے تعلق تعلق کرنے کا نتیجہ کر لیا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل ہیج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سنائی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ جیسا کہ اطلاع کروائیں۔ کئی کو ایک تھا سہل کرنے کے مسئلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا، تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے دوپے غریب نو ذکوہ دے دے۔ کوئی کو اس غریب کا ہاتھ نکالے۔ اس نے مئی سے کہا تھا، تم اس وقت اسے دو۔۔۔۔۔۔ بعد میں مئی بہنا اور مجھ سے اس نے چند روز کے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ مری سرنگے بارے میں پوچھا تھا، اور کثرت میں کاظمہ کر لیا تھا کہ پہلے کچھ کی موت کو اسنے برس ہو گئے ہیں، اور سراجی کہیں نہیں جوتا۔ رخصت کاہ سے زیادہ رخصت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں پسینہ طبیعت اس کو کچھ نہیں لگتی میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دوسرے مغللوں میں کچھ تھی۔ سراجی کا ڈاکٹر نہیں سے وہ نفرت کرتی تھی۔ پٹہ اس کو اپنے ساتھ لانا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی، ایسے فریڈی کو یہاں مت دیا کرو۔ پٹہ اس سے دوسرے جھٹا تو وہ بڑی بنیدگی سے یہ جواب دیتی تھی کہ مجھے یہ آدمی اور پورا پورا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ فٹ نہیں بیٹھا میری نظروں میں۔ یہ سن کر پٹہ ہنس دیتا تھا۔

مئی کے گھر کی محفلوں کی کڑی غلوں میں سیریں میں دیکھیں، جیسے چلا گیا، اس محفلوں میں زندگی تھی، ملاوٹ تھی، ہنسبائی رنگ تھا، مگر کوئی ایجاد نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح تھالی ختم تھی۔ اسی طرح ابھری جرتی۔ جتنا ہوس طرح کا شہب، چیتھی اور دیکھتے رہا کر کوئی حالت میں ڈالنے والی۔ گلاس میں بڑی میچ، باسیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے خیالوں میں یہ پڑھا کہ سیدہ کا لڑکے میں بنگالی میوزک گلوکار کٹر میں ادا کیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی باقی ہے۔ میں نے فوراً لکھنے کیلئے فوراً لکھنے کی گھر کوئی نڈل سنا۔

ایک ہفتے کے بعد پڑے کا خط لکھا جس میں حاملہ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ پتھر کے ہنگامی ہانگ کوئی لگا۔ وہ بڑا ڈر لگا تھا۔ روشنی کی تودہ کجا کر سیں ہے۔ خون میں لٹ پت۔ پتھر اچھڑا طرح اپنے ہوش و اس منہ لگے بھی نہ لیا تھا کہ اور اسے میں رام سنگھ خود رہا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب لونا اور رنجیت کمار بھی لگے۔ ساری سیدہ کا لڑکے بیدار ہو گئی۔

رنجیت کمار اور غریب لونا نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ پتھر نے سین کو اپنے پتھر پر لٹایا۔ اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ لکھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری جگہ لی اور ٹھٹھا ہر گیا۔

رام سنگھ، غریب لونا اور رنجیت کمار کی گرت میں تھا۔ مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ میں مریا تو رام سنگھ نے پتھر سے پرچھا۔ بجا پاچی — مر گیا ؟

پتھر نے انہماک میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب لونا سے کہا "مجھے چھوڑ دیجیے میں جہاں جا نہیں"۔

پتھر کی کچھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً ٹوکر کچھ کوئی کر لیا یا مٹی کی کڑبھ لٹھیں برنگے کو مارا۔ سبھ جانے لگا۔

نے رام سنگھ کو آڈو کر دیا اور چھوٹی دیہ کے بعد اپنے ساتھ پولیس سٹیشن لے گئی جہاں ان کو بیان درج کروا دیا گیا۔ اس کے بعد پتھر اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، بیانات، پھر عدالت میں مقدمے کی پوری مٹی اس دوران میں بہت

دور و دوپ کرتی رہی تھی۔ پتھر کے کو قیقین تھا کہ رام سنگھ بری جو ملے گا چلا پڑا ایسا ہی جوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صلوات

بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے قتلے میں دیا تھا مٹی نے اس سے کہا تھا "شیانگ لارڈ نہیں جو کچھ بتا رہے ہیں کچھ

بتاؤ —" اور اس نے تمام واقعات میں وہی بیان کر دیے تھے کہ سین نے اس کو پچھریک مگر نڈا دینے کا لالچ دیا تھا اس

کو خود بھی مری سنی سے بڑا نکلا تھا اور سینوں میں اچھا لگنے والا تھا۔ وہ اس پکڑ میں آکر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کر دیا، مگر اس

کو اس سے سخت نفرت تھی، اس کا دل ابدا اسے لعنت، ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ بیگیا تھا

کہ اگر اس نے پھر سے مجھ کو کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ وارثات کی رات کو بھی جوا۔

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا۔ مٹی جو وہ مٹی آگھوں ہی آگھوں وہ رام سنگھ کو لا سار مٹی ہی کی گھبراہٹ نہیں۔ پھر صبح

کے وہ بھی کچھ پیش ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قصا رہے ہاتھوں نے خون کیا ہے۔ مگر ایک شخص حیرت کا۔ ایک خباثت

کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی، بڑے سادہ پس اور بڑے خصوصاً نڈا نڈا میں سادے واقعات بیان کیے، پھر ٹیٹ اس قدر تاثر ہوا کہ

اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ پٹے نے کہا اُس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز بات ہے — اور اس کا سر پیری بڈھی جی کے سر ہے !

پٹے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو رام سنگھ کی رہائی کی غرض میں سعیدہ کلچر ڈانس نے کیا تھا۔ گریس مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل برادرہ، فیکٹل اور جیکل دونوں وہاں سعیدہ کلچر آگئے تھے۔ باہر کی فضا بھی اسی کی ذاتی نظم کینٹی کی تابیسوں اور تھیر کے لیے اس ذاتی فضا اب وہ پھر اپنی پُرانی نظم کینٹی میں کسی اسٹنٹ کے اسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرایے میں سے چند سرباتی بچے ہوئے تھے جو انھوں نے اپنی نظم کینٹی کی بنیادوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ پٹے کے مشورے پر انھوں نے سب دو پہر جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے دے دیا۔ پٹے نے ان سے کہا تھا، آج میں چار بیگ رہی کرو عاکروں کا گھروہ تھاری ذاتی نظم کینٹی فوراً کھڑی کر دے !

پٹے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں دن کترے نے شراب پی کر غلات معمول اپنے سامنے باپ کی تعریف بنی اور نہ اپنی خوبصورت چری کا ذکر کیا۔ غریب کو اڑانے کچھ کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دوسروں پر قرض دیے اور رنجیت کا دے اس نے کہا تھا۔ تم ان بچاری لڑکیوں کو روٹی جھالے نہ دیا کرو..... جو سکتا ہے کہ تھاری نیت صاف ہو، مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی..... کچھ نہ کچھ دے دیا کرو !

جی نے اس پیسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو یہ مشورہ دیا کہ اُسے گھروا پس جانے کے لیے کہا جائے چنانچہ میں فیصلہ جڑا اور دوسرے روز غریب کو اڑانے اس کے کھٹ کا بندوبست کر دیا — خیر یہ نے سفر کے لیے اس کو کھانا پکا کر دیا۔ ایشیہ پر سب اس کو چھوڑنے گئے۔ میں اپنی توجہ ورننگ ہاتھ دلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں جب مجھ کو ایک ضروری کام سے ہونے جانا پڑا۔ سعیدہ کلچر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم تھا کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل وصورت ہزار ہا ناغلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ دسی ٹنگر تھی جو اپنا خفا غریب پر کڑھتی تھی۔ میں جس روز وہاں پہنچا، غریب بٹ رہی تھی غریب کے گھرا ایک اور لڑکا بڑھا تھا۔ دن کترے کے ہاتھ میں ٹیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دونوں پر ٹی فیکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے چچے کے لیے کہیں سے دو پیدائے تھے۔ ان میں سے ایک وہ غریب کے کوڑا تھیلے کے لیے لے آیا تھا۔ پٹے نے غریب کو لڈو اس کے منڈ میں ڈھونڈے اور کہا کہ ٹیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے۔ بڑا کمال کیا ہے تو نے..... اپنے سامنے باپ اور اپنی سالی چوری کی دیکھنا، ہرگز کوئی بات نہ کرنا !

دن کترے نے بڑے سر پہن کے ساتھ کہا سامنے میں اب کوئی چنہ نہیں..... وہ تو دوسرا لاکرتی ہے..... ویسے بانی لاڈ..... میری چوری بڑی بیٹھ سم ہے.....

پٹے نے اس تدریجے تھا شائق تھوڑا سا دن کترے کے کچھ کچھ کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد پٹہ غریب کو لڈو اور رنجیت کا لڈو مجھ سے تقویٰ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہو گئیں جس میں اپنے چچا نے غلوں کے ذریعے سے وہاں کے ایک ہڈو دوسرے کے لیے

کھڑا تھا۔ پھر کچھ دیر شیریں کے نوازیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چٹے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ جانتے بیدار ایش یعنی سعیدہ کا بیٹے کی رعایت سے جو کام لوہو مسعود ہے اس لیے مسعود نام بہتر ہے گا، چٹے کو پسند نہیں تھا لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چٹہ، غریب نواز اور نجیت کمار تینوں کی طبیعت کسی قدر عجیب سی تھی، میں نے سوچا شاید یہ خراس کے موسم کی وجہ ہے جب کوئی خواہ مخواہ تھا کوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا کیا بچہ میں اس خفیہ احتمال کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ سین کو قتل کی ٹریجڈی ۹..... معلوم نہیں کیا وجہ تھی..... لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب مفسدہ تھے۔ بظاہر بچتے تھے، ہوتے تھے، مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں یہ بچات نگرس میں اپنے پرانے غموں کے ساتھ گھر میں کمانی لکھتا رہا۔ یہ مصروفیت مجھ سے سات دن جاری رہی، مجھے بابا خیال آتا تھا کہ اس دوران میں ہڈے نے فعل اندازی کیوں نہیں کی، کوئی کٹرے بھی کیس غائب تھا، رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس آئی فوراُ تا۔ غریب نواز کے شعل میں میں نے سوچا تھا کہ شاید جیو دا باو چلا گیا ہو۔ اندر میرا بُرا غموں کا ساتھ اپنے نئے غم کی بیرونی سے اس کے گھر میں اس کے بڑی بڑی منہجوں واسے خاندان کی مردوں میں عشق ڈرانے کا مستحکم مادہ کر، ہاتھا۔

میں اپنی کمانی کے ایک بڑے حبیب باب کا منتظر نہ رہتا کہ وہ ہاتھا کہ چٹہ بلائے گا کمانی کی طرح نازل ہوا کرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا: "اس کو اس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے؟"

اس کا اشارہ میری کمانی کی طرف تھا جس کے عداوت میں نے دوسرے قسط میں نے دوسرے قسط میں نے وصول کی تھی۔ "ہاں....."

وہ سہلخارہ سوں لیا ہے؟

"میرا حبیب ہیں؟"

چٹے نے میری حبیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے پاروٹ نکالے اور بچے سے کہا: "آج شام کوٹ کے ہاں پہنچ جانا۔"

ایک پاروٹ ہے؟

میں اس پاروٹ کے شعل اس سے کچھ دیافت کرنے ہی والا تھا کہ وہ چلا گیا وہاں خورگ ہو میں نے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی بدستور مردہ تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا۔ میں نے اُس کے شعل سوچنا چاہا مگر داغ ناکل نہ ہوا۔ کمانی کے رجب باب کے نظر آ رہا اس میں بڑی طرح جھپٹا تھا۔

اپنے پرانے غموں کے ساتھ کی جوری سے زنی جوری کی باتیں کو کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سداوہ ہو کر سات بجے سعیدہ کو لٹک چنچا۔ گراج کے باہر لکھی پر لکھی لکھی ہوئے ٹک رہے تھے اور لڑکے کے پاس ازل بروں میں شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گراج کے ٹاٹ کا پردہ جٹا ہوا تھا اور خیریں ان سے غالباً ملی کی باتیں کر رہی تھی مجھے دیکھ کر وہ چپ

اے..... بیکریٹرلس..... بیلیرینڈنٹشلیس..... وہ اتنی چھوٹی اتنی کمزور اور اتنی فکر دار تھی کہ اس بات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر چھپاتی رہتی، یا اسے قطعاً قبول جاتی..... ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جیسے کاسلیٹے اس کو کٹھن طعن پر نہ آتا..... مجھے اس کا کوہِ بزمِ تنہا — اچھا ہنسا گئی تھی اس وقت میں وہ حشرِ بانی بند کر دیا..... میں اب اپنی جگہ اس بند کرنا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت بلی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر مجھ سے کچھ بولائیں جاتا..... میں ایک ہیگ اور دیکتا ہوں۔“

اس نے ایک پیگ اوردیا۔ تقریب کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ نئی ذمہ داری کا سامنا کر رہی تھی۔ خانہ سے اوردی کے کتوں کے پیچھے اس کی جڑ باری بھی دکھائی دیتا تھا کہ نور و نکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بونے کے بعد چاند جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ اور حرا و حرم رہا تھا، جیسے کوئی چیز کھونے کے لیے ایسا کوڑا ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے ذہن میں ابھی طرح محفوظ ہے۔ میں نے اس سے ایک بار روجھا کہ بات سے چٹے ۛ

اس نے قفقہ دگا کر جواب دیا کچھ نہیں..... بات یہ ہے کہ آج وہی سب دماغ کے تڑپوں پر جہاں کے مت نہیں مار رہی ہیں اس کا قفقہ گھور کھلا تھا۔

وہ کھڑے نے قیلا کو اٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھایا اور دوسری باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا لائق آدمی تھا۔ ایسا ہارمڑم بچہ تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی جیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ کبھی یہ اس کے باپ نے یہ لڑکی جن کو اس سے زیادہ ہی محنتی، جنگلی، موزک ٹائر کٹر سیمن کی بات منسل تو اس نے کہا فطر منسل — وہ ایک دم جھکے آدمی تھا۔۔۔۔۔ کہا تھا میں خاں صاحب عبدالمکریم خاں کا شاگرد ہوں۔۔۔۔۔ جھوٹ بالکل جھوٹ۔۔۔۔۔ وہ تو جنگل کے کسی چمڑے کا شاگرد تھا۔۔۔۔۔“

گھر مٹی نے دو بجائے۔ چنڈے نے جھڑنگ بند کیا۔ مٹی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر دی خنکڑے کے کھنڈے سے سر پر دھینکا اور کہا اس بند کو بے..... اٹھ..... اور کہہ گا..... یہی خبر ہمارا کرتے کوئی پکا مال گایا۔

دن گزرتے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز چھی بنیں تھی، مگر کیوں کی ٹوک پلک۔ واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی۔ لیکن جو کچھ گانا تھا، پورے غلام سے گلا آ تھا۔ مگر کس میں اُس نے اور برتے دو میں گانے سنائے جن سے فضا بہت اُداس ہو گئی۔ ٹہی اور چلہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت ہٹا بیٹھے تھے..... غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ چلہ نے زور کا تھپہ بلند کیا اور کہا "میں یاد دلاؤں کی آنکھ کا شاد بہت کمزور ہوتا ہے..... موقع بے موقع چھینے لگتا ہے۔"

غریب نواز نے اپنے آئسپرچیجے اور ایلا کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ دن کترے نے گامزن کے قوسے پر دکاندار کو کہہ سونی لگا دی گئیں جوتی ٹیون بجھنے لگی۔ چلے نے ٹی کو چھڑک دیا، اٹھایا اور کونڈو کو کوشور مچانے لگا۔ اس کا ٹھونڈ ٹھٹھا تھا۔ ان ریڈیوں کی طرح جو شاہی بیاد کے موقعوں پر اُڑنے مروں میں گا لگا کر اپنی آواز کا ناس مار سکتی ہیں۔

اس پھیل گواہ پر خیمہ دھاریں چارنگا گئے تھے ایک دم خاموش ہو گئی، پھر اس نے چڑے سے غالب ہو کر کہا "بس اب ختم؟" چڑے نے تو کئی سے سر نہٹلایا، اسے خالی کر کے ایک طوط چھینک دیا اور گھر سے کہا "چلو منو چلیں آ" میں نے اٹھ کر مٹی سے اجازت مینی چاہی کر چڑے نے مجھے اپنی طوط کھینچ لیا۔ آج کوئی اور رات نہیں کے گا؟ ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے وہی کٹرے کے دو ٹکے آؤد شنی میں نے بڑے سے کہا، اٹھو، دیکھیں کیا بات ہے؟ گردہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا۔ اس سارے کی آنکھوں کا شانہ بھی خراب ہے؟" مٹی کے گھر سے سیدہ کلوشج یا کلنل نزدیک تھی۔ راستے میں چڑے نے کوئی بات نہ کی سونے سے پہلے میں نے اسے اس غریب پارٹی کے شعلی استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا مجھے سخت زیندا رہی ہے اور بستر پر لیٹ گیا۔ صبح اٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا غریب تو اڈ گرج کے کٹاٹ کے ساتھ ٹگ کر کھڑا ہے، اور مور ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھا وہاں سے ہٹ گیا میں نے پاس جا کر اس سے روٹنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا "مٹی چلی گئی؟" "کہاں؟"

"معلوم نہیں؟" یہ کہہ کر غریب توڑنے سے شرک کاٹھ گیا۔ چوہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک گھسے کے لیے بھی نہیں سہرا تھا میں نے اس سے مٹی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا "مٹی گئی۔ صبح کی گاڑی سے اُسے پونچھوڑنا تھا۔" میں نے خیر چھا۔ مگر کیوں؟

چڑے کے لیے میں مٹی آگئی حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں۔ اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی اس کے گھر کی خفیس اس کی نظر میں قابل اعتراض تھیں اس لیے کہ پولیس اس کی شفقت اور محنت بطور مثال کے لینا چاہتی تھی وہ اسے مان کہہ کر ایک دلا کا کام لینا چاہتے تھے ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی اور اس کو تیری کر دیا ضمنی کر دیا وہ اگر قریبی دلا تھی اس کا وجود سوسائٹی کے لیے مسلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے تھا۔ پورے کی خلافت سے یہ کہیں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور جہاں چاہو جیر ہو سکتی ہو چڑے نے بڑے نڈر کا قہر دکھایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اس نے بڑے جذبات جھڑپے سے کہا "مجھے افسوس ہے مگر اس خلافت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزہ مٹی چلی گئی ہے جس نے اس ذات میری ایک بڑی غلطی سے جس رنگ کر میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا۔" لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیے وہ پورے سے چلی گئی مجھ ایسے جو ان لوگوں میں مٹی چلی گیا اور غلط تر لگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی میں اپنی مٹی ان کے سپرد کرتا ہوں زندہ باد! زندہ باد! — چوہ غریب تو اڈ گڑھوٹا میں۔ دور دور کا اس نے اپنی جان بھگان کر لی ہرگز — ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا شانہ بہت کمزور ہوتا ہے — وقت بے وقت پٹکنے لگتا ہے؟

میں نے دیکھا، بڑے کی آنکھوں میں افسوس طرح تیر رہے تھے جس طرح مفقود کی لاشیں۔ (زیرید میں سے)

بابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے بری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں ممبئی کا ایک صنعت دار پرچہ ایڈیٹر کیا کرتا تھا جس میں جید پرچم سینڈویکھ نامے فنکار آدی کے ساتھ داخل ہوتا میں اس وقت پندرہ گڑھ تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں بابو از عیند مجھے ادب کیا اور اپنے ساتھی سے صداقت کرایا۔ صنعتو صاحب۔ بابو گوپی ناتھ سے ملے۔

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسبِ حالت میری تعریفوں کے بل بالہ سے شروع کر دیے۔ بابو گوپی ناتھ۔ تم ہندوستان کے بیرون وائر سے اٹھلا رہے ہو گھنا ہے تو دشمن تختہ پر ہانا ہے۔ لوگوں کا۔ ایس ایس کلنی برٹش ملانا ہے کہ طبیعت ملن ہو رہا ہے۔ بچے دونوں وہ کیا چٹکلا کھاتا تھا آپ صنعتو صاحب بس خریدنے کا خریدی۔ اٹھ بڑا کار ساز ہے۔ کہوں بابو گوپی ناتھ۔ ہے نہ انٹلی پیشہ پورہ

جدا رحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل رالاشا۔ کتنی رنٹیل دھڑن تختہ اور انٹلی پیشہ پورہ ایسے افغاناؤس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعادلات کرنے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بہت محبوب نظر آتا تھا۔ آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے نماں خراب۔ لاہور سے جھک رہے ہاتھ بے بے تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کھوڑی بھی۔ بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعادلات کو ناکافی سمجھ کر کہا۔ بیرون بے وقوت ہو سکتا ہے تو تو آپ ہیں۔ لوگ ان کے شکاٹنگ کیجیہ بھرتے ہیں۔ میں صحت باتیں کر کے ان سے ہر روز پراسن جڑ کے موکیٹ وصول کرتا ہوں میں صنعتو صاحب۔ یہ سمجھ بیٹے کہ بڑے انٹی غلو حبشیہ قسم کے آدی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے ٹیٹ پر ہندو تشریف لائیے۔

بابو گوپی ناتھ نے ہندو معلوم کیا سوچ رہا تھا چونکہ کو کہا۔ ہاں ہاں حضور تشریف لائیے صنعتو صاحب۔ پھر سینڈو سے پوچھا۔ کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اُس کا شغل کرتے ہیں۔

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے ہنسنے لگایا۔ اچی برقم کا شغل کرتے ہیں۔ تو صنعتو صاحب آج شام کو ضرور آئیگا میں بھی مینی شروع کر دی۔ ہے۔ اس لیے کہ ٹکٹ ملتی ہے۔

سینڈو نے مجھے ٹیٹ کا پتہ کھار دیا۔ جہاں میں حسبِ وعدہ شام کو کچھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا ٹیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجایا تھا۔ سینڈو اور گوپی ناتھ کے علاوہ چھٹنے والے کمرے میں دوسرا دوسرا جوڑی موجود تھیں، جن سے سینڈو نے مجھے صداقت کرایا۔

ایک قصہ غبار سانس، خمد پوش، پنجاب کا ٹھٹ سا میں گئے میں موٹے موٹے داغوں کی کالا سینڈو نے اس کے بارے میں کہا۔ آپ باورگونی ناقد کے رنگ اور دائرہ میں، میرا مطلب سمجھ رہا ہے۔ آپ ہر آدمی جس کی ناک بینی ہر پاس کے منہ سے لعاب نکلتا ہے۔ پنجاب میں خدا کو پہچاننا ہر آدمی میں چھپا ہوا ہے۔ یہ بھی اس پہچنے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے باورگونی ناقد کے ساتھ آئے ہیں۔ کیونکہ انھیں وہاں کوئی اور جوتھ نہیں ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ باور صاحب کریوں کے سرگٹ اور سکاپز دسکی کے پیگ پٹی کر رہے ہیں کہ انجام نیک ہو۔

غبار سانس میں یہ سنی کر سکا تا رہا۔

دوسرے مہر کا نام غلام علی، بھارتیہ جہان، کمرتی بدن، منہ پر جھپک کے داغ، اس کے متعلق سینڈو نے کہا تیرا شکارو ہے۔ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نالی ملاقات کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی، بڑی بڑی کٹنی زیرکیاں ملانی لگیں، اس کو بھانسنے کے لیے، مگر اس نے کہا ٹو لوڈ ڈاٹی، جس فکر شکا پکار سوں گا ایک کیکے میں بات چیت چیتے ہوئے باورگونی ناقد سے ملاقات ہو گئی، جس اس دن سے ان کے ساتھ رہا ہوا ہے۔ ہر روز کریوں کے کاڈتہ اور کھانا پینا ستر ہے۔ یہ سنی کر غلام علی بھی سکھتا رہا۔

گول چرے والی ایک ستر و سفید جوتھ تھی، مگر بے س دانل ہونے ہی میں بھر گیا تھا کہ یہ وہی گنبر کی کتہا ہے جس کے متعلق سینڈو نے انگریزوں کو کیا تھا۔ بہت صاف ستھری جوتھ تھی، بال بھولے تھے، ایک ٹٹا تھا، کتے ہوئے ہیں، مگر وہ جوتھ ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں خفقت اور ٹیکل تھیں، چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مدد اترے ہوا تجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا، ترستے رنگم، باور صاحب پیارے ترستے ہیں۔ ایک بھٹی ٹرانٹ، ناگہم ٹیمبر سے، سب توڑ کر لاہور کے آئی۔ باورگونی ناقد کو اپنی سہ ماہی سے پتہ چلا اور ایک رات لے آئے۔ مقدمے بازی ہوئی، تقریباً دو مہینے تک پوسٹیشن کئی رہی آخر باور صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے۔ وطن تختہ آ

اب گھر سے سافو لے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو ناٹوش بھی سرگٹ پی رہی تھی، آنکھیں ستر تھیں جس سے کافی بچائی ستر تھی۔ باورگونی ناقد نے اس کی طوت اخلاص کیا اور سینڈو سے کہا، اس کے متعلق بھی کچھ سنا ہے۔

سینڈو نے اس عورت کی دان پر ہاتھ مارا اور کہا، پنجاب یہ ہے، ٹیمبر ٹوٹی، غل غل فونی مسر جید اہم سینڈو عورت ستر رنگم۔ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں، سن پچیس میں مجھ سے ملتی تھیں۔ دو برسوں ہی میں میرا حشرن تختہ کر کے بگڑ دیا میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ باورگونی ناقد نے اسے یہاں بلوایا ہے تاکہ میرا دل ٹکڑا ہے۔ اس کو بھی ایک ڈیڑہ کریوں کے کلاشن میں ملتا ہے ہر روز شام کو ڈھائی دوپے کا موڑیا کا آنکھ کش لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ گرویسے بڑی ٹٹ فورٹیت قسم کی عورت ہے۔

سردار نے ایک ادا سے صرٹا کر کہا۔ کچھ اس ذکر، اس میں پیشہ و عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیے ہیں۔ میں نے کہا چھوڑو، یہ آؤ کچھ باتیں کریں۔

آٹھ بجے کے قریب سوان ڈاکٹر عید کے اس چلی گئی کیونکہ اسے مورخیا کا انجکشن دینا تھا بغیر اس کے نہیں چلنے کے بعد اپنی تیس آٹھ گز قریب پر سو گیا۔ غلام علی کو ہرٹل سے گھاٹا بیٹے کے لیے بھیج دیا گیا سینڈو نے برقی دھسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لیے بند کی تو باوگرہنی ناقدہ نے جواب نشے میں تھا زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا: منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

میں نے سوچا کیا کموں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ بڑا نیک خیال ہے۔
 باوگرہنی ناقدہ خوش ہو گیا۔ منٹو صاحب سے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا میں نے کئی بار کہا۔ جہاں میں مکان بنواؤں، وہاں کیا دیا، معلوم ہے آپ کو؟ — کیا کہوں گی مکان کے کمر میرا کون ہے — منٹو صاحب موٹر کتے میں آجائے گی۔

میں نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں۔
 باوگرہنی ناقدہ نے قہقہے سے کہا: کیا بات کرتے ہیں منٹو صاحب — آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو کل چلیے میرے ساتھ زینو کے لیے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بیٹے میں موٹر جوئی ہی چاہیے۔
 زینت کا چہرہ درود عمل سے خالی رہا۔

باوگرہنی ناقدہ کا لاشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ برقی جذبات ہو کر اس نے گھر سے کہا: منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں میں تو بالکل گدھا ہوں — لیکن آپ مجھے بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا میں نے اسی وقت ہلکی سی منگوائی اور اس سے کہا۔ مجھے بے چارے منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو تو سعادت کر دیجیے گا۔ — بہت گڑ کار آدمی ہوں — دسکی منگوائی گا آپ کے لیے اور۔
 میں نے کہا: نہیں نہیں — بہت بری لگتی ہیں۔

وہ اندھا دودھ جذباتی ہو گیا اور بھیجے منٹو صاحب یہ کہہ کر جب سے سو سو کے نوٹوں کا پلڑا نکالا اور ایک نوٹ ہڈا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لیے اور وہ اس کی جیب میں ٹھونس دیے۔ سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا بڑا ہٹا۔

مجھے دراصل کچھ سہاروی سی ہو گئی تھی باوگرہنی ناقدہ سے۔ کہتے آدمی اس قریب کے ساتھ جو تک کی طرح چپے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا باوگرہنی ناقدہ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا: منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑے گا یا —

باوگرہنی ناقدہ نے پورا جھگڑا ہی اور انہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے ڈک کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ بوٹلی میں کسی حرام زادے نے اس کی جیب میں سے سارے دوپے نکال لیے۔ باوگرہنی ناقدہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا: جلدی کھانا لے آؤ۔

پانچ چھ عاتقوں کے بعد مجھے باہر گئی ناتھ کی طرح غصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح توخیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پچھلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا خیال کدو پر ہے درجے کا پھند ہے غلط ثابت ہوا۔ اُس کو اس ہر کلا پر احساس تھا کہ سیدنا، غلام علی اور سردار و مقررہ جو اس کے مصائب بنے جو تھے غلطی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں لگایاں سب ملتا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا: منٹو صاحب میں نے آج صبح کسی کا مشورہ دیا نہیں کیا، جب بھی مجھے کوئی رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انھیں تھکر رہتا ہوں۔ اس لیے کہ میں کم از کم اتنی عقل تو بھی جو مجھ میں ایسی ہے و تو فی کو شناخت کر لیا جن سے ان کا اثر سیدھا ہو سکتا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے غیرتوں اور کجیوں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت ہی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی عینک میں جا بیٹھوں گا۔ زندگی کا کوٹھا اور میرے کا مزار۔ میں یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ زندگی کا کوٹھا تو چھوڑ جاتے گا اس لیے کہ عیب خانی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں ہیں۔ کسی ایک کے حصار پر چلا جاؤں گا۔

میں نے اس سے پوچھا: زندگی کے کوٹھے اور عینک آپ کو کیوں پسند ہیں؟

پچھو ویر سوچ کر اس نے جواب دیا: میں نے کہا کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اُس کے لیے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟

میں نے ایک اور سوال کیا: آپ کو ملتا تھا کہ ان کا گانا فتنے کا شوق ہے کیا آپ کو میری کئی سمجھ رکھتے ہیں؟

اس نے جواب دیا: بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کی شری سے کن شری ملتا تھا کہ ہاں جا کر بھی پتا نہ مل سکتا ہوں۔ منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن عیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر کالے والی کو دکھانے میں بہت مزہ آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اُس کو دکھایا۔ وہ اُسے ایسے کے لیے ایک اداسی اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جواب میں اڑا دیا۔ اس نے جھک کر اُسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں۔ وہ کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کے کوٹھے پر ہاں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کرتے ہیں اور مقبول اور عینکوں میں انسان اپنے خدا سے؟

باہر گئی ناتھ کا شجرہ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے گھوس بیٹے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ روپے کی جائیداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اثرا شروع کر دی۔ جیسے آتے وقت وہ اپنے ساتھ بچا اس ہزار روپے کا تھا۔ اُس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سو سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ فریو کے لیے اُس نے غلیٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈیڑھ نو روپے کا ایک وہ بھی غلیٹ ٹائپ کا۔ باہر گئی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ رُخ گیا۔ باوجود گہنی ناتھ سے مجھے توسلۂ الٰہی بھی دیکھیں اُسے جو سچے عقیدت والی تھی یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی جہالت میں بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں ٹیبل پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ شفیق طوسی کون تو شاید آپ کچھ نہیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے کچھ اپنی ہندو ملازمتی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ جس شکل بنوں کو مجھے بعد ہجرت یقین تھی چار چار سال کے وقفے کے بعد واپس نہ آنے سے پہلے اُس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لیے پسند نہیں تھی کہ اس میں خاص اُنھوں کے غم سے اور غموں سے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خبر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں ملازمتوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ بعد سے بعد کھا نا کھایا انھیں سے انھیں سے موٹر رکھی۔ گلاس نے اپنی گرہ سے کسی ملازمت پر ایک ایک دفتری بھی خرچ کر دی۔

عورتوں کے لیے خاص طور پر جو کچھ مشہور ہوں اس کی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میرے اُنھوں کے مزاج کی جھلک تھی بہت ہی جاوید نظر تھی۔ وہ کوشش کیے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ جاتا تھا۔

میں نے جب اسے نہیں پسند کر سکتا تھا تو مجھے اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دن مشرباں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈوئچ سے جاتا تھا۔ گران کی بول چال تو ایک عرصے سے ہندی دیکھنے بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈوئچ اس سے لایا جاتا تھا۔ اُن دنوں میں مسلح صفائی ہو گئی تھی۔

باوجود گہنی ناتھ ایک خوف بیضا شخص رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگڑت بالکل نہیں بڑھتا تھا۔ شفیق کو میراثیوں کے لطیفے سننا بہت اچھا پسند تھا۔ زینت کسی قدر کم اور سرفراست زیادہ دیکھیں لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا۔ اوبہم اٹھ۔ بسم اللہ کیا آپ کا گھر بھی اس دواوی میں ہو رہا ہے؟

سینڈوئچ نے کہا۔ تقریباً لے آئے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ ۛ

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوئی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں جھک کر کچھ اور بھی کر رہی ہیں۔ زینت اس فحش میں بالکل گوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خاموشی کو چھپاتی رہی۔ سوادہ فوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے ٹیبلے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے بیٹوں کے داؤد چھ کھینچتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے جہانی گشتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ کچھ منساہر طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سوادہ فوں۔ صاف تھوڑی۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اول تو اس میں جھوٹا پن تھا۔ اس کے علاوہ — کچھ لوگ کہنے کو

اس بات کا بھی اُس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی بلقیث اور سیٹھ اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے دردی کے ساتھ اس سے ننگا بازو کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور دوقی دوقی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بالوگرنی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا تھا وہی رہا تھا اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا، سوائے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے کہا کہ میں اس کو طلب نہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بالوگرنی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور آئیے منٹو صاحب کہہ کر مجھے اپنے ساتھ افسرے گیا۔

زینت ہنگام پر پہنچی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو دونوں ہاتھوں سے منٹو صاحب کی ریٹ گئی۔ میں اور بالوگرنی ناتھ دونوں ہنگام کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بالوگرنی ناتھ نے بڑی جھجک کے ساتھ کثرت شروع کیا منٹو صاحب مجھے اس حالت سے بہت عجب تھا۔

ہے۔ دوسرے سے یہ کہہ کر اس سے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُس نے مجھے کبھی مشکلات کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بیٹی میں اس کو طلب ہے اس بیٹی کی دوسری عورتیں۔ دونوں ہاتھوں سے مجھے فوٹ کر کہنا تھا کہ میں اس نے کبھی ایک آزاد میرے لیے سے نہیں لیا میں اگر کسی دوسری عورت کے پاس بغتوں چڑا رہا تو اس پر زب نے پناہ کوئی زور نہ دے گا کہ زور دیکھا میں میرا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی گمان ہے میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو میں نے لاہور میں اس کو بہت کچھ لایا کہ تم دوسری عورتوں کی طرف دیکھو جو کچھ وہ کر رہی ہیں سیکھو میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کالی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں چھوڑ سکی۔ تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری دشمنی۔ سارا دن خرافیت زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی ہیں نے غلط رسالہ سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا بیٹی لے جاؤ اسے معلوم تھا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا بیٹی میں اس کی دو جاننے والی عورتیں ایکٹریس ہیں جوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بیٹی ٹھیک ہے۔ دوسرے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سزا کو لاہور سے بکریا ہے کہ اس کو کسب کر سکے۔ غلط رسالے سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بالوگرنی جے ترقی ہو گی میں نے کام چھوڑ دیا اس کو بیٹی بہت بڑا شرم ہے۔ لاکھوں رش میں میں نے نہیں موڑے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی کاش کرو —

منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری دل خواہش ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اچھی طرح ہوشیار ہو جائے

میں اس کے نام آج ہی ہنگام میں دس ہزار روپیہ خرچ کر کے کرتار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے وہی دن کے اند اندر یہ باہر چلی ہوئی سزا اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال کے گی — آپ بھی اسے کھائیے کہ چلا لک بننے کی کوشش کرے جب سے مول زیدی ہے سزا اس سے ہر روز شام کو کچھ لو بندے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سیٹھ آج بڑی خشکوں سے عمر بلقیث کو رسا لیا ہے۔ آپ کو کیا خیال ہے، اُس کے متعلق؟

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن بالوگرنی ناتھ نے خود ہی کہا۔ اچھا کھا آج تیار ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہتر بھی ہے — کیوں نہ ہو جان — پسند ہے نہیں؟

فریخ شورش رہی۔

بالوگرنی ناتھ سے جب مجھے زینت کو اپنی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چمک اٹھا۔ مجھے جیسی ذرا کا بے باکی ہو

کہتا ہے، لیکن بعد میں مشاہدے سے غیبر ہی حیرت زدہ کر دی۔ باہوگوئی نا اہل کی دلی آرزو تھی کہ زینت بھی میرا کس اچھے مالدار ناہی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکر جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے دوہرا وصول کرتے رہیں جس کا سیلاب ہو سکے۔

زینت سے اگر موت چٹکھڑائی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ باہوگوئی نا اہل ایک ہی دلی مراد کا کام کر سکتا تھا۔ جو کہ اس کی نیت، نیک فہمی اس لیے اس نے زینت کے مستقبل کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایک سرس بنانے کے لیے اس نے کئی جعلی ڈاکٹریں کی، دو نہیں کہیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوایا، بیسکس ادنیٰ کسی کروڑہانہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوس کی نظر باہوگوئی پر مینہ آتا رہا، کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سارا ہی سکے۔ باہوگوئی نا اہل نے ایک ہزار انیس سو اور پنج کے ساتھ کد شفیق صاحب کو غلامی خریدی، بیٹھلیں ہی ٹٹلے جھستے دیکھیے لیکن بے چارہ زینت سے چار چارویں، چھ تکیے کے خلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیار لے گئے۔ کہنا ہے، ابکل ایک ملائی اس سے عشق لڑا رہے ہیں۔

یہ درست تھا۔ الماس خدیوہ کی پٹیا کے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی، اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دوسو روپے جو اس نے نرسیت سے لیے تھے۔ مجھے معلوم ہے الماس پر خوج ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ رو جھگڑا کہ الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیع نے جب آجانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے طیفیوں کیا اور کہا اُسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائے میں نے اُسے تلاش کیا لیکن کسی کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقاً قیصر لیلو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی سخت پریشانی کے عالم میں تھا جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا مجھے یہ پیغام اور دونوں سے بھی مل چکا ہے۔ انوس ہے اب جکل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن انوس ہے کہ بے حد شریف ہے۔
— ایسی عورتوں سے جو بروں جیسی ٹیکس مجھے کوئی ٹیکس نہیں :-

شفیق سے جب ایسی سوتی قرآنیت نے سردار کے ساتھ بھلاہو بندر جانا شروع کیا۔ چند روزوں میں بڑی مشکلوں سے کئی ایگس پٹرول پہنچنے کے بعد سردار نے دوا دی بھانے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو کوئی ناتھ نے سمجھا کہ حالات اُمید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی کل کا مالک تھا زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ لیکن یہ آدمی بھرنیت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جاتے تھے کام سے بارہ بجی روٹ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر بیٹھیں بیٹھا تھا۔ لیگز ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا: ”یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟“
بیٹھیں مسکرایا: ”تم جانتے ہو موٹر والی کو؟“
میں نے کہا: ”جانتا ہوں۔“

”تو میں سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی۔۔۔ اچھی لوکی ہے یا ریلیس نے مجھے آنکھ ماری، میں ٹسکرا دیا۔“

اس سحر جیسے نور یا لوگوں کی تھک چکیس پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے طبعی کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اچلو ہوندر سے ایک آدمی کے ساتھ راجہ زینت گلینہ ہوئی گئیں۔ وہ آدمی کسی بات پر جھجکا کر چل گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

باہو گرہنی تاتھہ ملھائی تھا کہ کوئی دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں میں نے نہایت کو چھ بہت ہی نگاہ اور محنت سے دی تھیں۔ باہو گرہنی ناگھاپ یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن اور گزرتے جائیں نہایت اور میں کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو ہر روز وہیں چلا جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

لیکن ہوائی میں ایک کڑی عورت نے کمرہ کر کے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی سیریل سے ٹیبلین کی آنکھوں کی چٹائی پر نشست لے چاری ہوائی میں بیٹھی رہتی اور ٹیبلین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھوما کرتا۔ یہ لڑکی گویا تھوڑا سا کلام ہونے پر بہت ڈانکھ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں، بھیجی دل اچھا ہے تو صاف کہہ دو، لیکن عزت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر نہ سے اتنا بھی نہیں کہتی میاں اگر تم نے اس کو رشتہ چھو کر کسی سے عشق ڈالنا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر گھوموں استعمال کرتے ہو۔ میں کیا کروں منٹو صاحب۔ ٹری ظریف اور نیک بہت عورت ہے۔ کچھ سمجھ رہی نہیں آنا۔ منٹو ٹری سے چپکاک تو بیٹھا ہے۔

ٹیبلین سے تعلیق قطع ہونے پر عزت نے کئی صد مہینوں تک کیا۔

بہت دھڑکنے لگی تھی بات وقوع پذیر نہ ہو سکتی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپتی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔ روپے کا بندوبست کرنے کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ نو ریت سے کہہ گیا تھا کہ اے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار اکرم دریا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سیٹھ کو پولیس کھن کی، چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ نو ریت سے کہا گیا کہ بابو گوپتی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لیے اُسے اپنی ٹکر کرنی چاہیے۔ سوسا سوراہے روز کے ہو جاتے تھے جن میں سے آدھے نو ریت کو ملتے باقی سیٹھ داد سردار دہا لیتے۔

میں نے ایک دن نو ریت سے کہا: ”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

اُس نے بڑے اظہارِ پس سے کہا مجھے کچھ معلوم نہیں ہے جانی جہاں یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں ان لیتے ہوں؟
 جی یا ہاتھ اکڑ کر تنک پاس بیٹھ کر کھانوں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو شکایت نہیں۔ سینڈو اور سٹوارا پنا آؤ سیدھا کرنے کے
 لیے تھیں سوچ بھی ڈال لیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا نہ زنت اکٹوینے والی حد تک بے سچے، بے اسٹاک اور بے جان محنت تھی
 اس کم محنت کو اپنی زندگی کی کچھ تھوڑی قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بچتی مگر اس میں پیسے خاںوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واقعہ ہے
 بہت کثرت ہوتی تھی اسے دیکھ کر سٹوٹ سے شراب سے کھانے سے لھر سے ٹیلیفون سے حتیٰ کہ اُس صوفے سے بھی جس
 پردہ اکثر بیٹھ رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابوگرنی ناتھ پور سے ایک میٹھ کے بعد لوٹا۔ تاہم گیا تو وہاں غیثت میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے بازہ میں ایک نکلے کا بالائی حصہ کرایے پر لے لیا تھا۔ بابوگرنی ناتھ پور سے پاس آیا تو میں نے اُسے پورا پتہ بتا دیا۔ اُس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہہ سکا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کراہے ہیں۔

بابوگرنی ناتھ صاحب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے ٹری مشینوں سے حاصل کیا تھا غلام علی اور نغارا سائیں کو وہ لاہوری چھوڑ آیا تھا ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابوگرنی ناتھ نے امرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں ہم بازہ پرچ گئے۔ پانی پل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابوگرنی ناتھ نے زور سے پکارا "سینڈو!"

سینڈو نے جب بابوگرنی ناتھ کو دیکھا تو اُس کے منہ سے موت اس قدر نکلا "وہڑن تختہ!" بابوگرنی ناتھ نے اُس سے کہا "ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو لیکن سینڈو نے کہا "ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیو، مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابوگرنی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دودے گیا۔ درنگ ان میں باتیں ہوتی رہیں جب تک ہوش بابوگرنی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا "واپس لے چلو۔"

بابوگرنی ناتھ نے جواب دیا "جیدو! باوندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کو وہ فوٹو خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں زمین وقت پر آپ پانچا جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زرخیز زمین خرید جائے گا۔" کیوں کیا خیال آپ کا؟

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا میں سوچ رہا تھا کہ جیدو! باوندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے؟ سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً جیدو! باوندھ کا متولی زمیندار ہے جو جیدو! باوندھ ہی کے ایک میوزک شپ کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک شپ زینت کو گانا سنانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا ایک روز میرا چہرہ مہرئی غلام حسین! یہ اس جیدو! باوندھ کے رئیس کا نام تھا، کو ساتھ لے کر آیا زینت نے غیب خاطر دہرات کی غلام حسین کی پڑو فرمائش پر اس نے غلام حسین کی غزل سے

نکتہ ہیں ہے غمِ دل اُس کو ستائے نہ بنے

گاکرستانی۔ غلام حسین سو جان سے اُس پر زینت ہو گیا۔ اُس کا ذکر میوزک شپ کے زینت سے کیا سردار اور سینڈو نے لکھنا چکا کہ وہ اور شاہی لے ہو گئی۔

بابوگرنی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی اس سے لکھنا بابوگرنی ناتھ کی خوشی دہائی ہو گئی مجھ سے اُس نے کہا "مختصر صاحب خوبصورت، جوان اور خوش لائق آدمی ہے۔" میں نے وہاں اُسے جوئے دارانہ گھنٹش کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ جگہ ان کے دونوں خوش رہیں۔

باورگرنی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زلیہ اور دو ہزار کے کچڑے بنوا دیے اور پانچ ہزار نقد دیے۔
 محمد کفایت طوسی، محمد نسیم پرویز انٹر لیگنڈ ہٹل، سینڈ ویوز ک شجر میں اور گرنی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دوسری طرف سے سینڈ ویوز کمل تھا۔

ایک باب وقبول ہوا تو سینڈ ویوز نے آہستہ سے کہا: ”دعوت مختصراً“
 غلام حسین سرچ کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سچے اس کو مبارکباد دی جس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی دیر بعد آدمی تھا، باورگرنی ناتھ اس کے حلقے میں چھوٹی سی ٹیبلر معلوم ہوا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خود دوش کا اور سامان بھی برتا ہے۔ باورگرنی ناتھ نے مینا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ ندرت ہوئے تو باورگرنی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے گیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں کہا: ”مسلط صاحب ذرا اندھا بنائے اور دیکھیے زینو دوسری کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔“

میں پروردہ جاکر اندر داخل ہوا۔ زینت شریخ زربفت کا شلوار کٹڑ پہنے تھی۔ دوڑے بھی اسی رنگ کا تھا جس پر لوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے جو ٹول پر آپ اسٹاک کی طرف بہت بری معلوم ہوتی ہے۔ مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرابا کہ مجھے آداب کیا تو بہت سیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسمری دیکھی جس پر پتھر لایا ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا: ”کیا مسخرہ دیکھ رہی ہے؟“

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کمر تری کی طرح دیکھا۔ ”آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان۔“ اس نے کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈھبڈھب آئے۔

مجھے اس غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ باورگرنی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے دو مال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا: ”مسلط صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے بچہ دلاور لائق آدمی ہیں۔“ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔“

باورگرنی ناتھ کے لیے میں وہ حقیقت ہوا سے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن چیختر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا: ”خدا تمہیں خوش رکھے۔“

یہ کہہ کر باورگرنی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی۔ بہت ہی دکھ بھری ملامت اور پھلا گیا۔

(”چند“ میں سے)

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ اپنا بچھاؤ فی میں تھی۔ جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے پہنچنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ چٹے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اُس نے اپنی پڑوسی منیر جان سے کہا۔ ”بس ایف — وری بیڈ“ یعنی ہر زندگی بستر بڑی ہے جبکہ کھانسی کو نہیں ملتا۔“

اپنا بچھاؤ فی میں اس کا دھندلاہست اچھی طرح چلتا تھا۔ بچھاؤ فی کے گورے شلوار پہنی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور بقیں چار گفتگوں میں اس آٹھ دس گوروں کو نسا کر بیٹھتے تھے وہ پہلے پیدا کر لیا کرتی تھی یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی کھجوریں نہیں، آقا خان گران کی زبان سے یہ فاطمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے۔ تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی۔ ”صاحب ہماری کھجوریں تمہاری بات نہیں آتا۔“ اور وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چپچڑھا کر کہتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گھیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ دوسرے میں اس کے منہ کی طوط دیکھتے تو وہ ان سے کہتی۔ ”صاحب تم ایک دم آؤ کا پٹھا ہے۔ جوا فراو۔“ گھجاریہ کہتے وقت وہ اپنے بھروسہ سختی پیدا کر دیتی۔ بلکہ بڑے ہیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی۔ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل آؤ کہہ چٹے دکھائی دیتے۔

گروہاں دہلی میں وہ جب تک آئی تھی۔ ایک گورہ بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین بیٹے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہوئے تھے جہاں اس نے نسا تھا کہ بڑے صاحب رہتے ہیں۔ جو گروہوں میں شغل جاتے ہیں صرف چھ آدمی اس کے پاس آتے تھے۔ صرف چھ، یعنی بیٹے میں دو۔ اور ان چھ کا گروہ اس نے خدا ترانہ تو سارے اٹھارہ روپے دوسرے کیے تھے۔ رتن روپے سے زیادہ ہر کوئی ماننا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نفوس کتا بھی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوٹری نہیں دے گا۔“ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا۔ ”دیکھو میں تمیں سے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھکا تم کم کو تو نہ ہو گا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو ہو جو روٹ جاؤ۔“ چٹھے آدمی نے یہ بات سن کر گڑبڑ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب وہ دوسرے گروہ میں دو روزے بند کر کے وہ اپنا کوٹ آٹھنے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ ”لایسے ایک روپہ روٹو کا۔“ اس نے ایک روپہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چٹائی ہوئی تھی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ

نے بھی چپکے سے لے لی کہ جو آیا ہے نصیحت ہے ۔

ساتھ ساتھ وہ بچے تین مہینوں میں — میں روپے اہوار تو اس کو کھٹے کا کر رہا تھا جس کو ایک مکانی اگر نری زبان میں غلطی کرتا تھا اس غلطی میں ایسا پاؤں تھا جس میں زمین کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے نصیب سے ایک ۔ ایسے نہیں ثابت ہو جاتی تھی اور بڑا خود ہوتا تھا شروع شروع میں تو اس شخص نے اسے بہت ڈرایا تھا ۔ پتلے دن جب وہ رفیع حاجت کے لیے اس پائے میں گئی تو اس کی کہیں شدت کا وہ دور ہوا تھا غارخ ہو کر سب اٹھنے لگی تو اس نے منگی ہوتی زمین کو سہارا لے لیا اس زمین کو دیکھ کر اس نے خیال کیا جو نگہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں ۔ یہ زمین کسی لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جائے کہ اسے مگر جو جی اس نے زمین کو کچھ کھڑا کھڑا چاہا اچھ کھٹ کھٹ سی ہوتی اور پھر ایک دم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈبکے مارے اس کے منہ سے تھوڑی سی نکل گئی ۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں بیٹھا فوٹو لگائی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈروکروم ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی ۔ دوڑ کر باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا ۔ کیا ہوا ؟ — یہ چیخ تھاری تھی ۔ سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا ۔ اس نے کہا ۔ یہ تو بچہ تھا ہے ۔ یا کیا ہے بچہ میں یہ دیکھ کر لڑکیوں کی طرح زمین پر لٹا لٹا کر ہے ۔ میری کمر میں دو تختوں میں لے کر چلا اس کا سہارا لے لوں گی پر اس ہوتی زمین کو کچھ کھڑا کھڑا کر دو دھماکا ہو کر اسے ہم سے کیا کھڑا ۔ اس پر خدا بخش بہت جھسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پر غصے کی بات سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زمین پر لٹنے سے سب گندگی زمین میں دھنسن جاتی ہے ۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمجھتا ہوا یہ ایک ہی کہانی ہے خدا بخش راوی پشٹی کا تھا ۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے مری چلانا سیکھی ۔ چنانچہ چار برس تک وہ راوی پشٹی اور نظیر کے درمیان مری چلانے کا کام کرتا رہا ۔ اس کے بعد نظیر نے اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی ۔ اس کو کھنگارہ ساتھ لے آیا ۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس لیے اس نے عورت کو بیٹھ بٹھا دیا ۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبار میں ہے ۔ وہ اس کی تلاش میں آیا ۔ جہاں اس کو سلطانہ مل گئی ۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کا سمجھ بھگ ہو گیا ۔ خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار یک آٹھا عورت جو کہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اس نے کچھ خدا بخش بڑا جھاگواں ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے چنانچہ اس خوش افتادہ نے خدا بخش کی دقت اس کی نظر میں آ رہی تھی ۔

خدا بخش آدمی غفرتی تھا ۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا ۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو روپے ایشیوں کے باہر منڈی کمرے سے فوٹو کھینچتا تھا ۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا پھر سلطانہ سے ساتھ روپے کے کمرہ بھی خرید لیا ۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا ، دھڑکیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے خود اپنا کام شروع کر دیا ۔

تھا جس سے تین روپے میں سودا لے لیا۔ اس کے بعد پانچ روپے میں تین بیٹھنیں چھپا دیں۔ سلطان نے صوف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

میں روپے اب اس طرح تو فیٹ کے کر دیے جلتے تھے۔ ہائی لائیکس اور ریکل کا بل بڑا اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ۔ کھانا پینا، کپڑے لے، اور اور اس آدن کی بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین بیٹھنیں آئے تو اسے آدن تو نہیں کر سکتے۔ سلطان پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ روپے کی آٹھ لکھنیاں ہیں اس نے وہاں سے تین نوائی لکھنیں، آہستہ آہستہ یک لکھنیں، آخری لکھن کی سب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا: تم میری سولہ روپے دو اپس آنا ہے۔ یہاں کیا دھڑا ہے؟ — جس پر جھکا اور چون توں شہر اس نہیں آیا تھا، کام بھی وہاں فروغ نہ تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں جو پر نقصان ہوا ہے اس کو پانچ سو روپے سمجھو اس لکھن کو نہ بکا کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ ہاندو کرتا روکتی ہوں۔ آج مات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔ خدا بخش نے لکھن سلطان کے ہاتھ سے لے لی اور کہا: نہیں ہمارا میں انہا سے نہیں ہاؤں گے۔ میںیں وہاں میں وہ کلا لائیں گے۔ یہ تمہاری چڑیاں سب کی سب میںیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کار ساز ہے۔ یہاں بھی روکتی نہ کوئی اسباب بنائی دے گا۔

سلطان چپ جو رہی چنانچہ آخری لکھن بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ نیچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوا تھا۔ پر کیا کرتی بیٹھ بھی تو انہی سبیلے سے بھرتا تھا۔

جب پانچ بیٹھ گئے اور آدن خرچ کے مقابلے میں جو تھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطان کی پریشان اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطان کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دوستیوں نے وہاں اس کو جو وہاں سے ملتا تھا وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی پر ہر دو دن اس کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھنے، ہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سبیلوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے منہاں نکال کر بیٹھتی رہتی۔ کبھی چای یا کاشتی رہتی۔ کبھی اپنے پڑا سودا بیٹھنے سے کپڑوں کو سستی دیتی اور کبھی باہر لکھن میں آکر جنگل کے ساتھ ٹک کر کھڑی ہر جاتی اور سامنے ریل سے ڈیڑھ میں ساکت اور حرکت انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

شرک کی دوسری طرف مال گورنم تھا جس کو اس نے سناں کو نے تک پھیلا ہوا تھا۔ دلہنے ہاتھ کو بچے کی قیمت کے نیچے بڑی بڑی کانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال و سباب کے ذخیرے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بڑا بڑا لکھن پڑا تھا۔ دھوپ میں یہ لوہے کی پٹریاں چمکتیں تو سلطان اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتی جس پر پٹریاں لگے بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لیے اس کو کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی ابھر کبھی ادھر ان انجنوں اور گاڑیوں کی چمک چمک چمک چمک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہاں ٹھکر باگھن میں آتی تو ایک عجیب سا ناظرانہ دھنگ میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گئے آسمان کی جانب موٹے اور جاری آبرموں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹریوں سے اُٹھتے اور انکو چمکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھول لی جاتے تھے۔ جب کبھی کبھی

جب وہ گاڑی کے کسی ڈبلے کو جسے انہیں نے دھکادے کر چھوڑ دیا ہو کیلے پٹریوں پر چلنا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا کہ وہ سچی کڑا سے
 ہی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکادے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی
 ہے۔ نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا اندر آہستہ آہستہ ختم ہوگا اور وہ کیوں تک جائے گی۔ کسی ایسے
 مقام پر اس کا دیکھا جائے گا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے طلب گفتگوں پر لک کی لک پر لکسی یا لکی پٹریوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے آنکھوں کی طرف دیکھتی رہی۔ ہر طرح طرح
 کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبار چھاؤنی میں جب وہ رتی تھی تو ریشمیش کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے
 کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا اب تو کبھی کسی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا
 پھیلا ہے اور مگر مگر سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکڑ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن
 اور دھواں دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے۔ جو کبھی کبھی انبار کے پاس کے ہاں آتا کہ تھے۔
 پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چپکے کے کسی
 بازار میں سناٹے کو کشتوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ کسی باتیں سوچنا، دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس
 نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خود بخش نے اس نے بار بار کہا کہ کھوسیرے محل پر دم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ یہاں سلاطین یہاں بیارو
 کی طرح پڑی رہتی ہوں۔ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی۔ "جانی میں! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ
 نے مجھ کو چند دنوں میں ہی پٹریاں مرنے کا۔"

پندرہ سال پہلے میں نے ہو گئے تھے مگر اب تک سلطانہ کا پٹریاں مرنے کا خیال نہ تھا نہ خود بخش کا۔

عزم کا ہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے نواسے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی میٹیش کی ایک نئی
 وضع کی قمیص جو ان تھی جس کی آستینیں کالی جاڑٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ بیچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹھی کی شلو اور تھی
 جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انہی نے ریشمیش کی جاڑٹ کی ایک بڑی نفیس ساٹھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساٹھی
 کے نیچے سفید بوسکی کا پٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا پیش ہے۔ اس ساٹھی کے ساتھ پہنے کا انہی کالی ٹائل کلاک جو آئی تھی جو بڑا
 نازک تھا سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت ڈکڑا کہ وہ عزم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے
 کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انہی اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھرائی تو اس کا دل بہت اُسا اس تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پٹو
 سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خود بخش حسبِ اہل باہر تھا۔ جب کہ وہ وہی رگڑا ٹکیرے کے نیچے رکھ کر بیٹھی رہی۔
 پر جب اس کی گت اور پچان کے باعث اگلا سی ٹی تو باہر باکھنی میں سی ٹی ٹاکنم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔
 سامنے پٹریوں پر گاڑیوں کے ڈالے کھڑے تھے۔ رات کو کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھ کاونچہ تھا۔ اس لیے

مگر وہ غیاب ہو گیا تھا۔ انارکس ایسے آدمی پہلے شروع ہو گئے تھے جو تاک تھا کہ کرنے کے بعد چپ چاپ گھوٹ کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اُپر کی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا، سلطانہ ہنس کر اڑی اور اس کو ٹپکول لگی۔ مگر وہ کتاب سامنے پڑھ رہی تھی۔ ایک انجی نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے خود سے اس کی طرف دیکھا شروع کیا اور ابسترا ابسترا یہ خیال اس کے دماغ میں اُڑا کہ انجی نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی جل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف الجھائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک طیلت اشارے سے پوچھا۔ کہ حیر سے آدمی۔ سلطانہ نے اُسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ مگر پھر ٹری ٹھہرتی سے اُپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اُسے وہی پر جھلیا جب وہ چل گیا تو اس نے سلطانہ کو شروع کرنے کے لیے کہا۔ آپ اور آپ آتے ٹر کیوں مہر تھے۔ وہ آدمی سن کر مسکرایا۔ قیاس کیسے معلوم ہوا — ٹوٹنے کی بات ہی کیا تھی؟ اس پر سلطانہ نے کہا تھیں نے اس لیے کہا کہ آپ ورنہ اب وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آتے۔ تو وہ یہ سن کر پھر سکرایا۔ قیاس غلط تھی ہوئی میں تمہارے اُپر دالے غیبت کی طرف دیکھ رہا تھا وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھٹھا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ نظر پند آیا۔ پھر بالکل سن سبب طلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبب روشن مجھے پند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جاتہ لیتا شروع کر دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا۔ آپ جادہ ہیں؟ اس نے آدمی نے جواب دیا۔ نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں — چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کو دیکھا۔ کاشانہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا میرا نام شکر ہے۔ سلطانہ نے پہلی بار غور سے شکر کی طرف سے دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل جسم کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں زیر معمولی طور پر صاف اور حقائق قیاس کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گھٹیلے اور کڑی بدن تھا۔ پینٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ نمائندگی رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قیاس تھی جس کا کارڈ گردن پر سے اُپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ شکر کچھ اس طرح دی پر جھٹکا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شکر کے بھائے سلطانہ کا ایک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدر سے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شکر سے کہا۔ فرمائیے.....

شکر بیٹھا تھا یہ سن کر میٹ گیا۔ میں کیا فرماؤں کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا قیاس نے ہے مجھے۔ جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اُٹھ بیٹھا قیاس بھلا، لو اب مجھ سے سُنو، چکھو تم نے کبھی غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح ہیری جی قیاس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو قیاس دینا ہی پڑتی ہے۔ سلطانہ یہ سُن کر چکا لگئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ آپ کام کیا کرتے ہیں؟ شکر نے جواب دیا۔ یہی جو تم لوگ کہتے ہو۔

کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا — بہت کام کا آدمی ہوں؟
 شکر چلا گیا اور سلطان کا لے پاس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دل کو
 کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ اپنا لے میں کرتا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی ملک میں اس آٹکی کو دیکھا ہوتا اور
 بہت ملکی ہے کہ اسے دیکھ کے وہ کر بار نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت آدمی رہتی تھی اس لیے لشکر کی باتیں اسے پسند ہیں۔
 خاتم کو جب خدا بخش آیا تو سلطان نے اس سے فرمایا کہ تم آج سارا دن کہہ رہے ہو کہ
 خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا: پرزائے قلم کہے پاس سے آ رہا ہوں وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے
 ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دل پر چرائیں۔

”کچھ انھوں نے تم سے کہا؟“

”نہیں، ابھی وہ مر رہا نہیں ہوئے۔“ — یہ سلطان نے جہاں کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ امارت کبھی نہیں جائے
 گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور اسے نیارے ہو جائیں گے۔“
 سلطان نے دماغ میں قہر مٹانے کا خیال سلایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے روٹی آواز میں کہنے لگی۔ سارا سارا دن باہر غائب
 رہتے ہو۔ میں یہاں بچے میں قید رہتی ہوں، کہیں جا سکتی ہوں نہ سکتی ہوں۔ قہر سر پڑ گیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر
 کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں چٹوٹی کڑی تنگ نہیں۔ گنگنیاں نہیں سورو، ایک ایک کر کے پگ لگیں۔ اب تم ہی
 بتاؤ کیا ہوگا؟ یوں فقیروں کے لیے کچھ کب تک مارے پھرا کر دو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں وہی میں خدا
 لے بی ام سے منہ موڑ لیا ہے میری سونو تو اپنا کام شروع کر دو کچھ تو سہارا ہو رہی جانے گا؟

خدا بخش دبی پریشان گیا اور کہنے لگا: یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے۔ خدا کے لیے
 اب ایسی دیکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتی، میں نے پہلے ہی اپنا رچھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو
 کرتا ہے۔ اللہ ہی کرتا ہے اور جاری ہوتی ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم.....
 سلطان نے بات کاٹ کر کہا: تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کو یا فاکہ ڈالو، پر مجھے ایک شہر رکا پڑا ضرور لا دو۔
 میرے پاس سفید بوسکی کی قمیص پٹری ہے، اس کی من دنگا لوں گی۔ سفید ٹیٹوں کا ایک دوڑے بھی میرے پاس موجود ہے وہی
 جو تم نے مجھے دیوالی پر رکا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ دنگوا دیا جائے گا۔ ایک صرت شہر کی کسر ہے۔ سورو تم کسی نہ کسی
 طرح پیدا کر دو..... دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔ — میری بھتیجی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔“

خدا بخش اٹھ بیٹھا اب تم خواہ مخواہ زور دے پھلی جاری ہو۔ میں کہاں سے لاؤں گا۔ — ایم کھانے کے
 لیے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔“

”کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گڑ کالی ساٹن لا دو۔“

”دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔“

یہیں تم کچھ نہیں کرو گے — تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹھی بارہ چودہ آئے گزول
 جاتی تھی۔ اب سو روپے لڑکے کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزول پر کھتے دوپے خرچ ہو جائیں گے؟
 آپ تم ملتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔ یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ کو اب ایسی باتوں کو قبول ہاؤ میں جن سے کمانے کوئی نہ

ہوئی سے کہہ کر اڑا دونوں نے لی کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش برائے قلعے اے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطان ناکیلی
 رو گئی۔ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ کچھ دیر سوئی رہی۔ اور اندر سر کر دیں میں ملتی رہی۔ دوپہ کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید منو کا دوڑا اور
 سفید لاسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لاندھی دوائے کو دھنسنے کے لیے دے آئی کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں دھنسنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یکایک
 کرنے کے بعد اس نے وہاں سے اکثر لوگوں کی کتابیں پڑھیں۔ جن میں اس کے دیکھے ہوئے نفلوں کی کافی اور گیت جیسے ہوتے تھے۔ یہ کتابیں
 پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چادر بچ چکے تھے۔ کیونکہ وہ صوب آٹھوں میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ خدا صکر ناراض ہوئی تو
 گرم چادر اور دھکر باگھی میں آٹھری ہوئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ سلطانہ باگھی میں بکھری رہی۔ اب شام ہو گئی تھی۔ قیاس دوشن ہو رہی تھیں
 نیچے شکر میں دونوں کے اشارہ نظر آئے گئے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ دھکر پر راتے
 جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک طرف سے دیکھ رہی تھی۔ وہ خدا اُسے شکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گون اور گائی۔
 اور سلطانہ کی طرف دھکر کو مسکرایا۔ سلطانہ نے غرغرا دی طور پر اٹھ کا اشارہ کیا اور اُسے کمر بٹا لیا۔

جب شکر اُپر آیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے کچھ اسے اشارہ
 کر دیا۔ شکر بے غلظت تھا۔ جیسے ان کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ ٹوٹی بے تکلفی سے پہلے دھکر کی طرح وہ گاؤں کی سرکے نیچے دھکر کر لیٹ گیا۔
 جب سلطانہ نے دھکر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا: تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔ میں
 ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔

سلطانہ شش درخت میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی: "میں جیٹو تھیں جانے کو کون کہتا ہے؟"

شکر اس پر مسکرایا: "تو میری شرطیں تھیں منظور ہیں؟"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے جس کو کہا: "کیا نکاح کر دے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟" — "تم تو میری کسی سے نکاح کرو گی نہیں۔ یہ دیکھیں ہم لوگوں کے لیے نہیں — چھوڑو ان

فرضیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو؟"

"ہاں کیا بات کروں؟"

"تم صحت ہو۔ کوئی ایسی بات کرو جس سے دو گھنٹی دل بہل جائے۔ اس کو دنیا میں صحت دکھاندا رہی ہی دکھاندا رہی

نہیں کچھ اور بھی ہے؟"

سلطانہ نے اپنی طور پر اب شکر کو تہل کر رکھی تھی کہنے لگی: "صاف صاف کہہ دو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

میرا دوسرے چاہتے ہیں؟ شکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تم میں اور دوسروں میں فرق ہی کیا رہا؟“
 ”تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو چھپنا نہیں چاہئیں خود بھجنا چاہئیں۔“
 سلطان نے تھوڑی دیر تک شکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا: ”میں سمجھ گئی۔“
 ”تو کہو کیا ارادہ ہے۔“
 ”تم جیتے، میں ماری پر میں کتنی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔“
 ”تم غلط کہتی ہو۔۔۔ اسی مجھ میں تمہیں ایسی ساوہ لوح و حوریں بھی مل جائیں گی جو کبھی فیض نہیں کریں گی کہ عورت ایسی قلت قبول سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو، لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو تھارا نام سلطان ہے نا؟“
 ”سلطان ہی ہے۔“
 ”شکر! ٹھیک تھا! جو ارادہ ہنسنے لگا میرا نام شکر ہے۔۔۔ یہ نام بھی عجیب! اوٹھ! ٹانگہ ہوتے ہیں پھلواؤ اندر چلیں۔“

شکر اور سلطان دہری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر جب شکر ملنے لگا تو سلطان نے کہا: ”شکر مری بات مانو گے؟“
 ”شکر نے جواب دیا: ”پہلے بات بتاؤ۔“
 سلطان نے کچھ عیب ہی لگئی۔ تم کو لگے کریں دام و سول کرنا چاہتی ہوں مگر.....“
 ”کو کو کو۔۔۔ ٹیک ٹیکوں گئی ہو۔“
 سلطان نے جرات سے کام لے کر کہا: ”بات یہ ہے کہ تم آج اسے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کریں گے کالی شلوار اور اسکا۔۔۔ یہاں کے سادے ڈاکٹر کے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو، تمہیں اور دو چڑ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج ڈنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔“

شکر نے یہ سن کر کہا: ”تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں تو تم یہ کالی شلوار اور اسکا۔۔۔ سلطان نے فوراً ہی کہا: ”نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھ کو ایک کالی شلوار لا دو۔“
 شکر مسکرایا: ”میری عیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا۔ مجرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔۔۔ بس اب خوش ہو لیں۔“ سلطان کے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا: ”کیا یہ بندے تم مجھ سے مل سکتے ہو؟“
 سلطان نے ہنس کر کہا: ”تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے عمل بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو پانچ روپے کے ہوں گے۔“
 اس پر شکر نے کہا: ”میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ جو لو رہی ہو۔“

تھے۔ یہ کہہ کر سلطان نے بندے کو آواز کر کے دیکھ دیا۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوا مگر شکر بجا چکا تھا۔

سلطان کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے سلطان سے پردہ سبک ہوئی۔ سلطان نے دوا نہ کھولا تو شکر کھڑا تھا۔ اخیر میں لڑائی ہوئی پھر اس نے سلطان کو دی اور کہا: سائل کی کالی مشلوار ہے۔ دیکھ لینا شاید ملی ہو۔ اب میں چلتا ہوں۔“

شکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطان سے نہ کی۔ اس کی پٹکوں میں شکینس پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی میں سوکڑا شہاب ہے اور سیدھا اور صریح چلا آیا ہے۔“

سلطان نے کاغذ کھولا۔ سائل کی کالی مشلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطان بہت غرض ہوئی۔ بندوں اور اس سوئے کا ہوا افسوس اُسے ہوا تھا۔ اس شلوار نے اور شکر کی وعدہ ایضاً کی تھی تو وہ گویا۔

دو پھر کو وہ نیچے لائڈی والے سے اپنی زنگی ہوئی تھیں اور دوپٹے آئی۔ تیغوں کا لے کر شہاب جب اس نے پہن لیے تو دوا کے پردہ سبک ہوئی۔ سلطان نے دوا نہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطان کے تیغوں کی پٹوں کی طرف دیکھا اور کہا: تھیں اور دوپٹے تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ یہ شلوار ہی ہے۔ کب بنوائی ہے؟

سلطان نے جواب دیا۔ آج ہی ادنیٰ لایا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں۔ یہ بندے تم نے کہاں سے لے آیا؟

مختار نے جواب دیا۔ آج ہی منگوائے ہیں۔“

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

(دھواں میں سے)

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بھارے کے دس تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیالی آیا کہ اسلامی قیدیوں کی طرح پاٹھوں کا تہلو نہیں ہونا چاہیے، یعنی جسٹان ہلال، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات مقبول تھی یا غیر مقبول، بہر حال دانشمندی کے فیصلے کے مطابق اور دھڑلہ بازی سطح کی کانفرنس ہوئی اور بالآخر ایک دن پاٹھوں کے تہلوں کے لیے مقرر ہو گیا۔ ایسی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے درمیان ہندوستان میں تھے وہ ہیں رہنے دیے گئے تھے جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہیں رہا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب ان کی حفاظت میں سرحد پہنچا دیے گئے۔

آخر کا معلوم نہیں لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تباہی کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چیزیں گویاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہروز باقاعدگی کے ساتھ زمیندار پر مہلتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا تو بولی ساب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے۔ تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں اترے جتے ہیں۔

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا سواہری میں ہندوستان کون بھیجا جا رہا ہے۔

ہیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔

دوسرا سکھ آیا۔ مجھے تو ہندو ستروں کی بولی آتی ہے۔ ہندوستانی بڑے شیطانوں کو اکو اکو پھرتے ہیں۔

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ اس قدر سے بلند کیا کہ فرش پر پھیل کر گر اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے سماجیوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے انھوں کو سٹے داکر پاگل خانے میں لے کر دیا تھا کہ چھان بین کے چندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور پاکستان کیا ہے۔ لیکن حج و تمکات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور ہر وہ دار و سپاہی ان پر خدا و جالی تھے۔

ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی کو علی جناح سے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں اس نے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم الشان ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے۔ اس کا نقل و وقوع کیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بالکل غلط فہمی میں وہ سب پاکستان میں کا داغ پوری طرح ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ اس غلط فہمی میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک بالکل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے پتھر میں کچھ ایسا گرفتار تھا کہ اس کا دل باغ و باغ ہو گیا۔ جھانڈو دیتے دیتے ایک دن دوست پر چڑھ گیا اور غصے پر غصے پر غصے پر غصے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نامک مسئلے پر تھی۔ سچا سچ اس نے اسے نیچے آترے کہ کوا تو وہ اور لو پر چڑھ گیا۔ ڈرا دھمکا دیا گیا تو اس نے کہا — میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں — میں اس دوست کی پھر رہیوں گا؟

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دل دھڑکنے لگا تو وہ نیچے آتا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل کر رونے لگا کہ خیال سے اس کا دل بھرا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائے گا۔

ایک دوسرا نام — سی ایس ایس بیٹری لڑائی میں جو مسلمان تھا اور دوسرے پاکستان سے بالکل الگ تھا کہ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش تھا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دھوا کر کے صاف کر دیے اور رنگ و طرح رنگ سارے باغ میں چلتا پھرتا شروع کر دیا۔

پٹیوٹ کے ایک موٹے مسلمان بالکل نے جو مسلم ایک کاسٹرم رکھ رہا تھا اور دن میں چند سو روپے کماتا تھا کہ اس کا تھکا ہوا جسم یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام کو علی تھا۔ چلتا پھرتا ہے ایک دن اپنے جھنگلی میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم کو علی جناح سے ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ بالکل باشر تھا اس کے گھر پر گیا۔ قریب تھا کہ اس جھنگلی میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک بالکل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

دوسرا کہ ایک نوجوان ہندو کو علی تھا جو بہت ہی ناکام ہو کر بالکل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرت سر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت ڈنکا ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے بہت بہت مہر تھی۔ گو اس نے اس دیکھ کو ٹھکرایا تھا مگر بالکل کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولتا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اسلم بیٹوں کو کالیاں دیتا تھا جنہوں نے لی ملا کر ہندوستان کے دھڑکے کر دیے — اس کی محبوبہ ہندوستانی بھی گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تباہی کی بات شروع ہوئی تو وہ بالکل کوئی پانگوں نے بھیا کہ وہ دل بڑا دکھ ہے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرت سر اس کی پرورش نہیں چلے گی۔

دوسرے دن وارڈ میں دو ڈھنگو اندر میں بالکل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کی تباہی کے اثر نہ چلے گئے ہیں تو ان کی

بہت حد پر جا۔ دو چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اچھٹے پر گھنٹو کرتے رہتے کہ بالکل خانے میں اب ان کی حیثیت کسی قسم کی ہوگی۔ یورپین وارڈز پر لگایا اٹھا دیا جائے گا۔ ہر ایک خاصٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی ٹوٹن دیا جاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سگہ تھا جس کو بالکل خانے میں داخل ہوئے چندہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ گھنٹے میں آتے تھے۔ اوڑھی گواڑوی انگلیں دی بے دھیا ناوی منگ دی وال آت دی لائیں۔ دن کو سوتا تھا زراٹ کو۔ پھر دادوں کا یہ گنا تھا کہ چندہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک ٹھکے کے لیے بھی نہیں سوراہیٹا بھی نہیں تھا۔ ابتر کہی کبھی کسی دروازے کا تھوٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑے رہنے سے اس کے پاؤں شروع گئے تھے۔ ہڈیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تحلیل کے باوجود یسٹ کراڈم نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پانگوں کے تباہی کے متعلق جب کبھی بالکل خانے میں گھنٹو مرنے لگی تو وہ خود سے منسا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ اوڑھی گواڑوی انگلیں دی بے دھیا ناوی منگ دی وال آت دی پاکستان گورنمنٹ۔

لیکن بعد میں، آت دی پاکستان گورنمنٹ، کی جگہ آت دی ٹوہریک سنگھ گورنمنٹ، نے لے لیا اور اس نے دوسرے پانگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوہریک سنگھ کہاں ہے جہاں کادہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو کہنے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ کیا ٹوہریک سنگھ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا، پر اب کتنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور، جہاں پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور پھر کون سیٹے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سگہ بالکل کے کسی چھوٹے ہو کر بہت مختصر ہو گئے تھے۔ چونکہ بہت کم خانا تھا اس لیے دائرے اور سر کے بال آپس میں جڑ گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی جھپٹا ہو گئی تھی۔ مگر آوی بے ضرر تھا۔ چندہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا نہ پیش کیا تھا۔ بالکل خانے کے جو چرنا لے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوہریک سنگھ میں اس کی کہنی زمینیں تھیں۔ اچھا کیا تو دنیا زیندار تھا کہ اچھا نک دماغ آٹ گیا اس کے رشتے دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور بالکل خانے میں داخل کر گئے۔

یعنی میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر فریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی ان کا آکا بند ہو گیا۔

اس کا نام جی سنگھ تھا اگر سب اسے ٹوہریک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ یقیناً معلوم نہیں تھا کہ وہ کونسا ہے، جیہ کہ کونسا ہے، دیا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر جیسے جب اس کے عزیز آتا رہا اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا

بشن سنگھ خاموش رہا، فضل دین نے کہنا شروع کیا، انھوں نے فہم سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پر پوچھتا رہوں — اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو — بھائی بلیہ سنگھ اور بھائی دودھو سنگھ سے میرا سلام کہنا — اور میں امرت کو سے بھی بھائی بلیہ سے کہنا، فضل دین راضی خوشی ہے — دو بھائی بھینس ہیں جو دو چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کہا تو یہ ہے — دوسری کے کئی بھائی تھے، پر وہ چھوڑ دیں کی بھوکے مر گئی اور میرے لائق جو خدمت ہیں، کناریں پر وقت تیار ہوں اور یہ تمہارے لیے تھوڑے سے مرڈے لایا ہوں۔

بشن سنگھ نے مرڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا تو بیک سنگھ کہاں ہے؟ فضل دین نے تقدسے حریت سے کہا، کہاں ہے — وہیں ہے جہاں تھا۔

بشن سنگھ نے پھر پوچھا، پاکستان میں یا ہندوستان میں؟ ہندوستان میں — نہیں نہیں پاکستان میں، فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ جڑ جڑاتا ہوا چلا گیا، اوڑھی گڑگڑادی ایکس دی بے دھیانا دی تنگ دی وال آت دی پاکستان ایسٹ ہندوستان آت دی ڈسٹے منڈا

تباوے کی تیریاں مکمل ہو چکی تھیں، دوسرے، دوسرا اور دوسرے اور دوسرے دوسرے پاگوں کی فزٹس پر پختہ تھیں اور تباوے کا بھی دن مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاپس کیا گیا، خانے سے ہندو سکوپاگوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے حفاظہ دستے کے ساتھ روادا جرمین متعلقہ افریقی ہوا تھے۔ واہگہ کے بارڈر پر مغربی کے سپر ٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تباوہ شروع ہو گیا، جورات بھرجا رہا۔

پاگوں کو لاریوں سے نکلانا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کمپن کام تھا، بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے، جو نکلتے پر دھماکا مارتے تھے، ان کو سلجھانا مشکل ہو جاتا تھا، کیونکہ دوسرا دوسرا بھاگ اٹھتے تھے، جو نکلتے تھے ان کو پکڑے پناے جاتے، تو وہ پھانکے اپنے حق سے جدا کر دیتے — کوئی کا لیاں بک رہا ہے، کوئی گارہا ہے، آپس میں دو جھگڑ رہے ہیں، دوسرے ہیں، بیک رہے ہیں، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی — پاگلی عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور مردی اتنی کڑکے کی تھی کہ دانت سے دانت کچ رہے تھے۔

پاگوں کی اکثریت اس تباوے کے حق میں نہیں تھی، اس لیے کہاں کی بھڑیں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جگہ کچھ سمجھ سکتے تھے پاکستان زندہ باد اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے، دوسری طرف ہوتے ہوئے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر حیرت آگیا تھا۔

جب بشو سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے پاس پاؤں متعلقہ افسر اس کا نام دوسرے درج کر کے گاؤں سے پوچھا، تو بیک سنگھ کہاں ہے — پاکستان میں یا ہندوستان میں؟

تعلقہ افسر بنے۔ پاکستان میں۔

یہ سن کر شیشہ ٹکڑا پھیل کر ایک طرف ہٹا اور دھڑکاپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف بے جھنجھکے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ٹوہ ٹیک سنگھ یہاں ہے — اور دہرے سے چلتا ہے لگا۔ اڑی ڈی گڈا ڈی ایٹکس وہی ہے دھیا نا دی سنگ دی وال آت ٹوہ ٹیک سنگھ ایٹک پاکستان۔ اسے بہت بھجایا گیا کہ دیکھو اب ٹوہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے — اگر نہیں گیا تو اسے فوڈ وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف بے جھنجھک کر شیشہ کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی شہرہ جوتی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آوی پکڑے ہوئے تھے اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی، اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تباہی کا باقی کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بٹھ سنگھ کے حلق سے ایک ٹھک ٹھک کا رنچ نکلی — اور دھڑکائی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آوی جو چند برس تک وہی ذات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اب دھڑکے مڑ پڑا ہے۔ اور صبر بردار تاروں کے نیچے ہندوستان تھا — اور ویسے ہی تاروں کے نیچے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ ٹوہ ٹیک سنگھ ٹپا تھا۔

(”چھندے“ میں سے)

اس منجھدار میں

کردار

بیگم ماں
 امجد { بیگم کے بیٹے
 مجید { بیٹے
 سعیدہ امجد کی بیوی حسین بیوی
 اصغر می خادمہ
 کریم اور غلام محمد نوکر

پہلا منظر

(نگارو کا ایک کمرہ — اس کی خوبصورت فیٹہ لگی کھڑکیاں پہاڑی کی ڈھلوانوں کی طرف کھلتی ہیں، بخیر
 تک پہاڑی پہاڑ نظر آتے ہیں جو آسمان کی خاکستری نالی نیلا جھوں میں گھل گئے ہیں۔ کھڑکیوں کے بیچ پر دھ
 بیج کی بلی چمکی ہوا سے ہولے ہولے سرسراہے ہیں۔ یہ کمرہ جیسا کہ سازو سامان سے معلوم ہوتا ہے جگہ غریب
 میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کو کھڑکیوں کے پاس ساگوان کی کسری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کونوں
 پیشے کی تپائی جس پر بڑی صراحی اور گلاس کے علاوہ ایک ٹائم میں رکھی ہے۔ نیچے ہٹ کر پیاز کی ٹینیٹے میں
 جوس سو فرسیٹ ہے۔ اس پر دو ملازم گورتاں سجا رہے ہیں — اس سے ٹور ہٹ کر ایک نوجوان خادمہ
 جو صحن کی شکل و صورت کی ہے آتشخان پر سجاتی ہوئی مختلف چیزوں کو اوڑھنا دے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔
 کمرے کی فضا میں ایسی دھڑنگی ہے جو ذرا سی جنبش سے منکوحیت میں تبدیل ہو سکتی ہے — باہر سے
 ٹانگوں پر کڑی کی تختی تختی ضرور کی آواز آتی ہے۔ تینوں خادمہ جگے سے دھکیل کے بعد اپنے اپنے کام میں
 مشغول رہتے ہیں — دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی دھیر عورت بیٹھا کھینوں کی مدد سے اندر آتی ہے
 اور کمرے کا جائزہ لے کر اپنے اطمینان کا اظہار کرتی ہے۔)

بیگم صاحب۔ (دیکھا کیوں کی مدد سے کہہ رہی ہیں ادھر ادھر بچہ کر تمام چیزوں کو صحیح مقام پر دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے، ٹھیک ہے (دیکھ دیکھا کئی کڑی بھل سے انگ کے صوفے کے ساتھ رکھ کر بیٹھنا چاہتی ہے، مگر فوراً ہی اپنا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ سہارے کے لیے صوفے کے بازو کی چمکیلی سطح کے ساتھ چھو رہا تھا اور اس پر نشان پڑ گیا تھا۔ اپنے دوپٹے کا ایک کونہ پکڑ کر وہ خود بخود مٹ جانے والا نشان بچھا رہی تھی ہے اور پھر یہ کئی بچی بھل ہیں جہاں کو جہاں خدا دے سے مخاطب ہوتی ہے) (اصغری!)

اصغری۔ (فوراً متوجہ ہو کر) جی!

بیگم صاحب۔ (ایک دم بے محسوس کر کے کہ وہ بھول گئی ہے کہ اس نے اصغری سے مخاطب کیوں کیا تھا، میں کیا کہنے والی تھی؟ (اصغری۔ (مسکراتی ہے) آپ یہ کہنے والی تھیں کہ آپ کا اطمینان نہیں رہا..... میں اب بھی یہ سمجھتی ہوں بیگم صاحب — دولہن بہت خوبصورت ہے — اس کرے کی تمام سجاوٹیں اس کے سامنے ہمارے جلوں کی۔ (وہ آتش دان کے عین درمیان میں ریختی ٹودروں سے آویزاں، دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے)۔
بیگم صاحب۔ (مسکراتی ہوتی) — آتش دان کی طرف! آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور اپنی ہموں کی تصویر کو خود سے دیکھتی ہے — خوش ہوتی ہے۔ لیکن ایک دم گھبرا سی جاتی ہے، (اصغری!)

اصغری۔ جی!

بیگم صاحب۔ سچ سے میری طبیعت — کچھ گھبرا سی رہی ہے۔

اصغری۔ (مجھڑیاں جو اُسے ہیں اپنی دولہن کے ساتھ۔

بیگم صاحب۔ (اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی) ہاں..... بس آنے والا ہے..... کمال موڑ لے گیا ہے (ایکشن پر۔

اصغری۔ (اگلے سال عید میاں کی شادی کے لیے) — گھر میں دو دن ہی دولتی ہو جائے گی۔

بیگم صاحب۔ انشاء اللہ — وہ بھی انشاء اللہ اسی طرح بخیر و خوبی انجام پائے گی..... (زیر لب) انشاء اللہ۔

اصغری۔ (دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے حلقے سے بہت فاصلہ ہوتی ہے) اللہ نظر بد سے بچائے۔

بیگم صاحب۔ (خیر ادا کی طور پر قریب قریب بیٹھ کر) (اصغری!)

اصغری۔ (سہم کر) جی!

بیگم صاحب۔ کچھ نہیں..... گاڑی کب آتی ہے کراچی سے!

اصغری۔ معلوم نہیں بیگم صاحب۔

بیگم صاحب۔ (ایک خادمہ سے) دیکھو کریم! تم ٹیلیفون کرو اور پوچھو..... لیکن گاڑی تو کل ہی کی مارویشنری پہنچ چکی ہے

— عید کا کار جوڑا تھا۔

کریم۔ جی ہاں!

بیگم صاحب - اور میں نے کہاں کو کس اسٹیشن پر پہنچا ہے (گھبرا کر) خدا معلوم میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے
 اجد میاں کو رات رات لو پیٹنڈی شیرنا تھا اپنے دوست سعید کے پاس اور وہ تو میرا خیال بچا ب
 وہاں سے چل ہی چکے ہوں گے (دوسرے خادم سے) غلام محمد؟

غلام محمد - جی؟

بیگم صاحب - تم دیکھو کمال کہاں ہے موٹر کہاں لے گیا ہے؟
 غلام محمد - بہت اچھا! (چلا جاتا ہے)

بیگم صاحب - (اصغری کے کاندھے کا سہارا لے کر) آج صبح سے میری طبیعت عجیب نہیں — چلتے پھرتے سے صفا
 نہ ہوتی — اس کم بخت ڈاکٹر بلایت احمد نے مجھے نسخہ دیا جو تانوں میں دھن کو ساتھ لاتی (دوسرے ٹیلیفون کی
 گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے) میرا خیال ہے، شاید اجد میاں کے دوست کا ٹیلیفون ہے کہ وہ چل پڑے ہیں جیانا
 اصغری جھاکے جاؤ۔ (اصغری دوڑی باہر جاتی ہے)

بیگم صاحب - (کریم سے) — اپنی انفرادی فکر کرنے کی خاطر، میں اب اتنے ہی جوں گے، اجد میاں۔
 کریم - اللہ خیریت سے لائے۔

بیگم صاحب - (قریب قریب چیخ کر) کیا مطلب تمہارا۔
 کریم - (ڈوکر، ججائی سی کر) ججائی سی
 (اصغری کی چہنچہن سنائی دیتی ہیں) بیگم صاحب، بیگم صاحب!

بیگم صاحب - (سر اسیر ہو کر) کیوں کیا مجھا؟

(اصغری سخت اضطراب کی حالت میں اندر داخل ہوتی ہے،

اصغری - بیگم صاحب — بیگم صاحب -

بیگم صاحب - (بیساکھیوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر) کیا ہے؟

اصغری - جی اجد میاں کا ٹیلیفون آیا ہے کہ گاڑی گاڑی نکلا گئی ہے۔

بیگم صاحب - (بیساکھیوں پر ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے، پھر؟

اصغری - (اجد میاں اور ان کی دونوں زنجی ہوئے ہیں اور ہسپتال میں پڑے ہیں۔

بیگم صاحب - (ہاتھوں کی گرفت ڈھیل پڑ جاتی ہے — بیساکھیاں بغل سے گر پڑتی ہیں۔ ایک لحظے کے لیے وہ

روں کھڑی رہتی ہے، جیسے پتھر کا ثبت — (پھر اس میں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے۔ اور وہ دروازے کی

جانب بڑھتی ہے، کہاں سے کمرہ نوٹز نکالے — ہم راولپنڈی جا رہے ہیں۔

(بیگم دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے — غلام محمد اور اصغری دونوں جہت زدہ ہیں۔)

اصغری نے دیکھ کر حیرت ہے۔ بیگم پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی ہے،

بیگم صاحب۔ کیا ہے؟

اصغری۔ آپ۔ آپ بے پروا ہیں۔ یہاں سے کتنی ہیں۔

بیگم صاحب۔ میں؟ اپنی بنوں میں جیسا کیوں کی عدم موجودگی کا احساس کرتے ہوئے، میں؟..... میں کیسے چل سکتی ہوں؟

(ایک دم پکارتی ہے اور فریاد کر کے برقع ہرجاتی ہے)

اصغری۔ بیگم کچھ پاس جاتے ہوئے، غلام محمد سے، غلام محمد جانو ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو۔

غلام محمد چلا جاتا ہے۔ اصغری، بیگم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی ہے،

پارہ

دوسرا منظر

رومی کو جو پہلے منظر میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو ساز و سامان پہنچا تھا۔ اب وہ تیار ہو چکا ہے۔ اب ہر چیز دیر کی استعمال شدہ معلوم ہوتی ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ کھڑکیوں کے پرستی پر دوسرے صبح کی پلٹ چلی ہوئی ہے۔ دروازے سرسرا رہے ہیں۔ دروازے کی سائیکل کی سرسری پر دوسرے سیدھے کیل اور سٹوڈیو ہے۔

— شیشے کی تپائی پر پڑی ہوئی تختی ٹائم میں جس میں نو بجے ہیں، لڑنا شروع کر دیتی ہے۔ ہلکی سی گھنٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ کپڑوں میں جنبش پیدا ہوتی ہے۔ — سیدہ کوٹ بدلتی ہے اور آنکھیں کھولتی ہے جبکہ کرنٹی ٹائم میں کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ ایسا کہتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے پر چھاتی ہوئی گھنٹی پلکیں چڑھ چکی ہیں۔ کوٹ بدلتی کو وہ بستر میں کیوں کا سہارا لے کر ڈال دیا اور اٹھ آتی ہے اور باہر جہانگیر تک پہنچ جاتی ہے۔ پٹریوں کا دھڑلہ منظر دیکھ کر بچوں کی سرسری محسوس کرتی ہے۔ پھر ایک دم ناگھیں چلا کر گلی اوپر سے بھاگتی ہے اور اچانک سرسری سے اترتی ہے اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ کسی خوش الحان پرندے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ — سیدہ اپنے خیال میں محو ہے۔ وہ جوان ہے۔ شب غازی کا ڈھیلہ ڈھلا لڑکی لباس پہنی جا اس کے بدن سے خود نورانی حریر دنیا انگ بساتے ہے، اس کے خوبصورت خطوط سے غافل نہیں..... اور خود سیدہ کا اور اکہ بھی..... اس کا سر ہر حسین و جمیل ہے اور اپنے حسن و جمال سے آگاہ..... اصغری کی کوشش آواز، پرندے کی خوش الحانی کا تقابل پیش کرتی ہے۔ سیدہ پر کھنکھتی ہے۔

سیدہ۔ (نگاہوں میں نگاہوں میں کیا ہے؟ پوچھتی ہے)

اصغری۔ بیدیاں ابھی ابھی ہسپتال سے آئے ہیں۔ کتنے تھے، جا کے دیکھو، اب جنگ گیلیں یا نہیں؟

سعیدہ - کیا خبر لائے ہیں ؟

اصغری - میں انہیں بھیجتی ہوں ۔

اصغری چلی جاتی ہے ۔ سعیدہ کھڑکی کے پاس سے بیٹھ کر شگھارہ کے پاس آتی ہے ۔ آنکھیں میں ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کا جائزہ دیتی ہے ۔ دونوں باتوں سے اپنے بکھرے ہونے والے سرسری طور پر ٹیک کر کے سری کی طرف آہستہ آہستہ ہرستی ہے ۔ سری کے سرانے اس کا بار جبٹ کا سفید و پڑ تلک رہا ہے ۔ اسے اٹارتی ہے اور ٹری بے کوکھ سے اپنے کانڈھوں پر ڈال رہتی ہے ۔ باہر سے بوٹوں کی چری آواز آتی ہے ۔ تحفیت سے روئے عمل کے ساتھ سعیدہ دروازے کی جانب دیکھتی ہے ۔ مجید ۔ سائو لے رنگ ۔ کل متوسقہ لوجوان جو مضبوط ہاتھ پاؤں رکھتا ہے اور اس کے چہرے کے خطوط فکر کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور منجھ ہوئے ہیں ، اندر داخل ہوتا ہے ۔

مجید - سلام بھابی جان !

سعیدہ - سلام ۔

مجید - (صوفے کے پاس آکر کھٹے ہوئے) طبیعت کیسی ہے آپ کی ؟

سعیدہ - (بے دلی سے) ٹھیک ہے (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) ، سنا ہے کیا خبر لائے ڈاؤنپٹی سے ؟

مجید - (سعیدہ کے سامنے آکر) کوئی خاص بات نہیں (اداسی سے آدھ بھر کر) بس اب انہیں لے آئیں گے یہاں ۔

سعیدہ - کیوں ؟

مجید - وہ تنگ آ گئے ہیں (ایک منڈھا گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے) ان کی جگہیں ہوتا تو بہت ممکن ہے میں نے خود کشی کر لی ہوتی ۔

سعیدہ - (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) کیا معلوم تھا کہ میری قسمت میں یہ لکھا ہے اتنے آدمی مرے میں بھی ساتھ ہی مر گئی ہوتی ۔

مجید - مگر یہ اللہ کو منظور نہیں تھا ۔

سعیدہ - (کھڑکی سے باہر ہاتھیں کا منظور دیکھتی ہے) ہاں ، یہ اللہ کو منظور نہیں تھا ۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ میری ٹانگ پر ہلکی خراش آئے پر میری ساری زندگی دشمنوں سے بھرپور جھڑپوں سے آنسو پکھنے لگتے ہیں ۔ سفید و پٹے سے وہ انہیں پور نزاکت طریقے سے ہولے ہولے خشک کرتی ہے ، اللہ کو یہ منظور تھا کہ میرے سہاگ کی کرلوٹ جائے اور میں ساری عمر بھائیوں کے ہونے تنگ کی طرح ڈوختی رہوں ۔

(سسکیاں دیتی ہے)

مجید - (آہستہ سے) بھابی جان حوصلے سے کام لینا چاہیے کیا تپا ہے وہ خشک ہو جائیں ۔

سعیدہ - (سردخس کے طور پر) مجید ، کم از کم تم کو مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو ۔ چھوٹے ہو گئے ہیں انہیں ہسپتال

کی چار پائی کے ساتھ لگے ہوئے ٹاکٹروں کا جو فیصلہ ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے ان کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو چکی ہیں لیکن لیکن میں ایک بات مانتی ہوں کہ ان میں بہت حوصلہ ہے میں جب بھی ان کو کہا اس گئی۔ انھوں نے مجھے پاس بٹھا کر کہا، سعیدہ! کچھ کھڑو کرو، میں بہت جلد تندرست ہو جاؤں گا اور پھر میں تمہیں ان پٹائیوں کی سیر کراؤں گا جن کا ذکر تم کراچی میں اتنی بار بار سے سڑ سے سن چکی ہو مجھے ان پٹائیوں سے پیار ہے انکو پیار ہے کہ تم ان کے متعلق اور سفر کی قور شک کرو گی اور وہ مجھے حوصلہ دینے لگے کہ سعیدہ دنیا حادثوں کا دوسرا نام ہے میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری جہاں نہیں گئی ورنہ پھر وہ ایسی بات کہنے کو میرے روٹھے کھڑے ہو جاتے۔

مجید۔ کیا؟

سعیدہ۔ (فناک آنکھوں سے غلامیں دیکھتے ہوئے) کو تم کو تم میرے بعد کسی اور کی ہو جاؤ گی (کانپ جاتی ہے) وہ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں مجید؟

مجید۔ معلوم نہیں۔

سعیدہ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے (اُپرستہ آہستہ قدم اُٹھاتی سوئے پر لیٹر جاتی ہے) — دوڑے ڈھلک آتا ہے — سوری لباس میں اس کا تسلط سینہ (دشمنی) آتا چڑھاؤ پیدا کرتا ہے، تم مرد ہو تم اس کے بھائی ہو اگر اس حادثے کے تم شکار ہوتے تو؟

مجید۔ میں کبھی ایسی باتیں نہ سوچتا جو بعد بھائی سوچتے ہیں؟

سعیدہ۔ کیوں؟

مجید۔ ہم دونوں مرد ہیں — دونوں بھائی ہیں — مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے ہم دونوں بہت مختلف ہیں۔ سعیدہ۔ (رڑھڑاتی ہے) دل اور دماغ۔

(اصغری داخل ہوتی ہے)

اصغری۔ مجید میاں، دُآپ کو بگم صاحب بلاتی ہیں۔

مجید۔ چل، میں آتا ہوں۔

اصغری۔ انھوں نے کہا ہے جلدی آئیے۔

مجید۔ اچھا (سعیدہ کی طرف دیکھ کر) میں ابھی آتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

اصغری۔ (فرش پر پکچھے ہوئے رنگ پر سعیدہ کے قدموں میں چٹھ جاتی ہے) دُآس کے پاؤں کی انگلیاں چٹخنا ناچاہتی ہے، سعیدہ۔ (پاؤں ایک طرف کھینچ کر) جلدی دو اصغری۔

اصغری۔ رہاؤں سے قریب قریب پٹک نہیں دوسن ٹیگم۔ (انکھیاں چٹنا شروع کر دیتی ہے)۔۔۔ کیا خبر لائے ہیں مجید میاں۔

سعیدہ۔ کہتے تھے، وہ یہاں آنا چاہیے ہیں۔

اصغری۔ یہ تو بڑی خوش خبری کی بات ہے۔

سعیدہ۔ (دو کھ کے ساتھ) ہاں!

اصغری۔ بیگم صاحبہ تو بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ اتنی دیر کیوں نگاہی مجید میاں نے۔

سعیدہ۔ کہاں؟

اصغری۔ یہاں — آپ کے پاس۔

سعیدہ۔ میرے پاس؟ — کیا کئی تھیں بیگم صاحبہ۔

اصغری۔ کچھ نہیں — ان کا مزاج آج کل بہت چڑچڑا سا رہتا ہے — انہیں کرنی بات بھی نہیں ملتی — انہیں

..... مجید میاں کا آنا ڈک نہیں جتنا آپ کا ہے..... ہر وقت آپ ہی کے متعلق سوچتی رہتی ہیں تو۔۔۔

..... اچھ میاں ٹھیک ہو گئے ہیں نا؟

سعیدہ۔ (چکر اپنا پاؤں شاکر اٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہو گئے ہیں۔

(ٹیگم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اصغری اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

سعیدہ۔ سلام خاد جان!

بیگم صاحبہ۔ سلام بیٹا — جیتی رہو! پاس اگر سعیدہ کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیرتی ہے، انہیں معلوم ہو گیا مجید کے۔۔۔

سعیدہ۔ جی ہاں!

بیگم صاحبہ۔ غریب تنگ آ گیا ہے وہاں ہسپتال میں..... (اصغری کی طرف دیکھ کر) اصغری تم جاؤ۔

(اصغری پہلی جاتی ہے)

بیگم صاحبہ۔ اس کی..... اس کی خواہش ہے کہ وہ تمہارے پاس رہے..... اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے مزاحی

ہے تو میری سعیدہ میری نظروں کے سامنے ہوتی چاہیے.....

سعیدہ۔ (آنکھوں میں سے آنسو پھٹک پڑتے ہیں۔ بیگم کے گے سے لگ جاتی ہے)

بیگم صاحبہ۔ (آنکھوں میں آنسو وال ہیں) وہ..... وہ تم سے بے انداز محبت کرتا ہے..... لیکن..... لیکن

اس نے کہا تھا، تم سے پوچھ لیا جائے کہ تمہیں اس کے یہاں آکر رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔

سعیدہ۔ اعتراض.....

بیگم صاحبہ۔ ہاں بیٹا — ہو سکتا ہے، یوں تمہارے ڈاکٹر میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

سعیدہ - وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں — خالہ جان وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔

بیگم صاحبہ - بیٹا وہ کچھ ایسے ہی دل و دماغ کا آدمی ہے — اس کو دوسروں کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔

سعیدہ - آئیں..... کیوں نہ آئیں (مجھے میوہ چھپسی پیدا ہو جاتی ہے) وہ لمبی باتیں نہ کیا کریں۔

بیگم صاحبہ - ڈاکٹروں نے کہا ہے، اگر وہ غرض ہے تو انشاء اللہ ایک دو مہینے میں بیسا کیوں کی دوسرے محل پھر سکے گا..... (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بیسا کھیاں..... جو اس کے گاڑی کے حادثے

کی خبر سن کر میری زندگی سے الگ ہو گئی تھیں..... مجھے معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والی ہیں تو

میں ان کو مضبوطی سے پکڑ کے رکھتی..... مگر بیٹا اس منہ جار میں جسے زندگی کہتے ہیں مضبوط سے مضبوط کھینچتی

لے ڈھکی ہے اور ایک معمولی تنکا ہی کنارے لگا دیتا ہے..... (توقف کے بعد) سعیدہ بیٹا، امجد نے عہد سے

ایک ادب بات تم سے پوچھنے کو کہا تھا؟

سعیدہ - کیا خالہ جان؟

بیگم صاحبہ - کیا تم اس سے جنت کرو گی؟

سعیدہ - (بوکھلا کر) جنت.....

بیگم صاحبہ - (سعیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) میں تجھیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی.....

(پہل جاتی ہے)

سعیدہ - (دوپٹے سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) جنت — جنت؟ — دل و دماغ آہستہ

آہستہ قدم اٹھاتی، آتش دان کے مین و سفین ریشمی ٹوپیوں سے ٹپکی ہوتی اپنی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی

ہے، بتا — کیا تو اس سے جنت کرے گی؟

(ٹہرے میں دکھی ہوئی چالیوں کی آواز آتی ہے) — اصغری ناشتہ لیے اندر داخل ہوتی ہے اور بیویوں والی

تپائی صوفے کے آگے لے جاتی ہے اور اس پر ناشتہ چمچ (رتی ہے)

اصغری - دو مہینے، امجد میاں سے جنت نہیں کریں گی تو پھر کون کرے گی؟

سعیدہ - (ایک دم چڑھتی ہے) کیا کہا؟

اصغری - جی کچھ نہیں..... ایسے ہی آپ سے باتیں کر رہی تھی — ناشتہ کر لیجیے۔

سعیدہ - تم جاؤ۔

اصغری - جی رہا۔

اصغری ایک نظر سعیدہ کو اور ایک نظر اس کی تصویر کو دیکھتی باہر چلی جاتی ہے۔ سعیدہ آہستہ آہستہ

سوچ میں متفرق صوفے کی طرف بڑھتی ہے اور صغری پر میٹ جاتی ہے۔)

سعیدہ۔ (بجٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) دو ملین بیگ، امجد میاں سے بھرت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی۔
(اوپر کی آواز میں) اور کون کر سکتی ہے؟ — اور کون کر سکتی ہے؟

(پہرہ ۵)

تیسرا منظر

(نگار دلا سے لحاظ بغیر) — وسط میں پست قد ترشی موتی بھاریوں کے درمیان فوارہ ہے جس میں سے پانی کی چھوڑ اور شرک و شرک کر باہر نکل رہی ہے۔ دھوپ کھلی ہے آسمان کھل رہا ہے۔ نضایاں عجیب سا کھنکھار رہی ہے — بے حجاب۔ ہر فردہ فطارت کی دولت لیے گویا قبولیت کا منتظر ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے ہوا چلتے چلتے ٹھہر سی گئی ہے کہ باغ کی چلیں پھرے اپنی زلفیں سلوار لیں، پھول اپنے گالوں کی شرفی درست کر لیں اور چھوڑوں کو جن کیلیوں کا شہرچہ منا ہے بے خوف و خطر چوم لیں — اس نضایاں گھاس کے ہوا تو لایا میں پر کر سیاں لپچی ہیں۔ ایک میں سعیدہ نگاہی لباس میں بلبس خود پر سیاہی عکس بنی بیٹھی ہے۔ دھوپ کی حدت سے اس کے غانے کے پلکے سے غبار سے اس کی اپنی گلابیاں، سرخیوں بن بن کر باہر نکل رہی ہیں۔ دوسری کر سی میں مجید ہے جو بولے بولے سگڑ کے کش لگا کر دھوئیں کے نیلے نیلے پھٹے منہ سے نکال رہا ہے اس کا چہرہ ٹھنک ہے۔ سامنے امجد ہے — اپا بچوں کی کر سی میں اس کے چہرے پر اپا بچوں کی کر سی والی کیفیت ہے جو کس اور کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی — اس کا رنگ بہت زرد ہے مگر اس کی آنکھوں میں چمک ہے جو سعیدہ کے شش و جمال کی بازگشت ہے)۔

امجد۔ (اپنے دائیں بائیں دیکھ کر) آج موسم کتنا دلفریب ہے۔

سعیدہ۔ (دُعا متوجہ ہو کر) جی ہاں۔

امجد۔ مجید، جاؤ سعیدہ کو گھملاؤ — ان پہاڑیوں کی سیر کر لاؤ — (پچھے ٹرک دیکھنا چاہتا ہے) افسوس ہے مجھ سے ٹرانس نہیں جاتا — مجید! ٹھو — میری کر سی گھما کر ادھر کر دو — یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیے۔

(مجید اٹھتا ہے لیکن سعیدہ اس سے پہلے اٹھ کر اچھ کی کر سی کا رخ پھیر دیتی ہے۔ اب تینوں کا منہ پہاڑیوں کی طرف ہے جو دھوپ میں تیز نگاہ تک اپنے منہ دھو رہی ہیں)

امجد۔ پہاڑیوں کے منظر کو اپنی نگاہوں سے چیتے ہوئے، سعیدہ وہی ہیں وہ پہاڑیاں جن سے مجھ کو پیار ہے — اتنا بڑا کہ میں بیان نہیں کر سکتا — (مجید سے) جاؤ، مجید، سعیدہ کو ساتھ لے جاؤ اور ان کی سیر کر لاؤ (سعیدہ سے) سعیدہ، جب تم ان پر چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگو گی اور تمہاری سانس رکنے لگے گی تو تمہیں ایسا محسوس

ہو گا کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لذت نہیں..... میں مجید کو زبردستی ساتھ لے جانا تھا مگر یہ ایک پڑھائی کے بعد ہی ہمت ہار دیتا تھا۔ مجھ سے کہتا تھا، جانی جان مجھے آپ کا یہ شغل پسند نہیں۔ یہ کیا کہ آدمی بیکار میں اپنے اپنے کربے ہوش پر جاتے (ہنستا ہے) پھاڑیوں اور ان کو سر کرنے کا حسن اُس کی بھر میں کبھی نہیں آتے گا۔ کیوں سعیدہ ؟

سعیدہ۔ (سکڑا کر کہا) جی ہاں۔

امجد۔ (مجید سے) بازیار۔ سعیدہ کو لے جاؤ۔ کبھی کام بھی کیا کرو۔

مجید۔ (سعیدہ سے) چلیے جانی جان۔ مگر میں شرط لگاتا ہوں، آج تو یہ پل جانیں گی۔ لیکن پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کریں گی۔ سعیدہ۔ نہیں نہیں۔ یہ آپ کی بات ہے۔

امجد۔ اس بے کمر ہار دل و دماغ کا آئی ہے۔

سعیدہ۔ دل و دماغ؟۔ یہ کیا بلا ہے دل و دماغ؟

مجید۔ آپ کو ایک ہی پھاڑی پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا۔

امجد۔ (ہنستا ہے) تم بچتے ہو مجید۔ سعیدہ کی زندگی کے سامنے تو ایک پھاڑی ہے۔ اگر یہ ایک معمولی سی پھاڑی کی پڑھائی سے آن لگی تو.....

سعیدہ۔ چلیے مجید بیاں۔

مجید۔ چلیے۔

اونوں چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ امجد سکڑاتا ہے۔۔۔۔۔ اصغری داخل ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے جس میں چھلے اور کٹے ہوئے سیب ہیں۔ وہ معنی خیز نظروں سے عبید اور سعیدہ کو دیکھتی امجد کی جانب آتی ہے اور اس سے غائب ہوتی ہے،

اصغری۔ تھوڑے سیب کھائیے۔

امجد۔ اے سعیدہ اور مجید کو ڈھلے لوں میں اترتے دیکھ رہا ہے، کھاؤں گا۔

اصغری۔ (راستی کی طرف دیکھ کر) آج دو من پیگم گنتی خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں۔

امجد۔ (ایک دم پلٹ کر اصغری کو دیکھتے ہوئے) دکھائی دے رہی ہیں ؟

اصغری۔ (خفیت سے ہنستا ہٹ کے ساتھ) جی ہاں !

امجد۔ ابھر سعیدہ اور مجید کو دیکھتے ہوئے خوبصورت ہے، خوبصورت دکھائی نہیں دیتی۔۔۔۔۔ ہونے اور دکھائی دینے میں فرق

آسمان کا فرق ہے اصغری۔

اصغری۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو ہے۔

امجد۔ لاؤ سیب۔

اصغری۔ دلیٹ ڈھاتے ہوئے حاضر ہیں — ہرچھلے ہوئے ہیں۔

امجد۔ تھار مطلب؟

اصغری۔ چھلی ہوئی چیز سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے (ہنس کر)..... اس کے سرخ سرخ گال تو بھری سے اُڑ چکے ہیں۔

امجد۔ (ہنستا ہے) اصغری! — تم اب بہت شیطان ہو گئی ہو۔

اصغری۔ (بھید لگ سے) شیطان؟ — امجد بیاں — آپ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ شیطان خدا کا سب سے بڑا فرشتہ

تھا جس نے آدم — یعنی مٹی کے پتلے کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

امجد۔ ہاں ہاں.....

اصغری۔ اور فرشتوں کے اس ہیڈ ماسٹر کو اس کی منزاوی گئی تھی.....

امجد۔ درست ہے.....

اصغری۔ تو یہ بھی درست ہے۔

امجد۔ کیا؟

اصغری۔ کچھ بھی نہیں — درست آخر ہو گیا ہے؟ — (وہی) جیسے آپ درست چھلیں، یا درست کھنے کی کوشش

کریں، یا وہ غلطی جو آپ ایک دفعہ اس لیے کریں کہ آئندہ درست ہوتی رہے گی۔ یا وہ درستی جسے آپ غلطی میں تبدیل

کر کے دیکھتے ہیں کہ آپ پھر درست کر سکتے ہیں — لیکن یہ سب بکواس ہے — میں ایک موٹی عقل کی عزت ہوں

امجد بیاں۔

امجد۔ تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟

اصغری۔ میں ایک موٹی عقل کی عزت ہوں — لیکن ایک عزت۔ ہوں امجد بیاں۔

امجد۔ میں پھر نہیں سمجھا

اصغری۔ (سیب کی ایک تاش اٹھاتی ہے اور امجد بیاں کے منہ کو اس نے جاتی ہے) آپ سیب کھائیے۔

امجد۔ (سیب کی تاش دانتوں میں لیتے ہوئے) تم پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کیا کرتی تھیں۔

اصغری۔ آج موسم ی کچھ ایسا دلغریب ہے۔

امجد۔ کیا نہیں ہے؟

اصغری۔ (سیب کی دوسری تاش اٹھا کر) کیوں نہیں..... یہ لیجیو یا ایک اور تاش.....

(دوسری تاش امجد کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالتی ہے)

امجد۔ (سیب کھاتے ہوئے کچھ وقف کے بعد) اصغری!

اصغری۔ دو پہاڑوں کا منظر دیکھنے میں عورتی چونک کر رہی؟

امجد۔ تھاری شادی کریں؟

اصغری۔ شادی؟

امجد۔ ہاں۔۔۔۔۔ اب تھاری شادی ہو جانی چاہیے۔

اصغری۔ کیوں امجدیاں؟

امجد۔ شادی بڑی اچھی چیز ہے۔۔۔۔۔ دنیا میں ہر شخص کی شادی ہو جانی چاہیے۔۔۔۔۔ زندگی میں شادی سے بڑھ کر اور کوئی

خوشی نہیں۔۔۔۔۔ میں اتنی جان سے کہوں گا کہ اصغری کی جلد ہی شادی کر دیجیے۔

اصغری۔ امجدیاں!

امجد۔ کیوں؟

اصغری۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

امجد۔ کس لیے؟

اصغری۔ (سنہرے پریشہ جاتی ہے۔) ہر فکر نہ ہوتا ہے، شادی سے۔

امجد۔ (ہنستا ہے، ہلکا)!

اصغری۔ سچ کہتی ہوں امجدیاں۔۔۔۔۔ مجھے تو قی ڈر لگتا ہے۔۔۔۔۔ اول تو ایک نوکری کی شادی ہی کیا ہے۔ ہر ٹی ہوئی،

نہ ہوئی۔۔۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن ہو گئی تو کہیں ایسا نہ ہو گاڑی پٹری سے اتر جائے اور۔۔۔۔۔

امجد۔ (دیکھ کے ساتھ) اصغری!

اصغری۔ (دکھ جاتی ہے، گاڑی پٹری سے اتر جائے اور اصغری قہر میں ہونے سے بچ جائے۔ ایک ٹانگ سے ٹکڑی

ایک بازو سے ٹوٹی اور ایک ٹانگ سے اندھی ہو جائے۔۔۔۔۔ آدمی اصغری غائب ہو جائے۔۔۔۔۔ آدمی بچ جائے

۔۔۔۔۔ نا امجدیاں۔۔۔۔۔ میری شادی کا نام نہ لیجیے۔۔۔۔۔ شادی تو ایک سالمہ چیز ہے۔۔۔۔۔ آدمی یا

چوتھائی چیز کو شادی نہیں کہتے۔

امجد۔ (سوچتے ہوئے) اصغری!

اصغری۔ گھٹی گھٹی آواز میں، جی!

امجد۔ تم ٹیک کشتی ہو آواز میں اتنا دیر سے کلاد پیدا ہو جاتا ہے، لیکن دیکھو مجھے زخمیدہ ذکر۔۔۔۔۔ میں خوش رہنا چاہتا ہوں

۔۔۔۔۔ اپنی ان دو شکستہ ٹانگوں پر بھی خوش رہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ مجھے زخمی نہ کرو۔۔۔۔۔ میرے دل میں درد نہ کہے۔

اصغری۔ (امجد کے پاؤں پر لڑکتی ہے) مجھے سمات کر دیجیے امجدیاں (آنکھوں میں آنسو آتے ہیں) جانے میں کیا ہک گئی۔

آپ خوش رہیں۔۔۔۔۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

امجد - رہاوری کے ساتھ خدا کا نام نہو — اگر اس کو مجھے غفل رکھتا ہو تا تو مجھے اس حدیث کا شکر ہی کیوں کرتا — کیا خدا تو ارکا اپنے شکاری قیدی میں کیوں نہ ڈال لیتا — اس کا نام نہو — میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے — مجھے اگر خوش رہنا ہے تو اپنے رہے سے جو رہی کے سارے خوش رہنا ہے — انھی لڑائی جوتی ٹینوں پر چند گنگے پٹی کر مجھے اپنی خوشی کے اشیائے بنانا ہیں۔

اصغری - صوف اپنی خوشی کے ؟

امجد - بہت زیادہ دھکے کے ساتھ، اصغری خدا کے لیے — تم انھی ظالم کیوں ہو گئی ہو — قصارے منہ میں اگر زبان پیدا ہوئی ہے تو کیا اسی لیے کہ تم میرے دھکے میں اضافہ کرو۔۔۔ میں تم سے دھماست کرتا ہوں کہ میری مدد کرو — ایک اپنا ہی کی مدد کرو کہ وہ اپنی لڑائی جوتی زندگی جوڑ باڑ کے چندوں — صوف چندوں گزارے۔

اصغری - آپ دھماست نہ کیجیے امجد میاں — میرا کچھ پھٹتا ہے — آپ انکس ہیں، حکم دے سکتے ہیں — میری زندگی حاضر ہے۔

اس کے موٹے موٹے افسانہ جگ کے سپروں پر گتے ہیں — اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ایک طرف چلی جاتی ہے،

امجد - اگر دن ٹھیکہ لاکر اپنے سپروں کی طرف دیکھتا ہے جی پر سے اصغری کے افسانہ لٹک جاتے ہیں — گردن اٹھاکر اصغری کو دیکھتا ہے جو کہ جا رہی ہے،

دکھائی کی جانب سے سلیم نمودار ہوتی ہے۔ شمال لڑ سے ہاتھیں زیادہ لڑ کٹے لیے وہ امجد کے پاس آتی ہے،

بیگم صاحب - امجد بیٹا۔

امجد - (جلدی سے اپنے پاؤں کیل میں پھپھکا کر) جی !

بیگم صاحب - سعیدہ کے بیچ زیورات تم نے پسند کیے ہیں تیار ہو کر آگئے ہیں۔ نو۔۔۔۔۔

(ثبے امجد کی گردن دیکھ رہی ہے)

امجد - اپنوں کے سے اشتیاق سے ہر ڈبکھول کر سارے زیورات دیکھتا ہے اور ابھی جوتی خوشی کا اظہار کرتا ہے بہت اچھے ہیں — بہت عمدہ ہیں — بہت حسین ہیں — لیکن اتنے نہیں اتنی سعیدہ ہے۔۔۔۔۔ اصغری :

— اصغری ! — ادھر آؤ۔

(اصغری جو ایک سرو کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ امجد کے پاس آتی ہے۔ امجد سے تمام زیورات دکھاتا ہے،

امجد - کو، کیسے ہیں ؟

اصغری - آپ خود کیجئے ہیں — حسین ہیں لیکن اتنے نہیں جتنی وہ اس بیگم۔

امجد - (ہاں سے) اتنی جان۔ کچھ بڑے کب آئیں گے۔

اصغری - کل تک آبا نہیں گے۔

امجد۔ اور وہ بایں کو پہنچیں — کہیں نہیں آئی ابھی تک۔

بیگم صاحبہ۔ بیٹا — مجید! ڈروے آیا تھا۔ ایک دھڑکن میں آجائے گی۔

امجد۔ اچھا! درگ کر، اتنی جانی!

بیگم صاحبہ۔ جی بیٹا۔

امجد۔ کچھ اور بھی منگوانا چاہیے سعیدہ کے لیے — میں اسے ایک ٹھٹھے کے لیے بھی اس میں دیکھنا چاہتا — ہر روز اس کے لیے کوئی نئی چیز ضرور ہوتی چاہیے۔

بیگم صاحبہ۔ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے، جو چاہو کرو۔

امجد۔ اختیار؟ (درگ کر) ہاں..... تو..... امی جان۔

بیگم صاحبہ۔ جی!

امجد۔ کمال کر بیٹھے — اسپورٹس کی دکان میں جائے — جتنے کھیل اسے مل سکیں لے آئے..... سعیدہ اور مجید کھیلنا

کریں گے اور میں دیکھا کروں گا..... اور دیکھیے..... اس سے کہیے کچھ ایسے کھیل بھی لے آئے جس میں..... میں بھی سعیدہ کے ساتھ کھیل سکوں۔

بیگم صاحبہ۔ (بے حد متاثر ہو کر) امجد! سر اپنے ہاتھوں میں لے کر میرے بچے!

(امجد بلک بلک کر دنا شروع کر دیتا ہے۔) صغریٰ ضبط نہیں کر سکتی اور

جینٹل ہوتی ایک طوطا جاتی ہے بیگم کی آنکھوں سے نمائشیں نمودار ہیں،

مردہ

چوتھا منظر

دری کو جو پہلے اور دوسرے منظر میں ہے۔ رات کا وقت، نضا بالکل خاموش ہے، بڑے بے ڈھنگے طریق پر ہمسری پر سعیدہ تین چار گڑگڑاتے ٹیکوں میں اپنا نیم منہ بے باؤں والا سر دبانے کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہے..... نظری کتاب کے حروف کبے بکائے اس کے اپنے دل کی جانب سلوم ہوتی ہیں۔ سینے کے مقام پر کبیل کی سٹریٹس چھلایں کھلا رہی ہیں اور نضے سے تالاب میں جز کا نقشہ پیدا ہو رہا ہے — بائیں طرف لہجے کی بہتا ہوا جھری چار پانی بھیج ہے — اس کے ساتھ ایک لہجہ والی ٹری میں امجد بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتاب ہے اور دسے یوں پڑھے ہے جیسے کوئی شیشے کی چیز ہے، اس کی نظریں پریشان ہیں، کتاب کے حروف سے اٹھ کر کبھی وہ سعیدہ کے ہاتھوں پر جا بیٹھتی ہیں، کبھی اس کے منہ سے بالوں والے سر پر جھکیں میں دھنسا ہے — آخر اس سے نہیں رہا جاتا — کتاب بند کر کے اپنی گود میں رکھتا ہے اور بڑی

آہستگی کے ساتھ سیدہ سے مخاطب ہوتا ہے،

امجد - سیدہ!

سیدہ - (چونک کر) جی؟

امجد - میرا خیال ہے، اب سو جاؤ۔

سیدہ - (گورٹ بدل کر اچھوڑ دیکھتے ہوئے) آپ سونا چاہتے ہیں تو میں غلام نکھار کر کم کو بلاؤں کر وہ آپ کو شادیں۔

امجد - (کھوکھلی آواز میں) شادیں..... نہیں سیدہ — میں بیٹ بیٹ کے تنگ گیا ہوں — آج میں کسی پر ہرجاؤں

گا — انہیں تکلیف نہ ہو تو اٹھ کے یہ سچی ٹھجھا دو اور سبز رشتی روشنی کر دو۔

سیدہ - (ناشتی ہے) آپ بار بار میری تکلیف کا ذکر کون کرتے ہیں۔

امجد - میں خود جو تکلیف میں ہوں۔

سیدہ - (دوڑ کر اچھاس کا احساس ہے) اچھا صاحب — مگر بتائیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں..... مجھ سے جو ہو سکتا

ہے میں کرنے کے لیے تیار ہوں — مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ کو ہر وقت میری تکلیف کی پٹری رہتی ہے — مجھے کوئی

تکلیف نہیں ہوتی۔

امجد - سیدہ، تم بہت اچھی ہو۔

(سیدہ جی ادھرت کرتی ہے — چند لمحات کے لیے اندر دیکھا جاتا ہے — پھر کمرے کی ہرجی بلی بلی سبز روشنی

میں نہا شروع کر دیتی ہے)

سیدہ - کاش میں ابھی ہوتی — (جس ہو سکتی) صوفے پر بیٹھ جاتی ہے — سینے سے اس کا اضطراب ظاہر ہے،

امجد - اس سے زیادہ تم ادا کیا اچھی ہو سکتی ہو سیدہ۔

سیدہ - (ترنزی سے) جی نہیں — آپ نہیں جانتے۔

امجد - بہت ہی ظالم آواز میں (اگر کسی وجہ سے میں نے تمہیں ناراض کر دیا ہے تو مجھے معاف کر دو۔

سیدہ - (امجد کی طرف دیکھتی ہے) — اُشتی ہے اور سکاقتی ہوئی رہتی ہیں میں، انگلیوں سے امجد کے بالوں میں گھسکی کرتی

ہے، اچھ تو یہ ہے اچھا صاحب کہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں۔

امجد - (سیدہ کا ہاتھ پکڑ کر)..... یہ تمہارے دل کی اچھائی ہے اگر تم ایسا سمجھتی ہو، روزہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

سیدہ - (بالوں میں گھسکی کرتے ہوئے) سو جائیے..... کئی راتوں سے آپ جاگ رہے ہیں — بلکہ جب سے یہاں

آئے ہیں، ایک لمحے کے لیے بھی آپ کی آنکھ نہیں ملکی۔

امجد - مجھے نیند نہیں آتی سیدہ

سیدہ - کیوں؟

امجد۔ معلوم نہیں کیوں — بس ایسا لگتا ہے کہ نیند کبھی آنی تھی نہ آئے گی..... میں تو وہ راتیں بھی یاد کرنا بھول گیا ہوں جب سو جا کر اٹھا۔

سعیدہ۔ کاش، میں آپ کو اپنی نیند دے سکتی۔

امجد۔ نہیں سعیدہ — میں اپنی عزیز چیز تم سے نہیں بھینٹنا چاہتا — یہ تمہاری آنکھوں ہی کے لیے سلامت رہے جو نیند میں ادبھی زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہیں — جاؤ، اب سو جاؤ۔

سعیدہ۔ میں کم بخت تو سو ہی جاؤں گی۔

امجد۔ ایسا ذکر — خدا تمہارے بخت بلند کرے..... جاؤ سو جاؤ۔

سعیدہ۔ (چوکر) آپ کیوں میرے ساتھ اتنی نرمی سے پیش آتے ہیں..... امجد صاحب، مجھے اس سے بڑی وحشت ہوئی ہے — خدا کی قسم آپ کی یہ نرمی، یہ حلیم، یہ انکسار، ایک دن مجھے پاگل بنا دے گا۔

(جھنجھلا کر تیزی سے مسمری کی طرف بڑھتی ہے اور خود کو بستر میں گرا دیتی ہے)

امجد۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے منہ سے جو باتیں نکلتی ہیں، وہ سب ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے۔ کروٹ بدل کر وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتی ہے — ابھلا پنی گود میں سے

کتاب اٹھاتا ہے اور اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے — سکوت کا عالم ہے۔ ہلکی ہلکی ہنر روشنی میں

یہ سکوت ادبھی زیادہ خفیف ہو گیا ہے — کافی لمبا عرصہ خاموشی میں گزرتا ہے، بڑی یزاد سی خاموشی میں

— امجد کے چہرے پر روشنی قبروں کے سبز ظلال کی طرح چڑھی ہے — اس کی نگاہیں کتاب سے

بٹ کر بار بار سعیدہ کی جانب اُٹھتی ہیں، اور شرمسار ہو کر وہ بے پاؤں لوٹ آتی ہیں — تھوڑی دیر کے بعد

امجد بہت زیادہ مضطرب ہو جاتا ہے)۔

امجد۔ سعیدہ!

سعیدہ۔ جگدا

امجد۔ میں — میں تم سے ایک درخواست کرنی چاہتا ہوں۔

سعیدہ۔ (کروٹ نہ بدلتے ہوئے) کیا؟

امجد۔ کیا..... کیا آج ہماری پہلی رات ہو سکتی ہے.....

سعیدہ۔ (بستر میں لڑکھی جاتی ہے)

امجد۔ وہ رات — جو ابھی تک نہیں آئی۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے)

وقفہ

امجد۔ سعیدہ۔

سعیدہ۔ بھئی!

امجد۔ کیا تم میری یہ درخواست قبول کر سکتی ہو؟

سعیدہ۔ کوٹ بدل کر اچھو کر دیتی ہے، اس کی آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش تیر رہی ہے، کیسے اچھو صاحب! اچھو جھوٹ ٹوٹ..... بھٹن میرے بھاؤ کے لیے..... تم یہ فرض کرو کہ میں قصداً سے پطرس ایسا ہوں..... میں یہاں فرض کروں گا کہ تم میرے پطرس بیٹی ہو..... میں تم سے وہی باتیں شروع کروں گا جو پہلی رات کو مجھے تم سے کہنا تھیں..... تم اسی طرح جواب دینا جس طرح کو قصیں دینا تھا..... میرے لیے..... کیا میرے لیے تم یہ جھوٹے موت کا کھیل کھیل سکتی ہو سعیدہ۔

سعیدہ۔ (آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش کی بجائے رگ کے آنسو تیر رہے ہیں، میں حاضر ہوں اچھو صاحب۔ اچھو۔ شکریہ۔

(طویل وقفہ)

امجد۔ آج چارویں پہلی رات ہے سعیدہ۔ وہ رات جس میں جوانیاں اور انہی بہت کی طرف پلا تدم اُٹھاتی ہیں۔ وہ رات جس کی تمام پرنا بول میں دوپہی غوطہ لگاتے ہیں اور ایک جڑ جاتے ہیں..... شہزادہ نہیں..... یہ رات قزوہ ہے جب تمام پوشیدہ حقیقتوں کے گھوٹ گھٹا اُٹھنے کے لیے بیجا رہ جاتے ہیں۔ جلی کی سرگوشی درم سم آہ، ایک چھوٹا سا مس، پریدہ سانس کا خفا سا جھکاؤ، ان گھوٹ گھٹوں کے پٹ کھول دیتا ہے۔ اس تداہستہ کہے معلوی سرسراہٹ نکس بی بیس ہوئی اور آدمی ہو بزار۔ پورے دیوار کے تمام مراحل طے کر جاتا ہے۔ یہ وہ رات ہے جب نگاہیں کراہ کر اُٹھ کر سبھرتی ہیں اور یہاں مشکل دونوں زندگیوں کے ایک ماحول پڑتی جاتی ہے..... یہ وہ رات ہے۔ پہلی رات، سب سے پہلی، جب آدم کی پسلیاں چیر کر قرآن لکھی گئی تھیں۔ یہ وہ رات ہے جس کی درازی طر کے لیے شاعر و عارف نامک کراہی تک نہیں تھا۔ یہ وہ رات ہے جس کے حصول کے لیے جوانی کی جائے نماز کچھ کر زندگی اکثر مجدد رہی ہے..... یہ وہ رات ہے جس میں حجاب کی تمام گرہیں فطرت کے نامی خود کھو جاتی ہیں۔ یہ وہ رات ہے جب قدرت کے تمام کارخانے صوف ایک ہی پُرزہ ڈھال دے جاتے ہیں۔ وہ پُرزہ جس نے کائنات کے ان تمام کارخانوں کو حرکت بخشنی تھی۔ یہ وہ رات ہے جب تمام آوازیں وہاں اپنے غزروں میں پھنسی جاتی ہیں کاس آواز کا جلوس انتہائی آرام و سکون سے گزر جاتا ہے جس میں کئی کی کوئی ہے..... یہ وہ رات ہے جس کا ہر پردہ اُجالتے سے بننا ہے۔ یہ وہ رات ہے، ہر آنے والی رات جس کے حضور جھولی بھیلانے بیبک کی منتظر کھڑی ہے۔ یہ وہ رات ہے جب بدن کا ڈھول ڈھول من کھول کے پوتا ہے اور کان کھول کے سُفتا ہے..... بڑے بڑے اُن کھے دانہ۔ بڑے بڑے اُن گائے دانگ..... (ایک دم چچ کی ڈھانپ لو۔ ڈھانپ لو..... سعیدہ اپنا بدن ڈھانپ لو)

..... یہ کچے دُوس رہا ہے — اس کا ایک ایک خط تمہارے دھار کے مانند میری ٹولی خواہشوں پر پھرا رہا ہے.....
 ڈھانپ لو — خدا کے لیے اپنا جسم ڈھانپ لو۔

سعیدہ - (بگی بگی ہنرورشی میں گھاس کی نرم نرم ٹیوں سے بنی ہوئی لاش کے مانند بیٹھی ہے۔ اس کا بدن لرز رہا ہے — ایک ایک انگ کانپ رہا ہے، جی؟
 امجد - (بلک بلک کر رونے لگتا ہے) اپنا بدن ڈھانپ لو۔
 سعیدہ - اپنا لڑکا بڑا بدن کھل سے ڈھانپ لیتی ہے، (بھڑانگھوں کے سامنے ہاتھ رکھے رو مار رہا ہے)

باردہ

پانچواں منظر

نگارہ سے ملحقہ باغیچہ — شام کا وقت۔ قوابے کا پانی کھل کھل رہا ہے۔ سایہ گہرے ہرچکے ہیں منظر
 میں نمائندگی یا مٹرائیں شام کے صندلوں میں بیٹھیں اختیار کر گئی ہیں۔ آسمان نے خوب لگتا ہے اپنے بدن پر
 بصورتِ ثل ل ہے تختوں کے بیچ پر سبز نمائش بیٹھا ہے۔ کرسیاں خالی ہیں۔ ساری فضا خالی ہے اس
 نرم کی طرح جوں میں تصویر بڑی جلتے والی ہے — عجد اور سعیدہ کی ہنسی کی آواز آتی ہے — چند لمحات
 کے بعد دونوں ہنسے، بڑی شکل سے اپنی تھکاوٹ کا بوجھ اٹھاتے داخل ہوتے ہیں — سعیدہ اندھا لڑکے
 خود کو کہی ہیں گراوتی ہے عجد اس کے پاس کھڑا رہتا ہے)

سعیدہ - (دافوں پر نگیاں مارتے ہوئے) اُت — اُت — ت!
 عجد - (ہنستا ہے) آپ تھک گئیں — وہاں آپ کو؟
 سعیدہ - (گھبرا کر) نہیں نہیں — اصغری کو بھیج دیجیے — مجھ سے قواب وہ قدم اُٹھاتا پھرتا رہا ہے۔
 عجد - (سکڑتا ہے) بہتر..... (اُگے ڈھک کر سعیدہ کے چہرے پر خم سرے بالوں کی گوارہ لٹ انگلیوں سے اُٹھا کر ایک طرف کر
 دیتا ہے۔

سعیدہ - (بہت زیادہ گھبراہٹ سے) میں جاتی ہوں اندر۔ اُٹھنے لگتی ہے)

عجد - (ایک طرف دیکھ کر) او وہ اصغری خود ہی آگئی — آؤ، اصغری — بھائی جان کے پاؤں دبا دو۔

(اصغری داخل ہوتی ہے — اس کے ہنٹوں کے اشتعالی کرتے لپک پارہے ہیں جیسے کچے کھنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

پاس آ جاتی ہے)

اصغری - (سعیدہ سے) دوسن یگم تھک گئیں آج؟

سعیدہ - (دافوں پر نگیاں مارتے ہوئے) ہاں!

اصغری۔ (گھاس پر بیٹھ کر سعیدہ کی ایک پٹلی دبا کر شروع کرتی ہے، خطاب مجھ سے ہے، یہ سب مجھ میں کا تصور ہے.....) (پٹی بڑی سیر اور اتنی ہلکی.....) (مجھے میں کھلیاں ہیں) ہر چیز دوسرے (جیسے بولتی ہے) (جیسے بولے دباتی ہے) اس طرح — بولے بولے (سعیدہ سے) کیوں دولہن بیگم — کچھ آرام محسوس ہوا آپ کو؟ سعیدہ۔ (دوسری ٹانگہ جو اصغری کی گرفت سے آزاد ہے، اضطراب کا شدید مظاہرہ کرتی ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے) اصغری۔ (مجید سے) مجید میاں، آپ جا لیں — منہ ہاتھ دھو لیں — گرد و غبار سے آپ کا چہرہ بالکل اُن صویراؤں پر ناچتا ہے مجید۔ (تیزی سے) تم بہت گستاخ ہو گئی ہو — یہ سب..... اصغری۔ (مجید کی بات کا شک، دولہن بیگم کا تصور جنھوں نے — منہ لگایا ہے، سعیدہ کے چہرے کی موت دیکھ کر، ایسا خوبصورت منہ)

(مجید زکاموں میں لگا ہوں میں غصہ برساتا چلا جاتا ہے)

اصغری۔ (ہنست ہے) مجید میاں کی شکل و صورت یوں تو شاہِ اندر بڑی (نہی) ہے — گرجنے میں ہمیشہ بگڑ جاتی ہے — آپ کا کیا خیال ہے۔

سعیدہ۔ تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو، اٹھنا چاہتی ہے مگر اصغری کی بیوقوفی کے باعث نہیں اٹھ سکتی چھوٹو مجھے۔ اصغری۔ (دوباتے ہوئے) میں اس خدمت سے خود کو بچھڑانا نہیں چاہتی (سعیدہ کے ہاتھ سے سیٹھ لگتا ہے) (تو کہتا ہے) (مجید میاں کہہ رہے تھے، میں گستاخ ہو گئی ہوں — کیا یہ درست ہے۔ دولہن بیگم۔ سعیدہ۔ بالکل درست ہے۔

اصغری۔ (بڑے اطمینان سے سعیدہ کے ہاتھ کی انگلیاں جھٹکاتے ہوئے) تو یہ بہت بُری بات ہے — تو کوئی کر گستاخ کبھی نہیں بڑھا چلا ہے — آپ میرے کان پہنچے۔

سعیدہ۔ خاموش رہو!

اصغری۔ یہ ظلم ہے — زبان بند بہت بڑا ظلم ہے دولہن بیگم — میں نے کسی کو کسی بات کی جو آپ کو ناگوار لگاری۔ سعیدہ۔ (اضطراب کے ساتھ) تمہاری سب باتیں مجھے ناگوار لگتی ہیں۔

اصغری۔ اصغری بے چاری اب کیا کرے..... (وقت کے بعد) میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ جیسے کبھی نہیں بیگم کی نوکری میں اس ایک برس کے اندر اندر ہی مجھے سب کچھ اگیا ہے..... چاہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط سمجھتی تھی — میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا — لیکن یہ کس کا تصور ہے؟ سیکھنے والے کا یا سکھانے والے کا؟

سعیدہ۔ ملا اپنی دونوں ٹانگیں ایک طرف بیٹھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں، تم کتنا چاہتی ہو؟

اصغری۔ (صوفی حیرت سے) میں؟

سعیدہ۔ ہاں تم — کیا کہنا چاہتی ہو تم؟

ہے اس کے پیچھے جاگتی ہوں — اندھا دھند دھڑکتی ہوں اور جیسا کہ پکڑا لیتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریت کا بنا تھا میرے پکڑتے پکڑتے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے — اصغری تم نہیں جانتی ہو میں کتنی دیر سے انگاروں کے بستر پر ٹوٹ رہی ہوں۔ بچھلنے کے لیے میں ان پرانی ڈالٹی ہوں تو جیسا کہ ایسے بگڑے ہوئے ہیں جو مجھے اپنے ساتھ اونچا بیٹوں میں لے جاتے ہیں اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جھنجھوڑا کر ایک دم نیچے دے چکے ہیں — میری ہڈی ہڈی، پسپا پسپا ہو چکی ہے۔ اصغری..... کیا ہی اچھا ہوتا اگر ابجد صاحب کے ہلے میں اپنا کچھ بھرتی ہوتی۔

طویل وقفہ — اصغری خاموش کھڑی رہتی ہے — سعیدہ اسطوب میں ادھر ادھر شلقتی رہتی ہے، سعیدہ — بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اصغری۔ - حقیت کے عالم سے بیدار ہوتی ہے کیا کرنا چاہیے — آپ کو — آپ کہ ابجد میاں کی موت کا انتظار کرنا چاہیے۔ سعیدہ۔ - کچھ دیر سوچ کر تم مجھے انتہا درجے کی مشکل کمر لگائی — لیکن میں پوچھتی ہوں — انہیں کب موت آئے گی۔ اصغری۔ جب ابجد میاں کو سنسکرت روگ لگا رہا تھا (لیکن ابجد میاں کی دوستی تو ان سے ختم ہو چکی ہے۔ سعیدہ۔ کیا کیا؟ اصغری۔ جی، کچھ نہیں۔

انکڑے انکڑے قدم اُٹھاتی اصغری چلی جاتی ہے — سعیدہ ہنگامے پاؤں لگاس کے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر اسطوب کی حالت میں شلقتی رہتی ہے،

پروردہ

چھٹا منظر

(نگار دلا — ڈرامینک روم — وسیع و عریض کمرہ جو برائی وضع کے ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ ہر چیز دفنی اور پائدار ہے — دیواروں پر آکل پینٹنگز آویزاں ہیں۔ جو خاندان کے مختلف افراد کو ہیں۔ ایک سوسائٹیک بیلیم کی ہے۔ جب کہ وہ جہاں تھی۔ اس پینٹنگ کے نیچے سلیم ایک سوئے پر بیٹھی تھالی پیتل کر رہی ہے۔ تصویریں وہ بے فکر ہے مگر صوفے میں سخت نگر مند اس کا چہرہ غم و اندوہ کا مجموعہ ہے کوئی آؤٹی پیرز مین رہی ہے، اگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خیالات و افکار کے اُچھے ہوئے دعا گارے کبھی بیٹنی ہے کبھی کھولتی ہے — اصغری داخل ہوتی ہے،

سلیم صاحب۔ جمید میاں لے؟
اصغری۔ جی ہاں۔

بیگم صاحبہ۔ کہاں تھے ؟

اصغری۔ باغیچے میں

بیگم صاحبہ۔ کیا کر رہے تھے ؟

اصغری۔ جی ہاں — دُرگ کر، جی اکیلے بیٹھے تھے۔

بیگم صاحبہ (اصغری کی طرف دیکھ کر لڑائی میں لپکی کر کے) آرہے ہیں۔

اصغری۔ جی ہاں !

بیگم صاحبہ۔ تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے — مجید اس کی طرف دیکھتا ہند داخل ہوتا ہے،

مجید۔ کیا بات ہے ائی جان ؟

بیگم صاحبہ۔ کچھ نہیں — بیٹھ جاؤ۔

مجید۔ (پاس ہی صوفے کی دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) یہاں سرور ہے۔

بیگم صاحبہ۔ ہاں — یہاں سرور ہے

(وقفہ)

مجید۔ (بے چینی محسوس کرتے ہوئے) میرا خیال ہے — آپ نے مجھے یہاں کچھ کہنے کے لیے بلایا ہے۔

بیگم صاحبہ۔ ہاں !

مجید۔ فرمائیے ؟

بیگم صاحبہ۔ میں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتی ہوں۔

مجید۔ مجھے ؟ (دُکھ کر) کہاں ؟

بیگم صاحبہ۔ بیٹھ جاؤ

مجید۔ (بیٹھ جاتا ہے) یہ کیجیے۔

بیگم صاحبہ۔ میں نے ابھی امجد سے بات نہیں کی۔

مجید۔ (پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) کون سی

بیگم صاحبہ۔ یہی تمہیں یہاں سے بھیجنے کی۔

مجید۔ لیکن آپ مجھے یہاں سے کیوں نہ لے رہی ہیں..... میرا مطلب ہے کوئی خاص کام ہے یا.....

بیگم صاحبہ۔ بیٹھ جاؤ۔

مجید۔ (بیٹھ جاتا ہے) کوئی خاص کام ہے ؟

بیگم صاحبہ نہیں۔

مجید۔ تو ہر لمحہ یہاں سے کہیں باہر بھیجنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے۔

بیگم صاحبہ۔ کریں، اسی میں بہتری سمجھتی ہوں۔

مجید۔ بہتری؟ — کس کی بہتری؟

بیگم صاحبہ۔ ہم سب کی — اس گھر کی۔

مجید۔ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) آپ بوسیلیوں میں بات کر رہی ہیں اتنی جان۔

بیگم صاحبہ۔ مجید تم میرے لڑکے ہو میں تمہاری ماں ہوں — میرے تمہارے درمیان کوئی ایسی گفتگو نہیں ہونی چاہیے جو

اس مقدسہ شتم پروردہ کی گلی کا گناہ لگائے — میں چاہتی ہوں کہ تم آج ہی کڑی چٹے جاؤ اور جب تک میں کھڑی ہوں

مجید۔ لیکن اتنی جان —

بیگم۔ (بات کاٹ کر) تمہارے وہاں بے شمار درست مرچوں ہیں۔ مجھے یقین ہے، تم ان کی مدد سے، یا غدا کی ہمت سے اس

منہ جدار میں سے جسے زندگی کہتے ہیں اپنی کشتی صحیح و سلامت کنارے لے جاؤ گے۔

مجید۔ (اچکھڑا ہوتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا اور ملٹ جاتا ہے) بہت بہتر — میں چلا جاؤں گا۔

بیگم صاحبہ۔ تمہارا فیصلہ..... (ایک دم خاموش ہو جاتی ہے)۔

(کمرے میں امجد پانچویں والی کرسی میں داخل ہوتا ہے جسے کوہم چلا رہا ہے)

امجد (مجید سے) یا مجید تم بھی عجیب آدمی ہو — میں وہاں کمرے میں بیٹھا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ تم آؤ گے تو ہم دونوں سید

کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں گے — لیکن تم یہاں بیٹھے ہو بیگم صاحبہ، اتنی جان — آپ نے کیا

سوچا — کیا تحفہ ہونا چاہیے — میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہوں۔

بیگم صاحبہ۔ تم سیدہ سے کیوں نہیں پوچھتے۔

امجد۔ (اور سنو) جلتا ہے، حد کر دی آپ نے اتنی جان — اس سے مشورہ لیا تو تحفے کا مڑا کیا خاک آئے گا۔ (مجید سے)

کیوں مجید؟

(مجید خاموش رہتا ہے)

امجد۔ (پوچھا)

مجید۔ (اٹھ کر) آپ اتنی جان سے پوچھیے — میں تو جا رہا ہوں۔

امجد۔ (حیرت سے) جا رہے ہو؟ — کہاں جا رہے ہو؟

مجید۔ کراچی!

امجد۔ یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے — کیا کہنے جا رہے ہو کراچی؟

مجید۔ کیا کرتے جا رہا ہوں دیکھیں گی سسکراہٹ کے ساتھ، منہ صاف میں سے اپنی کشتی نکالنے۔
 امجد۔ (دیکھ سے) کیا ہو گیا ہے اسے (مجید سے) بیٹھو یاد۔ برسوں اس کی ساگر ہے۔ — اسی اسی فیصلہ ہو جا چکا ہے۔
 مجید۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

مجید۔ کیا؟
 مجید۔ کہ میں کبھی جا رہا ہوں اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔
 امجد۔ کیا کہتے ہو (دیکھ سے) اتنی جان اب قصہ کیا ہے؟
 بیگم صاحب۔ کچھ نہیں۔ — ماں بیٹے کی لڑائی ہو گئی کس بات پر۔

مجید۔ کس بات پر؟
 بیگم صاحب۔ تم نہیں پوچھ سکتے۔
 امجد۔ عدول ملے تو ہوتی ہے۔ — لیکن مجید میرا بھائی ہے۔ — آپ کے اداس کے درمیان اگر کوئی رجحان یا غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے تو اسے دور کرنا میرا فرض ہے۔ مجید کو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس سے کسی کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی، جو آزار کا موجب ہو۔ — (مجید سے) ادھر آؤ مجید۔
 مجید۔ بھائی جان، مجھے اپنا اسباب بند سونا ہے۔

مجید۔ لا حول و لا۔ — یہ سب کیا ہے۔ — (دیکھ سے) اتنی جان۔ خدا کے لیے اسے روکیے۔ — میرے لیے نہیں تو سیدہ کے لیے روکیے۔ — اس گھر میں ایک حد تک یہی ہے جس نے ابھی تک اسے اداس نہیں ہونے دیا۔ — میری خاطر اتنی زحمت برداشت کرتا ہے۔ — اگر آپ نے اسے جانے دیا تو اتنی جان میں نہیں جاتا، میرا کیا حال ہوگا۔ — سیدہ کو میرے لیے لے جاتا ہے تو میں تصور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے بدلے میں اس کے ہمراہ ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتا ہے تو وہ علاوہ بہت حد تک پورا ہو جاتا ہے جو قدرت کے لیے رحم ہاتھوں نے میری زندگی میں پیدا کر رکھا ہے۔ — میں تو کئی بار سوچتا ہوں امجد، اگر ستر اچائی مجید نہ ہوتا تو کیا تیری شکستہ زندگی کا مطلب تو اس قابل نہیں تھا کہ گھوڑے پر بٹھا ہوتا۔ — اتنی جان اسے روکیے۔ — یہ تو میرا بازو ہے..... کیوں آپ اس کو مجھ سے جدا کر رہی ہیں۔ — اللہ میاں کی جگہ نہ بھیجے اتنی جان (رونے لگتا ہے)،

مجید۔ میں جا رہا ہوں اتنی جان۔

بیگم صاحب۔ خیر۔

مجید۔ (رک جاتا ہے)

بیگم صاحب۔ (دُشٹی ہے اور امجد کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) امجد بیٹا۔ — رو نہ نہیں جان اور۔ — مجید نہیں جانے گا۔ — جو چیز ہمارا ہے وہیں رہے گی..... اس لیے کہ اسے یہی منظور ہے..... (مجید سے) مجید

— بھائی کے پاس بیٹھو اور سعیدہ کی سالگرہ کے متعلق سرچر مچا جاتی ہے،

(مجید کچھ دیر سوچتا ہے پھر امجد کی کرسی کی طرف بڑھتا ہے،)

مجید۔ (آہستہ) بھائی جان! آپ مجھے جانے دیں۔

امجد۔ (ٹھٹھکا ہوا سر اٹھا کر) ہائے دوں؟ — کہاں جانے دوں؟ — پاگل مت بنو۔

مجید۔ آپ نہیں سمجھتے بھائی جان۔

امجد۔ میں سب سمجھتا ہوں — اپنا دھمال نکالو اور ذرا میرے یہ آنسو پونچھ دو۔

مجید۔ (فقوٹ سے توقف کے بعد اپنا دھمال نکالتا ہے اور امجد کے آنسو پونچھتا ہے — جلدی جلدی،)

امجد۔ کیا کہتے ہو یاد — تمہیں تو آنسو پونچھنا بھی نہیں آتا — (مسکراتا ہے)، اتنا معمولی سا کام ہے۔

مجید۔ یہ معمولی کام نہیں بھائی جان۔

امجد۔ (مسکرا کر) اچھا بھائی بڑا جان جو کمزور کا کام ہے — آؤ اور بیٹھو — سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق

سوچیں۔ بیٹھو۔

مجید۔ (امجد کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے، سوچے۔)

امجد۔ آہ بھر کر سوچتے ہیں بھائی سوچتے ہیں — سوچنے کے علاوہ اب اور کام ہی کیا ہے لیکن ذرا تم بھی سوچو۔

(مجید اور امجد دونوں سوچ میں مستغرق ہو جاتے ہیں،)

پروردہ

ساتواں منظر

(نگارو دلا سے طعنے بانجھ — شام کا وقت۔ فوارے کا پانی بند ہے، جیسے وہ ابل ابل کر عابر آجکا

ہے۔ پس منظر میں خاکستری سیڑیاں وحنہ مکوں میں اپنی سنگینیاں جیسے چھپا رہی ہیں۔ فرش پر سبزہ روئدا

ہوا سا ماسوم برتا ہے۔ درختوں طرف قوت سے سے قوت ہٹ کر گھنی جھاڑیاں جن کے عقب میں امجد اپاچوں

والی کرسی میں بیٹھا ہے۔ پشت پر اصغری کی کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہے — وہ اسے چلانے

لگتی ہے۔)

امجد۔ نہیں اصغری — کچھ دیر ٹھہرو۔

اصغری۔ (ٹھہر جاتی ہے) لیکن امجد بیاں

امجد۔ میں آج اپنی زندگی کا آخری زخم کھانا پانتا ہوں۔

اصغری۔ یہ زخم کھانا اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنے تصور ہی میں کھا سکتے ہیں — لیکن یہ زخم تو آپ کے لگ

چکا ہے..... اسے دوبارہ کیوں کھلونا چاہتے ہیں آپ؟

امجد۔ (مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے) میری حالت میں جو آدمی جو اس کے بدھو پہنے کی کوئی مدد نہیں دیتی — اپنے زخموں کے ٹائے کھول کھول کر دکھاتا ہے۔ انگوروں کی زبانی ٹیسوں کی داستانیں سناتا ہے اور خود کو بہت بُرا ٹھہر سبھتا ہے..... (ہنستا ہے) اصغری تمہاری کبھی کوئی چیز ٹوٹی نہیں، اس لیے تم لوگوں کا دردناک حال نہیں ٹانہتی، جو جو جھڑکی اٹھا کر پیچ کر شکست و مرخت میں بلند نام عمارتیں بناتے ہیں۔

اصغری۔ (مسکراتی ہے) میں تو ان مدتوں سے بھی آگے نکل گئی ہوں، امجد میاں — بڑی اونچی اونچی عمارتیں بنا کر خود اپنے ہاتھوں سے ڈھانچکی ہوں — ایسا کتے کرتے تو میرے دل میں بھی گٹھے پڑ چکے ہیں۔

امجد۔ (کانپ جاتا ہے) اصغری — تم بڑی خوفناک ہو۔

اصغری۔ (خنستے ہے) ہر اچھا خوفناک ہوتی ہے — حالانکہ بچاری کیا خوفناک ہو سکتی ہے۔ اُسے اپنے ماتم سے اپنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو دوسروں کو ڈرائے — وہ تو غور و خیال ہوتی، سبھی ہوتی ہوتی ہے۔

امجد۔ تمہاری زندگی بھی کسی حادثے سے دوچار ہوتی؟

اصغری۔ جی نہیں — اُس ہی کی زندگی کسی حادثے سے کیا دوچار ہوگی جو کہ خود ایک حادثہ ہے۔

امجد۔ تمہاری باتوں سے مجھے جوئے گوشت کی بُرائی ہے۔

اصغری۔ اس لیے کہ اب آپ کی سونگھنے کی حس جاگ رہی ہے۔

امجد۔ پہلے سو رہی تھی۔

اصغری۔ جی ہاں — بہت گری نیند۔

امجد۔ اسے جگایا کس نے ہے؟

اصغری۔ اس گاڑی نے جو پٹری سے اُتر گئی۔

امجد۔ (بڑبڑاتا ہے) اس گاڑی نے — جو پٹری سے اُتر گئی..... (دُعا بلند آواز میں) کیا یہ پھر پٹری سے اُترے گی؟

اصغری۔ جو اللہ میاں کو منظور ہے وہی ہوگا۔

امجد۔ اللہ میاں کا نام مت لو — میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے۔

اصغری۔ نہیں امجد میاں، اس شخص سے ہم ایسوں کی دوستی کبھی ختم نہیں ہوتی — ٹوٹ ٹوٹ کے آپ بڑتی رہتی ہے؟

امجد۔ یہ سب بکو اس ہے۔

(دونوں، ایک دم چپ کھتے ہیں۔ تدمروں کی آہٹ سنائی دیتی ہے — مجید اور سعید ہانپتے

ہوئے نمودار ہوتے ہیں — سعیدہ جو بہت تھکی ہوئی ہے، توارے کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے۔

(مجید کھڑا ہوتا ہے)

سجیدہ - آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔
مجیدہ - ماما نکہ ہم زیادہ دُور نہیں گئے۔
سجیدہ - ہاں!

(وقفہ)

مجیدہ - کیا ہی اچھا ہوتا، اگر میں کراچی چلا گیا ہوتا۔
سجیدہ - اچھا ہی ہوتا۔

مجیدہ - میری جان مجبِ شکر میں چھنس گئی ہے — میں کراچی چلا جاتا..... لیکن سوال یہ ہے کہ میں اس بندھا میں سے
اپنی کشتی کئے کر کنارے لے جاتا؟ — نہیں — میں ضرور نا کام رہتا۔
سجیدہ - مجھے معلوم ہے۔

مجیدہ - تھیں معلوم ہے — مجھے معلوم ہے — سوئے بھائی جان کسا اور سب کو معلوم ہے اور میری اس کمائی کا
سب سے الناک حصہ ہے۔

سجیدہ - میں نے کئی بار سوچا ہے کہ ان سے کہ دوں، لیکن اٹھ کھڑی ہوتی ہے، مجھے ڈر ہے، وہ اس صدمے کی
تاب نہ لاسکیں گے۔

مجیدہ - مجھے خود اسی بات کا ڈر ہے — ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک برس اور زندہ رہیں گے۔
..... غریب سے زندگی کا اتنا مختصر عرصہ جیتنا عظیم ہے۔

(جہازیلوں کے عقب میں اچھا اپنے دانت بھیج لیتا ہے۔) اصغری مضبوطی سے اس کا کندھا پکڑ رہی ہے،
سجیدہ - ہمیشہ کوشش کرتی رہا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں خوش رہیں۔ ان کے احساسات کے تازگ آئینوں کو
ہلکی سی ٹھیس بھی نہ ملے.....

مجیدہ - اور اگر ہمارا کوئی بھلا لارگوں کے پھوٹ پڑا تو.....

سجیدہ - قریب قریب بیخ کن تو قیامت آجائے گی۔

مجیدہ - اسی لیے میں سوچتا ہوں کہ میں چلا جاؤں..... جب تک بھائی جان.....

سجیدہ (ایک دم بات کاٹ کر) ایسا نہ کہو مجیدہ — اتنے ظالم مت بنو۔

(اچھا، پابرجوں کی کرسی میں لڑ جاتا ہے، اصغری اس کا دوسرا کندھا بھی مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے)

مجیدہ - محنت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے سجیدہ — کم محنت دوسروں کی موت پر نہ اپنے کی خواہش کرتے ہوئے بھی نہیں
خبر داتی۔

سجیدہ - ہمیں ایسے خیال اپنے دماغ میں نہیں لانے چاہئیں۔

مجید، شیک ہے — میں آجائیں تو کیا کریں۔

سعیدہ، کیا کر سکتے ہیں — چلو۔

(سعیدہ کوٹھی کی جانب چلتی ہے — مجید اس کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے — مجید کیوں کے عقب میں اپا بھائی والی کسی میں امجد کا سر جھکا رہا ہے اس کے پیچھے اصغری مبتنی کھڑی ہے)

اصغری۔ پلیں؟

امجد۔ اسی طرح سر جھکائے، نہیں — اہی نہیں — میں سوچ رہا ہوں۔

اصغری۔ کیا؟

امجد۔ معلوم نہیں — شاید یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا سوچنا چاہیے۔

اصغری۔ اسی سوچ بچار بالکل فضول ہوتی ہے۔

امجد۔ (سراٹھاں فضول تو ہوتی ہے — گر پھر کیا کروں —) (دقت کے بعد، اتنے ظالم نہیں رہا جتنی تم ہو — تم تو مجھے سوچنے سے بھی منع کرتی ہو — تم بڑی ظالم ہو اصغری!)

اصغری۔ (مسکراتے ہوئے) مجھت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے امجدیاں — کہنت (نئی موت) پر ہی ناپنے سے باز نہیں آتی۔

امجد۔ میرے سامنے آؤ۔

(اصغری، امجد کے سامنے آتی ہے۔ امجد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے — کچھ سوچتا ہے اور ٹوٹتا ہے)

امجد۔ یہ کتاب اب تک کہاں پڑی تھی۔

اصغری۔ کیسے رڈی کی ٹوکر میں..... رڈی صحیح جگہ!

امجد۔ چلو — مجھے بے چلو۔

(اصغری کوٹھی پہنچتی ہے اور کوٹھی کی جانب چلتی ہے)

پندرہ

آٹھواں منظر

(دو ہی کمرہ جو پہلے، دوسرے اور چوتھے منظر میں ہے، رات کا وقت — چھت سے ہنر و نشی کی مچواں گر رہی ہے — ہر شے کا اصلی رنگ بدلا ہوا ہے، جیسے حساب زدہ مریضوں کا — سہری خالی ہے کچھ اس

طور پر خالی جیسے وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی — اصغری، امجد کو اپا بھائی والی گڑھی میں اندر لاتی ہے)

اصغری۔ دو لکھن، بیگم صاحب کے کمرے میں کیوں پہلی گئیں؟

امجد۔ کدنی تھی۔

اصغری آپ سے ۱

امجد۔ (مسکرا کر) مجھ سے کوئی کیا ٹوڑے گا۔ — وہ اپنے آپ سے ٹوڑتی تھی۔

اصغر علی۔ وہ آتی کمزور نہیں ہیں اجدادیاں۔

عجید۔ وقت بڑے بڑے پھاڑ کھوکھلے کر دیتا ہے۔ — وہ تو ایک جہان لڑکی ہے۔

اصغری۔ (آفت کے بعد) آپ سونا چاہیں گے اب ؟

المجد۔ سونا..... (ہنستا ہے) میرا خالق مت اڑاؤ! مغری — میرے سچے ہوئے دغوں کی توہین ہوتی ہے۔

اصغری۔ (توقف کے بعد) کیا آپ کو سعیدہ سے نفرت ہے ؟

— *W. J. G. B. J.*

صغریٰ تو پھر بڑے ہوئے زلم کیسے ؟

امجد۔ مجھے سوچئے دو..... (الو اجازت دتی ہو سوچئے کی؟)

اصغری آپ سے ملے۔

(طویل وقفہ میں) مجھ سمجھ میں نوق رہتا ہے۔

مخدہ: مجھے سعدیہ سے محبت نہیں ہے — جس طرح مارکٹ سے ہونے والی انجلی جز خنہ کے لانا ہے — اس طرح میں نے

سنگھٹا روک کر اسے اس وقت تک کہ وہ غریب نہ رہا تھا۔ محمد خورشید نے اپنا زمانہ اور سال انعام

یہ سب کچھ دیکھ کر وہ بے حد غصہ ہوئی۔ اس نے کہا: "اے اللہ! یہ سب کچھ دیکھ کر میں نے اپنے رب سے شکایت کی ہے۔"

سعیہ کیا ہے لی مذہب لاجسورہ ہے۔ اس پر میرا مہرت اخلاقی ہے کہ میں نے جہاں اور ہی رفیعہ حیات

بتایا۔ اس حیات کا جواب پہلی ہمتی اسی کڑی میں ذخیر ہے۔ - جو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہی بل کیس میں

.....ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہنے کے لیے دیا ہے..... کچھ میں نہیں مانتا

لیون اس طرحے تک اس کو ایسی فریجروں میں باندھ کے دفنایا جتا ہوں، جن کا ہر طبقہ میری اپنی زندگی کی طرح طیر

یعنی ہے..... پھر بھروسہ آتا..... (سوچتے ہوئے) اس کی جہاں فراموشی ہی ایک وجہ ہو سکتی ہے ایک دم

چونکہ کہیں یہی — یہی درجہ ہے اور کوئی نہیں..... (تخلیف محسوس کرتا ہے) اور — اور..... وہ نظارہ — وہ

نظارہ..... مجھے غمزدگ سکتا ہے کبھی وہ نظارہ..... اس مسہری میں جہاں خواجہ جود کی اپنی تمام رعایتوں کے ساتھ

یہی دنیا کی حسین ترین بطریقات کو شمار کیا کر رہی تھی..... یہ قطعاً

اس کے ساتھ ہی لکھا گیا

صغریٰ - (جنگ کری)!

مخبر کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے جو یہ محفل کو ایسا کر مرے دھو سے علیحدہ

امجد۔ تو ڈھونڈنی چاہیے..... لیکن..... لیکن مجھے حجاب کیوں محسوس ہوتا ہے۔

اصغری۔ معلوم نہیں کیوں۔ یہ شکل، آپ ہی کی شکل ہے۔ اس کے بچے آپ کا یا تو کسی اعظم کا ہاتھ نہیں ہو گا۔

امجد۔ جانتا ہوں..... میں اپنے دل کی اپنی تمام ناخلف نسوں سے واقف ہوں جو اس غلط جذبے کی دھڑکنیں پیدا کرتی ہیں۔
— لیکن آج اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اصغری۔ کس کا؟

امجد۔ میرے سامنے آؤ۔

(اصغری، امجد کے سامنے آجاتی ہے)

امجد۔ جاؤ، مسہری میں لیٹ جاؤ۔

اصغری۔ (جھپکا کر) امجد میاں — مجھ میں وہ جوان خوبصورتی نہیں ہے جس کی رعنائیاں دنیا کے حسین ترین بلبرسات کو شرمسار کر سکیں۔ میری جوانی تو کھڑے ٹاٹ کی شرمندہ احسان ہونا چاہتی ہے۔

امجد۔ مسہری میں لیٹ جاؤ، اصغری۔

اصغری۔ (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں) نہیں امجد میاں — مسہری کو تکلیف ہوگی — یہ دو لکھن بیگم کے نرم اور نازک بدن کی عاری ہے۔

امجد۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔

اصغری۔ (سر جھپکا کر) آپ مالک ہیں، مسہری میں لیٹ جاتی ہے — آنکھیں جھپکتے ہیں گوجااتی ہیں،

امجد۔ جانتی ہو آج کوئی سی رات ہے؟..... وہ رات ہے جب ایک تڑی تڑی جڑی جڑی اور زیادہ طوطا کرسالیت اختیار

کر لے والی ہے — یہ قیامت کی رات ہے، فنا کی رات — اس کے اندھیاروں میں وجود، عدم کی بھٹیوں میں پھیل

کر ایک غیر فانی قالب اختیار کرے گا..... یہ وہ رات ہے جس کے بعد اور کوئی رات نہیں آئے گی۔ اس کی اندھی

آنکھوں میں ایسے کابل سے تحریریں ہوں گی جو انھیں ہمیشہ کے لیے روشن کر دیں گی — یہ وہ رات ہے جب موت کے

پنجرے ہوئے قصوں سے زندگی کے آخری قطرے ڈکڑا کر خود بخود ہی باہر آجائیں گے — یہ وہ رات ہے جب شکستگی اپنی

کوکھ سے سر بلند ایوانوں کو جہم دے گی — ایسے سر بلند ایوان جن کے کنگروں کو عرش کی بلند ترین اونچائیوں سے ہم کلام

ہونے کا شرف حاصل ہو گا۔ یہ وہ رات ہے جب زخم کا سارا پانی رنگ رنگ کر زمین کی تنوں میں چھپ جائے گا

اس کے بدلے خاک اڑے گی جس سے پاکیزہ رو میں گم کر دیں گی — یہ وہ رات ہے جب کاتبِ تقدیر اپنا قلمدان

اوندھا لے کر عرش کے کسی کونے میں نہ کر کے روئے گا..... یہ وہ رات ہے جس میں امجد اس دنیا کی تمام خوبصورتیوں کو

یمن و فخر طلاق دیتا ہے اور ایک بد صورتی کو اپنے رشتہ مناکحت میں لاتا ہے..... (ایک دم چلتی ہے) اصغری

— اصغری!

اس دوران میں اصغری مسری پر سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچ کر اسے کھول چکی ہے اور اس کی سل پر کھڑی ہو کر نیچے گرائیوں میں دیکھ رہی ہے،

امجد۔ (رجح کر) یہ کیا کر رہی ہو اصغری؟

اصغری۔ کھڑکی کی سل پر مڑ کر امجد کو دیکھتی ہے، اکیلا ب وقبول ضروری ہے میرے مالک! (نیچے کو دھلتی ہے)

امجد۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر اصغری!..... (ہاتھ ہٹاتا ہے اور چند لمحات کھل کھڑکی کے اندر سے کو دیکھتا رہتا ہے جو سبز طائر میں تاریک رقم کے نافذ منہ کھولے سے، اکیلا ب وقبول!..... (بڑبڑاتا ہے، اکیلا ب وقبول واقعی ضروری ہے (نور رنگا کہ دونوں ہاتھوں سے ہنسی کر سی اگے کو کھینچتا ہے — بڑی شکل سے کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے،..... مجھے شکل کو سامان کرنے کا یہ راستہ معلوم تھا..... مگر شاید کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت تھی.....)

کھڑکی کی سل دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے اور اپنا اپنا رخ جسم بڑی وقبول سے اوپر اٹھاتا ہے اور دوسری طرف ٹھکانا شروع کر دیتا ہے،

امجد۔ میری پھاڑیاں — میری پیاری پھاڑیاں — میری پیاری اصغری! (اکلا دھڑکنے پھسٹا ہے اور ایک دم اس کا سارا وجود اندھیرا کھا جاتا ہے،

(پہچ)

(”پچند فتمیں سے“)

نیا قانون

ملگو کو چران اپنے اوتے میں بہت مطمئن آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیم شیشیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا سر بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اوتے کے وہ تمام کوچوں جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، اُستاد ملگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد ملگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری نے جوڑے کا منہ سے پھینک دے کوہ ترانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی۔ ”وہ کچھ دینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔“

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد ملگو نے بڑی تسانت سے جواب دیا تھا۔ ”ولایت میں اور کہاں؟“

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو انیشش کے اوتے میں جتنے کو چران ملگو نے اپنے حق پر ہی تھے۔ دل ہی میں اُستاد ملگو بڑائی کا احترام کر رہے تھے اور اُستاد ملگو اس وقت الیوڈ کی ٹیکلی سطح پر انگ چلائے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تباہ و خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اوتے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تکتا ہوا تھا۔ تھے کا ہڈ چلتے چلتے تب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو اُستاد ملگو نے سر سے خاک کی چوڑی اتاری اور فعل میں داب کر بڑے مشکوٰۃ لمحے میں کہا:

”یہ کسی بڑی بڑا کام تھا ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں پاتر چھڑناں چلتے رہتے تھے اور میں نے اپنے بڑوں سے سُننے کے اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل ڈکھایا تھا اور اس درویش نے بل کر یہ وعادی تھی، جیاد تیرے ہندوستان میں جویشہ فساد ہی ہونے لگیں گے۔ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم دلا کر اپنی بات شروع کی۔ یہ کاگر کی ہندوستان کو آرا کو کرنا چاہتے تھے۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر چکے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگیزہ چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یاد دوس والا جس کی بابت میں نے سُننے کے بہت مشکوٰۃ آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا ظلام رہے گا۔ اس میں یہ کہنا عجول ہی گیا کہ میرے یہ بدعوا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔“

استاد منگو کو انگلیز سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلا با کرتا تھا کہ ان اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ پھیلانے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اُس کے تنقیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت شایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل شخص ہے۔ اس کے علاوہ اُسے اُن کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے شرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہتا تھا کہ اُن کے لال بھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اُپر پر کی جھلی لٹل گل گل بھڑ بھڑ رہی ہو!

جب کسی شکاری گورے سے اُس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکتہ رہتی اور وہ شام کو اُسے میں آکر مل مار کر سگریٹ پیتا یا حقے کے کش دگاتے ہوئے اُس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

..... ”پر موتی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ذیل پگڑی سمیت جھٹک دے کہ کھاتا تھا آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک سی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندوں کی اولاد نے، یوں وہ بگ کانٹھتے ہیں۔ گویا ہم اُن کے بلوا کے نوکر ہیں.....“

اس پر بھی اُس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اُس کا کوئی ساتھی اُس کے پاس بٹھارہ نہ تھا وہ اپنے بیٹے کی آگ اُٹھاتا رہتا۔

”شکل دیکھتے جو ناتم اُس کی..... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔ بالکل مڑا ہوا ایک دھچکی مارا اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے ماہی ڈبے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل ہی میں آئی کہ ملا لٹن کی کھوپڑی کے پرزے اُڑاؤں گا لیکن اس خیال سے مل گیا کہ اس مرد کو دانا اپنی تنگ ہے.....“ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو ناک کی تھپس کی آئینس سے مسات کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

”قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ حساموں کے نازا اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا خوش چہرہ دیکھتا ہوں۔ رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا تافون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے تیری قسم جان میں جان آجائے“

اور جب ایک دن استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سہارا لادیں اور اُن کی گفتگو سے اُسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے ہمدردی میں یعنی اڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

”سننا ہے کہ پہلی ایرونی سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟“

”ہر چیز تو ہمیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی؟“

”کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“

اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اُس نے دوس والے بادشاہ کو "ڈیپا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملایا اور پہلی اپریل کو کپڑے نفاذ میں جو کئی تبدیلیاں جوڑنے والی تھیں۔ وہ انھیں دوس والے بادشاہ کے اثر کا تجربہ کرتا تھا۔ حکومت سے پیشاد اور دیگر مشروں میں شریکوں کی تحریک جاری تھی۔ آستانہ منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں دوس والے بادشاہ اور پھر نئے قانون کے ساتھ غلط طے کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب بھی وہ کسی سے شستا گفلاں شرمیں اتنے ہم ساز پکڑے گئے ہیں باغلاں جگہ اتنے اُصوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیشیہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اُس کے مانگے میں دو پیرسٹر بیٹھے تھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی کے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اُن میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:-

جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری بکھر میں ابھی تک نہیں آیا۔ اسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ مانی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ لوں کشا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں آ اُن پر مشروں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے اس لیے آستانہ منگو صرت اُپر کے جُملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اُس نے خیال کیا ہے لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو کُما سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اُس نے کئی مرتبہ ان دو پر مشروں کو سخاوت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا: "ٹوڈی بچے آ"

جب بھی وہ کسی کو دہائی زبان میں ٹوڈی بچے کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے برا خوش ہوتا تھا کہ اُس نے اس نام کو میری جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریفین آدمی اور ٹوڈی بچے میں تیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز وہ گونٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے مانگے میں جھاکوڑنگ جہاں آستانہ اُس نے اُن تینوں کو آہیں میں یہ باتیں کرتے سنا:-

نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر..... صاحب اسیلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گراٹر میں ہمارے ہاتھ بھی کچر آجائے۔"

"ہاں، ہاں، ابکوں نہیں۔"

"وہ بیکار اگر کچر میٹ جو ہمارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن میں کچر تو کئی ہوگی۔"

اس گفتگو نے منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور اس بڑھادی اور وہ اس کو اپنی چیز سمجھنے لگا جو بہت بہت ہو۔ "نیا قانون....." وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ یعنی کوئی نئی چیز آ رہی ہے یا اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جس نے دو برس ہوئے جو ہدیٰ خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک کر خرید لیا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا،

بلکہ جگہ روپے کی کل چڑھی ہوئی کیلیں چکتی تھیں اور جہاں جہاں چوہل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دھکتا تھا۔ اس لانا سے بھی نئے قانون کا درخشاں دیا ہوا ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک اُستاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا، مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اُس کی آمد پر ہر چیز میں نظر آئیں گی۔ اُس سے اُس کی آنکھوں کو ضرور منہ دکھائی دے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے موسمِ خلافت معمولی سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے اُستاد منگو اُٹھا اور صبح میں جا کر تانگیں گھوڑے کو جوٹا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی — وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اُس نے صبح کے سرد و صند لکھیں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اُسے ہر چیز پر اپنی نظر آئی — آسمان کی طرح پُرفانی اس کی نگاہیں آج خاص طور پر زیادہ تنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس لکھی کے جو تنگ برنگ کے پلوں سے جڑی تھی اور اُس کے گھوڑے کے سر پر بھی ہوئی تھی اور سب چیزیں پر اپنی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی لکھی اُس نے نئے قانون کی غور محلی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کے ٹالوں کی آواز، کالی ٹرک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا خاصہ چھوڑ کر لگاتے ہوئے پہلی کے کھجے، دکانوں کے بوڑھے اس کے گھوڑے کے گھڑیوں پر بڑے ہوئے گھنٹوں کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کوئی بھی نہیں، لیکن اُستاد منگو ایس نہیں تھا۔

”ابھی بہت سویرا ہے، دکانیں ابھی تو سب کی سب بند ہیں، اس خیال سے اُسے تسکین تھی اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ ہائی کورٹ میں فی جج کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟“ جب اُس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رنٹ سے نوکارتے جڑی لیا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے، خوش پوش تھے مگر اُستاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے تھے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کی جیسے کانٹھوں پر لپکتی تھیں۔

”تاگے کو دانیں ہاتھ مڑو کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر نام لگیں گی۔ بازار کی آدمی دکانیں کھول چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ عوامی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بیڑ تھی۔ مندری والوں کی ناشی چیزیں شیشے کی لادروں میں لوگوں کو دعوتِ غدار دے رہی تھیں اور پہلی کے تانوں پر بھی کبوتر اُڑ رہے تھے مگر اُستاد منگو کے لیے اُن تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی — وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں سچ پیدا ہونے والا تھا تو اُس نے چار پانچ مہینے بڑی بے وقاری میں گزارے تھے اُس کو یقین تھا کہ سچ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو موت ایک

نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی زیادہ جبری کے پیٹ کو دبا دیا کہ اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہتا تھا مگر نام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑی تھا۔

قرب وقت مرنے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُنہو ذراہل پھرتے سے انگلیں میں تھوڑی سی طاقت آتے۔ لیکن تختہ بنے بچے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو کبھی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے تجربہ جس دے گی بچہ۔ استاد ملگو جیسا بہت جلد باقاعدہ ہوا تھا وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا ذریعہ خوبش مند تھا بلکہ بہت حس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دئی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی: ”ابھی کنوئیں کھودا نہیں گیا اور تم یہاں سے بے حال ہو رہے ہو۔“

کچھ بھی ہو مگر استاد ملگو نے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے بطور کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

پندرہویں کی غفلت کا اندازہ اُستاد ملگو ہمیشہ ان کے بطور کے ہنگاموں اور ان کے گھروں میں ڈالے ہوئے پتھروں کے پاؤں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی ایڈیٹر گینگے کے پتھروں سے لدا ہو تو اُستاد ملگو کے نزدیک وہ تو ادا ہی تھا اور اگر کسی ہٹلر کے بطور میں بیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے وہ جہاں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی تاروں میں توڑا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مل بٹلر کی کھلی سطح پر اپنے ”انگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھانڈی کی ایک سواری مل گئی۔ گریہ ٹھونکنے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا:۔۔۔

”پلے بھی اچھا تھا۔ شاید چھانڈی ہی سے نئے قانون کا کچھ بچہ چل جائے۔“

چھانڈی پر پہنچ کر استاد ملگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آٹری دو انگلیوں میں دبا کر سٹگایا اور اگلی نشست کے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ جب استاد ملگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی جیتے ہوئے واقعہ پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر کھلی نشست پر بڑے ایلینان سے بیڑ کر اپنے گھوڑے کی بائیں دایں ہاتھ کے کوڈ پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا آٹھواں سا ہنسنے کے بعد بڑی دیر میں چال چلنا شروع کرتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دھڑ سے بھٹائی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد ملگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد ملگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میسپل کیٹی سے ناگوں کے برابر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابل غور بات کا نہیں

ہدیہ کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا اُسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سماری نے اُسے بلایا ہے نیچے پلٹ کر دیکھنے سے اُسے طرح کے اُس طوطہ قندر بکلی کے کھجے کے پاس ایک گورا کھڑا نظر آیا جو اُسے ہاتھ سے بلاتا تھا۔ جیسا کریان کیا جا چکا ہے۔ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اُس نے اپنے تازہ گاجک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اُس کے جی میں آیا کہ بالکل توجہ زدہ اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا۔ ان کے جیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے بھگنی پر جو نفرت میں ساڑھے چھوٹے ٹھہر کر دیے ہیں، ان کی عجیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔

خالی طرح پر بڑی صفائی سے "نانگر مڑ" کو اُس نے گھوڑے کو جاک دکھایا اور انکو جھپکنے میں وہ بکلی کے کھجے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی بائیں گھٹنگی کو اُس نے تانگہ ڈھرایا اور بکلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔

"صاحب ہمارے کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں جاک کا طرز پر انداز تھا۔ صاحب ہمارے کہتے وقت اس کا اوپر کا سر خمیوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا اور بائیں ہاتھ کی اس طرف وہ دم سم کی گیزرناک کے نتھنے سے تھوڑی کے بالائی حصے تک پہنچا آری تھی، ایک لڑش کے ساتھ گہری برنگی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سالولی گلابی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا پھر وہیں رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس گورے کو پہننے کی آگ میں جلا کر شرم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بکلی کے کھجے کی اوٹ میں مڑا کا رخ بچا کر سرگٹ سلگایا تھا۔ مڑ کا تانگے کے پائیدان کی طرف قدم ڈھکا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چاروں طرف اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آٹھ سائے کی بندوتوں سے گویاں گھارے ہوئیں اور اُس میں کھٹکا کا ایک آتشیں گلابی کر اُپر پکڑا لیں۔

استاد منگو چاہتے دانتیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگہ پر سے نیچے اُتارنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا، مگر وہ اس کے وجود کے ذریعے توڑے کو اپنی نگاہوں سے چھوڑا ہے اور گورے کی طرح اپنی ہڈی تلون پر پیچھے مڑ کر پیچھے چھا ڈر رہا ہے۔ گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گورے نے سرگٹ کا دھواں دھکے ہوئے کہا۔ "جانا مانگتا یا پھر گورے کو کھجے کا؟"

"تو ہی ہے۔" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چڑی چھاتی کے اندر ڈانچنے لگے۔

"تو ہی ہے۔" اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اُتار دیے اور ساتھ ہی اُسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پہلے برس اُس کی چڑی ہوئی تھی اور اس خوار و مخار کے جھگڑے میں جس کا ہونٹ گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی اُسے طوعا کرنا بہت سی باتیں سننا پڑی تھیں استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا جو تاکہ اُس کے پُر زہرے اثر اویسے ہوتے۔ مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا زور عام طور پر کوچران ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لطافتی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا: "کہاں جانا لگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے بچے میں چابک اسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا: "سیرا منڈی۔"

"کرایہ پانچ روپے ہوگا۔" اُستاد منگو کی مونچھیں تھر تھریں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلا یا۔ پانچ روپے۔ کیا تم —؟

"ہاں، ہاں، پانچ روپے۔" یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا دانا ہنا ہواں بھرا ہاتھ بچہ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار

کر گیا۔ کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟

اُستاد منگو کا بھر زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیالی کر رہا تھا کہ

اس کی کھوپڑی پھر کھلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانے کی طرف اُلک کر بڑھا اور اپنی چٹری سے اُستاد منگو

کو تانے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی پاش کی ہوئی پٹلی چٹری اُستاد منگو کی موٹی دان کے ساتھ دو تین مرتبہ جھوٹی

اُس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پست قدم گورے کو دیکھا۔ گورا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُسے میں ڈالنا چاہتا

ہے۔ پھر اُس کا گھونسہ کان میں سے تیر کی طرح سے اُوپر کو اٹھا اور ختم زون میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے

کہاں اُس نے گورے کو پر سے ہٹایا اور نیچے اُنکرا اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و حیرت گورے نے اُدھر اُدھر سمٹ کر اُستاد منگو کے وزنی گھونسے سے پینے کی کوشش کی اور جب دیکھا

کہ اس کے منہ لٹ پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے ٹپکے برس رہے ہیں تو اُس نے ذوق

سے چلا نا شروع کیا۔ اس صبح وپکارنے اُستاد منگو کی بانوں کا کام اُدھی نیند کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا۔

اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑنوں..... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑنوں — اب ہمارا راج ہے بچہ؟"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو اُستاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ اُستاد

منگو اُن دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کی چوڑی چھاتی چھوٹی ہوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہورہی تھی۔ منہ

سے جھاگ بہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آوازیں کہہ رہا تھا۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل شاہ خانہ اُڑا لیا کرتے تھے — اب نیا قانون ہے یہاں — نیا قانون؟"

اور بے چارہ گورا اپنے گلوں سے ہونے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی اُستاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور

کبھی جرم کی طرف

اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ نیا قانون، نیا قانون، چلا آ رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

”نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو۔۔۔ قانون وہی ہے پرانا
اور اُس کو حالات میں بند کر دیا گیا!“
(منگو کے افسانے میں سے)

شہید ساز

میں گجرات کا شہید اور کارکن ہوا ہوں۔ ذات کا بنیاد ہوں۔ پچھلے برس جب تقسیم ہندوستان کا شہا ہوا تو میں با نکل بیکار تھا۔ صحت کیجیے گا میں نے فکرا منشا استعمال کیا۔ مگر اس کا کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ اردو زبان میں باہر کے الفاظ آنے ہی چاہئیں۔ چاہے وہ گجراتی ہی کیوں نہ ہوں۔

جی ہاں میں با نکل بیکار تھا۔ لیکن کو کہیں کا تھوڑا سا کاروبار چل رہا تھا جس سے کچھ آمدنی کی صورت ہو رہی تھی۔ جب شہوارہ ہوا اور ادھر کے آدمی ادھر ادھر کے ادھر خیرادوں کی تعداد میں آنے جانے لگے تو میں نے سرجا چلو پاکستان چلیں۔ کو کہیں کا نہ سمجھ کوئی اور کاروبار شروع کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑا اور اسے میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے دھندے کرنا پاکستان پہنچ گیا۔

میں تو پہلا ہی اس حیثیت سے تھا کہ کوئی مرٹا کاروبار کروں گا۔ چنانچہ پاکستان پہنچے ہی میں نے حالات کو دیکھی طرح جانچا اور الاٹمنٹوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسکہ پالش مجھے آتا ہی تھا۔ لیکن چٹری باتیں کیں۔ ایک دو آدمیوں کے ساتھ یارانہ کا نشانہ اور ایک چھوٹا سا مکان الاٹ کر لیا۔ اس سے کافی منافع ہوا تو میں مختلف شہروں میں پھر کر مکان اور دکانیں الاٹ کرانے کا دھندہ کرنے لگا۔

کام کوئی بھی ہوا انسان کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بھی چنانچہ الاٹمنٹوں کے سلسلے میں کافی محنت و دکن پڑی۔ کسی کے مسکہ نکلیا۔ کسی کی منشی گرم کی، کسی کو کھانے کی دھلت دی، کسی کو علاج دنگ کی۔ غرضیکہ بے شمار کھینٹے تھے۔ دن بھر خاک چھانٹا، بڑی بڑی کوٹھیوں کے پھیرے کرتا اور شرملا چہچہہ دیکھ کر دھچکا سا مکان تلاش کرتا جس کے لاٹ کرنے سے زیادہ منافع ہو۔ انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ ایک برس کے اندر اندر میں نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی۔ بینک میں بے اندازہ مال پانی۔ صحت کیجیے گا میں کا میں کا شہید اور گجرات کا دھندہ استعمال کر گیا۔ مگر کوئی داندہ نہیں۔ اردو زبان میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہونے چاہئیں۔ جی ہاں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، نوکر چاکر، پیکار ڈوموٹر، بینک میں ڈھائی لاکھ روپے۔ کا دھانے اور دکانیں الگ۔ یہ سب تھا۔ لیکن میرے دل کا چین حالے کہاں آگیا۔ یوں تو کو کہیں کا دھندہ کرتے ہوئے بھی دل پر کبھی کسی بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اب تو جیسے دل دبا ہی نہیں تھا۔ یا پھر یوں کہیے کہ بوجھ اتنا آں پڑا کہ دل اس کے نیچے دب گیا۔ پر یہ بوجھ کس بات کا تھا؟ آدمی نہیں ہوں، دماغ میں کوئی سوال پیدا ہو جائے تو میں اس کا جواب ڈوموٹر ہی نکالتا ہوں ٹھنڈے دل سے

اسلام ٹکڑا لیا کچھ رہا ہی نہیں تھا، میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس گڑبڑ کھوٹانے کی وجہ کیا ہے؟

حوت ۹..... ہو سکتی ہے میری اپنی تو کوئی غلطی نہیں۔ جوتھی وہ کاغذیادار گجرات ہی میں اسٹاک کو پیدا ہی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ مرنے کی طور پر موجود تھیں۔ شمال کے طور پر اپنے مالی ہی کی تھی۔ اپنا اپنا ٹیسٹ ہے۔ سچ پوچھیے تو نعمت جہان ہوتی چلی بیٹا اور یہ ضروری نہیں کہ ٹیڑھی کسی برادری میں کرنا جانتی ہو۔ اپنی کو تو ساری جہان کو تیس پہنچتی ہیں۔ اس کاغذیادار گجرات کا نام ہے جس کا وہ میں شرم ابدل موجود نہیں۔

حوت کا تو سوال ہی اٹھ گیا اور دولت کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ بندہ نوادہ اپنی نہیں جو کہ ہے اسی پر قناعت ہے لیکن پھر یہ دل والی بات کیوں پیدا ہو گئی تھی۔

اولیٰ زمین ہوں۔ کوئی مسئلہ سامنے آجاتے تو اس کی تشریح پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کارخانے چل رہے تھے۔ کارخانہ بھی چل رہی تھیں۔ دوسرا پتھاپ پیدا ہوا تھا۔ میں نے الگ تھانگ ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دور کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لیے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔

کاغذیادار گجرات میں تو نے بیسیوں نیک کام کیے تھے۔ شمال کے طور پر جب میرا دوست چاندو رنگ مر گیا تو میں نے اس کی جائزہ کو اپنے گھر ڈال لیا اور دوسرے نیک اس کو دھندلے سے روکے رکھا۔ دنا ننگ کی کڑی کی ڈانگ ٹوٹ گئی تو اسے نئی خرید دی۔ تقریباً چالیس روپے اس پر اٹھ گئے تھے۔ جتنا باقی کو ٹیڑھی ہو گئی سالی کو رعایت کیجیے گا، کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ چھ مہینے بار بار اس کا علاج کرتا رہا..... لیکن پاکستان آگرمیں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑبڑ کی یہی وجہ تھی۔ دنا اور سب ٹھیک تھا۔

میں نے سوچا، کیا کروں؟..... خیرات دینے کا خیال آیا۔ لیکن ایک روز شہر میں گھوا تو دیکھا کہ قریب قریب ہر شخص بھکاری ہے۔ کوئی بھوکا ہے۔ کوئی تنگ۔ کس کس کا پیٹ بھوں، کس کس کا انک ڈھانکوں؟..... سوچا ایک انگڑانا کھول دوں، لیکن ایک انگڑانا سے کیا ہوتا اور پھر ناچ کہاں سے لاتا؟ بیک مارکٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا کہ ایک طرف گناہ کر کے دوسری طرف کاروبار کا مطلب ہی کیا ہے؟

گھنٹوں میچے میچے کہ میں نے لوگوں کے دکھ دیکھے۔ ہرچ پوچھیے تو ہر شخص دھکی تھا۔ وہ بھی جو دکھانوں کے تھکوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی جو ٹیڑھی ہو چکے ہیں۔ پیدل چلنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کام کا کوئی ٹکڑا نہیں۔ موٹر میں بیٹھے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیا ماڈل نہیں۔ ہر شخص کی شکایت اپنی اپنی جگہ درست تھی۔ ہر شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ معتدل تھی۔ میں نے غائب کی ایک منزل اٹھائی تھی۔ شرملا پور کی آئینہ بانی چٹنے کے شئی تھی۔ ایک شرملا پور وہ گیا ہے۔

کس کی حاجت روا کرے کوئی

صاف کیجیے گا، اس کا دوسرا مصرع ہے اور ہو سکتا ہے پہلا ہی ہو۔

جی ہاں میں کس کس کی حاجت روا کرتا جب سو میں سے سو ہی حاجت مند تھے۔ میں نے پھر پوچھی سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں بلکہ ہے آپ جس سے اتفاق نہ کریں۔ لیکن میں نے مابریں کے کیسوں میں جاہا کہ جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

تو مجھے معلوم ہوا کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو باطل ہی گمراہ کیا ہے۔ وہی بھرتا تو ہر بات دوسرے بیٹھے ہیں۔ تماشہ کھیل رہے ہیں جیسا کہ جوہری ہے۔ دعاوت کیجیے گا جیسا کہ کا مطلب ہے۔ تو اس معنی قدر بازی لگا لیاں ہک رہے ہیں اور نوکٹا یعنی ہفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں..... ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ جیسا کہ دینا ہرگز بزرگ نیکی کا کام نہیں۔ لیکن پھر نیکی کے کام کے لیے اور کون سا راستہ ہے ؟

کہیوں میں دھڑا دھڑا آؤںی ہو رہے تھے کہیں ہیضہ پھوٹا تھا کبھی ہلک۔ ہسپتالوں میں قتل دہانے کی جگہ نہیں تھی۔ مجھے بہت ترس آیا کہ قریب تھا کہ ایک ہسپتال، جنہاں میں مگر سوچنے پر راہ ترک کر دیا۔ پوری سکیم تیار کر چکا تھا۔ عمارت کے لیے ٹھکانہ طلب کرتا۔ واسطے کی فیسوں کا روپہ جمع ہو جاتا۔ اپنی ہی ایک کپڑی کٹری کر دیتا اور ٹھکانہ اس کے نام نکال دیتا۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کروں گا۔ نظا ہرے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کٹری کر دیتا اور پورے فیس ہزار روپے بچا لیتا مگر یہ ساری اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بچا لیا گیا تو یہ عزائم آبادی ہے وہ کیسے کم ہوگی۔ غور کیا جاتے تو یہ سارا الفاظ ہی فاقہ آبادی کا ہے۔ لہذا کا مطلب ہے جیسا کہ وہ جیسا کہ جس میں نصیحت بھی ہو لیکن اس سے بھی اس لفظ کی پوری معنویت نہیں بیان نہیں کر سکا۔

یہی ہاں توڑ کیا جاتے تو یہ سارا الفاظ ہی اس فاقہ آبادی کا باعث ہے۔ اب لوگ بڑھتے جا رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی۔ آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا۔ بارشیں زیادہ ہوں گی۔ اقل زیادہ آئے گا۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ ہسپتال بنانا بزرگ نیکی کا کام نہیں۔

پھر سوچا مسجد بنواؤں۔ لیکن اللہ بخشنے شوالہ پھر کی اجنبانہی چٹکے کا کا لیا ہوا ایک شعر یاد آ گیا۔

ہام مخدر ہے تو فوج کے اسباب بنا

وہ منظور کو بخراہد فوج کو فوج کہا کرتی تھی۔ ہام منظور ہے تو فوج کے اسباب بنا۔ پہل بنا پناہ بنا مسجد و تالاب بنا۔

کس کم بخت کو نام دھوکہ کی خواہش ہے۔ وہ جو ہام اچھلانے کے لیے پہل بناتے ہیں۔ نیکی کا کیا کام کرتے ہیں ہناہک۔ ایسے نے کہا نہیں یہ مسجد بنوانے کا خیال باطل غلط ہے بہت سی انگ۔ انگ مسجدوں کا بڑا بڑی قوم کے حق میں بزرگ مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ عوام بٹ جاتے ہیں۔

تھک پڑ کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا۔ شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ جب تک ہوا تو لوگوں میں بظلم پھیل گئی۔ اتنی بگڑاؤں کی کہ تیس آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں لکھی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے۔

میں نے سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو ہلاک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں انہیں شہادت کا رتبہ ملتا ہے۔ یعنی وہ رتبہ جس سے بڑا کوئی اور تہری نہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگ مرنے کی بجائے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت باطل کارت جاتی ہے۔ اگر وہ شہید ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔

ایک بڑی تھیں مندر میں دانست نہایت میں آنت۔ آخری سانس بے ہوشی تھی مجھے بہت ترس آیا، ساری طرفیں کی منظمی اور رنج و غم میں گندمی تھی میں اسے اٹھا کر ریل کے پائے پر لے گیا۔ صاف کیجیے گا۔ ہمارے یہاں پٹری کو پاؤں کہتے ہیں۔ لیکن جانا جو منی اس نے ٹرین کی آواز سنی ہوش میں آگئی اور لوگ جبرے کھڑے کی طرح اٹھ کر بھاگ گئی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر میں نے بہت نہاری۔ نیبا کا جیٹا اپنی دھن کا پکا جوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا تھا میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوچھل نہ ہونے دیا۔

منظوں کے وقت کا ایک بہت بڑا ساحل تھا۔ اس میں ایک سوا کا دن چھوٹے چھوٹے کمرے تھے بہت ہی مختصر سات میں۔ میری جبر کا دھکسوں نے اخذ نہ لگایا کہ پہلی ہی ٹری بارش میں سب کی چھتیں ڈھسے جائیں گی چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساگا دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار مفلوک الحال آدمی بسا دیے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا۔ ایک سو دہرہ ماہوار کے حساب سے۔ تیسرے مہینے جیسا کہ میرا اندازہ تھا پہلی ہی ٹری بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آئیں اور سات سو آدمی جڑیں بچے بڑے سبھی شامل تھے۔ شہید ہو گئے۔

وہ جو میرے دل پر بوجھ بوجھ سا تھا کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ آباؤی میں سے سات سو آدمی کم بھی ہو گئے۔ لیکن انھیں شہادت کا ترس بھی مل گیا۔۔۔ اور ہر کا پڑا بھاری ہی رہا۔

جب سے میں یہ کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسب تفریق دو تین آدمیوں کو جام شہادت پلا دیتا ہوں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ کام کوئی بھی ہر انسان کو محنت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اللہ بخشے شولا پور کی آئینہ بان چٹنے کا ایک شعر کا یا کرتی تھی۔ لیکن صاف کیجیے گا وہ شعر یہاں ٹھیک نہیں دیکھتا کچھ بھی ہو، کتنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کو جس کا وجود چھکڑے کے پائپ میں پیچے کی طرح بے مٹی اور بیکار تھا۔ جام شہادت پلانے کے لیے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے چھیلے کرانے پڑے۔ لیکن موت کی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں شہادت کا بھی ایک دن مقدر ہے۔ دسویں روز جا کر وہ چھوٹا فرش پر کیلے کے چھیلے پر سے پھسل کر دھنید ہوا۔

آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے۔ دو لاکھ کا ہے۔ اس میں سے پچتر ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ میر بھی کرایا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ ڈراڈر اوڑھام گڑھے گی۔ یہ کہہ کر معاف ہوئی میں نے ایسا لگوا دیا ہے۔ اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔ خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ پورے درجے کا گناہگار ہے۔ جس کی شہادت اللہ تبارک و تعالیٰ کو مستحکم نہیں تھی۔

آئندہ کی خدائی میں سے

بڑا نامور افسانہ نگار تھا

۱۳۷۷ھ

تصانیف

مختصر حالات

منقوش کے ڈرامے	منقوش کے افسانے	۱۱ جنوری ۱۹۱۲ء	پیدائش
دھواں	افسانے اور ڈرامے	سیرالونک خلیج بحرہیانہ	مقام پیدائش
لذت سنگ	چھند	نگہت، نزہت اور نصرت	اولاد
ٹھنڈا گوشت	مزید	اگر سرور علی کریم میں	تعلیم
سیاہ ماسٹے	نمود کی خدائی	اگر سرور علی کریم لاہور وادی دہلی	قیام
تلخ ترش شیریں	خالی ترش خالی ڈبے	۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو لاہور میں انتقال	انتقال
گنے فرشتے	سڑک کے کنارے	○	
اوپر نیچے اور درمیان	بادشاہت کا خاتمہ	ماشہ	پہلی کہانی
پھندے	سرکشوں کے پیچھے	کبوتر کا کبوتری	آخری کہانی
شکاری عورتیں	برتنے	○	
آؤ	منقوش کے مضامین	جن کہانیوں پر مقدمے چلے	
تین عورتیں	جنازے	دھواں	کالی شلوار
عصمت چھائی	کوڑھ	کھول دو	بڑا
سرگزشت امیر (ترجمہ)	نور جہاں ٹرجمان	اوپر نیچے اور درمیان	ٹھنڈا گوشت
گور کی کے افسانے (ترجمہ)	دیرا (ترجمہ)	○	

افسانوں کا پہلا مجموعہ، منقوش کے افسانے ہے جو

۱۹۳۰ء میں شائع ہوا

○
ان کے علاوہ منقوش کی سات آٹھ کتابیں زیر طبع ہیں۔

(۳)

منٹو کے فن اور شخصیت پر مضامین

(جن میں منٹو بھی ہے اور سعادت حسن منٹو)

فن پر لکھنے والے

مجاز شیریں
وقار عظیم
عمر حسن عسکری
عابد علی عابد
ابوالکلیث صدیقی
عبادت بریلوی
ممتاز حسین

شخصیت پر لکھنے والے

سعید چغتائی
اویز زنا قداشک
احمد ندیم قاسمی
ماجرہ مسرور
ابوسعید قریشی
ساجد بلال
غلام عباس
محمد طفیل

منٹو کی فنی تکمیل

منٹو کے آخری دور کی دو تحریروں، میری نظر میں منٹو کی ادبی تکمیل کی منظر ہیں۔ ڈراما اس ہندوستانی اور انسانی طرح کے گناہ سے ”باہر کوئی ناخدا“ ایک بڑا اہم موڑ تھا جس سے منٹو کی انسانہ نگاہی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں منٹو نے خلافت مولانا ابوالحسن علی Nadwi اور علی Nadwi کی مثالوں کو دیکھا اور اس کو دیکھا کہ منٹو کا دور یہ بھی ایک نئے فن کا کاروبار تھا۔ ایک مکمل کردار کے ساتھ اس مسئلے میں ایک مکمل اور بھرپور تجربہ بھی تھا۔ جیسا کہ مسکری صاحب نے کہا ہے۔ منٹو کو ناچھوٹے چھوٹے انفرادی قہروں کو فوراً رقم کر کے انسان کی گرفت میں لے آتا تھا۔ اس سے پہلے کہ چھوٹے چھوٹے تجربے آپس میں مل کر اور وقت گزرنے پر فن کار کے ذہن میں حاصل کر ایک مکمل اور بڑے تجربے کی تشکیل پائیں۔ البتہ باہر کوئی ناخدا میں ایک تجربے اور اس تکمیل کا احساس پایا جاتا تھا۔

منٹو کے فن کے اس تبدیلی اور انسانی تکمیل آخری دور کی دو تحریروں میں پائی جاتی ہے جن میں ایک تکمیل، ایک وسعت، ایک کائناتی گیرائی کا احساس ہے۔ زندگی اور وجود کا ایک فلسفہ ہے۔ سماج اور زندگی کی جھڑپوں کو بڑی بے رحم صداقت اور بے ہلکی سے بیان کرنے میں منٹو کے قلم کی قوت منفی اور تجربی تھی۔ بعد میں منٹو میں انسانی اقدار کو پیدا ہو رہی چلتے تھے۔ لیکن انہیں منٹو اس درجہ تک پہنچ چکا تھا جس میں کہ ایک فن کار میں زندگی اور وجود کا ایک مثبت فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر کوئی اس ہندوستانی ”کی گولائیوں کو کچھ سکے تو اسے یہ احساس ہو گا کہ اس میں منٹو نے منفی عناصر (NEGATIVE ELEMENTS) کو جن میں زندگی کی قوت نہیں، عدم اور فنا کی طوط جاتے ہوئے دکھایا ہے۔ اور ان انسانی عناصر (POSITIVE ELEMENTS) کو آپس میں ملا دیا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے اور زندگی نکلے ہر سمت ہے۔

یوں تو پہلی نظر میں اس ہندوستانی کا موضوع وہی نظر آتا ہے جو ڈی ایچ لارنس کے (LADY CHALLERLEY) کا ہے۔ کردار بھی تقریباً وہی ہیں، ایک شوہر جو شادی کے فوراً بعد غلط ہو جاتا ہے، اس کی عین جوان صحت مند بیوی، ایک جوان صحت مند مرد جس کی بیوی کو زندگی کی قوت دے سکتا ہو اور ایک خادہ جو اس غلط شوہر سے بددلی اور لگاؤ رکھتی ہے لیکن لارنس کی اس موضوع پر پیش کش سے منٹو کی پیش کش کہیں اونچی اور فنی کا رہا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ایک ناول ہے، دوسرا ڈرامہ۔ اس میں ایک فلسفہ ہے، لارنس سے مختلف، حالانکہ لارنس کا بھی ایک فلسفہ تھا۔ ملکر یوں کہنا چاہیے کہ لارنس نے نفس ہی کا ایک فلسفہ بنایا تھا۔

منٹو کی اس تحریر میں ”اس ہندوستانی“ ایک جمالیاتی (AESTHETIC) احساس ہے اور ایک جمالیاتی رویہ (AESTHETIC APPROACH) یوں تو زندگی کی قوت کو منٹو نے ہی لارنس کے معنی میں لیا ہے، یعنی جنس، لیکن یہاں منٹو

نے حسن کو زیادہ اہمیت دی ہے اور ان دوسرے اثنائی عناصر کو بھی جو حسن اور زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔

حسن ایک اثنائی عنصر ہے، جنس، روحانی، صحت، لطیف جذبات، محبت کی قوت یہ سب اثنائی عناصر ہیں جو پوری میں بوجھت موجود ہیں اور کم و بیش اس کے خوراک کے چھوٹے بجائی میں بھی موجود ہیں۔ لیکن شوہر جب وہ کسی حادثہ کی وجہ سے اس طرح مفلوج ہو جاتا ہے کہ اس میں زندگی کی قوت منقطع ہو جاتی ہے، ایک منفی عنصر میں جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غلطی کے ہاں اس مفلوج شوہر کو پیش کرتے ہوئے وہ بھی کسی تحفہ نہیں دیتی یا تو جو مرض کے بوجھ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے بظلمات منظر کو اس کو دلا دے پوری ہمدردی ہے، بلکہ منظر نے اس بے چارہ کو بھی کرب و ادیت اور کشاکش کو ڈال دیا کہ اہم حصہ بنا دے۔ اس میں یہ محسوس کرنے کی صلاحیت ہے کہ آخر اس کی حسین اور فرمانی پوری کو اس کا پورا راقی حاصل ہے کہ اس کے بجائی کی طرف نتیجہ ہو جس سے اسے کچھ معذور میں مثبت محبت مل سکتی ہے اور ان دونوں کو آپس میں بے اختیار کشاکش ایک فطری امر ہے۔ وہ خود تو اپنے مفلوج جسم، نفسیاتی کردار اور احساس کمتری کے ساتھ ایک منفی عنصر بن چکا ہے جس سے ہمدردی کی جا سکتی ہے، محبت نہیں، محبت اسے اپنی خاموشی سے ملتی ہے جو خود محبت کے قابل نہیں جو بد صورت ہے، اور بد صورتی کے بجائے خود ایک منفی عنصر ہے۔ یہ دونوں منفی عناصر یعنی مفلوج شوہر اور خداداد، ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں، لیکن ان کی قربت اور آپس میں ملاپ کوئی اثنائی قوت پیدا نہیں کر سکتے، لہذا وہ زندگی کی بجائے موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، ایک ساتھ خود کشی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ منفی عناصر فنا کی طرف جاتے ہیں۔

دوسری طرف مثبت عناصر میں سے ایک دوسرے کی طرف کھینچ جاتے ہیں، آزاد، کھلی نفساؤں ہیں، قدرت کے یلین نظام میں ان کی محبت پیدا کرنے پر توجہ ہے اور جب مثبت عناصر آپس میں ملتے ہیں تو زندگی پر بہار آ جاتی ہے۔

منظروں کو ایک فطری فن کار ہے لیکن اپنی چند ایک تحریروں میں۔ چنانچہ تو، ٹھنڈا گوشت، دھڑلے تو ٹھنڈا گوشت پر جو کچھ کھا ہے اس سے اس بات کی پوری تصدیق ہوتی ہے، "محرک کے کائنات" اور اس جہد صاف میں "ذخیرہ میں" وہ ٹرائی شعری فنکار (CONSCIOUS ARTIST) نظر آتا ہے۔

ایک اور اہم بات جو منظر کے آخری دور کی ان دو تحریروں میں پائی جاتی ہے اور منظر کی ادبی تکمیل کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ وژن کی وسعت ہے۔ ان دونوں تحریروں میں ایک کائناتی وژن (COSMIC VISION) ہے یہاں منظر کے وژن میں وہ وسعت پیدا ہو چکی ہے جو انفرادی اور خصوصی (PARTICULAR) کو کائناتی اور کائناتی (UNIVERSAL AND COSMIC) میں تبدیل کر دے۔

ایک خاص واقعہ، ایک خاص تجربہ، ایک خاص، انوکھا، انفرادی کردار پیش کرنا منظر کی ایک خصوصیت تھی، "محرک کے کائنات" میں بھی ایک خاص واقعہ پیش ہے لیکن یہاں خصوصیت، آفاقیت میں حلول ہو گئی ہے۔ افسانے کے سامنے جزئیات میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو خصوصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ "محرک کے کائنات" میں، لیکن ان نئی انگلیوں کے آسان کی نیلا ہٹ کی تشبیہ (آسان اس کی انگلیوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا) اس خصوصیت میں بھی وسیع کائناتی وژن کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔

یہاں ہم زمان و مکان (TIME AND SPACE) کی تخصیص بھی بھول جاتے ہیں، یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر واقعہ کسی خاص صورت اور خاص مروجے میں ہوتا تھا، وہاں ازلی صورت اور ازلی مروجے کا لحاظ، اور وہی تخیل، اور ازلی بنیادی گناہ، اور اس بنیادی گناہ کا گناہ جو صرف صورت اور کرتی ہے۔

دور و جوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا، اور ایک ہو کر زمانہ و سمت اختیار کر جانا، اور جس سمت کو اس شخص سے نقطے پر پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے۔“

یہاں منظر کا جنس کا تصور بھی گناہ مختلف اور گناہ بلند ہے۔ مگر منظر کا نظریہ جنس کے متعلق ہمیشہ صحت مند رہا ہے اور وہ اسے ایک ازلی، فطری صحت مند جذبہ کہتا رہا ہے۔ لیکن پہلے منظر کے ہاں جنس کا تصور محض جسمانی تھا۔ لیکن یہاں منظر کا یہ تصور اتنا بلند ہو چکا ہے کہ اسے وجود کی تکمیل اور جوں کے لحاظ سے تعبیر کیا ہے۔

وجود کی تکمیل اور جوں کے لحاظ سے اس تصور کے ساتھ ہی یہاں بنیادی گناہ کا تصور بھی شامل ہے اور طرح کے گناہانے میں بنیادی گناہ کا تصور اتنا گہرا ہے جتنا کہ جنس کا تصور جنس کے ہاں ملتا ہے۔

اس گناہ کا نشان صورت کے سینے پر داغ دیا گیا ہے۔ اور صورت اپنے سینے پر اس دیکھتے ہوئے انگلیوں کو رکھ کر اپنے آپ سے یہ پوچھتی ہے، کیا یہ داغ بھی گناہ تھا؟ اور کیا یہ موت میرا گناہ تھا؟

”میں نے اپنی پھر پھر ترقی ہوئی روح اس کے سوا کچھ نہیں کر دی تھی، اس کے وجود کی تکمیل کی تھی اور اس کے وجود کے خدوں سے زندگی بستی کی تعمیر و تکمیل کی تھی.....“

یہ اس کی شخصیت کی تکمیل تھی کہ وہ ماں بن رہی تھی، ایک مرنے والی اس کی کوکھ کی سیپ میں تشکیل پا رہا تھا۔ اس کی گری اس کی ساری رگوں میں سرایت کر گئی تھی اور اس کی دودھ بھری پھیلتیوں کی گولائیوں میں مسد کے اچھے پائینہ بینادوں کی سی تقدیس آ رہی تھی۔ وہ ماں بن رہی تھی، اس کی تکمیل تو بن رہی تھی۔ لیکن اب جبکہ اس کی تکمیل ہو گئی تھی وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا.....

”اس کائنات میں ایک دوح بھی نہیں کیوں گھسائی چھوڑ دی جاتی ہے؟“

صورت جوں محسوس کرتی ہے جیسے وہ ہاتھوں کی بیسٹر کی طرح ایک سردا ہے ہر کھڑی ہے۔ یہ دنیا ایک چوراہا ہے۔ دیاو رکھ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی۔ اور جب اس کی کوکھ کا مرنے کی سیپ سے باہر نکلے گا گناہ کی زندہ علامت ہو جائے گا۔ ہاتھوں کے (SCARLET LETTER) میں بھی مرنے کا گناہ کی زندہ علامت ہے۔ موتی (PEARL) بیسٹر کی ناہانہ ترقی کا نام ہے اور اس نام میں بھی گویا ایک رمز ہی مصنوعیت (SYMBOLIC - SIGNIFICANCE) ہے۔

”انگلیاں اٹھیں گی، پس کی طرف سے بھی اور موت کی طرف بھی..... یہ انگلیاں سپریدیاں ہیں جن کو ان دونوں کو نہیں کی اور اپنے زیر سے ان کو نیٹا کر دیں گی.....“

اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی، زندگی موت سے بدتر ہوگی، اس کی بھی اور پھر کی بھی، اس سے بدتر ہے کہ اس کی زندگی کو آغاز ہی میں ختم کر دیا جائے۔

اور جب ایک ماں اپنے سارے جذبات اور احساسات کو کھل کر اپنی اماں کا آپ گلا گھونٹ کر جب اس زندگی کو ختم کرنے لگتی ہے، جو اس کی اپنی زندگی کا ایک حصہ تھی اس کے اپنے خون سے بنی تھی، اس کی کوکھ میں تشکیل پائی تھی، وہ ماں کس بے پناہ توہینی اور معافی کرب سے گھر جاتی ہوگی؟ اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے!

اور اخبار میں بھیجی ہوئی وہ چند سطریں، چند سہرو، مجھد سٹریں اس المیہ کو کہاں پاسکتی ہیں؟ لیکن فن کار منظر اخبار کی ان چند سطروں میں وہ گہرا المیہ تلاش کر لیتا ہے جو موت اور ماں کا المیہ ہے۔

اس المیہ کو اپنی ساری گہرائیوں اور ساری (PREGNANCY) کے ساتھ پیش کر چکنے کے بعد جب منظر ہیناک اپنا افسانہ اس اخباری رپورٹ پر ختم کرتا ہے تو ہم گویا ایک دھچکے کے ساتھ بہت بلندیوں پر سے سطح زمیں پر آگرتے ہیں یا دریغ گہرائیوں سے اچانک باہر نکل آتے ہیں، زمین سطح پر۔

اور کائناتی وسعت اور گہرائی سمٹ کر ایک مخصوص نقطہ پر آجاتی ہے۔

افسانہ کے اختتام پر یہ اخباری رپورٹ پہلی نظر میں کچھ غیر خودی معلوم ہوتی ہے، اور غیر فنی کارانہ بھی جس سے افسانے کے شہر، ٹون اور کیفیت کو ایک دھچکا سالگتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اختتام ٹھیک معلوم ہوتا ہے، شونے ایک معنویت، ایک خاص (SIGNIFICANCE) پیدا کی ہے۔

اس افسانے میں جو سارا فنی کیفیت سے مشرب ہے، اتفاقاً طور پر یہ بتانا کہ موت آخر میں اپنی کو مارنے کی کوشش کرتی ہے بالکل مناسب اور موزوں نہ تھا۔ غٹونے اس بات کا انکشاف، اخباری رپورٹ کے ذریعہ کر دیا ہے یہ زیادہ ضرورت ہے علاوہ ہمیں اس رپورٹ سے ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جتنی زندہ رہ جاتی ہے اہاں دوسرے انکشاف پر کئی اور سوال رہا ہے تو ہمیں ابھر تے ہیں۔ یہ جتنی زندہ رہ کر سچ کے ہاتھوں کیا کیا گناہ اٹھائے گی وہ عورت بن کر شاید ہی گناہ کرے گی، دیا گناہ پر مجبور کی جائے گی، جو اس کی ماں نے کیا تھا، شاید وہ بھی ماں بنے گی اور اپنے مرنے والے اپنے گناہ کے پھل کو اپنے ہاتھوں.....

کیا یہ داستان پھر دہرائی جائے گی؟ اور کائناتی ایک دائرہ میں گھوم کر اسی نقطہ پر آجائے گی؟ یہ جتنی کا زندہ رہنا بھی گویا (IRONY OF FATE) ہے۔

اور پھر اس اختتام سے ایک تضاد کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ آفاقیت (UNIVERSAL) اور انفرادیت (PARTICULAR) کا تضاد۔

انہی ہر دو لازمی صورت و صورتوں کا ملاپ، جو روکی ٹکھل، پہلا نیلوی گناہ اور اس گناہ کا کفارہ..... اور پھر اختتام پر اچانک یہ احساس کہ یہ محض ایک عام واقعہ تھا، ان جیسویں دروازوں میں سے ایک جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں کائناتی وسعت اور گہرائی سمٹ کر ایک مخصوص نقطہ پر آجاتی ہے۔

اور حقیقت کے دو پہلوؤں، حقیقت کی دو سطروں کا تضاد!.....

ایک خارجی، واقعاتی، سطحی حقیقت جو خیال کی چند سطروں میں سموری گئی ہے..... ایک نوزائیدہ بچی سردی سے ٹھٹھرتے شرک کے کنارے ہائی گئی، کسی سنگ دل نے بچی کی گردن کو پکڑے میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا اور غریاں جسم کو پانی سے گیسے پکڑے میں بانڈ دیکھا تھا تا کہ وہ سردی سے مر جائے۔
اور سنگدل کے غصہ پر ہم چرکتے ہیں۔

سنگدل کو نیا تھا؟

وہ ماں جس نے رخی رگوں میں سرائیت کرتی ہوئی ماتا کا خون کر کے بچی کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا؟
یا وہ مرد وہ بچی کا باپ، جو عورت سے سب کچھ حاصل کرنے کے بعد اسے دھوکا دے کر اور اس نازک حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا؟

یا وہ سماج جس کے خوف نے عورت کو یہ غیر فطری حرکت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ سماج جو عورت کے سب سے اہم خیر و
مآل کا بھی گلا گھونٹ دیتی ہے؟

ایک خارجی، واقعاتی حقیقت جو صرف یہ بتاتی ہے کہ ایک عورت نے گناہ کیا تھا اور اپنی نوزائیدہ کو مارنے کی
کوشش کی تھی۔

اور دوسری گہری باطنی حقیقت جو سارے انسانے میں عورت کی ذہنی کیفیات اور محسوسات کے ذریعے بیان کی
گئی ہے۔ عورت کی مضطرب ذہنی کیفیتوں، جذباتی پھل (DISTURBED EMOTIONS) کے ذریعہ جب وہ
ماں بن رہی ہوتی ہے۔

کچے بعد ونگے وہ ساری کیفیات — جب عورت نے اپنی پھر ٹپٹاتی ہوئی مدح مرد کے حوائے کو دی تھی اور
محسوس کیا تھا کہ دور درمیں سمٹ کر ایک ہو گئی ہیں اس نے دھوکا کی گھیل کی ہے اور اس کی اپنی گھیل اب ہوئی ہے۔
جب وہ ماں بننے والی ہے۔

عورت کے ماں بننے کی کیفیت جب وہ ایک جلد و برتر اور تقدس بخشی بن جاتی ہے جب ماتا کا گرم گرم
خون اس کی رگوں میں بہتا ہے اور اس کے سینے کی دودھ بھری گولہ لڑھکیں میں مسجد کے پاکیزہ میناروں کی تقدیس اور
طہارت آ جاتی ہے۔

پھر وہ اذیت ناک احساس — نہیں یہ تقدیس اور طہارت کچھ بھی نہیں..... وہ تو دنیا کی نگاہوں کے
سامنے ایک چوراہے پر کھڑی ہے۔ اس کے سینے پر گناہ کی علامت ایک سرخ نشان دھک رہا ہے۔ انگلیاں اس
کی طوط اٹھ رہی ہیں، یہ سب لوگ اسے سنگسار کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں مگر اس پر پہلا پتھر اٹھانے کا اس میں
سے کوئی بھی مجاز نہیں۔

اور پھر وہ پھل، وہ جذباتی طوفان، وہ کرب و اضطراب، وہ کش مکش اذیت

وہ کش مکش، اور چھوری اود بے بسی کی وہ آخری چیخ! مت چھینو، اے

مت چھینو، میری روح کا یہ ٹکڑا تجھ سے مت چھینو!

خارجی حقیقت کا پردہ چاک کر کے جب منظرِ پس یہ باطنی حقیقت دکھاتا ہے تو وہاں موت ایک روح نظر آتی ہے۔

ایک عورت اور ایک ماں کی زنجی پٹڑ پڑاقتی برقی روح!

ممتاز شیریں

منٹو کا فن

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی انصافی، موٹو گائی، اس کی دور میں دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز سچی گوئی، سیاسی، معاشرتی اور مذہب کے اجداد و اوروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار و فقہ و بازیوں کی درجے سے سزا گیا ہے اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب کے بڑھ کر انسانی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مصلحتوں کی کیا ہے اور اس داؤد و تختیں اور مجر و تعصیب میں لوگوں کا جہد و تیر رہا ہے اس میں جتنی پسندی اور تواضع بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ انفرادی نظر کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سادے کھیل میں جو برسوں سے مشرقی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے، منٹو ایک شمالی بیرونی نظر آتا ہے اور شمالی دیکھنے کی کچھ نظریں اس بات کی حاوی ہو گئی ہیں کہ اُسے جس شخص کا مجسمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نکالوں کو اس میں برائیاں کے سو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر طنز سے دیکھا جائے تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جہد باقی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھٹکے کھٹکے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔ دنیا کی ہر دوری بزرگ طرح منٹو نے کھنچا ہے اور محض تری، اس کے افسانے نہ خاصا مستحسن و مجال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے کھال اس کی حقیقت نگاری، اس کی انصافی، موٹو گائی، اس کی دور رس اور دور بین نظر اور اس کی جرأت آمیز سچی گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقر و بازی کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں۔ کبھی بہت اچھے اور کبھی بہت بُرے۔

ان اچھے، بُرے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے افسانہ کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے۔ کلک، کلک، منور، لطافت، ذہنی خرابیاں، توند، اہر پاپا، کشمیر، بیسویں، اولیٰ، لاہور، نظم، اسٹوڈنٹ، کلچر، بازار، گھر، جوتی، چاء، خانے، بچے، بوڑھے، جواں، عورتیں، مرد اور ان سب کی توہنی آکھیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر انہیں افسانہ کے گونا گوں مظاہر منٹو کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کو چورس پسینہ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی۔ بعض افراد کا ذکر وہ جس ادا کے خاص سے کرتا ہے وہ ادا ہر موقع پر تازیباں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض دموڑ اشتہار اور تعریف سے جوڑا آتا ہے وہ دوسری باتیں کہتے اور کہتے وقت شدید محسوس نہیں ہوتا لیکن ذکر کسی کو بچے کا ہو، کسی شخص کا ہو اور کسی بات کا ہو یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کو بچے کے سادے سچ و غم، اس شخص کے ولی کے سادے سچیدار اس بات کی ساری تراکھوں اور لطافتوں سے واقف نہیں۔ جہاں تک ان گونا گوں موضوعات کا تعلق ہے ان کے سلسلے میں ایک اور چیز بھی سلسلے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں بگڑ وے کو ٹھونے بہت سوں کی دلی آزاری کی ہے بہت سوں کی بوائی ملتی

لی ہے اور بہت سوں کی کتابیاں لکھی ہیں اور اس کا نتیجہ ہر اس کے بہت سے پڑھنے والوں نے انھیں کامیوں کو بسیار بنا کر منٹو کے نفی مرتبہ کا اعزازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر ذی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگاری کی حیثیت سے منٹو کو بچانے کے لیے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے۔ اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جس کا منٹو نے پوری ضروری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطہ نظر کی بھی اہمیت ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذریعہ ہے۔ یہی حقیقت ہے جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا جس چیز نے اسے وہ عزت دی جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں۔ وہ اس کا فن ہے۔ اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پلور پر کچھ لکھا جائے اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منٹو نے جب بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے اور اس کے اظہار کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں، شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطہ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہم اسے زمین میں فن کا ایک مفہوم دیتے ہیں۔ اس مفہوم میں سب سے پہلی چیز جو تخلیقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے تکنیک کے وہ مبادیات اور خطابات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں باہم امتیاز رکھتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کامیابی کے لیے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار اور ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ سمجھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرض آویں ہوتا ہے۔ ایک خاص صنف ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے غلوں اور حدود اقصیٰ کا تعین ہے کہ وہ اس صنف ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انھیں ہم پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک اس کی خطابات یا اس کا فن ہے۔ جانا، سمجھنا اور ان کا صدیقی دل سے اخراج کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے بھی اشارہ کیا۔ اس لیے کسی فن کار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو ماناں اصول و قوانین کو، اس کی صداقت کو کس حد تک جانا، سمجھا، برترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔ فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار نے فن کی ہدایات کی پابندی کرنے کا فنی ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو منٹو کی حد تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فن کار کے تخیل، انکسار اور فنی کاوش اور انھماکے توجہ کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے جو فن کار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ مزین و مکشافہ اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اسی حد تک اس کی توجہ، انھماک اور فنی کاوشوں کی بدولت انھماک اور بلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔ انھماک اور بلاغ کی یہی منزل ہے جہاں صنف کا تخیل اور فکر حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر میں انھماک اور بلاغ کے وسائل میں نئے سے نئے رنگ بھر رہے۔ یہی رنگ صنف کے اظہار اور اسلوب کی خصوصیت کا منظر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جزو سمجھنا

جاتا ہے جس میں نئی عداوت اور اظہارِ بلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیجئے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فنی کار کے فنی مترجم کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیش نظر نہ رکھی جائیں تو فنی جائزہ اور اوصاف رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فنی کار اپنے انعام، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے ان پہلوؤں کا انکشاف اور اس رنگ کی خوشی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فنی کار کے اھصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انعام اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جس سے اظہار کے وسائل کو نیا پن اور جلدی ملتی ہے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انکشاف کا غلبہ ہوتا ہے تو فنی کار رنگ بھی پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لیکن والا نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ان حقائق کو ہمیشہ منفرد کیے بغیر فنی کار کے فنی کار کا سراغ لگانا ناممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ اگر گو شخصیت کے عناصر کے انکشاف کے ساتھ ساتھ فنی میں انکشاف پیدا ہونا لازمی ہے لیکن فنی کار کو فنی کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انکشاف اور انعام اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جس کے فنی کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ظاہر ہونے کے بجائے کھنکھی کھنکھی اُبھر رہے اور اندر سے ہی چمک دکھ کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منشور کے اضافی فنی میں فنی کے یہ سارے مدارج بدستور قائم موجود ہیں۔ اس کے فنی نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ ناول، ڈراما، داستان، کہانی — ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی ذکوہی واقعہ، اس قصے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدائی اور اختتامی حالت اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص اندازِ فکر، نظریہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو کہ پال میں بیٹھے والے بڑی ساوگی سے ایک دوسرے کو ٹھانے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بڑی عیاں بات کی خاموشی میں بچکر کو سناتی ہیں۔ اس افسانے، ناول اور ڈراما میں بھی جو فنی کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک یا ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں تخیل اور قصور کی نگہبانی، ڈرامے میں کوئی ذکوہی کش مکش، ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی کہانی یا امتیازی اور انفرادی خصوصیت ہیں۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مقصد ہی ہوتی ہے۔

ایک کردار، ایک واقعہ، ایک فنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو، عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت بہت کر افسانہ نگار سمجھتے ہیں اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا اثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ اُردو کے افسانہ نگاروں

کچھ ہونے کے باوجود سوگندی ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم سوگندی کے علاوہ باقی سب چیزوں کو باقی کر دیاں کو قبول جاتے ہیں۔ وہ دگر ویش کی ہر چیز پر نقاب آگلا اس طرح چھایا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سمجھنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صحت سوگندی کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی انگلیوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر اواز ہمارا راز ہے۔

نظری افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گذری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض منزل کی ٹیکن ان میں سے ہر منزل میں ٹھٹھنے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اس سے کہانی کے ذریعہ صحت ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم کرنے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک دھندلہ اثر قائم ہونا چاہیے لیکن یہ دھندلہ تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فنئی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنئی وسیلے اگرچہ پوری ڈگری اور پورے فنئی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں لاتے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگاریہ سوچ کو اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے۔ اپنے افسانہ کا ایک ٹوکسا بنانا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح ختم ہوگا۔ کبھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے تو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے انتشار میں مبتلا کر دے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ کھنڈے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے نظری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا شکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطہ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی اقعے یا جگہ ہیں۔ جنہیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگرچہ پوری طرح قدم جاکر سمجھادی اور استودی کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جاتے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے باطل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں جو افسانہ کی موزوں تمہید سے تاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار بھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھایا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ ادا ہوا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ منظر نے ایک روایت دار اور محاسن فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت ساسی میں جاتی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھایا جائے۔ منظر نے اچھے اور برے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موزوں

اور خیال ہے پڑھنے والا خواہ تعلق ہو یا نہ ہو لیکن افسانہ کی قیدیں اسے ضرور ایک دلکش محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

مشور نے اپنے افسانوں کی قید سے مختلف وقتوں پر مختلف کام لیے ہیں، لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو تھاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بچانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ مشور کے چند افسانوں کی قیدیں دیکھ کر اندازہ لگا دیجئے کہ قید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کی کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

نیا قانون اس طرح شروع ہوتا ہے:-

”منگو کو جان پہنچاؤ۔ یہ میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا ستر بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اٹھ کے وہ تمام کو جان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، انسانوں کی وسیع معلومات سے بھی طرح واقف تھے۔“

اسی طرح ”جادو“ کی قید یہ ہے:-

”کچھ دنوں سے ہومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچتے پڑھتے ہی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔“

ان دونوں قیدوں کے ذریعہ تھاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے۔ لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے۔ دو قیدیں اور دیکھیے:

”گھر میں بڑی جہل پھیل چکی تھی۔ تمام کمرے لٹکے، لٹکیوں، پتچے، پچھریوں اور جھڑیوں سے بھرے تھے اور وہ خود پر یا خود ہاتھ کر کان پڑی آواز سناتی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں وہ بین بچے اپنی ماؤں سے پیٹے دودھ پینے کے لیے بیٹلا رہے ہیں، تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ٹھونکنے کی جگہ لڑکی یا لڑکیوں کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ نہ کال کی خبر ہے نہ لے کی بس گائے باری ہیں، نیچے ڈیڑھ سی سے لے کر بالائی منزل تک مکانی مہمانوں سے کچھ کچھ بھرا تھا کیوں نہ ہو ایک مکان میں دو سو روپے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاندسی وینس بیاہ کر گئے تھے۔“

”میری اور اس کی ملاقات آج سے تھیک دو برس پہلے اپلو بندہ ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں مسند کی ان ٹھنڈی زہروں کے نیچے غائب ہو چکی تھیں جو سائل کے پنج پر چڑھ کر دیکھنے سے روٹے پڑے کی تھیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیسٹ آف انڈیا کے

اس طرقت پہلا پہنچ چھوڑ کر جس پر ایک آؤٹو گئی دالے سے اپنے سر کی ماض کر دیا تھا۔
دوسرے پہنچ پر بیٹھا تھا اور تہہ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دوڑت ہوئے
جہاں سمندر اور آسمان گھٹل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں
اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا لہر سے رنگ کا تالین ہے جس پر سارے دوسرے پہنچ

پہلی قید شہر شہر کی ہے اور دوسری بانچھ کی۔ دونوں قیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات کے لیے ایک
نصاب تیار کی ہے اور اس نصاب میں دونوں مرحلوں پر تھے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور
جذبہ برتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سہج کہ کہہ سکیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے بڑھتا ہے۔

”پہلا پاکی قید صرف ایک جگہ ہے۔ لیکن اس جگہ سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے۔ وہ کہتا ہے:
”گو پال کی زبان پر جب یہ ٹرا پیڈر نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔“

گو پال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے اوسان بھی قصود بہت مضبوط نظر آتے ہیں
جانتے ہیں کہ وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا، مگر افسانہ نگار کی حیت ہے۔ اس نے
ایک محفل میں خبر سن کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے نیچے پہنچے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی قید دیکھیے:

”ایک نہایت ہی قہر والا س جڑوں میں دسی دسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد بے ہوا کہ باہر

گھر رہا ہے اور ایسی حرکت کی تلاش کی جائے جو جڑوں اور دسکی کے پیدا کردہ ٹکڑوں کو فکڑ کر سکے۔“

یہ قید پہچان کی ہے۔ اس میں دسی کردار کا تعارف ہے، اذ کوئی فضا یا ماحول نہ ملے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے
نہ کوئی چٹکنا دینے والی خبر سنائی گئی ہے۔ بلکہ جسے واضح اشاروں میں نہ بنا دیا گیا ہے کہ گے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح گھر
کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دولت بھی دی گئی ہے کہ آؤ، اگر تم میں ان شریعوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آجاؤ۔ اور
معصوم قاری فوراً یہ دولت قبول کر لیتا ہے۔

اور نیچے:

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس نیگیٹو عمارت کی ساقوں میں اس کے کاغذوں پر دھری گئی ہیں۔“

یہ نعرہ کی قید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کی شہر لال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی
کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی کہے گا کہ افسانہ نگار اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ شہر لال کے اس
شدید احساس کے نیچے کیا واقعہ کام کر رہا ہے۔ اس کے دل میں یہ جلتے کی غفلت پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں بھیجے کہ افسانہ
نگار کا ترنشا نہ پر بیٹھا۔

”دن بھر کی تھکن گامی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور ملتے ہی سرگئی تھی۔ میرے سر کی کپڑی

کا دودھ صفائی، جسے وہ میٹر کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ٹہیاں پسلیاں
جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چڑ، لگ کر واپس گیا تھا۔ وہ رات کو نہیں ٹھہر جاتا،
گلو سے اپنی محرم ہنسی کا بست خیال تھا جس سے بے حد پریم کرتی تھی :-

یہ تمیزت جنگ کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کو ہیں، ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں، اس
بچے کو افسانہ میں آگے بل کر جو گمان شروع ہونے والا ہے اس کا اتنا سنائی رہے کہ وہ بات سید سے ساوے انداز میں کہنے
کے بجائے ذرا نیچے خود کے ساتھ کہے۔ تہا ری افسانہ نگار کے ان نیچے خود کو کو بچان جاتا ہے اور یہ سرخ کر کر دیکھیں یہ تعجب نہ
کر سوجانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب وار دودھ صفائی آگے بل کر کیا اکل کھاتے ہیں افسانہ کے چند صحنوں کو پڑھتے ہے۔
منو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے توش کے بہترین کی ادبیت کا صحیح اندازہ لگایا
ہے۔ انہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی قید ہے، جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے، کہ رات کو متعارف کرنے کا،
ایک خاص نضایا ہوا دل بنانے کا، ایک پھر کتنی ہوتی خبر سننے کا، کسی کہار کی ذہنی کشش کشش کی معنوی کرنے کا، آئے نئے تعلقات
کے لیے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی بیک وقت کئی طے بننے مقصد پر اسے کرنے کا، لیکن ان گونا گوں کاموں کے علاوہ جو کام منظر
کے افسانہ کی بہر قید نے اپنے فتنے لیا ہے یہ ہے کہ وہ تہا ری کے ذہن کو بیدار کر کے اس کے دل میں لگدگی پیدا کر کے یا اس
کے ذہن میں آگے جو محسوس کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔ منظر کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور
یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے تو آپا پسے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمیز افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل افسانہ نگار اپنی تمیز کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل
پر تسلط جمانا اور اسے افسانہ کے آئے والے حصوں میں دلچسپی لینے کی طرف آواز دے دینا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں
ہیں جن میں طرح طرح کی صورتیں مسافر کی راویں مائل ہوتی ہیں۔ نہ ہلنے کیسے کیسے کاٹتے ہیں جو اس کے طول میں جیسے کیسے
بلے قرار نظر آتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والا ان مصرعوں کو آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کاغذوں کو راستے
سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی رہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی رہنمائی اسے اس منزل مقصد تک
پہنچاتی ہے، جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کشش منظر میں طے کرنے اور چھینے والے کاغذوں کی منظر کو گوارا اور آسان بنا
لینے کے بعد اس کی سبک بڑی خواہش اور تہا ری ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے تعلق و ذہن کے لیے سکون و راحت کا ملکہ
ہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی
جسم کو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابل قبول بھی ہو یہی
وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی
ذرا سی سستی، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی سہل انگاری اور بالکل معمولی سی غفلت، انھیں اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور
پڑھنے والے کے لیے گرفت اور منظر کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ منظر نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نرا کتوں

کو پوری طرح محسوس کر کے ملو، اپنا فنی منصب پر پارک کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس لیے اس انجام سے ہماری خدمت کو متاثر کرنے کی نیت نہ تھی انجام دی ہے اور فساد کو انسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی یہاں ہے۔ جھوٹ کے بعض انسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فنی کی اس خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا فساد نیا قانون اس طرح ختم ہوتا ہے:
استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے — راستے میں اور تھانے کے اندر وہ
”نیا قانون، نیا قانون چلا آ رہا، مگر کسی نے نہ مسمیٰ۔“

”نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو — قانون وہی ہے پُرانا“
اور اس کو جرائمات میں بند کر دیا گیا۔

”پچھا ہوا انجام یہ ہے:

فرما بڑے اشماک سے پچھا ہوا تراش رہی تھی۔ اس کی تپتی تپتی انگلیاں تھنی سے بڑھائیں
کام لے رہی تھیں۔ پچھا ہوا کٹھن کے بعد اس نے تھوڑا سا سر ہم نکال کر اس پر پھیلایا اور
گردن جھکا کر اپنے کرتے کے ٹخنوں کو لے بیٹھنے کے ادنیٰ طرف پھوٹا سا اُجھار تھا۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ ٹکڑی پر صابن کا چھوٹا سا مکمل لبلبلا اٹھکا ہوا ہے۔
فرما نے پچھا ہے پر پھونک ماری اور اس تھنے سے اُجھار پر چبا دیا۔

”شہ نشین پڑ کے آخری الفاظ یہ ہیں:

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے
بڑے دیکھے بھیر میں کہا: ”مجھے زندہ رہنا ہو گا۔“

اس کے اس دیکھے بھیر میں عزم کے آثار تھے۔ اس ٹھکی ہوئی جوانی کو دلگھٹی ہوئی چاندنی
میں چھوڑ کر میں اپنے غلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

”جھک کی ہیروئن سو گئی نہ ہم سے اس طرح فحشت ہوتی ہے:

”تبت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل
پر چانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کٹھن کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے
چٹ سے چٹک پر اسے پلوں میں ڈاکر سو گئی۔“

”..... اس کے حلق سے ایک نعرہ کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ
پھیلے ہوئے گرم گرم لادے کے مانند نکلا — بہت تیزی!“
جتنے کمزور بڑوں کی منڈیروں پر ادا نگہ ہے تھے، ڈر گئے اور نظر پڑانے لگے۔ نعرہ
مار کر جب اُس نے اپنے قدم زمیں سے بڑی شکل کے ساتھ ملندہ کیجا اور واپس شرا تو
اسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ بڑوں کی تلمارت اور اڑنا دوسرے کر گئی ہے۔
اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی پیروی سے جو یہ غمزدگی کر ڈر گئی تھی، کہا: ”بگلا ہے!“
(نعرہ)

”..... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ مگر فوراً ہی سب مسائل
سمات ہو گیا — سیوا بھی میری ضرورت میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی
سے چھا پا کر گئے تھے۔“ (میلا اور اس کا انتقام)
”آس دا فکرو ایک نماز گزار چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہنٹوں
میں ٹوسنیاں ہی چھبے لگتی ہیں — یہ ناکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہنٹوں پر لٹکا رہے گا۔“
(ناکمل تحریروں)

جب اس کو فصل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا: ”ٹاکٹر صاحب! اس
کی منگی میں کچھ ہے۔“ میں نے اس کی بند مٹی کو کھول کر دیکھا، لوہے کے دو کپ تھے۔
اس کی بیچو کی بازو کا مارا
”اُن کو نکالنا نہیں، یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔“ میں نے فصل دینے والوں سے
کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔“ (ریگو)

”وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ
اس جھگے کا نشان اٹھانا چاہتا ہے۔ اس کل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر
کسی پر غصہ کیا — سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے ٹھکی ہوئی آواز میں کہا: ”کے
نہا! بیلا! سمجھو مجھے واپس دے دے.....!“ (سمجھو)

’منشور کی مختلف کمپنیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے
والے کو اپنے ذہنی انتشار کے جمع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کمائی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر رہا ہے

جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا تھا، دوسری طرف وہاں میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر کہانی کی قید سے خروار ہو کر بار بار زیادہ عظیم بناتا رہا تھا، افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک انضباطی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منظر نے جذبات، انضباط اور فنی کے رشتے بٹولے اور انھیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کامیابیوں کے انجام سے کوئی ذکوہ کی کام لیا ہے۔

نیا خانوے کے خاتمہ میں استاد منظر کشی کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد رد عمل ہے جس سے پڑھنے والے دل میں حد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ ”چچا“ کا انجام واقعہ نگاری اور انضباطی تجزیہ کا بڑا سیدھا سا سادہ اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ شش ٹھیں پر کا انجام جذباتی کھینچ و کھنکھ اور اس کے بڑے سادہ لیکن فنی کارندہ عمل کی تصویر ہے۔ جنگ کے انجام میں افسانے وسیع پس منظر ایک خاص کردار کے شدید رد عمل اور زندگی کے ایک بڑے ڈکھتے ہوئے ماحول کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح مل گیا ہے کہ کائنات کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سوسائٹی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم آہنگ ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سوسائٹی کے نزدیک ناقابل فہم ہے۔ غور کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشور لال کی جذباتی شدت اور اعلیٰ کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جگہ پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضائی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ترچہ بازی کو واضح تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور انضباطی فنی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منظر کے افسانوں کے خاتمہ کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ ”بیگم کا انجام“ منظر کے فنی کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منظر اپنے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل جبریم اور معمولی بات کو بڑے پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گزار دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مزید یہ معمولی سی غیر اہم بات، گڈے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ ”میرا دادا“ اس کا اختتام میں آخری جملے میں بھیجی ہوئی ملکی سی ایما بیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی فہمی اور جذباتی کیفیت کو آخر کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا وہ کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اٹھ کر لے گئے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم آہنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صحت ایک واضح اور مزین نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر تئیں پہنچتا۔ ناقابل تحریر میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے دوامی واقعہ کو ایک ناقابل فروغوش یا ادنیٰ حیثیت مل جاتی ہے۔ ”سجدہ“ کا انجام منظر کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چٹا سی لگتی ہے، اپنے فنی کے بچے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منظر کی مختلف کامیابیوں کے ان خاتمہ کی نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات

محسوس کرتا ہے کہ فنی کے نقطہ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی تاثر کو مکمل کر لے کر خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مشرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر بھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتروں میں لکھنے والے کی خدمت، بیان اور اس کے انداز نگار کی خدمت اور دشواری ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے کبھی محض سادگی، بیان سے، کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شرفی سے، کبھی طنز سے، اور کبھی شادمانہ، طنز اور فحش کے امتزاج سے وہ اپنے فنی تخلیق میں حد و پیمانہ اور پڑھنے والا اور قاری سے دیکھے تو یہ محسوس کر لے میں وقت نہیں جوتی کہ افسانہ کے عناصر کا یہ انداز پوری طرح سوجا کھلا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمہ کے وہ چند عجیبے حوس ہر جگہ اس کی ذہانت، عظمت اور شرفی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ افسانہ اتار پڑھاؤ کے لطف مرحلے کے کہ یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید یہیں گناہ زیادہ سمجھ ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ فحش کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پوایا افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جس کے آغاز میں تھی۔ اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم خطاں دوم سفر ہے۔ افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام — ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو ہر مرحلوں سے گزرن پڑتا ہے وہ ان گناہوں سے کسی ایک کی طرف سے ہی عظمت یا بے نیازی برتے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ مثلاً کوئی کہ ان مراحل کا پورا محاسن جہاں سے کہ ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض وضع مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی شلق ہوتی ہے جس کا پڑھنے والے کی محاسن تو نہیں ہوتا لیکن وہ اس سے متاثر شدہ ضرور ضرور ہوتا ہے۔ افسانہ ضرور جو کہ بڑی درمی لیکن فنی آلی چال سے۔ بڑے نرم لیکن بڑے فنی تا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور ہوں جو آگے بڑھتا ہے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس درمی اور فنی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام تک پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مشرت محسوس کرتا ہے۔ اچھے لوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے ایسا کہ ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک ایسی کامیابی جو ہوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آجاتی اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی گلابی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ چڑھنا پڑتا ہے جہاں کے لیے زیادہ سوزوں ہو، کوئی گلابی اگر ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری ذہنی ضرور ہم جہاں سے اس کے تبدائی سرے اور آخری سرے میں جو سہوار رابطہ ہے اس میں جھجک بڑھائی اور پڑھنے والے کے لیے اس ربط میں ایک خوش گوار جھجکار کا جو تصور پویشیدہ ہے وہ مزہ و مزہ ہو جائے۔ چارے کم افسانہ نگاروں نے گلابیوں کے ربط کی اس جھجکار کے محاسن کو اہمیت دی ہے اور محسوس نے دی ہے انھوں نے پیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا غلط فہمی کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کو کبھی نہ جھلالتے ہوئے یہ پیشہ ہر افسانہ کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، مشرت، رفتار اور آثار چھاند کو فنی و فہرہ اس کے ساتھ برتا ہے مثلاً کے نزدیک فنی کے ان مراحل کی ہر اہمیت جہاں کا اندازہ مثلاً کے بعض افسانوں پر نظر ڈالی کر کیجیے۔

نیا قانون کے استاد منگوٹھاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سن کر غوشی سے پھولا نہیں سنا تو اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہونے سے پہلے ہی کے بعد ہی اسے ایک گورے سے دھڑکے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس آئین اور انجام کے درمیانی حقوں کو اس طرح چر کر ناکوں میں افسانے کا انجام چڑھنے والے کے لیے محدود کر کے بغیر بن جائے منٹو کے فنی احساس اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب و تنظیم کا منظر ہے۔ نیا قانون نافذ ہونے کی خبر سن کر منگوٹھاں کو خوشی ہوئی تھی اس کے لیے نئے قانون کے نافذ ہونے کی تائید یا تنک منٹو نے کئی ایسے موقع پر پیدا کیے جن پر منگوٹھاں کی حالت و فکر کا تاریخی برابر و اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس کی سرتر استہسا بہت دور تھی و دیوانگی کا درجہ اختیار کر رہی ہے اور بالآخر جب وہ وزیر سید کے پختہ ہے تو اس کی سرتر و عقلی اور دیوانگی، شوق آزادی کو ختم دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگتی ہے اور میں اس وقت جب اس واد عقلی شوق کو بظاہر اپنی تحصیل کامرغ حل جاتا ہے اسے حوالات میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح منگوٹھاں نے جذبات و احساسات کے جو مقصد نازک مرحلے طے کیے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر وہ تو غرق استغراب ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی زنجبلی کا منتقل شرم ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود محدود و پراپنہ والی ہے۔

نیا قانون منٹو کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لیے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان واقعات کا یہ فنی آثار چرچاؤ، یہ نازک اور پختہ، اور ایک شدید قسم کا نقطہ خروج شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرت مل کرے کہ منٹو اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں طے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منٹو کے نقطہ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز بہتے کا نا ہی نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجہ اور اہمیت کے ساتھ پورے ہونے پانچ ہیں۔ اس انداز سے کے لیے منٹو چند اور کہانیوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالیے۔

منتر اور نیر اور اس کا اختتام موضوع کے اعتبار سے دو بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر پڑھنے والا انھیں پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ اس نے ایک نئی پھلکی تقریر کی چیز چھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا بصری تاثر کسی طرح کے تاریخی پر بھی اس تقریر کی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منٹو نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنی اہمیت سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز، دونوں کا انجام اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی منزل میں سب پورے فنی دیکھ بھال کے ساتھ طے ہوئی ہیں۔

”چھا با“ بلاؤ اور کالی شہنشاہ ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنہیں منٹو کے محبوب موضوع کہا جاسکتا ہے اور جن محبوب موضوعات کے تقریبی تعلق نے منٹو کو اردو کا سب سے بڑا نام افسانہ نگار بنایا۔ چھا با اور بلاؤ میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بھولے بھالے اور محسوس جنسی احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی مبرا زمانہ اور کشش منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں جھجک اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو پڑھنے سے سادے انداز میں شروع کرنے والی سیدھی

سادہ انداز میں غم کرنے کے علاوہ آغا زاد راہنجام کو گریصنویت دینے کے لیے افسانہ نگار نے بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات کو جوڑ کر اس نضاد تیار کی ہے جو پوری قوج اور پورے احساک کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ افسانہ نگار کے اس نئی نمونہ اور ضرور دیکھنے والے سادہ انداز کی ایک ملکی حیثیت دے دی ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نے نفسیاتی نقطہ نظر سے دو اہم مسئلے ہونے کے باوجود فن کے ان حدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کافی کمائی نہیں رہتی۔

یہی صورت کالی شلواری کے ساتھ ہے۔ کالی شلواری میں لطافت کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت کچھ چری پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات ہیں ایسا آنا پڑھا پڑا پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے ہیچ وچ پچھرا مل سے کرتے ہیں کرٹھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے، جو کہ اردوں کو ایک خاص طرح کے کل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ کالی شلواری طوائفوں کی گندی کمائی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس بے شمار کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کمائی کی ساری دلچسپی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں زندگی چھوٹی ٹہری باتوں کو ایک زنجیر میں ملو کیا ہے اور میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کمائی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ بھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغا زاد راہنجام کو اس طرح چھوٹی ٹہری بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ پس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شریک ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں منظر کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں) موجود نظر آنے کی مشقوں نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو بے گناہ بنایا ہے۔

(۲)

منظر کے افسانوی فن کی ایک پہلو یہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرنا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تحریر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تنقید اس کی اُتھان، اس کے واقعات کا آنا پڑھا پڑا، ان واقعات کے ہیچ اور الجھا کر، اس کا نا پڑھا پڑا اور الجھا کر کے بعد افسانہ کا نقطہ عروج اور اس کا خاتمہ۔ ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے، اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت، اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے وہ سب سے اہم چیزیں ہیں۔ منظر نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے یہیں سا اندازہ لگانے اور نہ تو تجربہ انداز کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منظر ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے اس ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لیے ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن اور تلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے حقیقی وسائل ہیں۔ گویا فن کار کا مقصود بالذات فن کے اس ظاہری پہلو پر ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لیے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد میں یہ سوچنا ہی آئے گا کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان عناصر کی تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے بہتے ہوئے اور استعمال کیے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان نگاہ بری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اہتمام اور اہتمام کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنہیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتنا ہے۔ ایک سیدھی سادی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا اندازہ کیا ہو اس کے لیے کسی خاص عمل پر سیدھے سادے فقرے، اشارے، نکاتے، تعظیبات، استعارے، تشبہات یا نگار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہو گا یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور انہیں صلاحیتوں کے مطابق اپنی پسند سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص عمل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ فقہوں، معجزوں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور مفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگلا اسلوب اور اہتمام کے ان وسائل کے نقطہ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو نظر آئے گا کہ منٹو کے ساتھ ساتھ اثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اہتمام کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، انطو کے بہتے میں تھوڑی سی بدلت پسندی اور بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہے ذہنی منٹو کے انداز اہتمام کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض محکمتے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کیجیے۔

(۱) سب سے پہلی مثال نیا قانون کی ہے۔ استاد گھونٹے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے ملک پہنچانے کے لیے بے تدار ہے۔ استغنیہ منٹو گھاٹا ہے پڑا تا ہے۔ منگولستان آواز سے اس سے کہتا ہے،

”اتحاد دھڑلا، اسی خبر سنائی کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گدی گسٹری پر بال آگ آئیں۔“

(۲) پہچان میں بازار چشتی کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ ”یہ رنگ برنگی عورتیں کانٹوں میں پکے پکے پھلوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔“

(۳) پہچان میں جس ایک لڑکی کا ذکر کیا ہے۔ ”توڑیاں اس کے ہاتھوں سے پکے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا سلوم ہوتا تھا کہ آناج دور رہا ہے اور یہ روڑیاں اس کے افسوس ہیں۔“

(۴) پہچان میں ایک اور بازار کی عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ بلند ہی تھی جیسے عمارت دوکاندار کی طرح ڈھنڈی مارتے گی اور کبھی پوری تول نہیں توڑے گی۔“

(۵) ”شو شو نہیں رک جگہ کہا کیا ہے — شو شو..... شو شو..... ارے یہ کیا؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پکایا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پرنسٹ کی گولیاں جس دبا ہوں۔“

(۶) ”شو شو ہمیں سونے سے پتلے کی کیفیت یوں بیان ہوتی ہے ”میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھکی ہوئی روٹی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔“

(۷) ”خوشیا میں کاٹا کاٹا کھانا جسم مہم کے پتلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور کھل کھیل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔“

(۸) ”آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں۔“ (بانجھ)

(۹) ”..... محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔“ (بانجھ)

(۱۰) ”اندری اندر اس نے اپنے ہر قسم کے کرم بنایا تھا کہ وقت پر کام آئے۔“ (نعرہ)

(۱۱) ”محبب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو میں کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر بڑے کئی خباثت پوش گھسے۔“ (مراقبہ)

(۱۲) ”خوشکے دل پر ایک گونسا سا رنگ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ چمرکی دھوپ میں اترنے والی ساری چلیں اس کے داغ میں گھس کر چھپنے لگی ہیں۔“ (اس کو پتہ)

(۱۳) ”کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہر دم میں بہت اونچی بگڑ چکی ہوئی ہو — اوپر ہوا نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا بس ہوا ہی ہوا ہے۔ اور پھر اس ہوا میں دم گھٹتا بھی ایک خاص خزاں رہتا ہے۔“ (شک)

(۱۴) ”فضائل نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری نریاں ہوتی ہے اور انسان کے اندر دوزخ نرم خواب یوں پھٹ جاتے ہیں جیسے آبی پکڑے۔“ (دھواں)

(۱۵) ”میں نے آنکھوں سے اس کے ہاتھوں میں گھسکی کرنا شروع کر دی — میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے اُچھے ہونے خیال میں بھی کرم اپنے ذہن کی آنکھوں سے ٹوٹ رہا ہوں۔“

(۱۶) ”آسے صرت اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی بہت پروہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔“ (دنیا سال)

(۱۷) ”محبت ایک عام چیز ہے، حضرت آدم سے لے کر اضر ثا تک سب محبت کرتے آئے ہیں۔“ (تغیض)

(۱۸) ”زندگی کیا ہے؟ — میں گھسا ہوں کر یہ ایک — آدمی بظاہر ہے جس کے دھانگے کا ایک سلا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس بظاہر کو اوجھرتے رہتے ہیں جب اوجھرتے اوجھرتے دھانگے کا دوسرا سلا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ معلوم ہے زندگی کسا جاتا ہے، ٹوٹ جائے گا۔“ (معری کی ٹولی)

منظور کے افسانوں کے ہر متفرق اعتبارات اس کے انداز بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں مثلاً بُرا میں شگونے جب یہ بات کہی کہ دوسری خرفانوں کہی خوش ہو جائے تو یہ معمولی بات تھی لیکن یہ بظاہر معمولی معلوم ہونے والی بات شگونے کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منظور نے شگونے کے مزاج اس کی ذہنی سطح اور گہنے فطرت کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا

جدد کھاجو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لیے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک پختے ہوئے غیر سنجیدہ فخرے کو ایک بے حسام اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے ہدایت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثالی نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے، اسے دیکھ کر کڑھنے والے کو اس کے منتظرین کا احساس تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا۔ لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر اعلیٰ گرا سکتے ہیں۔ تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ جملہ جو خیالی یا بیان کے اختیار سے باطل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے، بازار کی گدگد کے کوہ دار اور اس کی ان خصوصیات کی پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا اختیار رکھتی ہیں۔ تیسری مثال میں ابتدائی کڑھے میں منشاہد کی جو بات کہہ رہی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرز فکر کی ایک خصوصیت ہے۔ لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مرد ڈریاں نیچے گرا رہی تھیں اس کے لیے منٹو کے دل میں گھٹن ہی ہے اور نفرت بھی، اس گھٹن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لیے اکثر گھٹنے والوں کو کمر ٹھکریں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے کوہر آباد رکھنے کی فکر ہوتی۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبہ کے اظہار کے لیے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک سلیسی ترتیب دینا کہ چلے کی نظا ہری حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی صغیریت کئی گنا زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرت بیان کا ایک ادنیٰ کر ٹھہر ہے۔ — ادنیٰ اس لیے کہ یہ کر ٹھہر کبھی کسی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثالی نمبر ۳ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور قدرت کا ذکر کیا ہے جہاں کے نزدیک تعالیٰ نفیر ہے۔ لیکن نفرت اگر ایسے لفظوں کے ذریعہ ظاہر کی جائے جو بدیہی طور پر جذبہ نفرت کے مظہروں تو یہاں میں گوریت آجائے منٹو نے اپنے انداز کو ہمیشہ گوریت سے بچایا اور سادگی بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثالی نمبر ۴ تا ۸ انگریزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اپنی دو دنوں خالوں سے متعلق سلیقی ہے فرق موند یہ ہے کہ یہاں منٹو کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لیے یہی شورش کے نام میں دعویٰ قدرت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پرانی گلی آشنا ہے۔

پچھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے انداز بیان کی قدرت اور قدرت کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ ہم پر ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک سلیقہ مری اور خرافاتی حس ایک ٹھوس اور مری حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

انہوں میں دونوں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کیے ہیں۔ ”بانجھا در استقا کا ایک واضح معنی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے اس لیے جب منٹو محبت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے یا اس کا استقا ہو سکتا ہے تو ہمارے ذہن

اس کا جو فردی اثر قبول کرنا ہے اس میں الجھن اور شک کی ایک نئی عملی کیفیت ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ نئے سیاق و سباق میں ان فنکاروں کے منہم پر پڑ کرنا شروع کرتا ہے تو اسے مخصوص ہوتا ہے کہ غلطی ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے اظہار کے لیے دو ایسے فنکاروں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور فکر کا بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ یہی منہم کی چابکدستی کی بدولت ان دونوں معمولی و حقیقی فنکاروں کی حیثیت باطل بدل گئی۔ انھوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار ٹری کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے اہل نہیں تھے، بلکہ پڑھنے والے کے لیے سوچ بچار کے دھماکے بھی معمول دیے۔ غلطی کے اسلوب کی حقیقت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے فنکاروں سے بڑا کام پایا ہے اور اس طرح معمولی فنکاروں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ — یہی صورت ان دونوں شاعروں میں ہے۔

دوسرے سے لے کر چند دھڑوں شامل نہک ہر تعلق تصور سے بہت فرق کے ساتھ غلطی کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے، کبھی رسمی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے سمجھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے عمل معلوم جو کہیں جہاں غلطی نے انھیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت سی نئی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل اثر قبول کر لیتا ہے۔ دل کی بات ایک زندہ اور حقیقی حقیقت ہیں کہ اس کے سامنے انگریزی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ دیکھو میں یہ ہوں۔ مجھے کبھی طرح پہچان لو اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لیے ناقابل فراموش بن جاتی ہے۔

سولہویں مثال میں غلطی کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر نہ کرنا ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ خصوصیت کی کیفیت جس کا بیان مقصود ہے آئینہ کی طرح روشن اور شوری کی طرح تاباں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

سترہویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے میں ایک خبر کے مکمل سلسلے کو محبت ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لیے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک بات معلوم ہونے کے باوجود اس قدر مضطرب ہے کہ کوئی سمجھنے والا اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ غلطی کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں۔ یہاں بھی سادگی بیان اور اجماع ترین بات کو مدد و رجحان کی بجائے اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت بار بار کار فرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی غلطی کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور امتزاج سے جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادہ عبارت اور معمولی کی تشبیہ کی اس طرح ایک ہی ذہنی گہرائی بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرانے کا بہترین اور موثر ترین انداز وہ ہے جسے غلطی نے اپنا لیا ہے۔

غلطی نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے، اسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں

کی نظر میں باطل حقیر اور بے حیثیت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جس میں سمجھ کی دشانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، پیچیدہ سے پیچیدہ اور نرگڑے نرگڑے بات کہنے کا کام لیا ہے اور یہ کہ اس سادگی اور عوامیت کو تصور فرمیں، منکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے پھر بھی بہت کم تعلقات ایسے ہیں جن میں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ وہ سوں کے ٹھکانہ پر محفل کی غلطی جملانے والے منظر نے یہ باتیں کہنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دیا ہے منظر نے جو کچھ کہتا ہے اس میں اور فساد کو نہیں، ایک ایسی آواز ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی منظر پر سے اسلوب پر بھی بے غلطی آواز ہے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پر تو اس منظر کی ان تشبیہوں میں بھی انفرادیت ہے جو اس کے ترکش فن کے لیے حیدر انگیز ہیں۔ ایسے ترکشوں کی منظر کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لیتے کہ منظر کا ہر رنگ اور ہر صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

استاد منگور نے فہمی گوروں کے چہرے کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے، دیکھ کر کس قدر حیرت و حیرت و حیرت ہے۔
 ”آن کے لال چہروں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر
 سے اور ہر کی جھلی گل گل کر جھڑی ہو۔“ (نیا قانون)

منظر کے دل میں دیا منظر کے کسی کردار کے دل میں، کسی چیز کی کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منظر کے پاس الفاظ، تقریریں اور جملوں کی کمی نہیں، اسی طرح ان کا ذہن تازہ شکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نمائندگی اور لطافت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کر لیتے ہیں اور ہے جس کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا یہی خصوصیت ادب کی شامل ہیں ہے۔

منظر جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور ایم و کم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہم قرار بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے — اور اکثر بالکل معمولی تشبیہوں سے — وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح چھٹا جاتا ہے کہ ہر شے کے ذہن میں قائم دیتے ہیں۔ وہ جذباتی طور پر پوری طرح اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے — استاد منگور کی زبان سے اور اوروں کو زبانوں کی کاٹیا میں لگنے ہوئے کھنڈل کھولنے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کوئی قانون ان کے لیے کھولا جاتا ہے یا جو کا منظر کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب استاد منگور کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار برسوں تو ایسا معلوم ہوتا کہ یہ ایک وقت آنے سے پہلے کی بندو باندی کی گویاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں گرداں کی طرح ہو کر آڑ لگیں۔ بندو باندی سے نکلی مرنے والی گروں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ اس کے برعکس موت نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مرنے والی شکل دے دی ہے۔ ایسی تشبیہ جس میں یوں بظاہر کوئی تباہی نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں لیکن منظر کا ہر صفت اور ہر جزو اور چیزوں میں ہر صفت و ہر شے کا تلاطم کے آسے بڑی جوش و خروش سے صرف کرتا ہے اور ایک مکمل اور بظاہر بے حقیقت سی

تنبیہ ایک مکمل مضمون کی حامل ہوا ایک گھر سے تجارت کی عکاس بن جاتی ہے۔ بندو قوں سے نکل کر بریں میں بیوی اور بہت سی سیدی سادی عین اپنے تازہ کے لحاظ سے انہم تنبیہ میں منگو کے ہر انسان میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایسی چند خائیں ملاحظہ کیجئے: ”وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے یوں پھوٹنے والی مٹھیں کا کھلتا ہے۔“ (پہلاں)

”اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے۔“ (شو شو)
خوشیا کے موجد و تیار کر اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کاشا برہنہ اس کے سامنے اگر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ کیا ہرچ ہے، اپنا خوشیا ہی تو ہے۔ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے ٹوپ بھرا کر سے سنائی اور ہر نشان کرتی ہے۔ ان بے شمار دہروں میں سے ایک یہ ہے: ”خوشیا نہ ہوا، سالادہ، بلکہ ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اور ہنگامہ رہتا ہے۔“ (خوشیا)

”بانجھ نہیں ایک منظر کا تصور منظر نے اس طرح پیش کیا ہے: ”کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دھچپ کمانی سننے کے دوران میں کسی نے نور سے یوں کی ہے۔“ (بانجھ)
یہ تنبیہ بھی غیر معمولی نہ سمی لیکن اس تک منظر کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارستانی اسے غیر معمولی بھی بنا رہی ہے اور منظر کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

”کھلی۔۔۔ یوں کیجئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شیش میں شیش کرتا اس کے دل میں اتر گیا۔“ (نور)

”باہر یہ دو گایاں، جریٹھ نے بائیں ہانک کی پیک کے ماتھ اپنے منہ سے اگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس نہرلی پٹروں کی طرح صہبنا ناثر مرغا گورتی تھیں۔“ (نور)
”دو گایاں، جیسے اس نے اپنی گت سے داد کر سی میں سے دو کھل نکالی کر پیٹیک دیے ہیں۔“ (نور)

”دو گایاں۔۔۔ اس کے ذہن میں آئی کہ اپنے بیٹے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی جیلے گئے ہی نہ تھے، باہر نکالے۔“ (نور)

ایک گالی یا دو گایاں — میرے اور آپ کے بے دوسنی سنائی بے حقیقت باتیں ہیں جنہیں آدمی صبح سے

شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلتے سنتا تھا۔ لیکن کیشورال کے دلہران گایوں نے جو اڑ کیا ہے اس کی شدت اور غریب کو مشران گنت تشبیہوں کے اندر پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہیں۔ اور ہر ایک چاندنی تشبیہوں میں کوئی نیا پس نہیں، لیکن اس فرسودہ تشبیہوں سے مشنر نے بار بار جو کام لیا ہے اس سے عورت میں خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ سطحیت میں گرائی آتی ہے۔ مشنر نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع فطر کی تصویر کھینچنے اور نقصان قائم کرنے کی جو خدمت کی اس کی چند دوسری تصویریں دیکھیں پہلی دوسری دھواں کی ہیں:

”موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو رڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔“

(دھواں)

”ایک بمبوڑا اور ایک بمبوڑی پاس پاس پر پھیلے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم بچت کی جوتی بندھا کی طرح گرم ہیں۔“ (دھواں)

”وہ کچھ اس طرح مٹھی جیسے کسی نے بندی سے ریشمی پڑے کا ٹھکان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔“ (حصری کی ڈلی)

دو ایک منہ سے وار تشبیہیں اور دیکھیں اور اندازہ لگائیے کہ مشنر چیزوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے نکال کر منظر پر آتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے:

”یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پلو کے پریش کی تہ ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاشرائی پنی رہا ہے۔“ (سجدہ)

”آپنے آپ کو چھپانے کی جھوٹی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیف بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو۔“ (سجدہ)

”وہ کہ کسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے غلطی کا پٹا ہوا امرہ بسا دے بہت دور پڑا ہے۔“ (سجدہ)

”اس کی شلوات اب ٹوم کٹی گھری بن کر رہ گئی تھی۔“ (سجدہ)

”نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے قدمقابل کی طرف غم ٹھونک کر ٹھنکتا ہے۔“ (نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے گا۔ ایک ایسی تصویر بنائے ہیں

مدد دیتی ہیں جس کا ہر رنگ تبکھا اور ہر نقش واضح ہے۔ منظر کی آتشیںوں کا یہاں تیار ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی طرح اور پتھری سے خالی نہیں۔ ہر تشبیہ کے نیچے ایک کھلی اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منظر کی فنی چابک دستی اس طرح بر عمل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصور پر اپنا اثر قبول کرتا ہے اور وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اُسٹار کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔ منظر کا اسلوب انما جس میں اضافہ، تفرق اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے۔ مکمل تاثر کی تکلیف کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم موقع ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی نہ ہوتی ہو۔ اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص جز کو بھی دخل ہے۔ اور وہ ہے ٹکراؤ۔

ٹکراؤ منظر کی اسلوب انما کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے شاعر فراہم نظم میں برتا گیا ہے۔ لیکن افسانہ نگار اسی میں ٹکراؤ نگار کو ایک فنی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس فنی صنعت سے کھنڈ داؤں نے عموماً منطوقی ترقی اور تاثر انگیزی کا کام لیا ہے۔ گو کبھی کبھی یہ تاثر محض منطوقی حتم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے انما کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ منظر میں منظر نویس کے اثر سے فطرت اور فطرت کی نگار خاص مام ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی شاہیں ملتی ہیں لیکن کسی افسانہ نگار نے انما کے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا جیسے منظر نے منظر کے مشہور افسانوں میں خوشیا، لغزہ، بلاؤں، جنگ، خیا قافون اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں آؤ کاٹھا اور قبض اس فن کے بڑے کامیاب منظر ہیں۔

دو تین افسانوں پر منظر ڈال کر دیکھیے کہ اس ٹکراؤ سے منظر نے کیا کیا کام لیے ہیں۔

’ لغزہ میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتوں منزل والے بالا خانے سے نیچے آجاتا افسانہ نگار کے فطرتوں میں :

’ آسے یوں محسوس ہوتا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کانہ صوں پر دھری

گئی ہیں ۔‘

اس لیے کہ وہ جیسے کاکڑیاں ادا کرنے کی مناسبت سیٹھ نے اسے دو گلیاں دی تھیں اور دو گلیاں اس کے لیے دھریں سماں جاری تھیں۔ ان گلیوں سے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے انما کا بہترین ذریعہ منظر نے ٹکراؤ کو بنایا ہے۔ یہ گلیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے دہر پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منظر کی ذرا بانی نیچے:

..... مالک مکان نے خفتے میں آکر اسے گالی دی — گالی دیوں کیجیے کہ

کانوں کے داسے چٹکھ جڑا سیسہ شاہیں شامیں کرتا اس کے دل میں آتا گیا اور اس کے

سینے کے اندر جھڑکی گیا اس کا کچھ ٹھکا تا ہی نہ تھا.....

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی مذتک نکل چکا تھا، سیٹھ کے بھرپور پڑے

چہرے پر تے کو دے گروہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو باہر پڑا تھا۔

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی، اتنی ہی مرنی جتنی اس کی چربی جبری گدون تھی — اور اسے یوں دکھا کر کسی نے اُپر سے اس پر کوئی کرکٹ پھینک دیا ہے.....

ایک نہیں دو گالیاں — بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی جگہ کے ہانڈ اپنے منہ سے اُگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس زہریلی جھڑوں کی طرح غصہ بھرا شرواع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چارے بن جاتا تھا۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکڑ جھڑی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر گھل دیا گیا ہے چاؤں ”کیا اور پرے بٹ گیا، اور وہ کہا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے..... گالی..... گالی..... گالی“ اسی طرح اس سے اُلجھ کر وہ گئی جیسے جھڑ پیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ اس کی شمع زخمی جوتی جا رہی تھی۔

سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ زہر والا — دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو — پر مٹی کا پتلا کیسے بھرا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلنے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلے ہوں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹو نے اپنے ماتھے کی نیلیاں دوش کیوں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پھیل کر اس کی آنکھوں میں دھنسن گئی ہیں۔

گالیاں — گالیاں — کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جگر میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی جیلے گتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دسے مارے۔

اس کا دماغ آگ کا ایک پتھر سا بن گیا۔ اس پتھر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک بار کی صورت میں گندہ گئے — دو جیلے کا کرایہ، اس کا پتھر کی بٹونگ میں دھرا

نے کر جانا — سات خنزروں کے ایک سربادہ لہنے، سیٹھ کی بھتیجی آواز اس کے سر پر مسکتا آجڑا بھلی کا میچ اور یہ موٹی گالی پھر دوسری اور اس کی خاموشی یہاں پہنچ کر ناگ کے اس پکڑ میں موجود گویاں ہی نکلتا شروع ہو جاتی ہیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ پھٹنی ہو گیا۔

لہرہ میں گالیوں والے واقعہ کی ٹکرا سے غشو نے آہستہ آہستہ کیٹھن لال کے ذہنی اور جذباتی بھان کو راسخ کرنے میں مدد لی ہے اور اس ٹکرا اور ڈرتے ہوئے بھان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جملہ پیدا کیا ہے جس میں کیٹھن لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ لہرہ بن گیا جس سے کیٹھن لال کے دل کو مزید تسکین مل گئی لیکن سفید دلوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ ٹیگلا ہے — منظر اپنے فنی میں انسانہ کی تنبیہ اس کی اٹھان اس کے نقطہ عروج اور اس کے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور اٹھان سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ لہرہ میں گالیوں کے ذکر کی ٹکرا سے پورا ہوتا ہے۔ ٹکرا ہی نے اس انسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے، ٹکرا ہی نے انسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طوط نے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے اور ٹکرا ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو تباری کے نقطہ نظر سے اس کا مقصد ہے

’بلادہ شباب کی نازک اور بھان گزار منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس غمی بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے خود بھی کبھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لہری میں پرو کر تصورات کی ٹکرا کی قربانی سنا ہے۔ اس کی ابتداء لوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن کو:

”تھیکہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا..... یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سسنی سی اس کے سامنے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی برقع میں بن جائیں۔“

مومن کے دل میں اس کے بعد وضدے خیال پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹریک کھول کر اپنے حید کے لیے بنے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو.....

”توئی لڑکی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا چہنڈنا آگیا اور چہنڈنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے تھیکہ کی بغل میں دیکھا تھا۔“

اور پھر کمر و صاف کرنے پر ہے اس نے ساشی کی تکمیل کتریں اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی انگلیک جڑ کر ان کے دھانگے انگ کرنے شروع کر دیے.....

”جی! کو دھانگے کے چھوٹے بڑے کڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا، اس کو ہاتھ میں لے کر وہ ہاتھ مارا، مستار رہا — لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغلی تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔“

اس کے بعد وہ جب بھی اندھا کر بلاؤ کو دیکھتا تو.....

”آس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ اور بالآخر ایک رات کو:

”جب وہ سہرا تو اس نے کئی اوٹ چٹانگ خوب دیکھے — ڈیڑھی صاحب نے پتھر کے کونوں کا ایک بڑا ڈھیر اس سے کٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوٹھا اٹھایا اور اس پر بیٹھوڑ سے کی جنب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی کھانڈ کے مین مین تار غصے ہی کا گولہ بنا ہوا تھا — پھر ہ گولے کالے رنگ کے خبار سے ہی کہہ رہا میں اُنٹے شروع ہوئے — بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آدھی آگئی اور موس کی دہنی ٹوپی کا پچھڑا کیں غائب ہو گیا۔ پچھڑے کی تلاش میں نکلا اور کبھی اور ان دیکھی ٹنگوں پر گھومتا رہا — ایک کالی ساشی کے بلاؤ پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ بھرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہر ٹرا کے اٹھ بیٹھا۔ غصوڑی در رنگ وہ کچھ نہ کچھ سا کر گیا ہو گیا ہے.....“

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقا، اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منتھونے ایک خاص تصور کی تکرار کو فنی کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشش کے جو مراحل طے کیے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے، لیکن منتھو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ فنی کار کی حیثیت سے منتھونے اپنے لیے یہ اختیار مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص عمل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس عمل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔ ”غور اور بلاؤ کی مثالوں سے منتھو کے فنی میں تکرار کی اس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نیا اسلوب ہے، جنک، خوشیا، آؤ کو پٹھا اور تبس جیسے افسانوں میں بھی آج اگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔“

منٹو نے نگرار کی طرح تضاد کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے انسانوں میں بڑاتا ہے — ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں تضادوں کا جو حسرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور کشمکش کی نظر سے دیکھا اور اپنے انسانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ کے مختلف طبقوں میں اور پختہ پنج اور معاشرتی اور معاشرتی کشمکش زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور متضاد، ایک ہی فرد کے ظاہر اور باطن میں بیرونی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔ منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسرت کی برابری کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوب و اس سے جس میں مفاد، فقرے اور انسان کے مختلف اجزاء مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں، ملبہ نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے انسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے : پہلا اقباس نعرہ کا ہے جس میں کیشتوالال کے جذبات کی ستوری میں تصورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اور پختہ پنج کا پیدا کیا ہوا ہے :

”میں کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرا یا ہوا ملک مکان کے گئے سرے کے اوپر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے پوندے ٹکے پکڑے ان کھوٹوں پر ٹک کر پھر اس کے بدن سے چٹ گئے، ہر دوڑ میں گڑھی چمک رہی تھیں۔“

اسی طبقاتی تضاد کی ایک شکل بلوڑ میں اس طرح دکھائی دیتی ہے :

”..... لوگوں کے متعلق کون کون کرنا ہے ؟ بیچیں سے کر پڑھ لے تاکہ وہ تمام عزیز ہیں پیدل ملے کر جانتے ہیں اور اس باس کے آدمیوں کو شرمناک نہیں ہوتی۔“

دو کردار ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے جذبات اور تصورات کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں۔

اس کا اظہار جتنک میں کئی جگہ ماحول اور سونگندھی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے۔ ان کی کئی تصویریں میں سے ایک یہ ہے :

”ایک ہاتھ سے سونگندھی نے چمڑی دسے کی تصویر بنائی اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں ماحول کا فوٹو لڑا تھا۔ ماحول پر مٹی جگہ سمٹ گیا، جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکٹر میں فریم کیل سمیت سونگندھی کے ہاتھ میں تھا۔ فوٹو کا فوٹو لگا کر اس نے اونٹنی کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کا پختہ ٹوٹنے کی آواز آئی تو ماحول کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی شکل سے

اس نے ہنس کر اتانکا اچھا کیا — مجھے بھی یہ نوٹ پسند نہیں تھا۔

آخری جہلیں ادا ہونے پر کہہ لیا ہے وہ اس کے دل کی بات تھیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک سو فرسید بھڑک کی شکل اختیار کی ہے — اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھیے :
 ماسوٹر گیا وہ مری ہوئی لڑکی اٹھانے کے لیے جھکا تو سرگندھی کی گرچ سنائی دی۔
 ”خوداد — پڑھی رہے دے دیں — تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کوئی آؤں
 کہوں گا۔“

سورگندھی کے اس تلخ فز بھرے جہلیں میں کئی تضاد ایک جگہ اکرج ہو گئے ہیں — ایک تضاد تو وہ ہے جو سرگندھی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس سطر میں پوشیدہ ہے جس میں سورگندھی کا ایک ایک غلط قدم بجا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کا اس مجموعہ سے ظاہر ہے جو گزرتے ہوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تضاد بن کر رہنا ہوا ہے۔

’جنگ‘ کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فنی کارآمد تصویر ہے :

’تست در تک وہ بید کی کرکھی پر پٹی رہی۔ سرچ پچا کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل
 پر جانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے غارش زدہ کتے کو گریں اٹھایا اور ساگ ان
 کے پڑے چنگ پر اسے ہل میں ٹھاکر سونپی۔‘

سماثرقی جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہ تضاد ہمیشہ دوسری عقلی اور معنوی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ان کے فنی کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب تک جو بحث کی شایاں پیش کی گئیں، ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ بچکتے دکھائی دیتے ہیں — مثلاً نعرہ کے بارے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کی زندگی کے اندر کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو تضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں ہے اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسل میں منٹو کی کئی سوئی وہ بات اب بھی برے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے اسٹر شاد تک ہر انسان نے محبت کی ہے۔

منٹو کے فنی کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فنی کے ان مطالبات سے ہے جنہیں ہم تکنیک کے عبارات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان مسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال، اس کے تاثرات و تصورات و دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کہہ سکتا ہے وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص عمل کی ضرورت کے مطابق ان میں سے ہزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فنی کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگاران مطالبات سے کام لیا ہی کے ساتھ محدود ہوا ہوئے ہیں۔

فرق صرت یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد انداز فکر کی بنا پر جزئیات نگاہی کلاویک یا انداز قائم کیا ہے چنانچہ اس خاص نقطہ نظر سے منظر کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا جلتا۔ منظر نے جسے کسی واقعہ یا آئزات و نقوش کی وضاحت کے لیے کسی جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے جنہیں دوسرے مولانا غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ منظر میں طرح بیان و اظہار خیال کے مسائل میں اور اپنے تصورات کی وضاحت کے لیے تصویروں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کراہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گرائی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے مسائل میں بھی انھوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلو کو اہم پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واقعہ کی ہر بارہ کی انھیں معمولی رنگوں سے شرح اور شگینا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں دیکھیے :

”اداروں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے مارکی میں درختوں کی کڑکان پر کدو سیر دی کی مٹی پی کر ایک بڑی ڈکارتی اور موچکوں کو مندر میں دبا کر ان کو بڑے سوتے سوتے ایسے ہی بلند آواز میں کہا بہت تیزی ایسی کی تھی۔“

یہ استاد منگولوں نے کیا قانون ہیں۔۔۔ اسی افسانے میں انہی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں :

”چھانڈ لہجہ کو منگول نے سواری کی اس کی منترال مقصود پر تار دیا اور جیب سے سرکٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر ٹسٹا یا اور انگلی نشست کے گڑھے پر بیٹھ گیا۔“

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ڈھرایا اور کچلی نشست پر بیٹھ بیٹھے گڑھے سے پوچھا : صاحب بہادر ! کہاں جانا مانگتا ہے ؟

اس سوال میں بلا کا طنز یہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اور کلا موچکوں پہلا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو دم سے لکیر ناک کے نچنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک پہنچ جاتی تھی، ایک لڑکے کے ساتھ گہری ہو گئی۔

انہی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے میں استاد و منگول کو اپنی طرح پہچانتے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذبہ ہونے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ انہیں گوبال کے پتاجی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے :

”اس کو اپنے پتاجی کی دھڑانٹ اپنی طرح یاد تھی۔۔۔۔۔ اس کے پتاجی لالہ پر شرم داس تھا لے دار لنگوٹ باندھے لی کی دھار کے نیچے اپنی گہنی چھوڑ کے اور بیٹی کو نہ بڑھائے موچکوں میں سے اہم کارس نہیں رہے تھے۔“

”پہچان میں کچھ شبہ زندہ داروں نے مجھ کمروں کا جائزہ دیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے :
 مگرنے میں ایک بہت بڑا پنک تھا جس کے پائے رنگیں تھے۔ اس پر سیلی سی چادر بھی ہوتی
 تھی، دیکھ کر ہی چڑھا تھا جس پر شروع رنگ کے پھول لڑھے ہوئے تھے۔ پنک کے ساتھ والی
 دیوار کی کادرس پر سیل کی ایک سیلی بوگل اور ٹکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دواتوں میں ہر کا
 میل اور کئی بال بچنے ہوئے تھے۔ پنک کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنبک تھا جس پر
 ایک کالی گرگولی رکھی تھی۔“

”پڑے اس کے خستہ حالت میں تھے، لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے کٹڑی
 خستے کثرت استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوٹے نقل آئے تھے۔ کار کھلا
 تھا اور تیس میں ایک اور ڈھلائی کی لاد تھی۔“ (باغیچہ)

”بادرچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لودھلا تھا اور دھکوں سے
 چھت میں ایک گونج سی دڑ باتی تو مومن کے ننگے پیروں کو رزش بہت بھلی معلوم ہوتی“
 (بلالدر)

”وہ ساگان کے لیے اور چوڑے پنک پر اووند سے منٹو تھی۔ اس کی بائیں ہونڈھوں
 تک ننگی نہیں، پنک کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اس میں بھیگ جانے کے
 باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جاتے۔ دائیں بازو کی نٹل میں خشکی آلود گوشت ابھرا
 بڑا تھا، جو بار بار منٹو نے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے پٹی ہوئی مٹی
 کی کمال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔“ (شک)

یہ منٹو کی جزئیات نگاہی کی صورت چند مثالیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقعہ کی
 مصوری کرنے، کسی اصول یا فنکارانہ معیاری تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں
 بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ منٹو نے کار تھا اور فی کار کے نزدیک کوئی بات
 اور کوئی چیز معمولی اور حیرت نہیں ہوتی۔ — دوسروں کو معمولی اور حیرت نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل
 بن سکتی ہیں، بشرطیکہ فی کار انھیں صحیح انداز سے ادھر رکھ کر رہے ہو۔ اور یہ قدرت منٹو میں بدیعاً قائم موجود ہے۔ چھوٹی سے
 چھوٹی جزئیات انھیں عزیز بھی ہیں اصل ان کی نفوس میں محترم بھی جزئیات کی قدر ہے انھیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے

منظر کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منظر کے فن کے مختلف پہلوؤں میں انسانی ساخت، تشکیل اور اس کے خواہ کے علاوہ اسلوب نگارش کی ساری خصوصیتیں شامل ہیں یعنی تشبیہیں، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقرات کی شکل اور ان کے استعمال میں تضاد و کائنات کی شخصیت مزاج اور اندازِ فکر سے متاثر ہونے میں منظر کے سمجھنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور ان کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا اور سمجھتا ہے، اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے حرات کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں اس کے شدت پسند مزاج اور گونا گونا گونی شخصیت کا بڑا دخل ہے۔

منظر کی نظر میں گہرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق — معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے اس کی باریک بین اور کثرتِ نظر ہر ایک کے حسی و فنی، اچھائی بُرائی اور صیب و سحر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی اس طرح صیب و سحر پروری طرح اساطیر کی پٹنے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں انہی سے انسانی زندگی کی مذہب میں جھکا ہے اور کسی سے انسانی زندگی اس سکون و سترت سے عروم پر مبنی ہے جو قدرت کا مقصد ہے۔ منظر انسانی زندگی کو اس کے سب اجتماعی اداروں یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں قدرت کے بتائے ہوئے راستے اور اس کے بنائے قوانین کے مطابق پروری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت نا انصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ نا انصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون نا انصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے منظر نے اس نا انصافی کو کھلنے، اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طمس توڑنے کو اپنے فن کا مقصد بنایا ہے۔

زندگی کے اس ہستہ و حستہ اور عید و کام کا طرِ اٹھانا بے خود ایک نم ہے، لیکن اس سے سخت توہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے منظر کی مخصوص نظر نے انہیں جو کچھ دکھایا اور اس شہدے کے بعد ان کے احساس دہنے انہیں جس کام کی طرف مائل کیا، اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ہر نا انصافی کرنے والا، سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں ایسا وہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے مزاج سے فریب اور طمس کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے کھانڈنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس اہم کام کا شراکت دار ہونے کو اٹھانڈا، اتنا بے خوف اور بڑی سزا چاہیے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہے۔ منظر کو قدرت کی طرف سے جو بے خوفی و حرات اور مددگار عطا ہوئی تھی، اس کے احساس میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر راہ کو دیر ہی سے روک کے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منظر کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اچھا بھی اور بُرا بھی، اچھا اس طرح کہ زندگی کی خواہیوں کا تجزیہ کر کے، انہیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کر کہ چٹکھانے والا ملکہ کر رہ جائے۔

انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور ہر اس طرح کی حیات انسانی کے بعض ستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی زردیہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ناموروں کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اور کبھی کبھی حقیقت یعنی اور حقیقت نگار ہی سے دنیا والوں کو صرف حریفانی سکھائی ہے۔ یوں اس بُرے پہلو کا ایک اچھا پہلو بھی ہے اور اس کی کبھی تاثری ہی کہہ کر کی جاسکتی ہے کہ یہ سب خیر کا مزاج تھا، اس کی شخصیت تھی اور مشن فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی لگتا، سمجھتا ہے۔ اس لئے اپنے فتن میں اپنے آپ کو بُری طرح بے نقاب کیا ہے۔

مشن فریب کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں جنہوں نے ان کی شخصیت اور فتن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کیے ہیں۔ سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور فتنی حالات سے متاثر ہوتی رہیں، غلطی اپنی زبردست قوتِ ارادی سے ہر طرح کے انتشار، کشمکش اور کاروں میں پیدا کر دینے والے حالات کا مقابلہ بڑی دہری اور ہنری سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر مشن نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لیے نفع کی راہ نکالی اور اپنے فتن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان، انتشار اور کشمکشوں کی فکر اور پیسے سے اس کے پردوں کو ڈال گاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار اور سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض غزلوں میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لی ہے پر کامیاب پایا ہے شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آپ زندگی کو پرنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور جانبی ماحولِ بیرونی زندگی کے اس تصادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آئی ہے اور مشن کی شخصیت کی عظمت اور بھی نمایاں ہوئی ہے۔ لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ ہی ہے۔ مشن کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیات فتن کے ہر دور میں کسی نہ کسی طرح جاری رہی ہے لیکن اس کے فتن کا آخری دور اس تصادم اور کشمکش کا سخت ترین دور ہے۔ یہی دور ہے کہ مشن نے اس دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے قوتِ اثر کی جھلک نمایاں ہے کبھی ایسا ہوا ہے کہ مشن نے نہ توں کچھ نہیں لکھا کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح قوت اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک مسلسل میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً مشن کے مجموعے ٹھنڈا گوشت کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت کے) ۱۲ اور ۱۳ جولائی سنہ ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھے گئے، بادشاہت کا خاتمہ (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جولائی سنہ ۱۹۳۷ء اور ۱۴ جولائی سنہ ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح زید (مجموعہ) کے سب افسانے ۴ اکتوبر اور ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھے گئے۔ مشن کے آخری دور کے بعض اور مجموعے جو زیرِ ترتیب اور زیرِ اشاعت ہیں۔ مشن کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر فنی حیثیت سے

منٹو کے کردار ہے کہ افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن، مخطوطہ کی منزلوں سے محروم رہا ہے اس لئے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنس ہم تحریری حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہتے ناجائز منٹو کی ذہانت، ان کی جدت پسندی، ان کی خوش طبعی، ان کی گہری فکر اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گرہ نظر آتی ہے۔ منٹو کی قاعدہ نگاری اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی خصوصیت کہ وہ کہانی لکنا جانتے ہیں۔ اس بار میں بھی اسی جاذب اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے کردار کے افسانے — بہت اچھے اور نئے سب افسانے — دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔ منٹو کو قدرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اُس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو رہنے کی پوری قوت تھی اور جب اُس نے مجھ اور بے بس ہو کر مرنے سے چندویں پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پاسے فطری محاسن کے ساتھ موجود تھی۔ منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کہی گئی کہ بایں مسلم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ ان کے فطری سلطان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں رنگاڑنے اس میں ان لڑکی باتوں سے پوری طرح تازہ و آفتاب نے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے۔ ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسے سادی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا ٹرا موزوں اور پس پس موضوع ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے اور بظاہر معمولی مسلم ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا چاہتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یکا رنگت اور بے تکلفی کا روشنی قائم ہو جائے۔ پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہم راہ سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا، وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔ کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو غالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح لکنا کہ وہ بے حد اہم ہے، کہانی کہنے والے کی بڑی حیثیت ہے۔ منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ حیثیت حاصل کر لیں اور تقاضا وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح بایں کہنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا کہ دوسرے اس کے جھوٹ کو، اس کے پُر فریب خیال کو، اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب قصہ گو کی جھڑک قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کس طرح کہانی بن سکتی ہے۔ اس کی مثال منٹو کا افسانہ پھر ہے وہاں ہے کہ کہانی میں کس طرح باتوں کا فرا پیدا کر کے اپنے اور پڑھنے والے احساسات میں مکمل مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے اس کا اندازہ چند مس ٹیمن والا، میراث نام راد صاحب، ٹوٹو، ٹنگی آواز میں، حلو کا بیچ، رحمت خداوندی کے ٹیٹولی، خورد شش، باسط ٹیٹولی کا کتا، چور، ٹنگی اور دلو صاحب جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کس طرح عجیب و غریب اور ناقابلِ اطمینان خیال افسانوں میں جگر پا کر اور منٹو کی چابک دستی کے حلقہ گرفت میں کر لے دینے والوں کا دل مرہہ کہتے ہیں یہ بہرہ، صاحب کرامات، باجشا کا خاتمہ، کتے کی دعا اور عورت کے لیے، جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ منٹو اپنے تقریباً احوال میں سے اتنی

آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا، یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی — لیکن یہ سب کچھ لیے تھا کہ منٹو کہانی کہنا جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی فنی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دورِ انحطاط میں بھی وہ کہانی کہنا بخوبی جانتا تھا۔ اسی لیے اس انحطاط کے زمانہ میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں ہیں جن کی منٹو کی زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی۔ لیکن منٹو میں اگر اسکاٹل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی، پڑھنے والوں میں کبھی بھی ایک جنگامہ اور گراں گاہی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگرچہ نکل دینے والی باتیں کہنے اور رکھنے پر اصرار نہ کرتا، وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں بچھے ہوئے تیروں کی طرح برتنے اور دوسروں کو کچھ کے دے کر اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجزیہ کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ و بازار میں رسوا کرنے سے احتراز کر سکتا تو منٹو یقیناً اس سے بھی بڑا فن کار ہوتا جیسا کہ وہ اب تھا — اس لیے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال نہیں کہ وہ اسی چند کمزوریوں کے باوجود بہت بڑا فن کار تھا۔ اس کے مشاہدہ و تخیل، قصور و فکر اور حساس میں اس کی شخصیت کا بڑا گہرا رنگ ہے اور شخصیت میں بڑی معمولی قوت و توانائی — وہی قوت و توانائی اس کے پرے فن پر چھائی ہوئی ہے اور اسے والے پرورد میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپردِ فن کی حفاظت کرے گی اور اسے ذرہ نہ رکھے گی — منٹو مر گیا — لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

وقار عظیم

منٹو کا مقام

جس دن منٹو مرا تھا اُس دن بھی میں نے یہی کہا تھا کہ منٹو جیسے آدمی کی زندگی یا موت کے بارے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، ہمیں تو اُس کی زندگی اور موت دونوں کے عمومی متعین کرنے چاہئیں۔ غلط تو ان لوگوں میں تھا جو موت ایک فرد یا ایک ادیب سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ بھراب تو بڑا ہستی کی گمانش یوں بھی نہیں رہی کہ منٹو کو مرے دو مہینے سے زیادہ ہر گز اور ہمارے لیے یہ سوال زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ اُردو ادب میں یا کم سے کم پچھلے بیس سال کے اُردو ادب میں غلطی جگہ کیا ہے، بعض لوگوں کے خیال میں غلطی وہو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ غلطی ہے مرہاساں وغیرہ کی صفتوں نہ اس کے بلکہ ادیب کے اچھے خاصے افسانہ نگاروں سے اُس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں سے متعلق ہوں، بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر غلطی مرہاساں کے بہترین نسخہ مسکا تو اس میں اتنا تصور خود غلطی کا نہ تھا جتنا اُس اپنی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ بات میں غلطی مرہاساں سے کچھ زیادہ جاتا ہے، وہ مرہاساں کی شریعہ۔ اور مرہاساں کو جس قسم کی نثر کا حقیقی وہ فرض میں اور بکونیں تو دوسو سال سے نشوونما پاری تھی۔ مرہاساں کے پیچھے روشن ہو کھتا، تاثیر تھا، استال وال تھا، غلطی تھا، غلطی کے پیچھے کوئی تھا؟ میری بات کا وہ مطلب نہ بھیجے ہمارے دو کے اُردو کے لیے بھیجیں گے میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو شریعہ کا کلی فصول ہے۔ اس میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن منٹو کو جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اُردو شریعہ کی روایت میں موجود نہیں، غلطی کو پانی پینے کے لیے اپنے آپ کنواں کھودنا پڑا، جو شروع اور بہت دوروں میں غلطی کی حیثیت، ایک پیش رو کی ہے۔ اس لیے غلطی کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس سے پہلے اُردو میں کیا تھا، اُس کے بعد ہم مصر کیا کر رہے تھے، غلطی کا اسکا اور کیا نہیں کر سکا، یہ باتیں دیکھ کر غیر ہم غلطی کو اچھا یا برا تو کہہ لیں گے، مگر اُردو ادب میں غلطی کی حیثیت ہماری بکھری نہ تھی۔

منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا جیسا لگا سمی، اور سڑی سے جو پانی نکلا وہ گدایا کھاری سمی مگر وہ باتیں دہی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ایک تو یہ غلطی نے کنواں کھودا ضرور، دوسرے یہ کہ اُس میں سے پانی نکالا۔ اب ذرا گھنے تو سمی کہ اُردو کے کتنے ادیبوں کے متعلق یہ دونوں باتیں کہی ہیں۔

میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہی بہت سے خوش ذاتی حضرات کو غلطی ان دونوں چیزوں سے انکار رہا ہے۔ اس کے برخلاف ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اقبال کی وفات سے لے کر آج تک کسی اُردو ادیب کا ماتم اس طرح نہیں ہوا جس طرح منٹو کا، تو کوئی چیز تو تھی جس نے لوگوں کو اتنا سوگمنا نے پر مجبور کیا خیر

بعض لوگ اتنی مشوریت کو بھی منٹو کی سچی کائنات سے تو قطعی ثبوت سمجھیں گے، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ ادیب کو ہر آدمی کے لیے نہیں لکھنا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو بیس سال سے منٹو پر اس اعتراض پر رہا ہے کہ منٹو تو بس ایسی باتیں کرتا ہے جس سے لوگ چونک پڑیں۔ شاید یہ کوئی شرط لگانا یا بغیر ادیانہ بات ہو، لیکن میں نے جو قصہ بہت ادب پڑھا ہے اس سے تو میں پریشان ہوں کہ لوگوں کو چونکا نا ادب کا ایک مقدس فریضہ رہا ہے۔ بلکہ میل دل نے تو ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو چونکا لے سے اُڑتے ہیں۔ منٹو کو چھپوڑتے۔ بروڈیسر جیسے عظیم شاعر کو کیا کہیے کہ اس کا ایک ادبی اصول یہ تھا کہ متوسط طبقے کو چونکایا جائے؟ اگر چونکا نا کوئی بہت بُرا اور ادبی نقص ہے تو چونکنے سے ڈرنا ایک فزنی بیماری ہے، اگر وہ شخصیت کی نشانی ہے جو آدمی و دوسروں کو چونکا نا چاہا ہے اس میں پہلے خود چوٹ کھانے کی صلاحیت ہونی چاہیے جس شخص کے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعضاء زندہ نہ ہوں وہ کسی کو کیا چونکا لے گا، ننگی کیا خانہ لے گیا پھڑ سے گی۔ اگر کوئی ادیب اپنے پڑھنے والوں کو چونکا نا ہے تو یہ کوئی شکایت کی بات نہیں۔ ورنہ پھر تو بڑھتی کی شکایت کیجیے کہ اس نے کس کیوں بتائی۔ ایسا ادب تو محض اپنا فریضہ ادا کرتا ہے۔ ہاں ادیب سے آپ یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے ہیں چونکا لے کے بعد دکھایا کیا۔ اگر میں جھنجھوڑ کر جگانے کے بعد منٹو نے ہیں انسانی فطرت اور انسانی معاشرے کا کوئی تماشا نہیں دکھایا۔ اگر اس نے ہمارے غدر زندگی کا کوئی نیا شعور پیدا نہیں کیا تو پھر ہم اسے گالیاں دینے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس نے ہیں جہیں سے سونے بھی نہیں دیا۔ جو لوگ کسی قیمت پر جاگنا ہی نہیں چاہتے، انہیں تو ان کے حال پر چھوڑ دے، لیکن کیا آپ نیا قانون، ہنگامہ، باوجود کوئی ناتھ جیسے افسانے پڑھ کر دنیا منت داری کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ منٹو نے ہیں چونکا کر منت میں ہماری خند خواب کرائی؟ اچھا، منٹو نے چونکا یا بھی ہے دو طریقے سے۔ ایک تو اس کے اچھے افسانے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انسانی حقیقت ہمارے لیے کچھ بدل گئی ہے۔ دوسری طرف اس کے بُرے افسانے ہیں۔ منٹو کا وہ منٹو ہی کہنے کے باوجود مجھے تسلیم ہے کہ اس نے بعض بہت ہی خواب افسانے لکھے ہیں، لیکن اس کے بُرے سے بُرے افسانے میں بھی آپ کو دو ایک فقرے ایسے ضرور ملیں گے جو کسی نہ کسی آدمی یا چیز یا خیال یا احساس کو زندہ کر کے دکھ دیں گے۔ ہمارے یہ روشنی ایسی ہو جو آپ کو پسند نہ آئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں بھی آورد زیادہ ہے، یہ بھی منٹو کا منٹو ہی تھا۔ مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ آمد اور آورد کا فرق ادب میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کوئی چیز آمد ہو یا آورد، فیصلہ کی بات تو یہ ہے کہ اس سے نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ اگر آورد کے نتیجے میں تجھے کو اعتماد ملی گیا تو وہ آمد سے بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کون سے مردوش بھی دو طرح گنتی جاتی ہے، کبھی تو مردوش اپنے آپ بول پڑتا ہے، کبھی اس کے کان مردوشنے پڑتے ہیں، مردوش کی قیامت سے تو ہر آدمی ہی ادیب بن سکتا ہے، لیکن مردوش کو زبردستی بولانے کے لیے بہت دھکار ہے کیونکہ مردوش کے کان مردوشنے کا مطلب ہے اپنے کان مردوشنا۔ آپ یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بعض دفعہ منٹو نے مردوش کے کان اس طرح مردوش سے کوہ بولنے کے بجائے چیخ پڑا یا اول قول کہنے لگا۔ لیکن منٹو نے حوصلہ تو دکھایا۔ یہ کہڑی نا تو آسان ہے کہ منٹو کو ابی کیا تھا، دو بے بوڑ باتوں کو جوڑ دیتا تھا، مگر یہ کبھنا شکل ہے کہ اس ان کی بے جڑ میں آدمی

علیہ بگڑ جاتا ہے۔

بڑا قیاس اور کوئی نہ کوئی بڑوئے کار۔

منٹو کے اندر اس شدید سے بازی کی تیر میں جو چیز کام کر رہی تھی وہ یہ کہ منٹو اپنے چھوٹے چھوٹے احساس یا جذبے کو رد کرنے کا ناکامی نہ تھا۔ ہر چیز اُس کے اندر کوئی نہ کوئی رد فعل پیدا کرتی تھی، اور وہ اس رد فعل کو قبول کر لیتا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے اور وقتی تجربات کو ایک دوسرے سے متعلق اور منضبط کرتے رہنے کی عادت اُس میں نہ تھی۔ سو وقتی رد فعل کو وہ اتنا دلچسپ یا وقتی سمجھتا تھا کہ اس پر انصاف اور انصاف کو قربان کر دیتا تھا۔ اسی لیے اس کے افسانے کبھی خوبست اچھے ہوتے تھے، کبھی بہت بُرے۔ اور کبھی افسانے میں ایک سو دو فقرہ ہی کام کا نکلتا تھا۔ منٹو میں یہ بہت بڑا نقص تھا۔ لیکن اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کا حال یہ رہا ہے کہ وہ یہ بات اپنے احساس کو ایک ڈھکے پر لگا دیتے ہیں، اس ڈھکے سے بہت کم کسی اور قسم کے تجربے کی صلاحیت ان میں باقی ہی نہیں رہتی، یا پھر وہ چھوٹے چھوٹے اور منطقی تجربات کو حقیر سمجھ کر رد کرتے چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادیب دو چار اچھے افسانے لکھ کر ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں بس منٹو ایک ایسا آدمی ہے جو کسی جذبے یا احساس سے نہ ڈرتا تھا اور جس کے لیے کوئی احساس حقیر یا غیر دلچسپ نہ تھا۔ بعض حضرات نے منٹو کے کارنامے کو یہ کرکڑاٹانے کی کوشش کی ہے کہ منٹو کے یہاں افسانے کا خام مواد تو ہے، افسانے نہیں ہیں۔ اس کا منطقی تجربہ نکلتا ہے کہ اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کے پاس خام مواد تک نہیں ہے۔ کیونکہ خام مواد تو احساسات اور جذبات ہی فراہم کرتے ہیں۔ جب آدمی اپنے احساس پر پرے بٹھاوے تو تجربہ کار ہے۔ منٹو کی شخصیت کو وہ کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ آزاد وقتی داس منٹو میں کم اُس نے اپنے احساسات پر کسی قسم کی بندشیں نہیں لگائی تھیں۔ جب اُس کے احساسات ایک دوسرے سے آنا دہرنے لگتے تھے تو یہی چیز اُس کے افسانے کے لیے ملک بھی بن جاتی تھی۔ لیکن اُردو میں کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں، جو احساسات کی آڑوں سے اتنا کم ڈرتا ہو۔ احساسات اور ارتعاشات کی عمل میں منٹو کی شخصیت خود پاش پاش ہو گئی، لیکن اپنی زندگی اور موت سے منٹو نے جس اتنا ضرور دکھا دیا کہ فی کار اپنا کام اس طرح حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے مواد جمع کرنے کا کام سرعام اور سب کی نظروں کے سامنے کیا۔ اسی لیے اُردو میں اُس کی حیثیت محض ایک ادیب سے زیادہ ہے۔ اسی لیے اس کی موت اُس کی زندگی کی منسوب کو مکمل کرتی ہے اور اسی لیے اُس کے بڑے افسانوں کو بُرا سمجھنے کے باوجود وہیں منٹو کا اندھا سب سے بڑا افسانہ نگار کہتا ہوں۔

محمد حسن عسکری

گنجِ فرشتہ

غزوہ مرحوم، اچھ سے عمر میں کوئی پانچ سال کے قریب چھوٹا تھا۔ لیکن جب وہ اسیرت سے لاہور آیا تو اس ایم۔ اے۔ کے چکا تھا۔ اور وہ اپنی تعلیم لاہوری چھوڑ کر انجمنوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کا اور میرا ایک مشترک دوست تھا (اور ہے) وہ مجھے دیال سنگھ کالج میں پڑھو چکا تھا۔ اور کبھی کبھی شری کوئی چیز لے کر آیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ غلو کھلے آیا۔ ان دنوں ہی (اور میرے مدت کی بات ہے) انٹو کے انداز میں ایک نخت اور چند کارڈنگ تھا۔ جو غلو داری سے بڑھ کر تھا۔ ان دنوں ہی منٹو کسی نفسیاتی الجھی کا مریض نہ تھا۔ جو پھر غلو کو ہی چیز پریشان کرتی رہی کہ وہ کسی نفسیاتی الجھی کا مریض نہیں تھا۔ اور چونکہ ان دنوں سے اسے واسطہ پڑتا تھا اور پڑتا تھا۔ وہ کم و بیش مختلف نفسیاتی بیماریوں کے شکار تھے۔ بے باک نگاری، غی کوئی، صداقت شعاری، غلو، دیانتداری، ادب میں اسی ادیب کو نصیب ہوں گی جو حقائق کو نفسیاتی تعصبات اور انجمنوں کی پینکس پر کھائے بغیر دیکھ سکے گا۔ ورنہ چیز اور حقیقت کی شکل مسخ ہو جائے گی جیسی چیز مسخ معلوم ہو گی اور مسخ شریں۔ مستطیل مربع معلوم ہو گا۔ اور دائرہ کعب۔ حقائق کے مسخ کرنے کی صلاحیت خود مشاہدہ کرنے والے کی ذات میں مخفی ہوتی ہے اور وہ حقائق کا بیان کرتے وقت ان تمام باتوں سے (سہری تم ہاں سے گزرے) کے انداز میں گزرتا ہے جو اسے تکلیف دیتی ہیں یا جس سے کوئی تلخ یاد وابستہ ہوتی ہے۔ یا جس سے کسی نفسیاتی الجھی کا تعلق ہوتا ہے۔

منٹو حقائق کا تعاشل نہیں تھا۔ اس کا عقائد، فنون، مفہومیں، عقاسی اور مقصدی میں یہی فرق بتایا گیا ہے کہ عقاسی حقائق و اشیاء کا اس طرح دیکھتی ہے۔ جس طرح وہ موجود ہوتی ہیں۔ اور مقصدی اس طرح جس طرح مقصد کے ذہن میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اس طرح مقصد کی تخلیق میں اور اس نمونے یا موضوع میں جو تخلیق کا موجب ہوا ہے۔ بعض اوقات ایسا قیود تو ملے کہ یہاں نہیں پڑتا۔ کیورسٹ آرٹ، تجریدی آرٹ کی مختلف قسمیں۔ اس قسم کے مشاہدے کی مثالیں ہیں، جہاں مقصد اشیاء کی ماہیت اور موضوع کی مصونیت کی جستجو میں اطلاعات و حوزے کام ایسا ہے اور اصل چیز جس کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ بعض ایک محور ہو جاتی ہے، جس کے ارد گرد مقصد کے شعرات و افکار گھوم جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف عقاسی میں کیورسٹ اشیاء یا حقائق کو بعینہ اس طرح دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے، جس طرح وہ موجود ہوتی ہے۔ یعنی موجود فی الخارج۔

میں نے عرض کیا ہے منٹو حقائق کا عقاس تھا۔ وہ نہایت استغنا اور بے پروائی سے اور مکالمی (الٹان خاطرہ) تمام نقطے الفاظ میں آتا رہتا تھا۔ جو اسے گرد و پیش کی دنیا میں نظر آتے تھے۔ یہ نقشے اپنے اصلی خطوط حال اور رنگ روپ میں بہت سے آدمیوں کو دکھ بچاتے تھے۔ ایک گروہ کو دکھاتا جو آگاہ ہی نہ تھا کہ حقیقت کی یہ شکلیں بھی ہیں۔ دوسرا گروہ وہ تھا،

جو آگاہ تو تھا۔ لیکن مشرق کی وضع داری اور تہذیب کے خلاف کسی بات کو دور مختصر افسانہ ہی کہیں نہ ہو، گروہ اور سکھ تھا ایک وہ گروہ تھا جس کے دل کے چور چوڑے جاتے تھے بلکہ انسانوں میں ان کے دل چوری کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے ان کی جھلپا ہٹ بھانپتی وہ اب تک قائم ہے اور غالباً سچی دنیا تک قائم رہے گی۔

یہ مقام کم کوئی شخص کسی انصافاتی پیاری کا شکار نہ ہو بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتا ہے۔ غصے کے بکتر، نفرت اور ہندار کو مرض نہ کہا جاتے۔ یہ فن کار کو اپنی مہارت پر جو ناز تھا اس کا اعلا تھا۔ اور صرف ان عورتوں پر ناز تھا جب فن پر بحث ہوتا تھا۔ حقیقت کی منکاسی میں، فن کار کو ہر خیانت کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اپنے اولیٰ کی اجتماعی تصویر کھینچنے کے لیے اس کو طے کرنا پڑتا ہے کہ زندگی کے یہ پہلو دکھائے جائیں گے اور نہ نہیں۔ غصے نے یہ کام بہت سلیطے سے کیا تھا۔ اس کے افسانوں کے مطالعے سے جاری صحاح و زندگی اور اس کے اسرار کے بہت سے پہلو اسی طرح اجاگر ہوتے ہیں کہ مختلف افسانوں کو مل کر ایک مکمل تصویر بنتی ہے۔ اس تصویر میں جنس کے دو ٹکڑے بھی پورے کئے گئے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جنسی معاملات میں، ہمارے ملک میں ہر لڑکا اور ہر لڑکی کسی وابستہ کتاب سے یا کسی دوا بیات تروست یا سیسی سے جنسی معلومات حاصل کرتا یا کرتی ہے اور یہ معلومات ایسی ناقص اور محدود ہوتی ہیں کہ بہت سی جنسی گمراہیوں اور گتے دکھائیوں کا موجب بنتی ہیں۔ غصہ اس گمراہی اور گمراہی کی عکاسی کرتا ہے اور جنس بھوک کا تذکرہ بھی کرتا ہے، بات ذرا طول پکڑو گی۔ میں کہہ رہا تھا کہ حقیقت کی عکاسی کے لیے ضروری ہے کہ عکاس کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ یعنی ذہنی بیماری میں۔ غصہ اس اعتبار سے اپنے دور کا بڑا صحت مند ادب تھا۔ اس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کو بالکل کر کے پچھے اور پچھان پڑھیں تو ان کے اخلاق پر برتاؤ ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خود منظر کی نیت کا کیا عالم تھا؟

حقیقت کے عکاسوں کو دنیا نے پیشتر بڑا اچھا کہا ہے کہ اس کے بغیر بات نہیں بنتی، انھیں تو وہ نقاش اپنے آئنے میں جو وہ نقش نگارش کے دل کو پہلے معلوم ہوں۔ موضوع تصویر کچھ ہی کہیں نہ ہو۔ وہی مرنی شکل پیدا کریں گا وہی گھنٹوں دیکھا کرے لیکن ادب کو پہلے عکاس کی ضرورت ہے، پھر نقاشی، اصلیت معلوم ہوگی تو وہ تصویر برتناں جلتی، جو غور ہے اور نشانے دلی ہے۔ دنیا باطن اس وقت تک خلعت میں تشکیلی نہیں ہو سکتی۔ جب تک پہلے فن کار کے ضمیر کے اندر پیدا نہ ہوئے دنیا بھی وجود میں آ سکتی ہے کہ ادب میں ہر مرحلے پر عکاس پیدا ہونے نہیں۔ تاں انسان حقیقت سے آگاہ رہے اور انھیں بند کر کے یہ نہ سمجھ لے کہ کب کچھ ٹھیک ہے۔

دنیا نے عکاس میں کوئی معیاری معاشرت اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتی جب تک حقیقت کے عکاس پر غور نہیں ہوتا ہے اور پریشان خاطر ہو کر بھی یہ سکون قلب، جزا کو دیکھ کر ایک اجتماعی تصویر نہ بناتے رہیں کہ نقاشوں کو معلوم ہو سکے کہ اصل صورت کیلے۔ نئی دنیا بنانے کے لیے، نئی اقتدار دریافت کرنے کے لیے، نئی انفرادی حریت کے لیے، اجتماعی اصلاح کے لیے پہلے اس دنیا کی عکاسی کی ضرورت ہے۔ جو ہے۔ ناگاہ وہ جو ہر ناچلیے، اور وہیں آ سکے۔

افسانوں میں فن کار اپنی غلو قات ذہنی اپنے کلاموں کے ذریعے بات کرتا ہے۔ اس لیے جو کچھ اُسے کہنا ہوتا ہے وہ بالواسطہ کہا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں اگرچہ صفت کی اخلاقی اقتدار شرح ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کے فانی عقائد کا زندگی پر اس کے خطہ نظر

معارض بہت کم ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ فلسفے میں مصنف ان تمام خیالات سے اختلاف کرے، جو کرداروں کی زبانی ظاہر کیے گئے ہیں۔ عکاس کے افسانوں میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ انسانوں کے متعلق، فنی کے متعلق، زندگی کے متعلق اور بہت سے دوسرے مسائل کے متعلق، نظر کا نقطہ نظر زیادہ وضاحت سے اس کی کتاب گئے فرشتے کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔

جیسا کہ یہ کتاب منٹو نے جو فنی کی منزلیں طے کی ہیں، ان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوانح نگاری اور ذاتی اثرات کے متنازع سے کم دیش اور میں ایک نئی صنف ادب وجود میں آئی ہے۔ یہ طے کرنا کہ اس صنف ادب کا نام کیا رکھا جائے۔ چنداں ضروری نہیں، صرف یہ طے پا جانا ضروری ہے کہ گئے فرشتے میں منٹو نے بہت سے عناصر کو محکمہ سوانح نگاری کا ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ اس کتاب میں قائد اعظم (مرحوم)، آغا خان (مرحوم)، اختر شیرانی (مرحوم)، میراجی (مرحوم)، باری (مرحوم)، عصمت چغتائی، شایام، پیری پروین نسیم، بانو، رگس، اویسیائی اور بابورا ویشیل کے متعلق مضامین ہیں۔ ان مضامین میں منٹو کے سوانح حیات کے بہت سے تار اگلے ہوئے ہیں۔ بصورتِ ظلم سازی کے ذکر سے مراد وہیں ہمیشہ اتفاقوں پر مبنی ملکی جوش بھی ہیں۔ جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا کردار اور ان کی شخصیت منفرد ہے۔ لیکن ان کے تذکرے میں ایک قدر مشترک ہے منٹو کا بے تکلفانہ انداز نگارش جو اس مجموعے کی تمام شخصیتوں کو گویا ایک لہری میں پرورتا ہے۔ ذاتی تعلقات تو ظاہر ہیں کرتے۔

قائد اعظم (مرحوم) کے سوا، نگاہ ہر تجربہ، بارہ آدمیوں کے متعلق ہے۔ لیکن درحقیقت اسی کا موضوع ایک تیرہ جواں آدمی ہیں۔ اور وہ خود منٹو ہے جس کی شخصیت اس کتاب میں بے نقاب ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ منٹو ابھی کی حدود رہ کر تفسیر غلطی دینا میں رو کر بھی جذباتی، باطلوں کا خزانہ اور محال مزے کی بات یہ ہے کہ منٹو نے اپنی جذباتیت کو اپنی خبریوں کو اور اپنے خلوص کو ترے اہتمام سے پڑھنے والوں سے مخفی رکھنا چاہا ہے۔ لیکن ہر شخصیت اس کتاب میں سب سے زیادہ ابھرتی ہے۔ وہ منٹو کی ذات ہے۔ معلوم نہیں کہ ترتیب میں ترتیب زمانی کس حد تک ملحوظ ہے۔ لیکن سلسلہ وار مطالعے سے منٹو کی ایک شخصیت ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے نوجوان، سادہ دل، فنی کاروں اور مصنفوں پر فریفتہ، پھر دنیا کی عظمت سے دوچار، کارنامہ حیات میں ہنر آزمایا اور آخر اپنی ہی ذات کی ایک کمزوری سے شکست کھا کر یاروس و نامراد انسان۔

آغا خان سے جن دو ملاقاتوں کا منٹو نے ذکر کیا ہے، اُس میں ہیں وہ کم عمر منٹو نظر آتا ہے جس کی طبیعت پڑھائی سے اُچاٹ ہو چکی تھی اور جو اپنے ارد گرد کے حالات کو ترن نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں اُس پر مشہور صحافی اور مہذب بادی کا بہت اثر تھا۔ جو منٹو کے خیال میں محدود و جزئل واقع ہوئے تھے۔ اختر شیرانی سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے اُس سے منٹو کے جذباتی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ”میں گوئے“ میں (پیراجی کے متعلق مضمون ہے) منٹو نے پراسسڈ ٹیلیٹ کا انسانہ شعور کے بڑی پتے کی باتیں کیں ہیں اور پیراجی کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے اس سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، یہ اور بات ہے۔ لیکن منٹو نے جو دور روشناسی دی ہے اس سے انصاف کی بات کسی کو نہیں ہو سکتی وہ لکھتا ہے :

”حقی عشق اور موت اس ٹیلیٹ کے تمام اقلیدہ سی زاویے صرف ان

تجی گروں کی بدولت اس کی بھریں آئے تھے۔ لیکن جنی اور خشتی کے انجام کو دیکھا اس نے شکست خوردہ بینک سے دیکھا تھا جس کے طیشوں میں تیرے سے تھے۔ اس لیے اس کو سن کر کل میں اس نے دیکھا تھا، ریح نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان، بہام کا ذہر چھل گیا تھا جو ایک نعلے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ اس کا ہر نقطہ اس کا نقطہ آغاز ہے اور وہی نقطہ انجام۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا بہام کو کیلا نہیں تھا۔ اس کا رخ موت کی طرف تھا، نہ زندگی کی طرف۔ نہ بانیّت کی سمت نہ قنولیت کی جانب۔ اس نے آغاز اور انجام کو اپنی مٹی میں اس طرح پہنچ رکھا تھا کہ ان دونوں کا کوئی پتہ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ماریت پسندوں کی طرح وہ اس سے سرور نظر نہیں آتا تھا یہاں چھوٹے کے جذبات کو لہو جاتے تھے۔ اُن تین آہنی گروں کی طرح جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بڑنگر کے فیٹ لبریک میں دیکھا تھا۔

منٹو کو اپنے معاصروں سے، فن کا دل سے خاص طور پر اداسانوں سے عام طور پر کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے میراجی کے مرنے پر یہ لکھا کہ اچھا بڑا گدوہ جلدی رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور خراب ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ بظاہر ان فقریوں سے مستعدی ٹپکتی ہے۔ لیکن ان کے بین السطور پر نظر کیجئے تو معلوم ہو گا کہ منٹو کا دل دھم سے جیسے بھرا ہوا ہے، اور میراجی کی دھماکا کی مزید طاقت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس کے مرنے پر اچھا بڑا کے کلمات استعمال کرتا ہے۔

آدمیتِ جستِ رام آدمی

باخبرِ شواہِ معتمدِ آدمی

باری پر منٹو کا مضمون نہایت تسکین دہکُن نہایت دقیق مشاہدات پر مبنی ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ منٹو باری کو بہت بڑا دل تصور کرتا تھا۔ اپنے بے کاہداری کو سیکم وہ نہانا تھا اس میں ناز کا چھوٹا سا ذراہ سرور ہوتا تھا کہ اگر حالات ناخوشگوار ہو جائیں اور محاذ سے پیچھے ہٹنا پڑے تو ایک راہ کھلی رہے۔ باری کو جن طرح منٹو نے دیکھا ہے۔ ان کے کردار کا شخص ایک چلنی جنھوں نے کر دیا گیا ہے۔

”باری صاحب قبر میں ہیں، معلوم نہیں، اس میں بھی کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے

وہ کوڑ کر باہر نکل سکیں۔“

باری کے متعلق منٹو کے مضمون میں طنز کا رنگ بہت چمکا ہے اور مذہبی کے کرشمے بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ گویا منٹو کو باری سے جو محبت تھی۔ وہ اُسے طنز، جملوں کے پردے میں چھپاتا تھا۔ تاکہ

پڑھنے والے کیس یہ نہ کہیں کہ، اس مشورہ ایک بڑول کو دوست رکھتے ہوا لیکن سارا مضمون پڑھ جائیے۔ دوبارہ پڑھ جائیے، تو معلوم ہو گا کہ مشورے دوستی کو دشمنی کا سارا رنگ دے دیا ہے۔ دریا کاری کی یہ عجیب و غریب شکل ہے۔ لوگ مصیقت کو بے نظور نہ کر دشمنی کو بھی دوست کہتے ہیں۔ مشورہ دوست کے لئے بھی حسب و لحاظ نہیں آتا کہ لوگ اس کی اس کمزوری پر مطلع نہ ہو جائیں کہ وہ جذباتی ختم کا آدمی ہے اور دو مستویں کے تمام عجیب معامات کر دیتے پرتا ورتے ہے۔ مشورے کے اپنے بیان کے مطابق باری کی زندگی کے پیکر پہلو پر بیٹھائی لڑا ہے جو غلطی میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مشورہ کا ایک فقرہ اس کی اصل نیت کی غمازی کرتا ہے۔ "لیکن تیرے بچے یہ بھی کہ ان صحافیوں سے اس کے خلاف (یعنی ڈرامے) لکھوا دیا گیا۔ جن کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی اس میں کی گئی تھی۔" اب معلوم ہو گیا کہ مشورہ کا جو مضمون باری پر ہے اس میں وہ صرف باری پر ہی نہیں اپنی ذات پر بھی غور کر رہا ہے کیونکہ خود اس نے بھی زندگی صحافی کی حیثیت سے شروعات کی تھی۔ اس مضمون میں درحقیقت مشورے اس زمانے کو یاد کیا ہے جب اس نے انوار حیات میں قدم رکھا ہی تھا۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ تصنیف و تالیف کا چسکا پیدا کرنے کا محرک باری مرحوم ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مشورہ دریافت کر رہا تھا کہ اس کی فطرت کے ممکنات کیا ہیں اور تصنیف و تالیف کی طوط متوجہ ہونے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کامیاب ہو گا اور کامیاب ضرور ہو گا۔ لیکن لاف زوال شہرت، اے بے پناہ خلوص، حیرت انگیز مشاہدہ، بے تکلفی کے قدرت، کوئی چیز بھی آخر اسے اس معاشی بحر میں سے نہ بچا سکی جس کے سدھات کو بھلانے کے لیے وہ شرب چیتا تھا۔ باری پر جو مضمون ہے۔ وہ دانوس کی طرف ہے۔ اس میں مشورہ جہاں سے چلا ہے وہیں واپس آتا ہے۔ معاشی بے ایمنی سے معاشی بے ایمانی تک۔ ان دونوں حدود کے درمیان دشمنی ثروت کی گئی نہیں ہے۔ لیکن ان سے مشورے کو بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ توبہ ی پر جو مضمون ہے وہ صرف باری کا ہی نہیں مشورہ کا اپنا مشورہ بھی ہے۔ اور کم و بیش ہر صحافی اور ادیب اور فن کار کا مشورہ ہے۔ اس مضمون کا مزہ خنداں بے نظیر ہے اور مشورہ کی کسی اور دشمنی تخلیق میں ایسے نیچے فقرے نہیں ملیں گے مثلاً:

"یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ پراقری سکول کے استاد سے قرنی کرتے کرتے کہیں یونیورسٹی کے ریڈر ہو جاتے۔"

تجاؤ کوئی اور کام کر۔ پہلے اور کمال مارکس تھا رہی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ خوب باری بھی اچھی تک ان کے فلسفے کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔

"آقبال کی غرضی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آ گیا تھا کہ اس کو اپنا اور حنا بھرنے بنایا مگر مردوں میں معلوم ہوا کہ کام نہیں دے سکتا۔"

"ان کی طبیعت شعلہ نگ حتی بدل کا عارضہ ان کو بہت دور سے تھا۔ مگر اس کا علاج انھوں نے جب بھی کیا مصالحت آمیز طریقے سے کیا۔ اس کی ملامت میں ان کے کبھی جارحانہ انداز نہ تھا۔"

وہ انگریزوں کے سخت مخالف تھے لیکن یہ عورت کا شاہ ہے کہ جب انگریز چلا گیا تو وہ اُن کے

فکر ہو گئے۔

خدا و ادب کے معاملے میں بڑی سوجھ بوجھ رکھنا تھا۔ لیکن اس کا مطالعہ عزت و رسلع نہیں تھا۔ اس لیے جب وہ لکھا و کا ہر وہ بھڑا تھا تو بڑی پُر خلعت کیفیت پیدا ہوتی تھی اس کی نزہات اور لطافت بعض اوقات اسے ایسے کچھ بھاتی تھی کہ پیشہ ور لکھنا دیکھتے رہ جاتے تھے اور کبھی وہ ایسے دھوکے کراتا تھا جس کا انبات ممکن ہی نہیں۔ عصمت چغتائی پر جو اس نے مضمون لکھا ہے اس میں اسی قسم کے تضاد کا ثبوت پُر خلعت منظر ہر وہ ہے۔ ایک بار عصمت سے زبان کی مسئلے پر گفتگو شروع ہوئی، تو عصمت نے بھی شہادت کی تائید کی کہ منظر سے زبان کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، اس سلسلے میں عصمت نے لفظ دست و داری استعمال کیا۔ منظر نے کہا صحیح لفظ دلازوستی ہے۔

”شاید قصہ ختم کرنے کے لیے دوسرے کمرے سے نعت اٹھا لیا۔ وال کی نعتی میں لفظ دست و داری موجود ہی نہ تھا۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ منظر سے کہنا چاہتا ہے کہ دست و داری کرنا، کوئی محاورہ ہی نہیں نہ دست و داری کوئی صحیح ترکیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لغات میں دست و داری مندرج ہے اور اس کے معنی بھی طاقت اور زبردستی وغیرہ ہیں۔ لکھے ہیں۔ معلوم نہیں شہادت نے کونسی لغت دیکھی، اسی طرح عصمت کے افسانوں پر اتھا کر تے ہوئے اس نے جن افسانوں کی تنقید پر جرات اٹھا دیا ہے وہ اس کی ثروت نگاہی کا ثبوت ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ عصمت کے عورت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ہر رنگتے میں موجود ہے جو اس کے کچھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں کو ہم مصنف کی نہیں سے بلکہ عورت کے کھٹے تر امر زبانی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے کچھنے ہونے افسانے پر طرح کو لڑا پڑ چلتا ہے کہ مصنف عورت ہے اور مرد کے افسانے کا بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ مصنف مرد ہے۔ یہ غلط صریح ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کہ عورت مردوں کی فطرت کی تصویر کشی میں مرد مسنونوں سے کم تر ہے۔ نہ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ عورت ہر وہ مردوں کے جذبات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ غنیمت کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہوتا ہے۔ وہ شہادت کا مطالعے اور تنقید سے حد سے کہ جس مقابل کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچ سکتا ہے عورت اور مرد کے جذبات بنیادی طور پر یکساں ہوتے ہیں کہ انسانیت دونوں میں مشترک ہے۔ اور انسان نے جو کچھ محسوس کیا ہے اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہاں کسی افسانے کے متعلق یہیں معلوم ہو کہ کھٹے والی عورت ہے تو ہم پر نفسیاتی اثر خود ہوگا اور ہم کہیں گے کہ جذبات کی یہ لطافت اور یہ لطافت صرف عورت ہی کے افسانوں میں مل سکتی ہے۔ منظر بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر عصمت کے بعض افسانوں کو عورت کے نازک اور ظالم افسانے کہتا ہے۔ منظر کی نظر میں یہ افسانے عورت کی ادائیں ہیں۔ صاف شغافانہ برہمن کے تصنع سے پاک ہیں۔ نے عرض کیا تھا نا کہ منظر جب لکھا و کا روپ دھارتا ہے تو نہ تو کلام میں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ عورتوں نے ایسے ایسے غیر نازک اور نا ظالم افسانے لکھے ہیں کہ بایں وہ شاید ادھر مردوں نے بھی ایسی عزت کی خیال دکھائی ہے کہ سمان اللہ۔ اس سلسلے میں یہ شعر ہے کہ ادب کا ذکر بھی منظر نے کیا ہے۔ یہ شعر اس پر مشتمل ہے کہ یہ شیطیت

بطوری فقوے بازی ہے۔ اب یہ پیڑھے کے دب کا کر جو آیا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ خاص منظر ملازی ہے۔ بلکہ نئی افتاد کے سلسلے میں رسل کی فہم ابدل نہیں ہی سکتی۔ دعوے اور دلیل میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اسی مضمون میں فنی قیر کے متعلق بھی ایک آدھ افتادی فقروے۔ اس سے بھی درگزر کر ہی لیا جائے تو اچھا ہے۔

صحت چٹائی کے بعد جن لوگوں سے منظر ہمارا تعارف کراتا ہے وہ سب فہم کے منبری آسمان کے روشن دیکن اور مندریل ستار ہیں۔ فہم زندگی کے متعلق لڑکے لڑکیوں کے دلوں میں جو روحانی تصورات پرورش پاتے رہتے ہیں ان میں سے کچھ تو ان مضامین کے مطالعے کے بعد مزید نشرو نما پاتے ہیں۔ اور کچھ جہاگ کی طرح جھٹھ جاتے ہیں۔ فہم کی توفیقاً خود منظر کی فہم کی طرح متضاد باتوں کا مجموعہ ہے۔ منظر نے بڑی چابکدستی سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ چشمہ مضامین کا اسلوب ہمدردانہ ہے۔ اسی مضامین میں بھی منظر بے حد جلد بلی نظر آتا ہے اور سب مضمون اپنی جذباتیت کے اختلا میں مصروف ہیں۔ وقت برصغیر ہندو پاک کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ منظر بلی کے نگار خانوں میں مسلم ادبی جلیفیت اور وجاہت رکھتا تھا۔ ہندوؤں روپے ماہوار کا آقا ہما کے پاکستان آنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ ہاں یہ تھا کہ بعضی مائیکز میں بڑے بڑے منصب مسلمانوں کے قدرت میں تھے تقسیم کے بعد بعضی مائیکز کے ارباب اقتدار کو گناہ منظر موصول ہونے لگے کہ مسلمانوں کو الگ کر دو۔ ورنہ اسٹیو جلا کر داکو کر دیں گے۔ منظر نے دلی میں سوچا کہ بعضی مائیکز کے ارباب اقتدار یعنی اشوک کمار اور داج کو تکلیف میں مبتلا کرنا چیک نہیں۔ اس نے بسے مائیکز کا ترک کر دیا۔ پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا اور خود اس کے مضمون میں:-

”میں چپ چاپ باجو کی لگی سے پاکستان چلا آیا۔“

اس کے بعد :

تجھ سے فہمی ہے جو مجھ پر گندوی

تو قریب رگ جان رہتا ہے

منظر نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ لیکن فارغ اہالی اور آسودگی کے بعد اپنا اپنی معاشی بے اطمینانی میں مبتلا ہو جانے کے نتائج ظاہر ہو کر رہے۔ اور وہ منظر جو کسی سے نہیں ڈرتا تھا جس نے کسی سے شکست نہیں کھائی تھی۔ خود اپنے آپ سے شکست کھا گیا۔ ٹو اکڑوں نے اس سے کہا، شراب مینی ترک کر دو، ورنہ مر جاؤ گے۔ کچھ عرصہ اس نے اس مشورہ پر عمل ہی کیا۔ لیکن :-

پیسہ ان فنی پرند

مریدان بھی پرانند

والا قصہ ہوا۔ اور آخر شراب نوشی کی کثرت نے منظر کو بھی ہلاک کر دیا۔ یہ اتفاق دیکھیے تاکہ گننے فرشتے میں تین اور بھی ارباب ایسے ہیں جن کو شراب سے ٹروٹی۔ یعنی آقا مشرہ، آخر مشرہ، انی اور مشرہ۔ آدمی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ہمارے

ان زندگی کے صحیح حقائق سے فرار کا سوائے شراب کے شاید اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ باری مرحوم دل کے مریض تھے۔ معلوم نہیں شراب کس حد تک ان کی موت کی ذمہ دار ہے۔

میں ذرا بیک گیا ہوں۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ مجھے فرشتے بارہ آدمیوں کے حالات پر مشعل نہیں۔ اس میں ایک تیرھویں شخصیت بھی ہے، یعنی خود منٹو۔ ایک طرح یہ کتاب منٹو کے خود نوشت سوانح حیات کے چند ٹکڑوں پر مشتمل ہے اور چونکہ منٹو کا ذکر کتاب میں گویا مختصراً آیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کے مندرجات منٹو کی شخصیت کو اجاگر کرنے میں منٹو کی منٹو سے کہیں زیادہ معاون ہوتے ہیں جو سرکشوں کے کچھ کچھ کا آخری ٹیزو ہے۔ کیونکہ اس منٹو میں منٹو میں مصنف کچھ باتوں کو معنی رکھنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یوں ہی اپنے سوانح حیات لکھنے کی شعوری کوشش میں دیا کاری کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور مختلف مضامین میں بغیر سوچے ہوئے مصنف جو کچھ لکھ جاتا ہے اُس سے انکشافِ ذات و صفات میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

”مجھے فرشتے“ کا پہلا منٹو تیرا صاحب ہے۔ اس میں قائد اعظم کا شرفِ انبی زبانی میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ ٹونر غمِ صیغہ آزاد ہے۔ اس منٹو میں شروع سے لے کر آخر تک محبت و احترام کا بڑا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ جو میں نے کہا تھا کہ منٹو شدید قسم کا جذباتی انسان تھا۔ اس کا مزید ثبوت ملے۔

منٹو ہمیں کس نگار خانوں میں کامیابی کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔ ایسی کامیابی لکھ چکا تھا جو مقبول ہوئی تھیں۔ مکالمات تبند کر چکا تھا۔ سیناریو لکھ چکا تھا۔ لیکن نقیب کی بات ہے کہ اس کے ڈرامے اس معیار تک نہیں پہنچے جو اس کے انسانوں نے حاصل کیا۔ پانچ ناولس میں اس کی نثر کی کمالی گہرائی پوری تفصیلات کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کہانی کا موضوع یہ ہے کہ ایک نواب صاحب ہیں (بڑی سرکار) جنہوں نے جہان میں وہ سب لکھ لکھا تھا، جو لوگوں کو کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اپنے مالی کی بیوی سے بھی عشق فرمایا تھا۔ ان کے صاحبزادے ہیں دھچوٹی سرکار۔ وہ باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں بلکہ بڑی سرکار اب ٹرکی اس منزل پر ہیں کہ دھچوٹی سرکار کو محبت کے جلال میں شکار پھا لے دیکھ کر خوش ہو جیتے ہیں، اور میں۔ بڑی سرکار کا مالی ایک لڑکی کا باپ ہے جس کا نام جنیل ہے۔ دراصل یہ لڑکی بڑی سرکار کی ہے جو مالی کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ مرتے وقت مالی نے خاوند کو حالات کی صحیح صورت سے مطلع کر دیا تھا اور اس نفا کا اظہار کیا تھا کہ حرامی لڑکی کا لگا لگھوٹ دیا جائے۔ لیکن مالی کے دل میں شیطان جاگ اٹھا اس نے بڑی سرکار کی لڑکی کو اپنی لڑکی بنا کر بالا اور جب سیانی ہوئی تو دھچوٹی سرکار کو مزین دیا کہ اس بچی سے ہی وہی کیمل و ہرادیں جو ان کے باپ نے مالی کی بیوی سے کھیلے تھا۔ یوں مالی نے خوفناک قسم کا انتقام لے کر اپنے دل کی آگ بجھائی۔ اس کہانی کا موضوع ایسا بیہت ناک تھا کہ منٹو اگر چاہتا تو دھچوٹی سرکار بڑی سرکار، مالی، مالی اور اس کی لڑکی جنیل، انہی کرداروں کے ارد گرد تمام واقعات گھوم جاتے۔ لیکن نقیب کی بات ہے کہ اس

نہیں مٹنے کی نکل نکالی میں بڑی سرکار کے خشتی کلاوا لگا بہ میری ہے اور خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لڑکی نکلی ہوئی ہے ۔
 جیسا کہ ڈھانے کے نام سے ظاہر ہے ۔ یوں بھی واقعات کے انارچ حناؤ کے اعتبار سے یکجہیل میلورڈ اور ساما معلوم ہوتا ہے ۔ یہیں
 میلورڈ اور سبھی کو زور دیا ہے ۔ کٹاری اور گلاب کی داستانیں محاشفہ جو چھوٹی اور بڑی سرکار کی ہوس رانہوں کے متحرک ہونے سے باہل
 بیچارہ فریشتیں ۔ آخری سین میں گلاب اور تھیل کی تقدیر میں جو مشابہت ہے اس کا ذکر کے خٹو نے کٹاری کے مدان کو بھی ڈھانے
 کا مشورہ ہی جزو بنا کر دیا چاہا ہے ۔ لیکن بات یہی نہیں ۔ یوں بھی ڈھانے میں خٹو کی زبان میں وہ مقامات انحصار جو بھارتی حد تک
 پہنچا ہوا ہے ، موجود نہیں ، زبان روزمرہ کی ہے ۔ یہ تو خرو کی قہب کی بات نہیں لیکن نفس یہ ہے کہ جہیز زبان کلام
 ہوتی ہے اس پر خٹو زیادہ زور صرف نہیں کرتا ۔ چھوٹی سرکار اور بڑی سرکار کی کوئی واضح تقسیم بھی پڑھنے والے کے ذہن میں نہیں
 ابھرتی اور کٹاری اگرچہ ڈھانے میں ہمارے فخر کی رہتی ہے لیکن اس کے باوصف ہے جان ہے ۔ اس کے مقابلے میں جہیز ہونے والی
 لڑکی معلوم ہوتی ہے ۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لڑکی کا ساما خٹو اس مسئلے میں معاویہ حیثیت دکھاتا ہے جو خٹو کے
 ڈھانے میں دوسرا متضاد پلاٹ دکھاتا تھا ۔ کٹاری کی داستان خارج کر دینے سے اصل ڈھانے کی طرح متضاد نہیں ہوتا ۔ ڈھانے
 جو اس ایک نقطہ کی خاطر نہیں ہوتا ، زبان خٹو نے پوری داستان کی داستان خٹو نگاہی ہے ۔ یوں بھی اس کھیل میں انگریزی
 فلموں کے ڈائلاگ فرسٹ ، دکھائی دیتا ہے جو خانہ بدوشوں کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں ۔ خانہ بدوشوں کا سودار ڈھانے تمام باتیں
 کرتا ہے جس سے پڑھنے والے کی قوت اس کے حیرت انگیز کردار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اس کے پاس ایک بانجھ جس کے تار
 نہیں ، گھڑی ہے جس کی سوئیاں نہیں ۔ لیکن اس کے باوصف وہ کسی انگریزی فلم کا سولوئیڈ کا ٹکڑا ہے جسے خٹو نے
 کسی انگریزی فلم سے نکال کر یہاں چپکا دیا ہے

یہی موضوع اگر شواہد نے افسانے کے لیے انتخاب کرتا تو آپ دیکھنے کر کیا صورت پیدا ہوتی ۔

”خٹو کے ڈھانے ڈیرڈیائی ، میں بھی یہی بات ہے کہ خٹو افسانہ کو بغایت انحصار استعمال نہیں کرتا ۔ اس میں بہت سی
 خاص میلورڈ اور ہے لیکن خٹو نے اس میں کچھ (PROBLEM PLAY) کا سامنا پیدا کر دیا ہے ۔ اس ڈھانے کی پروائی
 دہائی ہے ۔ جس پر ایک لال لال آنکھوں والا کھیل پیش کرتا ہے ۔ ڈھانے کی شادی ایک تھانڈا رہے ہوئی ہے اور اسے آخری
 سین میں کوئی گڑھی سے مارا دیتا ہے ۔ یہ اشارہ ملتا ہے کہ کاتالی تھانڈا خود ہے ۔ لیکن کھیل پیش عاشق قتل کا اشارہ کرتا ہے ۔
 ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خٹو کے خیال میں ڈھانے کو دو آدمیوں نے قتل کیا ہے ۔ اس کے ہم کس کے شور تھانڈا دے ، جسے جب
 ہر گز تھا اس کی بھرتی کسی کھیل پیش کے میں بھی جاتی ہے اور اس کے ردِ سنو کی کھیل پیش نے جو اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے
 پیش کرتا ہے کھیل بھی لاپتہ اہمیت کا حامل ہے ۔ ہر اور ہے کہ کوشش کے متعلق یہ دریافت کن مشکل ہوتا ہے کہ اس کا ڈھانے ۔
 کیا ہے ۔ انتظار کا دوسرا رخ ، کٹاری بار پڑھنے کے بعد بھی کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا ہوا ۔ ایک لڑکی جہیز نے ساتھ آٹھ ہے
 کسی سے ملنے کا مدد کیا ہے ۔ اس کی ماں اُسے دکھانا چاہتی ہے ۔ لیکن وہ بھائی کی دوسرے ہائز نا کر خٹو کے نظر جاتا ہے ۔
 دوسرے مشرق جس سے ملنے کے لیے نکلتی ہے اس کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دل کا درد چرا ، مر گئے یا سو رہے ہیں ۔ اس

میں بھی وہی (PROBLEM PLAY) کا سارا ناک ہے لیکن (PROBLEM) یا مسئلہ کوئی نہیں۔

ان ٹولوں میں سے کسی ایک کا استعمال کرنا نہایت مشکل ہوتی اور شعری ذہنی تخلیق ہے اس میں تسلیم ایک آزاد خیال اور تعلیم یافتہ نوجوان درجہ حیثیت میں اس صنفِ نثر کی علامت ہے جو ہر قسم کی انقباضی الجھنوں اور تباہیوں سے آزاد ہے مختلف جگہوں سے نکالا جاتا ہے۔ بارغیر بیٹھا چاہتا ہے تو بارغیر کھڑی کھیت آئے آتا ہے۔ ایک مجلس میں شریک ہونا چاہتا ہے تو دعوت نامے کی عدم موجودگی پر پیشانی کرتی ہے۔ ایک کلب میں ایک لڑکی سے باتیں کرنا چاہتا ہے وہ اپنے پیاسے اجازت لینا چاہتی ہے۔ یہ لڑکی آج کل کی وہ پڑھی لکھی شائستہ لڑکی ہے جو اپنے حسن، ادبی شائستگی اور اپنی تعلیم کی زیادہ سے زیادہ قیمت دھماکا کرنا چاہتی ہے۔ تعلیم کے بے موثر جوش کے بے کوٹھی اور شائستگی کے بے سلاح میں ایک اور خفا مقام، آخر تعلیم اپنے گھر پہنچا ہے اور لوگوں سے کتاب کے گریبان تو نہ آسان میرا ہے، نہ زمین، نہ ہوا اور پانی۔ آخر وہ ایک۔ حوا لغت کے اس پہنچا ہے جس کے الفاظ سے پتیاں ناپیں آوت چھین کے بولوں کی آواز دیتی ہے (یہ حوا لغت زندگی سے گریز کی علامت ہے۔ ماس ہے جہاں انسان پناہ لینا چاہتا ہے لیکن خود یہ حوا لغت اپنے پیار کی منتظر ہے) اس سلسلے تکمیل میں کلامات کا اختصار، کرداروں کا تضاد اور کرداروں کی علاقائی اہمیت کی عزت، اشارے، منظر کی حمایت فن کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوصف، میرا خیال ہے کہ یہ چیز غمناک انسان کے صورت میں لکھتا اس سے یقیناً بجز گھٹا۔ آخری ڈراما نہایت مشکل منظر کے اسی نام کے مشہور افسانہ پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ حوا لغت کے اندر بھی ایک خود اور قدرت مخفی ہوتی ہے اور اس کے منہ پر پتھر کی تختی تھیں کیوں نہ چڑھ جائیں لیکن نیچے دو گوں میں خون حرکت کرتا ہے جو وقت آنے پر کھولی بھی سکتا ہے۔ ڈرامے اور افسانے کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ جو فحاشی اور جھوٹا فحاشی افسانے میں ہے وہ ڈرامے میں نہیں۔

منظر کے افسانوں پر تبصرہ ایک نہایت مفصل مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے اس مضمون میں زیادہ تر گئے فرشتے کے مطالب اور ان کی اہمیت سے بحث کرنا تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ منظر کا ذکر ہر افسانے کے افسانوں کے متعلق کچھ ذکر کیا جائے تو یہ عجیب فریب بات ہوگی۔ منظر کے افسانوں کے گہرا زندگی کے ہر شعبے سے متعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دلائل ہیں، انداز ہیں، استاد ہیں، پہلو ہیں، کونجی کے ڈاکے، دیکھیں ہیں، قریب، قریب، ازبیر، معاشری طبقے کے افراد منظر کے افسانوں میں لیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس معاشرے کا منظر نامہ بہت قریب سے دیکھا ہے اور جس کے افراد کم و بیش منظر کے نام میں سب ننگے ہیں۔ وہ مترسدا، محال طبقہ ہے جو غریبوں اور غریبوں کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح متحرک رہتا ہے۔ اس طبقے میں سے کچھ لوگوں کے طبقے میں پلے جاتے ہیں اور وہ دھنسنے کھاتے ہیں۔ اگر کچھ آتے ہیں اور اس قسم کے ناموں سے سہانے جاتے ہیں، جنہوں، کسان، بلوگ، زفرہ، منظر کے افسانوں میں ان خصوصیات ایسی ہیں جو اس سے باہر ملنے والے ہیں۔ ایک تو کہ وہ کبھی ایسی چیز کو افسانے کا موضوع نہیں بنا جس کے کہتے ہیں کہ وہ غریب، آگاہ نہ ہو اس کی حیرت، غمزہ، قوت مشاہدہ اس کے ذہن میں واقعات کا تخلف، اس کی حیرت، اپنی چیزیں اسی سے ہیں نظر آتی ہیں اس کی دوری، خصوصیت جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے وہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں۔

ذہنی طور پر غالباً عنصر یا ضابطہ کے زمرہ قرار دینا اور صحت مند محبوب ہے۔ اس لیے ذہنی بیماری، نفسیاتی الجھنیں اور ذہنی پھانسیاں ہیں۔ یعنی ان چیزوں کو ذہنی ذات کی نسبت سے پہچانتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہنا چاہیے کہ اس کی ذات ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی بیماریوں کے لیے (SYSTEM OF REFERENCE) ہے۔ یعنی نظامِ مشق (ایک اہم چیز کے مشق بھی کہہ سکتے ہیں) کو وہ متحرک ہے مگر ایک نظامِ مشق ایسا موجود ہو جس میں سلسلہ طور پر چیزیں سامنے بھی ہوں۔ ورنہ کہنا ناممکن ہے کہ ذہنی چیز سامنے ہے اور وہ متحرک، ذہنی الجھن اور نفسیاتی امراض کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک نظامِ مشق ان کے لیے بھی موجود ہو مثلاً اپنی ذات میں ایک عملی نظامِ مشق تھا۔ اس لیے جہاں کہیں وہ نفسیاتی الجھنیں یا مرض کا ذکر کرتا ہے۔ نہایت اثرات نکال رہی ہے کہ کتاب۔ جو امراض اسے اپنی ذات میں نظر نہیں آتے، انھیں وہ نا صحت مند کیفیات تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دل کے چرچہ بری آسانی سے پکڑ لیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کھتے وقت کوئی سماجی یا لفظی کمزوریاں، اس کے رستے میں کھڑی نہیں ہوتیں اس کے پاس (TABOOS) یعنی ممنوعات ذہنی بالکل نہیں ہیں۔ پڑھنے والوں کی جھنجھلاہٹ اور بیچ و باب کا اصلی راز اسی خصوصیت میں مخفی ہے۔ ان ممنوعات کو جب غور راستے سے دیکھا جائے تو جو لوگ ان کے سامنے آتے ہیں ان کی دیواروں کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ ان کو اپنی اس دنیا کے ستون لرزتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جتنی کوشش جوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور دنیا کو باہر کی طرف گرا دیتے ہیں۔ اس طرح بعض لوگوں کو نگہ کرنے کا، بے آسرا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ غور کو گاہیاں لے کر اپنی شکست غور کی کیفیت مانتے ہیں۔ تخریب و تباہی معاشرہ، ثقافت یا سماج، جو چاہے کس لیے، ان کے مفروضات، معتقدات، نظریات اور توہمات کو منظرِ انزیر پر رکھتا ہے۔ اس طرح زندگی کی انداز بھی رکھی جاتی ہیں اور جو لوگ کچھ نظریات اور ممنوعات کو ہی اندازِ گہر کرنا دیکھ جڑوں میں دھتے تھے، ان کو میدان میں کھڑے ہو کر غور کی روشنی میں اپنی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑا تعلیمت دہ مال ہے۔

یہ دو خصوصیات۔ تو منظرِ بانی میں کون میں غالباً اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ایک اور خصوصیت بھی اس کے انسانوں میں ہے جو کچھ سات اٹھ سال کے عرصے میں بنیادی ہوئی تھی جاری تھی۔ اس کے انسانوں کے کردار اس طرح گفتگو کرتے ہیں، جسے اصطلاح میں (SPEAKING IN CHARACTER) کہتے ہیں۔ بشرق کو جب میں یہ خصوصیت بلاغت کا ایک جزو ہے اور اس کے معنی میں کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا۔ بشرق کے انسانوں میں پنجاب کے بزرگوار و قبیلمداروں کے غلوں سے ساز نہیں ہیں۔ بشرق کے انسانوں میں کو جوان و قبیلمدار ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہیں فراتے۔ ان کی بات چیت سے کشمیا، میٹروں اور مٹی، پوسوں کی دھڑکیوں کی، پیسے کی گونجی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے قبیلمدارانہ خصلتیں ہوتے ہیں اور وہ قبیلمدارانہ شعور چمک رہا ہے۔ چمکاتے ہیں کہ۔

انیس دھم کا بھروسہ نہیں ذرا غور
چراغ لے کے کہاں سے بھوکے چلے

سید عابد علی عابد

منشور

منشور بھی عجیب آدمی تھا اور کتابی عجیب آدمی، زندگی شروع شروع میں مجھے غلو کی شخصیت اور اس کے اندازوں دونوں میں سے کسی سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوئی، شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ منشور کے بعض اندازوں میں اس طرح کی غلو کی قسمی جس کا نظارہ کوئی مقصد نہ تھا، سوائے اس کے کہ منشور نے اس میں اپنی مریضانہ ذہنیت کا اظہار کیا تھا اور یہ غلاظت محض جنسی قسم کی تھی اور مجھے اس اعتبار سے منشور اور میر تقی میر کی دوسری سے بہت قریب آنے نظر آتے تھے، ابھی میں یہ سوچتا کہ میر تقی کے پاس جرتیں گئے تھے ان میں سے ایک گورہ خود منشور تھا، آٹا ہی بسم اور اتا ہی دلچسپ۔

تقسیم کے بعد مجھے اکثر منشور سے ملنے اور اس کے اندازے، اسی کی زبانی تفسیر کا موقع ملا، اسی قسمی ایک صحبت میں منشور نے ایک افسانہ پڑھا، افسانے میں ایک اُچھ سپاہی کا کردار تھا جو بات بات پر گالی بکتا اور اکثر گامیاں مٹا کر غلط فہمیاں لوگ منشور پر برس پڑے، اس نے باہر ارجحانے کی کوشش کی، گالی منشور نے نہیں کی، اس سپاہی نے کی، یہ جہاں آپ کو اٹھ گئے آپ اس کی تواریخ کریں، منشور نے تو صرف اسے اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ اس افسانے میں اور کئی باتیں بھی ہیں، آپ اس گالی کے پیچھے پڑ گئے، ان باتوں کو دیکھنے اور سننے کے لیے آمادہ نہیں، آپ کا حق چاہئے آپ گالی سے میں بھی افسانے ضرور پڑھنے کی کوشش کریں میں کہتا ہوں منشور نے ٹھیک کہا تھا، بلاشبہ اس کے بعض افسانوں کے موضوعات ایسے جنسی مسائل ہیں جو ہمارے ادب اور معاشرہ میں اتنی ممنوعات ہیں، یہ بھی درست ہے کہ بعض افسانوں میں محض لذت لینے کی خاطر ایسے مسائل کی تشریح، ایسی تفسیریں، استعارے اور کلمات ملتے جلتے ہیں جن کا مقصد محض آتش شوق کو بھڑکانا اور جھڑکتے شعلوں سے اس آگ کو بھڑکانا ہوتا ہے، کہیں وہ جراثیم نگاری میں ایسا عمل جراثیم کرنے لگتا ہے، جیسے کوئی مریض ہو، لیکن یہ عمل جراثیم کسی ہسپتال کے آپریشن بختہ میں ہو تو کوئی ہرج نہیں، منشور سے شارع عام پر لڑنے لگتا ہے، کہیں منشور علاج با مثل اور کہیں علاج با مضاد کا ناکی معلوم ہوتا ہے۔ وہ دہر کا علاج نہرے کو نا پناہتا ہے، لیکن شکل یہ ہے کہ نہرے نہر کا علاج نہر میں۔ کے میں کلبہ اور نہ ہر مرض پر آنا یا جاسکتا ہے اور منشور جیسے شران کے لیے ان محدود کالام کو کھنا ممکن نہ تھا، لیکن ان سب باتوں کے علاوہ منشور کے زبان کچھ اور بھی ہے اور اس کچھ اوتے منشور کو بحیثیت انسانی نہ سمجھتے افسانہ نگار ایک مرتبہ بخشا ہے۔

اپنے اندازوں کے بارے میں منشور نے ایک لکھا ہے کہ زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے، اگر آپ ان افسانوں کو بغاوت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ

ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا ایک نقص ہے۔ اس بیان میں کچھ صداقت ضرور ہے کیونکہ مٹھو کے علاوہ اوراد میں، شاعروں، افسانہ نگاروں کی تحریروں کا جائزہ لیجیے تو یہ نقص اور بھی کیس کیس مل جائے گا۔ میر تقی میر کی شاعری کا اثر حق، واقعہ کی بعض چیزیں اسلام، عیسیٰ شہری کی بعض غلیظ جھڑپوں کے بعض افسانے اس طرح کے ہیں جو بہت سے لوگوں کے لیے قابلِ برداشت نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان میں ایک طرح کی فرسودگی اور ریاضانہ نوعیت پائی جاتی ہے لیکن اس صورتِ حال اور نفسیاتی کیفیات کے پیدا ہونے کی ذمہ داری اس احوال پر ہے جو ان لوگوں کی نشوونما ہوئی۔ ان کی فطرت میں ایک طرح کی جھوک، ایک تشنگی اور محرومی جھلکتی ہے۔ اور جب ان چیزوں کی نفسی کے فطری ذرائع مسدود ہوتے یا ان کی راہوں میں روٹے اٹکتے ہیں تو یہ پھرا پنے لیے نئی راہیں تلاش کرتی ہیں۔ سادہ اور آج ہی نہیں جیسا سے ہونا چاہیے۔ اور شاعری میں امر پرستی، معاملہ بندی یا بقول چرچا پائی اس نوعیت کی ترجمان ہے۔ نظیر جیسا شاعر جس کے یہاں فطری شعور کی معراج تک پہنچنے کے امکانات سبکے زیادہ تھے، اس کچھ نہیں پسلی پڑتا ہے اور آج تک اس کی سزا پارہا ہے۔ تو ظاہر ہے آج کے زمانے میں جب شستہ کلاسی، صحت اور نفاست پسندی ہمارے احوال میں آپ حیات کی طرح خطرات کے ہزار ہوں ہیں، ہم بھی ہیں، ان لوگوں کو کیسے آسکتی تھیں۔

ایک بات آپ ضرور کہہ سکتے ہیں، وہ یہ کہ اس طرح کے کھینے والے بیانیوں کی تعمیر کرتے ہیں۔ خلافت کے ڈھیروں پر سے خاص و خاص خاک کے غلات ادا کر بھیج دیتے ہیں لیکن ان بیانیوں کا علاج نہیں جانتے، اس خلافت کو پیدا ہونے سے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے یہ خالی ان میں الجھتا ہے، یہ جھوٹ اور غلط خیال ہو سکتے۔ اس کے لیے ان کے پاس رازدرازا نہیں۔

لیکن میں مٹھو کے افسانوں کے اس پہلو پر زیادہ نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اس کے لیے بعض بنیادی طویل جلیں درکار ہیں، ہم کس چیز کو غفلت کرتے ہیں، کیا غفلت کا تصور کوئی بنیادی تصور ہے یا محض اخلاقی ہے کہ حالات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جس کے ساتھ غفلت کا تصور کب اور کیوں وابستہ ہو گیا۔ ایک فطری فعل اور اس میں شریک بعض لوگوں کی غفلت اور ان کا ذکر کب اور کیوں ایک گناہ سمجھا جانے لگا، یہ جلیں ہیں معاشرتی ارتقاء، مذہب اور اخلاق کی تاریخ اور نفسیات کی تاریخ۔ راہوں پر لاٹھیاں لگیں، کامیابیاں موقع نہیں، شاید اس سے یہ بھی غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ میں مٹھو کی غفلت نگاری کی عمدہ تسبیح کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس وقت میرا مقصد یہ نہیں میں مٹھو کے افسانوں کو موت افسانوں کے فنی معیار سے دیکھنا چاہتا ہوں، ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جو غفلت ہیں اور ایسے بھی جو غفلت نہیں ہیں۔ اس بحث میں میرے سامنے مٹھو کے تین نمونے ہیں، مٹھو کے افسانے، نوصوان اور سرکشوں کے پیچھے۔

مٹھو کے افسانے میں پہلا افسانہ نیا نیا تو ہے۔ مٹھو کو ان جو سیاست داں اور بیڈر نہیں سرنایک کو جو ان ہے انگریزوں سے نفرت کرتا ہے، اس لیے نفرت کرتا ہے کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں، طرح طرح کے

ظلم ڈھالتے ہیں اور ملگو کو چران کو ستاتے ہیں، شرابی گوروں سے اس کا کٹر جھگڑا کرتا ہے اور ایک روز ملگو کو چران کو خبر ملتی ہے کہ نیا قانون بننے والا ہے جس سے ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔ استاد ملگو نے نینیں اور کلاں مارکس کی کتابیں جن میں اسی تئیں لکھیں وہ نوٹس والے بادشاہ وہاں کے قانون اور دوسری کئی چیزیں کو بہت پسند کرنا لگا اور اس نے ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں کو دوس والے بادشاہ کے تختی سے وابستہ کر دیا، نئے قانون کے نفاذ کا دن آگیا اور استاد کے دل میں بھی انگوں نے گورنر کی۔ اب وہ گوروں سے نہیں ڈرتے گا، استاد ملگو کی ملاقات ایک شرابی گورے سے ہوئی جو پہلے ایک مرتبہ اس سے جھگڑا کر چکا تھا، آج بھی جھگڑا ہوا، لیکن نیا قانون بن چکا تھا، گورے کی بید کی پالش کی ہوئی چھری استاد ملگو کی دامن سے چھوٹی اور اس کے جواب میں استاد ملگو کاٹھو نسا گورے کے منہ پر جم گیا۔ وہ گورے کو سیٹ رہا تھا، وہ دن گزر گئے جب فیملی خاص فاختہ ڈراتے تھے، اب نیا قانون ہے نیا قانون۔

”نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو — قانون وہی پڑانا ہے۔“

اور اس کو حوالہ میں بند کر دیا گیا۔

اس افسانے میں منٹو کا کوئی کردار پولیس میں آجرتا، یہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دور کا آئینہ دار ہے جس میں ہماری آزادی اور اٹھائیں، آئینا میں اور نا کامیاں جھلکتی ہیں اور نئی عیاد سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اچھے منظر افسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا نا نا زمانہ نہ بکھرا ہو، بات سے بات نکل کر طوالت نہ پیدا ہو بلکہ مرکزی خیال ایک رہے۔ کردار واقعات اور مکالمات، اسی ایک خیال کو جان کر کرتے اور آخر میں شدت پیدا کرتے ہیں کہ مکالمات ثابت ہوں، یہ بات بھی یہاں پوری طرح حاصل ہو گئی ہے کہ کردار صرف ایک ہی ہے۔ استاد ملگو، واقعات اور مکالمات مناظر اور پس منظر کا محور بھی ایک ہے یعنی نئے قانون کے نفاذ کا انتظار، لیکن اس ایک محور پر مضامہ اور مطالعہ کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً:

”آس نے سچ کے سرور و حسد کے میں کچی تلک اور کھلے باز اوروں کا پتھر لگایا، گلوٹے ہر چیز پر اپنی نظر آتی — آسمان کی طرح پڑائی، اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کھانی کے جو دنگ برنگ کے پردوں سے نئی تھی وہ اس کے گھوٹے کے سر پہ بھی ہوتی تھی اور سب چیزیں پڑائی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کھانی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۴ مارچ کو چودھری سدا بخش سے ساتھ سے جودہ آنہ میں خریدی تھی۔“

مختصر افسانہ میں جزئیات نگاری کی کامرغ نہیں ہوتا لیکن پاکدست افسانہ نگار مختصر اشاروں میں بھی جزئیات نگاری کا حق ادا کر دیتا ہے۔ استاد ملگو کی ملاقات گورے شرابی سے ہوئی ہے اور وہ تانگہ منہ کر کھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھتا ہے،

”صاحب ہمارے کلاں بانا مانگتا ہے۔“

اس سوال میں بلا کا طنز یہ انداز تھا، صاحب ہمارے کتے وقت اس کا اور پر کا نوچوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ

گیا اور پاس ہی کے گال کے اس طرف جو دم سے ہی لکیر ناک کے نچھنے سے قھوڑی کے بالائی حصے تک پہنچی آ رہی تھی، ایک لڑکش کے ساتھ گری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاکرے سے یہ شیش کی سانولی کڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔
اس طرح کی شائیں اور افسانوں میں بھی ملتی ہیں:-

تساویسوں کی ریشیں سرسراہٹ، دلکٹ لگی شلواروں کی کھڑکڑاہٹ اور چٹروں کی کھٹکھٹاہٹ ہوا میں تیرنے لگیں، تہتے تہتے ہوئے کھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی مٹیں، نیچے نیچے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی جند آوازیں، اونچی اونچی لڑائی کے برتنوں پر بھرتی ہوئی ٹانگیں، چٹکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے بچے، پھر کئی ہوئی رنگیں اور پھلان اٹھنے والی کھوں کی آہیں میں سرگوشیاں..... یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ لگی کے پتھر پر فرش پر شبنم و شہاب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے۔

اسی لمحے میں ایک اور افسانہ چمکا ہے، اس میں بھی اس طرح کی جزئیات نگاری کی شائیں موجود ہیں اور پھر یہ ایک ہی مجموعے پر منحصر نہیں، سادے مجموعوں میں بکھری پڑی ہیں۔

عام حالات میں اس تکنیک سے افسانہ نگار ڈراما خانہ اٹھا سکتا ہے لیکن منظر جہاں بعض اعضاء اور افعال و افعال حرکات و سکنات کے بیان میں اسے استعمال کرتا ہے، وہاں قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ منظر دراصل صرف مزے لے لے کر اسے لکھ رہا ہے، اس کا مقصد لذتیت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ دھواں، جلاؤ، کالی شلوار، مصری کی ڈلی، چھاپا، خوشیا اور منروٹی کر شاڑی جتنے سے اس کا آغاز ہوتا ہے، منظر کے افسانوں میں ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے، یہ نفسیاتی مطالعہ ہے۔ ایسے آدمیوں میں یہ روایت ملتی نہیں، مولوی غفری احمد کے یہاں کم از کم تو بڑا انصوح میں اس کی دو شائیں نھوج اور کلیم کے کرداروں کی تخلیق میں موجود ہیں اور پھر یہ سلسلہ مزارتسا کی ادراؤ جان آواز سے ہوتا ہوا ہمارے زمانے تک پہنچتا ہے مختصر افسانے میں یہاں بھی تفصیلات کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن اشدوں اور کٹالیوں میں کرداروں کی فرضی کیفیات اور ان کے رد عمل کا جائزہ لے لیا جاتا ہے، منظر کے کردار طرح طرح کے ہیں اور وہ ان سب کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ طیب نہیں کہ نفسیاتی بیماریوں کا علاج تجویز کرے لیکن اس کی نظروں میں بیماریوں پر ضرور ہے، اس طرح کی ایک مثال منظر کے بدنام افسانے دھواں میں ملتی ہے، اس افسانے میں دریا میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک تو یہ کہ ان باپ کے تعلقات کا اثر نو جوانوں کا پرکس طرح ہوتا ہے، منظر نے یہاں بات اشدوں میں کی ہے جس کا وہ کم عادی ہے لیکن بات صاف ہو گئی ہے:-
”اُدھر اُدھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے، بارش اب رگ لگی تھی، مسعود نے ہاکی اور گیند نکالا اور صحن میں کھیلتا شروع کیا، ایک باوجود اس نے ڈھک سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھوں سے کمرے کے دروازے پر لگی، اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی، کون ابھی میں ہوں مسعود، اندر سے آواز آئی کیا کر رہے ہو جی کھیل رہا ہوں۔ کھیلو، پھر قھوڑے تو قھنٹ کے بعد اس کے باپ نے کہا تمھاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔“
نویادہ طور پر چھانا:-

ماں باپ کا سرد باری ہے۔ وہ خود فقوشی پر پہلے اپنی بہن کی کروا چکا تھا، اور دوسرے نے اس نے ایک اور عجیب منظر دیکھا، اس کی بہن کلثوم اور اس کی سہیلی بکلا اس افسانے میں بلاشبہ نفسیات کا سادہ کا سادہ ہے اور نہ سننے والے کو ایک جگہ تو کچھ گھسی سی محسوس ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک خاص اصول کی وجہ سے ہمارے یہاں صحت مندانہ جنسی تسلیم کا امکان نہیں اور اسی لیے اس طرح کی چھیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ بھی اسی طرح کا ایک افسانہ ہے اور عصری کی ٹولی میں بھی صحت شعور میں بھی مسئلہ ہے۔

طوائفوں اور عیاش عورتوں کے نفسیاتی مطالعے منٹو کو خاص طور پر بہت مرغوب تھے۔ منٹو نے جس طرح کی زندگی خاص طور پر فوٹو، دہلی اور بمبئی میں گزاری تھی اس نے منٹو کو ان طبقوں کے کرداروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا تھا۔ اس کی ایک مثال خوشیاں میں ملتی ہے۔ خوشیاں ایک سریشور دلال ہے، اسے علاقے کی چھوٹوں کا سارا مال معلوم ہے لیکن کاغذ جب اس کے سامنے بالکل نکل چلی آتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے کیونکہ اس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر نہ لگا نہیں دیکھا تھا۔ یہاں سے قہقہے کا آنا پانا شروع ہوتا ہے اور خوشیاں کا کردار عورتی طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی مطالعوں کے سلسلے میں نعرہ بھی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ کیثور دلال ایک سینٹو کے مکان میں کرایہ دار ہے برسوں کرایہ ادا کرتا رہتا ہے۔ اندھ لڑکے وقت آتا ہے کہ وہ دھیسے کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اور سینٹو اسے نکال دیتا ہے۔ اس نکالی کو سن کر کیثور دلال پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا منٹو نے ٹری خوبی سے تجزیہ کیا ہے اور بلاشبہ یہ افسانہ منٹو کا اس طرح کے دوسرے افسانوں کے خوب سے پاک اور مثالی افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں، جسٹ اور نکالی شلواری بھی اسی طرح کے افسانے ہیں۔

ایک اور مختصر منٹو کی تمام تحریروں میں جاری و ساری ہے طنز ہے۔ ایسا بھرپور طنز جس کا اور کبھی خیالی نہیں جاتا، جس میں شہ کی مٹی جوتی ہے اور تلخی مٹی۔ اس طنز میں بھی منٹو کبھی کبھی تنگ ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ کیا کہے جن زخموں کو وہ دکھانا چاہتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے جسم پر صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور دس دس کرنا مشورین چکے ہیں، ہم ان کا علاج کرنے کے بجائے انھیں کپڑوں کی تلوں میں چھپاتا چاہتے ہیں اور اس طرح خود غریب کا شکار ہیں۔ ہم نے اخلاق اور شرافت کا ایک معیار بنا رکھا ہے۔ لیکن ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے ویسا ہی ہر جگہ ہے اور ہم صرف کپڑوں اور نعروں کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں، جنھوں نے منٹو کا افسانہ جسٹ پڑھا ہے وہ اس زخم کو دیکھیں جو طوائف کہلاتی ہے۔ اب یہ موضوع نیا نہیں رہا۔ نظریہ تھک کی ہریالی سے مرزا آسوا کی امر و جان اور قاضی عبدالغفار کی بیٹی تک ہم اپنے افسانوی ادب میں اس کے بہت سے دوپ دیکھ چکے ہیں۔ نظریہ احمدیے چارے مولوی تھے، یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے ایک طوائف کو ادب کے مقدس اربابوں میں آنے کی اجازت دے دی۔ یہ اور بات سمجھ کر انھیں اپنے اس کردار سے آخر تک مولویاؤں کو گدہ ہی ہے

منٹو کی حقیقت نگاری

منٹو کو کاسب سے بڑا نہیں، تو بہت بڑا افسانہ نگار ضرور ہے۔ اُس نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور بہت جڑے بھی۔ اس کے یہاں بھندی اور پستی، ادھنی اور تاریکی، سب سے بڑیک وقت دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس کیفیت کو مجموعی طور پر اس کی غمازی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ پستی اور بھندی کا یہ تفاوت فکر و فن کی استواری سے محروم کر دیتا ہے۔ ٹیکے منٹو کے یہاں اس غمازی میں ایک غریبی بھی نظر آتی ہے۔ اور وہ غریبی یہ ہے کہ منٹو نے زندگی کے بُرے اور بچے، صاف اور کثیف، ہر پہلو کو دیکھا ہے اور ان میں ہر ایک کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اُس کے تمام احوال و امور مکمل جاتے ہیں اور سارے منسوب و قرار آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ منٹو کی غریبی یہ ہے کہ وہ باتیں اس کے یہاں کانٹے کی طرح کھینکتی ہیں، ان میں بھی زندگی کی حقیقت کا کوئی نہ کوئی رخ اور اس کی اصلیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف حقائق تک اس کی نظریں بڑی بے باکی اور دراکی کے ساتھ پہنچتی ہیں اور ان کو چوری طرح نمایاں کر دیتی ہیں۔ منٹو اس اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کے رنگا رنگ پہلوؤں کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اسی لیے افسانہ نگار اور اس کے مختلف حقائق اپنے تمام تنوعات کے ساتھ اس کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ اسی کو اس کی حقیقت نگاری کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

حقیقت نگاری کا ادبی تنقید میں رواج جو صحیح مفہوم ہے وہ پوری طرح تو منٹو کے افسانوں میں نہیں ملتا۔ کیونکہ زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر میں کو موجودہ دور میں حقیقت نگاری کی بنیاد بکھا جاتا ہے وہ منٹو کے افسانوں میں نہیں ہے۔ منٹو نے زندگی کو دیکھا ضرور ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے، لیکن اس سلسلے میں ان معیاروں اور قدروں کو اس نے اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے جن کے ہاتھوں نقطہ نظر اور نظریہ حیات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسی لیے منٹو کے افسانوں میں کوئی مخصوص فکر و فلسفہ نہیں ملتا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ زندگی کو کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس کو کس سانچے میں ڈھلے اور کس شیشے میں آئینے کا رخا ہند ہے۔ اس کو منزل کاظم نہیں ہے، وہ تو صرف راستے کا ایک مسافر ہے اور سفر کی کوئی منزل نہیں ہے۔ منزل سے بے نیازی اور صرف راستے پر گامزن رہنے کی خواہش نے منٹو کو اس کے تمام منسوب و فرائض آگاہ کر دیا ہے۔ اس کے سارے احوال و امور اس پر روشن ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں زندگی کے ان گنت پہلو اس کے سامنے آ گئے ہیں۔ اس لیے ان سب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور ان میں سے اپنے فن کی مختلف سمجائی ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل اور جزئیات موجودہ افسانہ نگاروں میں جیسی منٹو کے یہاں ملتی ہیں، کسی اور کے یہاں اس کی حشر حشر بھی نظر نہیں آتی۔ اس لیے نقطہ نظر اور نظریہ حیات نہ ہونے کے باوجود اور معیاروں اور قدروں کے نہ ہونے کے باوجود اس نے زندگی کے حقائق کو اس

نے زندگی کے حقائق کو اس غریبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے یہاں خود بخود زندگی پیدا ہو گئی ہے — اس کی زندگی میں جو کچھ بھی ہے، جو کچھ بھی سرد ہے، جو کچھ بھی تھا، جو کچھ بھی برتنا رہا ہے، منظر اس تفصیل و جزئیات کو پیش کرنے کا فن کار ہے — یہاں اس کی واقفیت ہے — یہی اس کی حقیقت نگاری ہے — یہ جانے ہوئے بھی کو حقیقت نگاری کا یہ قصور جدید نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے، اسی چاہتا ہے کہ اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جائے — کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے ماضی اور حال کے حقائق کی تفصیل و جزئیات موجود ہیں مستقبل کا احساس بھی اس میں ہوتا تو اس کی تکمیل و برپائی ممکن منظر نے ماضی اور حال کی متنوعی میں جو کمال دکھایا ہے اور اس سلسلے میں جس طرح مختلف رنگوں کی آمیزش سے اپنی پیش کی ہوئی تصویروں میں زندگی کی کھلیاں ہماری ہیں، وہ مستقبل کے خیال کو نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے — لیکن ماضی اور حال کے مختلف پہلوؤں سے زندگی کے بے شمار حقائق سامنے آتے ہیں — منظر نے ان حقائق کو ایک نو نو گراں کی طرح پیش نہیں کیا، بلکہ ایک صورت کی طرح ان کی تصویریں بناتی ہیں اور دھتے تیار کیے ہیں — اسی لیے حقیقت نگاری کے علاوہ مضموم سے چوری طرح ہم آہنگ نہ ہونے کے باوجود منظر کی یہ ترہائی حقیقت نگاری معلوم ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ منظر نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جزئیاتی کی ہے، اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کرنا ایک بہت بڑا دعوئی ہے۔ بعض کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے — خصوصاً وہ اس سے خدا بھی متفق نہیں ہو سکتے جو بعض اصولی و نظریاتی کو حقیقت سمجھتے ہیں، ایسے لوگوں کے نزدیک تو زیادہ سے زیادہ ایک واقعیت نگار یا منظر نگار (NATURALIST) کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے پیشرو فلسفہ ایسے ہیں جن میں اس نے زندگی کو جس طرح دیکھا ہے، بس جو ہر اسی طرح پیش کر رہا ہے — اپنی طرف سے کوئی خاص بات نہیں کہی ہے۔ لیکن خدا خود سے دیکھا جانے تو منظر کے انسانوں کے بارے میں یہ خیال پوری طرح صداقت پر مبنی نہیں ہے: اس میں شک نہیں کہ اس کا خاص میلان واقعیت نگاری رہا ہے۔ زندگی میں روپ میں بھی اس کے سامنے آئی ہے، اس نے جو ہر اس کو اسی طرح پیش کر رہا ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کی پیش کرتے ہوئے وہ کھل کر بہت کچھ نہ کہنے کے باوجود، کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے — انسان اور انسانیت کی آواز جگ جگ اس کے یہاں سنائی دیتی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اس زندگی کے سماجی پہلوؤں کا گہرا شعور نہیں رکھتا — اس لیے اس کے یہاں انسان اور انسانیت کی آواز بڑی حد تک صدادت سے باز گشت (MERE CHOES) میں جاتی ہے۔ لیکن اس کا احساس انشاؤں میں اس کی نظر اتنی گہری اور اس کا تحلیل اتنا بلند ہے کہ وہ اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے بھی زندگی کے سمندر سے حقائق کے مرقی نکال ہی لاتا ہے — منظر کے یہاں اس سلسلے میں بڑی صداقت نظر آتی ہے، بڑی ہی جذب و شوق کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ ایسا کہتے ہوئے ان حقائق کو بھی سامنے لاتا ہے جو عام طور پر نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن انسانی زندگی میں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں — منظر کے یہاں حقیقت نگاری کا کوئی ایک مخصوص قصور نہیں ہے، بہت سے قصورات ہیں — کیس وہ زندگی کے سماجی اور انسانی پہلوؤں کو حقائق کے روپ میں دیکھتا ہے، اکیس انسانی زندگی سے عام واقعیت اس کے یہاں حقائق کو رد کرنا کرتی ہے، غرض اس کے یہاں مختلف روپ ہیں — اس نے ان حقائق کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔

مختلف پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالتا ہے۔ — یہی سب کی تفریم انسانی زندگی سے دلچسپی کا ایک خیال ضرور کارفرما نظر آتا ہے۔ یہی انسانی زندگی منظر کے فنیہ میں حقیقت اور حقیقت کا رنگ بھرتی ہے اور اسی کے سلسلے اس کا فنی حقیقت نگاہی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ منظر کے افسانوں کا بنیادی عرصہ عام انسانی زندگی ہے۔ اس کے تمام موضوعات اسی طور کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے تمام خیالات کی بنیاد اسی انسانیت، انسانی زندگی پر استوار ہے۔ منظر اس دائرے سے باہر نکل کر کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ ہر حال میں وہ اسی کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ انسانیت اس کے نزدیک ترقی سے عبادت ہے۔ اس لیے وہ ہر انسان کو ترقی پسند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ادب یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے، لہذا وہ اس کے لیے زمین ہے یا کوئی اور چیز ہے۔ لکھا جاتا ہے سماعت حسن منظر ترقی پسند انسان ہے۔ — یہ کیا جہود کی ہے۔ سماعت حسن منظر انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی بُرائی کا ثبوت دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں یعنی وہ خود ترقی نہیں چاہتے۔ میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہش مند رہا ہوں۔ اور ترقی سے اس کی مراد انسان اور انسانیت کی تکمیل ہے۔ — یہ جذبات اس کے یہاں بڑا کارفرما رہتا ہے۔ — اجمتاس جندے کے اس کے یہاں مختلف ادب ہیں۔ — کیس انسانی کاسد حار ہے، کیس انسانی جذبات کی تفریب ہے، کیس انسانی روابط کی اہمیت کا احساس ہے، کیس انسانی دشمنوں کی ضرورت کا خیال ہے۔ — کیس انسانی زندگی کی کمزوریاں ہیں، کیس اس کی خامیاں ہیں، کیس اس کی بے راہروی ہے، کیس بے عزتی ہے۔ — کیس اس کی بے بسی ہے، مجبوری ہے۔ — غرض انسانی زندگی کے ان گنت روپ منظر نے اپنے انسانی ہر پیش کیے ہیں۔ —

انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرنے میں منظر کے یہاں جبر و نگرانی ملتی ہے، وہ بدلتے ہوئے حالات کے شدید احساس کا نتیجہ ہے۔ — منظر تبدیلی کے عمل کا ناگاہک ہے۔ وہ تخیل کے قانون پر ایمان رکھتا ہے۔ — اس کے خیال میں حالات کی یہ تبدیلی ادب اور فنی کو تیز رفتاری سے جھٹکا کرتی ہے۔ — ایک دور کا ادب دوسرے دور کے ادب سے اسی بے خلقت نظر آتا ہے۔ — اس کے خیال میں حالات کا اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ آبادانی تھی۔ لوگ آرام پسند اور وحش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں۔ وہ خود کی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو اس زمانے کے ادب میں پرکاری تھی اس زمانے کا شاعر اپنے اسل ٹرٹا کی بزم رنگ پر زور دے کر نظم لکھتا تھا اور بہت بڑا شعر تسلیم کر جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی ہی زندگی کے قوسے لکھتا ہے جو جرمز اور پیریں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اُس دور کا ادب بے طعن انسان تھا۔ آج کا ادب ایک غیر طعن انسان ہے۔ اپنے اہل، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غیر طعن ہے۔ اُس کی بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اُسے ترقی پسندی کہتا ہے، کوئی فحش نگاری اور کوئی مزاح پرستی۔ — یہ سبھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر کرات سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو جو آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر کرات سوار رہی ہے اور کیوں نہ ہے ہر مرد کے اعصاب پر کیا جتنی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے۔ ۶ جب گھوڑے گزریں گے تو کوڑے لگتے ہیں تو مرد ادب توں کو کوڑے کو غل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں۔ — ساری فحش گزریں سے کہیں زیادہ جو صورت اور فکر خیز ہیں۔ — اس لیے اس نے ان صورتوں کے بارے

میں بھی افسانے لکھتے ہیں۔ اور عورت کی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی حقیقت نگاری کا ثبوت یہ ہے کہ جسے ہوسے حالات کے زیر اثر وہ عورت سے متعلق محض جذباتی اور روانی پہلوؤں ہی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس سے باور ہو کہ اس کی زندگی کے بڑے ہی سنگین پہلوؤں کی طرف بھی توجہ کرتا ہے۔ چنانچہ عورت اس کے یہاں طوائف کے روپ میں بھی آتی ہے لیکن یہ طوائف قیصر کا زلیخا اور دیوید نہیں رہتی، ایک بھیا تک صورت بھی اختیار کر لیتی ہے کیونکہ منشور اس کی زندگی کے صحیح اور تاریک پہلوؤں کو بھی بے غائب کرتا ہے۔ بلکہ یہ کتنا زیادہ صحیح ہے کہ ان پہلوؤں پر ان کی نظر زیادہ پڑتی ہے۔ اور نسبتاً زیادہ گہرائی کے ساتھ پڑتی ہے۔ منشور میں سادی باقوں پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کی نظریں اندر تک سمجھتی ہیں۔ اور وہ بڑی میٹھی باقوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی بہت پسند طبیعت چھوٹی چھوٹی باقوں میں بھی اہم پہلو تلاش کر لیتی ہے۔ اس نے خود اس صورت حال کو واضح کیا ہے۔ لکھتا ہے: جب میں ٹریس میں چلتا چلتا اپنا تیار خیرا ہوا لٹریچر دیکھتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ لوگ اسے دیکھیں اور مطلب ہوں تو مجھے اپنا سطرچ بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ میرے ٹریس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاندان سے اڑھائی ہے اور پھر اس کے غور سے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لیے ذرا دلچسپی پیدا نہیں ہوتی لیکن جب میرے ٹریس میں کوئی عورت اپنے خاندان سے لڑکھو اور خوشی کی دھمکی دے کر سینا چلی جاتی ہے اور اس خاندان کو دھمکے تک بھرت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو اسے زکام کے برابر ہی سمجھتے ہیں۔ مگر وہ لڑکھو کو میری توجہ کو منحرف دیکھنے کا جوش برکے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان بوجھتی ہیں، لیکن وہ حقیقت وہ محبت کا اتنا ہی جھوٹا ہے۔ جتنا لڑکھو کا غارتوہ باشندہ۔ اس بظاہر کامیاب عاشق کی دہلیز باقوں میں جو ٹریڈی سسکیاں بھرتی ہوئی ہیں، اس کو میں اپنے دلی کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سنائوں گا۔ چکی پیسنے والی عورت جہون بھر کام کرتی ہے اور اس کو اطمینان سے سو جاتی ہے۔ میرے افسانوں کی سڑوئی نہیں ہو سکتی میری سڑوئی چمکے کی ایک ٹکھیا کی دھڑکی ہو سکتی ہے جنات کو جانتی ہے اور وہ کو سوتے ہیں کبھی کبھی یہ قواؤں کا خواب دیکھ کر شہسختی ہے کہ بڑھاپا اس کے دوازدہ برس ہر دستک دینے آیا ہے۔ اس کے بھاری بھاری چہرے جن پر برسوں کی آغوش ہوئی غنیمت سمجھ ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن گئے ہیں اس کی غلامت، اس کی بھلیاں اس کا پڑ پڑنا اس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں۔ اور گھر میں خواتین کی شستہ کلاسیوں، ان کی صحت اور ان کا فحاش پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔ گویا انسان کیا جزا ہے، حالات اسے کیا بنا دیتے ہیں، زندگی اس سے کیا کیا کچھ کر لیتی ہے، اسے زندگی کو سیر کرنے کے لیے کن کن راہوں سے گزنا پڑتا ہے، منشور کے یہاں ان سب کی طرف توجہ زیادہ ملتی ہے اور اس غیر معمولی توجہ کا سبب یہ ہے کہ وہ زندگی کے مذہمات پر کڑھتا ہے۔ اس کی ناسازگار حالت پر افسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے اس کے یہاں نشریت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس نشریت میں صحت کو سدا رہے اور ان کو کسی نئے سانچے میں ڈھانے کا ایک دبا ہوا احساس بھی کاغذ پر رہتا ہے۔ اور یہی کیفیت اس کے فن کی حقیقت نگاری سے قریب کرتی ہے۔

منشور زندگی کی تحنیوں اور اس کی خون آشامیوں کا فن کار ہے۔ اس کی لہروں اور سرخوں کا احساس اس کے یہاں نہ

ہونے کے بارے — زندگی کی ناسازگار حالت کے شدید احساس نے منٹو کو ان لذتوں اور مستیوں کے احساس سے بڑی حد تک محروم کر دیا ہے۔ وہ مستیوں کو دیکھتا فرد ہے۔ لذتیں اُسے ضرورتاً ہی ہیں لیکن زندگی کی بے غوریزوں کا شدید احساس، ان لذتوں اور مستیوں سے اُسے محفل نہیں سجانے دیتا۔ اسی لیے اُس کے افسانے بعض اوقات ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جہی حالِ غم کی ترجمانی اور جس ماحول کی عکاسی وہ کرتا ہے، وہ خود ناقابلِ برداشت ہیں۔ اس نے خود دیکھا ہے۔ زندگی کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ایسی افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو بڑیاں ہیں وہ اس عہد کی بڑیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ اصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔ میں ہنگام پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں بوجھان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چوٹی کی باتوں کو جو میری نگاہ میں اُسے کڑے پیمانے کی کوشش بھی نہیں کرتا اس لیے کہ میرا کام نہیں دوسروں کا ہے۔ منٹو نے سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کو غلط دیکھا ہے۔ اور اسی لیے اُسے منٹو دکھایا بھی ہے۔ اسی لیے لوگ اُسے دیکھ کر شینٹا بھی جاتے ہیں۔ ان میں گھول مٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کا دھڑواہی جگہ باقی رہتا ہے کہ سوسائٹی نگاہ سے، تہذیب و تمدن پر ہرگز ہے۔ اس کو کڑے پیمانے کا کام بھی منٹو اپنے فتنے لینا چاہیے تھا۔ اس کام کو دوسروں کے سپرد کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہر حال منٹو اس برہنہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے زندگی کے ذمہ داری پر اس کی نظریں بڑی گہری پڑتی ہیں۔ وہ اس سلسلے کی تمام حقیقتوں کو معلوم کر دیتا ہے۔ اور اسی کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے یہاں رومانیت نام کو بھی نہیں ہے۔ اس نے زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کو اپنا مزاج بنالیا ہے۔ حلیہ جوتہ افسانہ نگاروں میں وہ واحد فنکار ہے جس کے مزاج میں رومانیت کا اثر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو تکمیل پرست نہیں ہے وہ جو کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، اُسی کو اپنے فنی کام شروع بناتا ہے۔ خارجی حالات کو دیکھ کر جو باتیں اس کے ذہن میں آتی ہیں انہیں اس کی تفصیل و جزئیات کو پیش کرتا ہے۔ منٹو نے اپنی طوٹ سے خیالی دنیا میں تمام نہیں کی ہیں۔ اپنی طوٹ سے اس نے بہت کم باتیں کہی ہیں۔ جو کچھ اُس کی آنکھوں نے دیکھا ہے، وہ اُس کے لبوں پر آگیا ہے اور اس کی تفصیل اس کے قلم سے افسانوں کی شکل میں نیکس پڑی ہے۔ اسی لیے دماغی پہلو اس کے یہاں خدا بھی نمایاں نہیں ہوتا۔ وہ شروع سے آخر تک زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کا ترجمان اور عکاس ہی رہتا ہے۔

یہ صورت حال منٹو کی لڑائی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ جس وقت اس نے لکھنا شروع کیا ہے، اس کے آس پاس وہ گورو بخش رومانیت کی عداوت خاضی مستحکم صورت میں موجود تھی۔ ہر چند کہ اس وقت تک جذباتی رومانیت کی اس تحریک کا غائر ہوجا تھا جس نے ایک زمانے تک ادبیت کے گہرے گائے تھے۔ لیکن اس کے بعد واقعیت کا جو نیا رخ پید ہوا تھا، اس میں بھی رومانیت کا رنگ سما گیا تھا۔ انقلاب کے قصصات تک اس زمانے میں جذباتی اور دماغی تھے۔ اس میں لکھنے والوں کے دماغی مزاج اور جذباتی افکار طبع کو بڑا دخل تھا۔ اس کے نتیجے میں اس کی واقعیت اور حقیقت بھی رومانیت سے علی علی معلوم ہوتی تھی۔ افسانے میں اس رومانیت کے اثرات، پھر زیادہ ہی نمایاں تھے۔ پریم چند نے اس دماغی رومانیت کے بہت کو توڑا تھا لیکن ان کی رومانیت سنگین جملوں کا غائر ذکر سکی تھی۔

اس زمانے میں بھی روایت کی یہ روایت روپ بدل کر اپنے آپ کو مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں دولہا کر رہی تھی۔ کوشی چند اور عصمت اس زمانے کے جوئی کے فی کار تھے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی طریت قدم قدم بڑھایا ضرور ہے لیکن چونکہ روایت ان کے تحریر میں داخل تھی اس لیے ان کا فنی بھی اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ غرض روایت کے اثرات اس وقت تک موجود تھے۔ منٹو نے اس روایت کے ثبوت کو پوری طرح توڑا اس کے مخرج میں روایت نہیں تھی۔ اس لیے اس کے اثرات اس کے افسانوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ منٹو کا کمال یہ ہے کہ افسانہ نگاری کے بڑے ہی نازک جذباتی معاملات کو چیل کرتے ہوئے بھی وہ جذباتی نہیں ہوتا اس کے یہاں جذبات کی اہمیت کا احساس تو ہے لیکن جذباتیت نہیں ہے۔ اسے محض تحلیل کے دھار سے برہنہ نہیں آتا۔ اسی لیے اس کے یہاں روایت کا اثر نہیں ملتا۔ وہ اپنی ذات کو مثال کیے بغیر زندگی میں اس حقیقت کو دیکھتا ہے جو ایک خارجی وجود رکھتی ہے۔ اسی لیے منٹو کے یہاں حقیقت کا ادراک ہے لیکن اس میں محسوسات کو دخل نہیں ہے۔ برعکاس اس کے اگر اظہور ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے حقیقت منٹو کے یہاں ایک خارجی وجود رکھتی ہے اور وہ حقیقتوں کو اسی طرح دیکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے فنی میں حقیقت نگاری کے خط وخال اس دور نمایاں ہیں۔

منٹو کی حقیقت نگاری کی پہلی قوز زندگی کے شدید احساس اور صبح شعور کا نتیجہ ہے۔ اور کہہ فرانسس اور اس کے بعض حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے گھر سے اثرات بھی اس میں شامل ہیں۔ منٹو زندگی اور اس کے مختلف شعبوں سے قریب رہا ہے۔ اس نے اسی میں سے ہر ایک میں گہری دلچسپی لی ہے۔ اس کی ایک ایک بات کو اس نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ایک ایک پہلو کو کھینچ کر کشش کی ہے۔ اور اس طرح زندگی کی تمام حقیقتیں اس پر بے نقاب ہو گئی ہیں۔ زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے خفاقی سے وابستگی نے منٹو کو بعض اہم حقیقت پسند افسانہ نگاروں کا گردیدہ بنایا ہے۔ دینی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں منٹو نے دوس اور فرانس کے افسانہ نگاروں سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے افسانہ نگاروں کے یہاں اسے زندگی اور اس کی حقیقتیں اپنے اعلیٰ روپ میں بے نقاب ملی ہیں۔ چیخوت، ترجمیت، اٹالیشائی، موہاساں، بالڈاک اور غلو تیر وٹرو کے اثرات اس پر بہت گہرے ہیں۔ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ ایک زمانہ اس پر ایسا گوارا ہے کہ جب اس نے ان افسانہ نگاروں کے بہت اچھے تجربے بھی کیے ہیں۔ اس لیے ان کی حقیقت نگاری نے منٹو کو براہ راست متاثر کیا ہے۔ اور جب آگے چل کر اس نے خود افسانے لکھے ہیں تو ان افسانہ نگاروں کے رنگوں کی جھلک خود اس کے فنی میں پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کی تقلید کی ہے۔ اس کے یہاں اس سلسلے میں تحلیل نہیں بلکہ اجتہاد ہے۔ اس نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنا ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے۔ اس لیے اس کی حقیقت نگاری ترجمیت، چیخوت، موہاساں اور بالڈاک سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ ان سب کے یہاں حقیقت کی ترجمانی میں ایک دھماپا ہی ملتا ہے، منٹو کے یہاں اس کے برخلاف ایک جیڑی، اتھری اور ٹیکھا بھی ہے جس کے اثرات اس کے فنی میں ہر جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں۔ منٹو کی حقیقت نگاری اسی جیڑی، اتھری اور ٹیکھے پر سے بھجانی جاتی ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں سے ہر ایک نے اپنے فنی کے لیے ایک مخصوص میدان تلاش کیا ہے، ایک مخصوص راہ نکالی ہے

منظر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے افسانوں کا بھی ایک مخصوص میدان ہے۔ اس نے بھی اپنے فن کے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ منظر کا یہ میدان دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح محدود نہیں ہے۔ موضوعات کے تنوع سے اس نے اس میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ منظر زندگی کا فن کار ہے اور زندگی تنوع سے عبارت ہے۔ اس لیے اس کے افسانوں کے موضوعات میں زندگی ہی کی طرح تنوع نظر آتا ہے۔ منظر نے زندگی کے سماجی اور اخلاقی معاملات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ عام انسانی مسائل کو سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ نفسیاتی حقائق پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ غرض اس کے یہاں زندگی کے تمام پہلوں پر ساری زندگی کے ساتھ بے تعصب نظر آتے ہیں۔ منظر نے ان سب کی تفصیل و جزئیات کو گہرے مشاہدے کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان سب کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اس کا زوئیہ نظر انسانی رہا ہے۔ منظر کے یہاں اس انسانی زاویہ نظر کے مختلف روپ ہیں۔ اور اس کے ہر افسانے میں اس کا کوئی نہ کوئی روپ ضرور دکھائی دیتا ہے۔ منظر نے اپنے افسانوں کے مختلف اور متنوع موضوعات کی بنیاد پر اسی انسانی زاویہ نظر پر استوار کی ہیں۔ یہ انسانی زاویہ نظر منظر کے یہاں زندگی کے عام حقائق کی ترجمانی اور عکاسی میں محدود معاون ہوتا ہے اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری اس کو اپنے وجود کے لیے ایک سہارا بناتی ہے۔

یہ بات کسی تقدس پر ضرور ہے کہ منظر کے فن نے سیاسی انتشار اور معاشی فقر و غریبی کی آغوش میں، آنسو کھونٹے کے باوجود، ان معاملات کی طرف اس کیچہ زیادہ توجہ نہیں کی۔ وہ سیاسی اور سماجی اقتدار کی نا اہماری کا احساس رکھتے ہوئے بھی ان معاملات سے متعلق کوئی بڑی گہری باتیں نہیں کہہ سکا ہے۔ صرف بلکہ بلکہ چند تاثرات کا اظہار ہے۔ ان تاثرات میں کسی قسم کی کوئی گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ ابتداء اولیٰ کی ایک قسم ضرور سامنے آجاتی ہے، حالات کا ایک نقطہ ضرور انکھوں میں چیر جاتا ہے۔ جستہ جستہ تو یہ کیفیت نظر کے بست سے افسانوں میں مل جاتی ہے لیکن جبری طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں اس کے افسانے کیا قانون اور لغوہ ایک نمایاں حیثیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ان میں گہرا سیاسی اور سماجی شعور تو نہیں ہے۔ لیکن ان کو پڑھنے کے بعد یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کے بعض حالات نے منظر کو متاثر ضرور کیا ہے۔ انہیں تاثرات کا اظہار ان افسانوں میں ملتا ہے۔ اور یہ تاثرات محض بعض حالات کی عکاسی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔

”نیا قانون“ میں درج کیے تو ایک کردار ان متادم منظر کے بعض خیالات اور چند حرکات و سکنات سے متعلق ایک کہانی ہے، لیکن ان سب کو پیش کرتے ہوئے منظر نے اس زمانے کی سیاسی حالت کی ایک تصویر بھی بنائی ہے۔ اور سیاسی حالت نے جس کشمکش کو پیدا کیا ہے اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ لیکن کوئی رسمی بات نہیں کہی ہے، جس سے اس کشمکش کا کوئی عمل بھی نکل سکے۔ منظر کی پروراز اس حد تک نہیں ہے، اس کی نظر تو صرف کشمکش میں کھسک رہ جاتی ہے۔ لیکن ویسے اس کیفیت کی ترجمانی اس نے بڑی ہی چابکدستی سے کی ہے۔ دراصل وہ دیکھا نامیہ چاہتا ہے کہ آئندہ منظر کو سب خدایت عقلمندانہ دئی گئے ہیں، ایک جڑے، تبدیلی کو کھینچتا نہیں۔ اس کا قریب کھاتا ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اُسے

بہرے لے لی ہوا کہانی پڑتی ہے۔ آئندہ منظر کا یہ خیال تھا کہ پہلی ایڑی کی کوجنیا قانون نافذ ہونے والا ہے اور زندگی کے اجازت کو بدل دے گا۔ اس لیے وہ خوش تھا کہ نیا قانون اُسے انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا دے گا۔ کیونکہ آئندہ منظر کو انگریزوں سے

بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب دورِ بھلاہٹ کا تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے ختم ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت شایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل مٹا ہے۔ اسی لیے وہ اکثر کتا قسم ہے جسکو ان کی این لاث صاحبوں کے نازا اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب بھی ان خاص چہرہ دیکھتا ہوں، دلوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون اور ان بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔“ نئے قانون کے ساتھ اسناد منلو کے دل میں مسرت غلامی سے چھٹکارے ہی کا خیال نہیں آیا، یہ لہر بھی آغشی کہ مہاراجاں اور ان کے سو بیوی اس کا اثر پڑے گا۔ وہ اس کے بعد وہ غریبوں کا خون نہیں چوس سکیں گے غریبوں کی کھلیاں میں گھسنے ہوئے کھنسل۔ نیا قانون ان کے لیے کھولنا غریبانی ہو گا۔ اور پھر یہ بات بھی اس کے ذہن میں پائی کہ اس کے بعد اس کا بادشاہ بھی کچھ نہ کچھ خود کے رہے گا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے ٹشنا کر انھیں شرم سے ہم ساز کھٹے گئے ہیں یا انھیں جگہ اتنے آدمی ملے، نجات کے الزام میں ہتھ پڑایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا۔ نئے قانون کی اہمیت اس کے دل میں اور بھی بڑھ گئی جب اُس نے دو گریٹ طالب علموں کی زبانی یہ ٹشنا کر دیکھا کہ گریٹ مارے مارے پھر رہے ہیں، ان میں کچھ تو کی ہو گئی۔ لیکن جی ایل کو بڑا یہ کہ نیا قانون تو نائنڈہر گیا لیکن زندگی تبدیل ہو سکی، نظام تبدیل نہ ہو سکا اور اسناد منلو کو اس حقیقت کا احساس اس وقت ہوا جب چھاؤنی میں ایک گورے کو پھٹنے کے سلسلے میں اُسے جیل خانے کی ہر کھائی پڑی۔ وہ سمجھتا تھا کہ نئے قانون کے تحت حفاظت بدل چکے ہیں اس لیے اپنے دل کی بھڑاس نکالی جا سکتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پولیس آئی تو وہ نیا قانون، نیا قانون چلا رہا لیکن انھوں نے ایک دشمنی اور اس کو حالات میں بند کر دیا۔ اس مختصر کہانی میں کئی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ ہندوستانی قوم کی انگریزوں سے نفرت، انگریزوں کی خواہش، آزاد خیال کا خیال، سرمایہ داروں کی دست و داری، اشتراکی نظام کی استواری، تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری، سب غریبانی جگر چھینتی ہیں۔ منظر نے ان کی ترجمانی غریب سے کی ہے۔ ہر جگہ ان حقیقتوں کے پیش کرنے میں کوئی بہت واضح سیاسی نقطہ نظر نہیں ہے لیکن جو حالات ہیں ان کی عکاسی ہی نے اس کو حقیقت نگاری کی سرحدوں میں داخل کر دیا ہے۔

غریب سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ معاشی اقدار کی انگریزوں کے ہاتھ میں پیدا ہونے والی الجھنوں اور پریشانیوں کو بھی شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ بہت سے انسانوں نے اس کی علوت اظہار ہے۔ ————— ایکٹو غریب اس نے اس صورت حال کو بڑی غریب سے پیش کیا ہے۔ غورہ ایک ایسے شخص کی الجھنوں اور پریشانیوں کی کہانی ہے جو انڈیا کا شکار ہے اور جس کو موجودہ سماجی نظام اقدار میں غفلت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ کیشو لال کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی کھوئی کالہ پر تنگ دوا نہیں کر سکتا، اور جب اس کو کوئی کاماک، اس سے دو مہینے کا بقیہ لکرایہ طلب کرتا ہے تو اس کی بھرمیں نہیں آتا کہ کیا کرے وہ گھبرا جاتا ہے پریشان ہو جاتا ہے اور زمانے نے مختلف اوقات میں اس کے دل پر جو زخم مل گئے ہیں وہ سب کے سب ہرے ہو جاتے ہیں۔ کل کے تمام ڈاکوہر اس کے لیے رچ کر نکلیں ہیں جس جاتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کی باقی دو ٹیڑیاں پھر انھوں پر سیکنڈ شروع کر دیتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ سوچتا ہے۔ اور اس کی نظروں اپنے گھر کے اندر سب کو کئی بار پھل کے اس

بلب سے ٹکراتے ہوئے دیکھتی ہیں جو مالک مکان کے گھنے سر پر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے سر پر بونگے پڑے۔ ان کھنٹوں پر ملک کو پھر اُس کے پیٹے بدن پر چھٹ جاتے ہیں جو یو ایس گولی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اُسے اُن داٹا جگران کا خیال آتا ہے جو بہت دور پہلے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ اسی حالت میں مکان داٹا اُسے گھل دیتا ہے۔ اور یہ گالی اس کے دل میں کچھ اور بھی بظاہر پکڑ دیتی ہے۔ وہ اسے یہی جانتا ہے۔ لیکن اُس کے جی میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ اس گالی کو جیسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریاں بھرے ہر سر پر تے کو دے۔ مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اُس کا خود تو باہر نٹ پاتھر پر پڑا ہے۔ غرض اس داٹا کی گنت خیالات کی آماجگاہیں جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ غریب ہے، اسی لیے اُسے دلی دلی گئی ہے اور اسی لیے اُسے یہ گالی سننا پڑی ہے۔ اگر اس کا راج ہوتا تو وہ اس سیٹھ کو گزہ پھکا دیتا جو اُسے اُن پر تے دو گالیاں سننا کا اپنے گھر میں توں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گیسے دار کو گھر میں سے دو گھنٹ نکال کر باہر پھینک دیے ہیں۔ یہ سوچ کر اس کا پتار راج ہوتا تو وہ چوک میں رت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو گھر میں کھڑا کر دیتا اور اس کی کئی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ بلبلا اٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھڑک ہنسو، اور خود اٹھا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دیکھنے لگتا۔ پراس وقت اُسے باطل سنی نہیں آتی تھی۔ کیوں؟ — وہ اپنے راج کے بغیر جی تو سیٹھ کے گھنے سر پر دھپا مار سکتا تھا۔ اُسے کس بات کی زکاوہ تھی؟ — نکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش رہا۔ لیکن اس کے سر پہنے کے ٹکڑوں میں کوئی نکاوٹ پیدا نہ ہو سکی اور اس نے کہیں تو زکاوہ یاں چلتی ہوئی دیکھیں، کہیں اُسے آگ کا ایک پتھر نظر آیا جو گھونٹے گھونٹے ضلعوں کی ایک بہت بڑی گوند سی بن گئی ہو اس کے آگے آگے زمین پر اچھلے کوڑنے لگی۔ وہ سڑک پر چلتا رہا۔ اور سڑک پر چلتے ہوئے اُسے انتقام کا خیال بھی آیا۔ انتقام کا خیال آتے ہی اُسے اپنی زبان پر لونا نکلیں ذائقہ محسوس ہوتا اور اُس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوتی۔ سو۔ سو۔ اُسے آسمان زمین سب لوگوں رنگے ہوئے نظر آنے لگے۔ سو۔ اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رنگوں میں سے بھی ہر چیز نکلتا تھا۔ لیکن انتقام اس کے بس میں نہیں تھا۔ اُس کی اس ذہنی کیفیت نے بہت سے حقائق اس پر روشن کیے۔ اپرو بندہ لوگ گیٹ سے آتے اٹھیا کے سامنے جب اُس نے بہت سی موٹریں قطار بند تھا کھڑی دیکھیں تو اُس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گندہ پیر جوڑے کسی لاش کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ ان حقائق پر غور کرتا ہوا انتہائی کرب کے عالم میں وہ ایک حایہ شان جڑی تک پہنچا۔ اور وہاں پہنچ کر بے اختیار اس کے ملتی سے ایک غور نکلا۔ کان کے پردے پھاڑ دینے والا غور، گھپٹے ہوئے گرم لاوے کی مانند نکلا۔ بہت تیزی۔ اسے یقین تھا کہ اس غور سے جڑی کی عمارت زمین پر جا بے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ایک شخص جس نے اس غور کو سننا اپنی جی سے کہنے لگا۔ ”پگھلے۔“ منٹوں میں افسانے میں غصوں کی زبوں حالی اور اس نہایت عالی کے زہر اثر پیدا ہونے والی ذہنی اور ذہنی کیفیت کی حقیقت سے بڑی بھرپور تصویر بنائی ہے۔ منٹوں میں ایک فرد کی بے بسی کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور اس بے بسی کو پیش کر کے اس نظام کے تشاؤ کو واضح کرتا ہے۔ جگہ جگہ اس میں ملکی کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں۔ انقلاب کا خیال بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ایک نئے نظام کی قضا بھی اپنے آپ کو کہیں کہیں رونما کرتی ہے لیکن ان سب باتوں کی تان ایک حساسی شکست ہی پر جا کر لگتی ہے۔ غرض اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے کہ اگرچہ موجود

نظام کے ہاتھوں یہی بات ایک حقیقت بن گئی ہے۔ اسی لیے منٹو کے یہاں ان معاملات کو پیش کرتے ہوئے کوئی جاہلانہ انداز پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے کردار ملل اور انقلاب کے بارے میں سوچتے خور ہیں لیکن کچھ نہیں پاتے۔ حالات نے انہیں بے بس بنا دیا ہے۔ منٹو اسی لیے زندگی کے ان پہلوؤں کا صریح عکاس بن کر رہا ہے۔ اس نے کچھ نہیں بڑھتا۔ لیکن اس کی یہ عکاسی بے قصہ نہیں ہوتی۔ اس عکاسی میں قدم قدم پر وہ کچھ ایسا جنما محسوس ہوتا ہے۔ زندگی کو سدھارنے کا پیام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی خصوصیت کا سارا رے حقیقت نگاری اس کے فن میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔

دوسری افسانے میں حقیقت نگاری کے جو مختلف روپ ملتے ہیں ان کے اثرات منٹو کے فن پر گہرے ہیں۔ جیغ و زور اور گورگی سے خاص طور پر وہ متاثر ہوا ہے۔ گورگی کے یہاں زندگی کے نظام اور ان کا جو رخ اور گرا شعور تھا ہے، وہ منٹو کے یہاں نسبتاً کم ہے۔ اسی لیے وہ گورگی کے مقابلے میں جیغ و زور کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ گورگی کے یہاں زندگی کا تجربہ ہے جو جیغ و زور کے یہاں اس کی عکاسی ہے۔ منٹو کا ایک افسانہ شغل ہے جو جیسکس گورگی کی یاد میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں منٹو نے گورگی کے شعور افسانے (TWENTY SIX MEN AND A GIRL) کی تکنیک استعمال کرنے کی طوری کشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں گورگی کی حقیقت نگاری کا انداز پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا موضوع بھی بہت بامال ہے۔ کچھ خرد میں جو میر سے شام تک ایک پٹاری طرح پر کام کرتے رہتے ہیں۔ روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتے رہنا ان کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسی طرح وہ اپنا بیٹ پال سکتے ہیں۔ ایک دن اس طرح پر ایک موٹر آئی اس میں ایک لہجہ ان نکلا۔ اور وہ منٹو چاکی کی دکان دام دہی کو لے کر گم ہو گیا۔ بعض مزدور اس واقعے کی ترمیم کر بیٹھ گئے۔ بعضوں نے اس سے چشم پوشی کی۔ وہ پڑت جس نے دام دہی کو اس لہجہ میں لکھے ساتھ بنجا دیا تھا اس نے مزدوروں کے اضطراب کو کچھ کر صحت یہ بات بتائی کہ میں نے ان سے دریافت کیا ہے کوئی بات نہیں۔ وہ دکانی کو ذرا غریبی کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ ان پکڑے صاحب کے صاف ہیں اور دکان بھلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دور لے جا کر چھوڑ دیں گے۔ امیر تو ہیں، ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ سن کر یہ کام کرنے والے درنگ خدا معلوم کن باگوں میں خرق رہے کہ وہ غصے فضل کی آواز نے انہیں چی نکا دیا۔ دوسرے فرد سے تھوک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گیلے کیا اور نیپے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں لٹا دے ہوئے کہا۔ اگر امیر زمینوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی ہوسٹریوں کا اللہ بلی ہے۔ بیساکو اس افسانے سے ظاہر ہے یہ سچا ہے۔ اس میں ایک سماجی برصاں کا تذکرہ ضرور ہے لیکن کسی گرائی کے ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اسی لیے اس میں وہ نکلیاں پیدا نہیں ہو سکا ہے جو منٹو کے بعض دوسرے افسانوں میں ملتا ہے۔ لیکن ہر حال اس افسانے کی حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اسی باتیں ایک غلط سماجی نظام میں عجیب نہیں ہیں۔ منٹو اس افسانے میں اسی حقیقت کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اظہار میں نظریات نہ سہی لیکن سچی زندگی کے ایک تاریک پہلو کا اظہار تو ہے۔ اسی لیے اس حقیقت کے اظہار میں گورگی سے کہیں زیادہ جیغ و زور کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس میں وہ سادگی اور صمیمیت ہے جو جیغ و زور کے ساتھ محسوس ہے۔ وہ گرائی، انشیت اور نکلیاں نہیں جس سے گورگی حقیقت نگاری پہچانی جاتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغلوں کی سماجی حقیقت نگاری، نشریت اور تنقید ہی سے یکسر خالی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ منظر کے یہاں گرائی کا احساس البتہ کم ہوتا ہے۔ دیکھی نشریت اور تنقید ہی اس کی سماجی حقیقت نگاری میں جگہ جگہ اپنا اثر دکھاتے ہیں اور یہ صورت حال اس وقت اس کے افسانوں میں خاص طور پر پیدا ہوتی ہے جب وہ انسانی زندگی کے حدود پر تاریک پہلوؤں کی پودہ دہی کرتا ہے جب وہ انسانیت کے جسم پر شرٹے ہونے زخموں کو بڑی بے رحمی سے کر دیتا ہے۔ اس خیال سے کہ افراد کو ان زخموں کی اصلی حالت کا صحیح اندازہ ہو۔ اور منظر کی حقیقت نگاری کے جوہر یہیں کھتے ہیں۔ یہاں وہ اصل حقیقت کو دکھانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کہتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں اس کے سب سے اچھے انسانے وہ ہیں جو اس نے طوائفوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھے ہیں۔ اور جس میں اس نے ان خیمہ نشینوں کو واضح کیا ہے کہ طوائف انسانی زندگی کے خوشگوار حصے پر ایک بدنامدار رخ ہے۔ وہ ایک ایسا نامور ہے جو سا اسی سال سے دس رہا ہے۔ اس نامور کو دکھاتے ہوئے منظر نے طوائف کو ایک انسانی مخلوق کی طرح دکھایا ہے۔ اسی لیے وہ اس کی سرتوں، اس کے غموں اس کی سرکوں، اس کی ناکامیوں اس کی بالائیوں کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کر رہا ہے۔ منظر کے ایسے افسانوں کو پڑھ کر طوائف سے جلد دلی اور غلط نظام اقدار سے گھمن اور نفرت کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہیں سے مغلوں کا سیاسی کی حد شروع ہوتی ہے۔ اس موضوع پر منظر نے یوں تو بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن جنگ اوشنیا، کالی شلوا اور پچان اس دھماکے کے سب سے اچھے نمونے ہیں۔

منظر نے ان افسانوں میں اپنی مخصوص حقیقت نگاری کو ساری کمال پر پہنچا دیا ہے۔

’جنگ‘ سوگندھی کی کہانی ہے۔ وہ سوگندھی جو ایک طوائف بھی ہے اور ایک عورت بھی۔ بکریوں کنارا زادی بھی ہے کہ جو طوائف ہوتے ہوئے بھی ایک عورت ہے جس کو عورت بننے کی تڑپ ہے لیکن حالات جس کو طوائف ہی دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ ایک طوائف ہی رہتی ہے۔ سوگندھی دس روپے میں اپنا جسم بیچی تھی جس میں سے ڈھائی روپے اُسے دایم دل لال کو دینے پڑتے تھے۔ سوگندھی اپنے کام میں بڑی ہوشیار تھی۔ اُسے بے شمار گریز تھے۔ عام طور پر وہ یہ گریز سب کو بتا کرتی تھی۔ اگر اُن کی شریعت ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اُس سے خوب شواہد ملیں گرو، اُن کی گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستار، اُس کے گدگدی کرو۔ اگر ڈاکھی دیکھتا ہو تو اُس میں انگلیوں سے نکلی کٹے کٹے دوچار بال بھی فوج کو پریش بڑا ہو تو چھپتا پاؤ۔ اس کو اتنی صلت ہی نہ ہو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی پکی رہو گی۔ ایسے مرد جو گھنچپ رہتے ہوں، بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا دامن چل جائے۔ غرض اس میں طوائف کی تمام خصوصیات موجود تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک جذباتی عورت بھی تھی اُسے بے شمار گریزوں کے شہیک کرنے کے لیے یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی دوسری بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے دو کھپے ہیں کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور نھتھک ایک سیاسی عورت باقی رہ جایا کرتی تھی۔ ہر روز اس کا ہانکا یا ناٹا قاتی اُس سے کیا کرتا تھا۔ سوگندھی میں جھ سے پریم کرتا ہوں اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے پس ہم بوجھاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے پیچ پیچ اُس سے پریم کیا

جامد ہے — پریم کتا سندرجل ہے — یا پھر وہ خود اس کے اندر چل جاتے — اس نے چاروںوں سے اس پریم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا — اور ان کی نصیر رہیں اپنے سامنے نکالی تھیں۔ لیکن سرواں کے نہ ہو سکے۔ انہوں نے سوکھ بھی کو ایک طوائف ہی سمجھا۔ ایک زمانے میں آدھو کی باتوں نے اس پر ٹرا اثر کیا تھا۔ آدھو کو نامیں حوالدار تھا — اور اس حوالدار کی مرضی باتیں سنیں کہ وہ چند غلطی کے لیے خود کو حوالدار بنی سمجھنے لگی تھی — آدھو ہر پہننے کو تاسے تاسے ٹھٹھٹھ باتیں کر کے اُسے طلب سہانے چہننے دکھایا کرتا — لیکن کبھی کبھی وہ سوکھ کی کے کام نہ لیا۔ اس سے کچھ نہ لکھے سے ترقا تھا — اور وہ دسے دیتی تھی — ایک دن آدھو نے سوکھ کی سے پچاس روپے طلب کیے۔ اس ہلے سے کہ اس پر کوئی کیس ہو گیا ہے اور یہ رقم اُسے دار و فر کو دینی ہے — سوکھ کی کا کاروبار جاری تھا لیکن اب اس کی گرم باناری نہیں تھی — چند روز ہوئے ایک سیٹھ بڑی شکل سے اُس کے پاس آیا تھا اور تاج کی روشنی میں اُس کے پیر کے کو کھوکھرا سے ناپ سنا کہ نہجست ہو گیا تھا، گویا اس نے سوکھ کی کی ہنگ کی تھی — سوکھ کی پر اس واقعے کا کار اثر تھا — چنانچہ جب آدھو نے پچاس روپے کا سال کیا تو اسے کچھ اس بات کا احساس ہوا کہ آدھو اُسے ہر طرف بنارہا ہے — چنانچہ اُس نے اُسے خوب اڑے ہاتھوں لیا — کھری کھری سنائیں۔ اور اس کے خارش زدہ کتے نے آدھو کو کرے سے باہر نکال دیا — اور جب آدھو چلا گیا تو سوکھ کی نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگون کے پیر پڑے ہنگ پر اُسے پہلو میں ٹاکر مگئی۔

غٹھو نے اس کہانی میں طوائفوں کے ماحول کی جو جو تصویریں کھینچی ہے اور اُس کی انسیات کا زندگی سے جو پیرا پر نقشہ بنایا ہے، اس میں تمام قدم پر حقیقتوں کے پیکر بھرتے ہیں — طوائف بہر حال ایک صحت برقی ہے لیکن طوائف کو صحت ہونے کے باوجود ایک طوائف ہونا پڑتا ہے — حالات اُسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں — اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ — اس کہانی میں سوکھ کی کی زندگی، اس کے جذبات و احساسات، دام مال و مال سے اس کے روابط، اپنی ہمیشہ عورتوں سے اس کی بھلائی، سیش کے ہاتھوں ہونے والی اس کی ہنگ، ایک سیٹھ چاروںوں کے ہلے میں اس کی غلط فہمی، لیکن اس حقیقت کو معلوم کرنے کے بعد آدھو سے اُس کی سخت کلامی، ان سب باتوں میں حقیقت کی جھلکیاں نمودار ہیں — غٹھو نے اس میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کیا ہے — صرف حالات، انصاف اور ماحول کے بعض ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا ہے جس سے اس کی زندگی کی بعض بڑی ہی اہم حقیقتیں ذہن نشین ہوتی ہیں — غٹھو نے اپنی حقیقت نگاری کا یہ وہ بڑی حد تک انہیں حقیقتوں سے تیار کیا ہے۔

غٹھو کا موضوع ہنگ سے ذرا مختلف ہے لیکن ماحول یہی ہے، اور غٹھو نے اس انداز میں بھی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے جو حقیقت پر مبنی ہیں — کاتا اور غٹھو ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ کاتا پیشہ کوئی تھی اور غٹھو کاتا اس کا دلال تھا — ایک دن غٹھو کی حیرت کی انتہا زہری جب اس نے کاتا کی کھولی میں داخل ہو کر اسے بالکل ہنس دیکھا۔ وہ اس پر گھبرایا لیکن کاتا نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اور یہ کہ اس کی حیرت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جب تم نے کاتا غٹھو سے تو میں نے سوچا کیا حراج ہے یا غٹھو کاتا ہی تو ہے، اُسے دو..... — اس بات نے غٹھو کی حیرت کو کونسی حد تک دور کر دیا لیکن

اس فقرے میں اس نے بہت سے مطلب کردہ شروع کر دیے لیکن وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اور اس کو ایک الجھن سی رہی۔
 دس برس کی وصال کی عمر تھی جس وقت سے کبھی بھی دو چار عینیں بنی تھیں۔ اس لیے اس نئی عزت کو دیکھ کر اسے سوں سوں موص ہوا
 جیسے وہ خود شک ہو گیا ہے۔ اس کے جذبات میں یہ کائی کیفیت ظاہری ہو گئی — اور کائنات کے جسم کے خطوط نے اس کے دل میں اس
 خیال کو بیدار کیا کہ کائنات اس روپے میں مشغول نہیں ہے — انہیں خیالات میں نمود و نگہ کر چکا اور اپنے آپ کو خوب سمجھا دیا، نئی دھواں
 پھٹی، بالوں میں گھسکی، داڑھی منڈوائی — اور پھر ایک ٹیکسی لی — ٹیکسی لے کر وہ ایک اور دکان کے ساتھ کائنات کے گھر پہنچا
 — دکان معاملے کے کھانا کو ٹیکسی میں لے آیا — اور جب وہ ٹیکسی میں داخل ہوئی تو سانسے خوشیا کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل
 گئی اور اس نے کہا خوشیا قائم — خوشیا نے جواب دیا: "ہاں میں — لیکن تمہیں روپے مل گئے ہیں نا؟" — خوشیا کی موٹی آواز
 بلند ہوئی۔ دیکھو ڈرامہ — جو ترجمے میں — اس واقعے کے بعد خوشیا پھر اس بازار میں نظر نہ آیا — اس افسانے میں منظر
 نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مرد بھی بہر حال میں مرد ہوتا ہے — دکان تک اس سے مشتعل نہیں ہوتے۔ خوشیا کے کردار میں اس
 نے ایک ایسے مرد کو رکھا ہے جس کے جذبات دس سال کی دکان کے بعد بھی سرد نہیں ہوئے ہیں۔ اور جو ایک زمانے تک کائنات کی
 دکانی کھلنے کے بعد خود اس کی انسانیت کا شکار ہو جاتا ہے — زندگی کی اس بنیادی حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے؟
 غفلت کی ایک اور کہانی پہچان بھی ملو انھوں نے متعلق ہے لیکن اس میں ایسی طوائفوں کا ذکر ہے جو بازار میں نہیں اپنے گھروں
 میں بیٹھے کرتی ہیں۔ منٹو نے ان بیٹھے ہوئے مردوں کی زندگی کی ساری نروں مانی اور اس کے ساتھ کرب کو اس افسانے میں مجسم کر دیا
 ہے — چار دوست شراب سے سرشار ہو کر یوں تو تفریح کی غرض سے عورت کی تلاش میں نکلتے ہیں لیکن چار جگہ جانے کے بعد بھی
 انہیں تفریح کی جگہ تنفس حاصل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تلنگ دالا انھیں بھرتی کے میاں لے جاتا ہے — ایک ایسی جگہ جہاں
 کمرے میں گھپ اندھیرا تھا — اور جہاں انہیں دکانی بھگتی انسانی بد صورت عورتیں نظر آئیں اور جن کو دیکھ کر ان دوستوں میں سے
 ایک نے کہا کیا لڑیہ ناخاں ہیں — یہ بات سن کر سوں میں سے ایک جس کا سیاہ چہرہ مشرقی رنگ کے باعث زیادہ پتی ہوئی
 رشت کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا، ہنسی — یہ لوگ بھی ہنس دینے — اور ان دوستوں میں سے ایک نے پوچھا — کیا نام
 ہے آپ کا؟

بولی — "نوسی۔"

دوسرے دوست نے آگے بڑھ کر پوچھا — "آپ کا۔"

اُس نے جواب دیا: "میری۔"

تیسرا بھی آگے بڑھ آیا — "کیوں صاحب آپ کیا کام کرتی ہیں؟"

دونوں بھاگتیں — ایک نے ادا سے کہا — "کیا بات کرتا ہے تم؟"

دوسری نے کہا — "چلو جلدی کرو — دہنا مانگتا ہے یا نہیں۔ میں روٹی پکانا ہے۔"

اور ان لوگوں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ گئے اُسے سے بھرے ہوئے تھے اور وہ اس کی مڑیاں بنا رہی تھی۔

— تائے و الا قطعی طور پر قطع کرنا نہیں یہاں لے کر اٹھا۔ موثریاں اس عورت کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ رانگ دور رہا ہے اور یہ موثریاں اس کے آنسو ہیں۔ اس خطر سے تنگ اگر وہ لوگ وہاں سے ہٹ دیے۔ اور اس کے بعد اٹھنے والے انھیں ایک پتھریاں گلیں رکے یہاں لے گیا اور جیڑی ہی خوفناک صورت تھی۔ وہاں سے یہ لوگ اٹھنے پاؤں وہاں سے ہوئے۔ اور پھر انھیں تھنگے والا ایک میلے کپڑے لٹھریں لے گیا جہاں ایک بڑھیا ٹوٹا جھوٹا کسبہ بھی تھی۔ یہ سب اس مکان میں اندر جا کر بیٹھ گئے۔ اور وہاں انھیں ایک خشکی کی کوہر لڑائی نظر آئی اس کا رنگ سا دھوا تھا۔ بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے پہلے ہوتی کاڑھی ہے جہاں ایک دم رنگ گئی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں بریک ٹکٹ تھے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے اس کا سا رنگ دھوئیں و صوب اور باد شعلہ نما آٹھ گیا ہے اس طرح میں جھدی سے جھدی ڈک کے جسم میں جس ایک قسم کی شورش یا ذریت ہوتی ہے، اس میں بالکل نہیں تھی۔ کیرٹل کے باوجود وہ خشکی دکھائی تھی۔ بہت سی بچہ مرده اور ناوا جب طریقے پر تھی۔ اس کے جسم کا پچھلا حصہ قطعی طور پر خستہ ہو گیا تھا۔ یہاں سے بھی یہ لوگ جان چڑا کے بھاگے۔ تائے دے نہیں لے کر آیا جی آپ کو پہچان نہیں۔“ اور یہ کہہ کر اس نے گریہ کے دوپے چپ میں ڈالے اور — مساند کے نظارے میں، گانا بڑا چلا گیا۔ اس افسانے میں زندگی کے متضاد پہلوؤں کو دکھا کر غصوں نے حقیقت کو واضح کیا ہے۔ ایک طرف تفریح اور دنیا کی خیالی اور اس کی سحر و دکاش ہے لیکن اس کا حصول بے امن ہے کیونکہ جس ماحول میں اس کو تلاش کیا جا رہا ہے، اس میں ایک کرب کی سی کیفیت ہے۔ جہاں بھی یہ لوگ پہنچتے ہیں وہاں خشکی نظریں گندگی اور تاریکی کو دیکھتی ہیں، لاشیں لاشیں کی اندھی ماضی میں جڑی شکل سے انھیں راستہ ملتا ہے۔ ساتھی ہر گستاخانہ گندھا ہوا اور دھوئی پکتی ہوتی نظر آتی ہے۔ کو اسی کے لیے یہ سارا کاہر بار چلتا ہے۔ غصا سی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے۔ اور اسی لیے کالی مینا کی عورت کے ہاتھوں سے اٹنے کی جو موثریاں کچے فرش پر گر گئی ہیں، ان کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لاش دور رہا ہے اور یہ موثریاں اس کے آنسو ہیں۔

اسی طرح کالی شلوار میں بھی اس نے زندگی کے انھیں پہلوؤں میں سے ایک پہلو کی تصویر کشی کی ہے۔ کالی شلوار، سو گندھی اور کافانی کی طرح ایک طوائف سلطانہ کی کمانی ہے۔ سلطانہ پہلے انہاں سے چڑھ کر تھی۔ وہاں اس کے دھاک خدا بخش نے چڑھ گوزن کو اس کا مستقل گاہک بنایا تھا لیکن پھر نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا ساقی کا کس نے سلطانہ سمیت، ذاتی متعلق ہونے کا ہر وہ کرنا سلطانہ تیار ہو گئی اور وہ دونوں دیلی آ گئے۔ لیکن ذاتی میں دن کا کاہر بار نہ چلا۔ سلطانہ کی چڑیاں تنگ پک گئیں۔ پریشانی اور کسی جیل سے بھرا تھا۔ عزم کا حسینہ آیا تو سلطانہ کو ایک کالی شلوار بنانے کی نگر ہوتی۔ کیونکہ اس کی فود سنوں میں، انوری اور جوتے بھی عزم کے موقع پر لکے کپڑے پہنے کا اہتمام کیا تھا۔ خدا بخش اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکا۔ ایک شخص شکرنا نامی ایک دین سلطانہ کے یہاں آیا۔ اس کو دیکھ کر سلطانہ کی ہچیں کھل گئیں لیکن وہ اچھا لک کا ثابت نہ ہوا۔ دوسری دفعہ جب وہ آیا تو سلطانہ غصا سے کالی شلوار لانے کی فراخ کر دی۔ شکر نے کہا کہ وہ کاوشش کے گا اور چلتے وقت سلطانہ کے ہنسنے دنگے جناس نے آدا کرش دیئے۔ عزم کی پہلی تاریخ کو شکر آیا اور ایک اخبار میں لپٹی ہوئی اس کے پاس کالی شلوار تھی۔ شکر نے کہا کہ اس کی شلوار ہے دیکھو مینا جی نہ ہو اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ سلطانہ نے اخبار پھا کر دیکھا تو اسے ساتھی کی شلوار نظر آئی۔ اسی جی شلوار جو اس نے

انہی کے پاس دیکھی تھی — محرم کے موقع پر سلطان نے یہ شعور پہنچی ہی تھی کہ وہاں سے پرورشنگ ہوئی اور وہی داخل ہوئی — اور اس نے کہا کہ شعور دنیا نکل گئی معلوم ہوتی ہے — اس پر سلطان نے جواب دیا: آج ہی وزی لایا ہے — یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انہی کے کانوں پر پڑیں تیرے بندے تم نے کہاں سے لیے — انہی نے جواب دیا: آج ہی منگوائے ہیں — دونوں کو خوشی اور غموش رہنا پڑا — اس کی کہانی میں بھی خوشیوں طوائف کی زندگی کی زبانوں مانی پیش کیا ہے — اس کی کس پر سیاہی اور زبانوں مانی کی پر کیا قصور اس کہانی سے انکسوں کے سامنے پھر جاتی ہے — اس کی ہر بات اور ہر پہلو میں زندگی کی سنگین اور غموش حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے۔

خوشی نے ان موضوعات پر اور بھی افسانے کھے ہیں لیکن حقیقت نگاری کا جو کمال ان چار افسانوں میں ملتا ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آتا۔ ان افسانوں میں طوائف کے ذکر کے ساتھ کسی قسم کی نفرت، کس طرح کی تنگیں یا جسمانی آسودگی کا خیال نہیں پیدا ہوتا — اسی لیے طوائف خوشی کے سامنے دلچسپی کا سامان بناتی نہیں رہتی۔ برعکس اس کے انسانیت کے جسم پر ایک ناموس کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ خوشی طوائف کو اسی زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے یہاں طوائف کی زندگی سے متعلق ہر ایک پہلو نسبتاً زیادہ نظر آتا ہے — خوشی ان پہلوؤں کی وضاحت بہت تفصیل سے کرتا ہے۔ یہ تفصیل ایک طرف تو نگہیں کا احساس پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اس سے ہمدردی کا خیال بیدار ہوتا ہے۔ نگہیں تو اس ماحول سے پیدا ہوئی ہے، جس میں زندگی کے سوا کوئی نہیں ہوتا اور ہمدردی کے خیالی کردار حسرتیں اور ایسے ہی بیدار کرتی ہیں جن کا اس ماحول کے افراد کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خوشی حقیقت میں نگہیں ہیں یہ سمجھتی ہیں کہ طوائف پیشگی خاطر انسانیت کی سطح سے نیچے گرنے کے باوجود پناہ بیٹ نہیں پال سکتی۔ اس کی زندگی معاشی بد حالی میں گزرتی ہے — اس کی ساری زندگی جذباتی اعتبار سے نا آسودگی کے عالم میں رہنا پڑتا ہے۔ — جنگ کی سرگندھی، خوشنیا کی آواز اور کالی شہر کی سلطنت سب معاشی اعتبار سے بد حال اور جذباتی اعتبار سے نا آسودہ ہیں۔ خوشی نے ان طوائفوں کی نفسیات کے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے، اور جس ماحول میں یہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس ماحول کی زندگی سے بڑی جبر پر تصویریں نکلتی ہیں — خوشی جب ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے تو گویا ایک غلط سماجی نظام اقدار کے خلاف احتجاج کرتا ہے جس نے صدیوں سے طوائف کہاں کی رکھا ہے — وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن جن حالات کی تصویر کشی کرتا ہے، ان سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ خوشی اس غلط سماجی نظام کا بانی دشمن ہے — وہ اس نظام و اقدار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کوئی واضح اور عملی پیش نہیں کرتا لیکن اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو ضرور بھارت دیتا ہے۔ لیکن بالکل محض نفرت نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کی عین انسانی ہمدردی سے ملتی ہوئی ہیں — طوائف کے ماحول اور اس کے معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کا عنصر خوشی کے یہاں ہر جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے — اور انسانی ہمدردی کی یہ خصوصیت اس کی حقیقت نگاری میں جان نوال دیتی ہے۔

یہ بات بظاہر تو عجیب ہے کہ خوشی نے جذباتی روانی موضوعات پر افسانے نہیں لکھے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات اتنی عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ خوشی نظرًا جذباتی اور روانی نہیں ہے — اس کے یہاں جب کبھی یہ پہلو نمایاں بھی ہوتے ہیں

قوان میں سے بھی کوئی ذکرِ ان حقیقتِ اُجرتی ہے، مذنگِ اِک کوئی ذکرِ اِک، ہم دوسرا منہ آتا ہے۔ اس لیے اس کی حیثیت اور
 روحانیت اپنے آپ کو کہیں روحانی نہیں کرتی۔ اس پر ناگہمی اس کا دورِ مقرر آتی ہے تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے۔
 میں نے اندازہ مذاق اُس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اس وقت فضا ایسی دلربا تھی کہ اگر کسی صورت پر عاشق ہو جاتا تو
 مجھے افسوس نہ ہوتا جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں۔ نیم تاریکی میں بھی کئی فتنے نکلا رہا نظر آتا تھا جس جیسے شروع شروع
 ہوا میں تنگی پیدا ہو جاتے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جاتے تو کسی اجنبی صورت کے پاس جو تنگ ضرورت
 محسوس ہو کر آتی ہے۔ ایک ایسی ضرورت جس کا احساس محنت شعور ہی میں چھپا رہتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے
 — چرکیٹ اور دلاور فضا میں صورت کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ شعور اس سلسلے میں کسی
 روحانی فضا کو پیدا نہیں کر لے رہا۔ موسم اور فضا میں تو قدرتی ہی روحانیت کا رنگ وہ ضرور دے رہا ہے لیکن اس کی تان زندگی کی
 ایک بڑی ہی اہم حقیقت پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ یوں تو بعض افسانے جذباتی روحانی موضوعات پر مشروط کے ہاں ہی ضرور جلتے ہیں
 لیکن ان افسانوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے خود مشروط نے ان افسانوں کو اہمیت نہیں دی ہے اور اس لیے انھیں مافی
 حیا تھی کی پیداوار بتا رہا ہے۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے — ”مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو
 بالکل یاد نہیں جو روحانی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم صورتوں سے مل رہا ہوں۔ وہ افسانے جو میں نے صورتوں کے متعلق
 لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں یا محض دماغی حیا تھی کے لیے۔ میرے ایسے افسانوں میں جو نگہ
 خلوص نہیں ہے، اسی لیے میں نے بھی ان کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایک خاص طبقے کی اور تیسیری نظر سے گزری ہیں اور
 ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں، مگر وہ روحانی نہیں ہیں۔ وہ کسی دیکھی حقیقت کے گرد گھومتے ہیں۔ مشرق کی طبیعت
 کا رجحان ہی روحانی کی طرف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جب محنت کا تذکرہ ہو تب بھی وہ اپنے گرد روحانیت کا حصار نہیں کھینچتا۔
 اس کی نگاہیں یہاں بھی حقیقت پر بھی رہتی ہیں۔ محنت کے ساتھ اُسے یہ خیال آتا ہے کہ محنت کی لیں تو بہت سی قسمیں ہمارے
 باپ دادا بیان کرتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ محنت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا سائبریا کے کج بستہ میدانوں میں، سڑکوں میں پیدا ہو یا
 گھر میں، ایمر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں۔ محنت خوبصورت کمرں یا بدصورت، بدکردار کے لیے یا نیکو کار، محنت حقیقت
 ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی جلی آ رہی ہے، اسی طرح
 محنت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے، یہ بُھابات ہے کہ سید و بگم ہسپتال میں بچے جنے اور راج کمار کی جگہ میں۔
 غلام محمد کے دل میں لیکن محنت پیدا کرے اور غلام لال کے دل میں کوئی دانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں
 اور کمزور رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ محنت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے۔ بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں
 بعض دفعہ محنت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح صورتوں کا عمل کر جاتا ہے، اسی طرح محنت بھی گرواتی ہے بعض
 دفعہ بانجھ پر پیدا ہو جاتا ہے۔ ابھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محنت کرنے کے معاملے پر بانجھ ہیں۔ اس کا مطلب
 نہیں کہ محنت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے، یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں دھنسا نہیں، یہ

خواہش ان کے دل میں برآمد ہوتی ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ جست کر سکیں جس طرح صورت اپنے جسمانی انعام کے باعث پہنچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ اسی طرح یہ لوگ چند عانی انعام کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔ محبت کا استقاو بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ جو شخص محبت کا ذکر ایسے غیر مفید موزانہ اناز میں کرے اس کے بیان زوان جیسا کہ طرح پیدا ہو سکتا ہے ۹۔۔۔ منظر کے یہاں محبت بھی حقیقت پسندانہ اناز میں سامنے آتی ہے۔ اسی لیے اگر کہیں وہاں پیدا بھی ہوتا ہے تو حقیقت پسندی کی اس فضا میں اس کام کھٹنے لگتا ہے۔۔۔ اور دیکھتے دیکھتے اس کی ہستی دم توڑ دیتی ہے۔

ویسے منظر نے بعض افسانے محبت اور عشق کے موضوع پر کچھ حضور ہیں لیکن وہ دوا نیت اور خصوصاً جذباتی دوا نیت سے محروم ہیں۔ ان میں شروع سے آخر تک حقیقت و حقیقت کی ایک فضا ملتی ہے۔۔۔ بانجھ اگرچہ محبت سے متعلق ایک کہانی ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی اس کہانی میں دوا نیاں ماحول پیدا نہیں ہوتا۔ کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ خاصی دیر تک اس بات کا طعنہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کا موضوع محبت ہے۔۔۔ ختم ایک نا اہلی زخم خوردہ انسان کی طرح سامنے آتا ہے۔ کہنی لانا قلوں کے بعد وہ ایک دن لگتا آہ اور یہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک دولت مند مالک کی لڑکی زہرہ سے محبت کی ہے۔۔۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو کر کھنوسے باہر چلے جاتے ہیں اور اطمینان سے رہنے لگتے ہیں لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ زہرہ ورجاتی ہے اور نعیم اس دنیا میں تھا رہ جاتا ہے۔ ختم بیان کرنے کو تو یہ واقعہ بیان کر دیتا ہے لیکن ان میں اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حقیقت انسانی رہے۔۔۔ چنانچہ وہ خود میں یہ جہاد لگتا ہے۔۔۔ ”آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستان عشق سنائی تھی۔۔۔ وہ محض افسانہ تھا، ایک جھوٹا افسانہ۔۔۔ خدا کوئی زہرہ ہے نہ کوئی نعیم۔۔۔ میں ویسے سچ دیتا ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہرہ سے محبت کی تھی۔۔۔ کہانی میں اگرچہ ٹوٹنڈا ٹوڑ پانے مالک کی لڑکی سے عشق کرتا ہے لیکن اس کے باوجود کہانی میں کہیں دوا نیاں پیدا نہیں ہوتا زہرہ اور نعیم دونوں حقیقت پسندی ہیں۔۔۔ وہ کچھ کہتے ہیں، سچ کچھ کہتے ہیں۔۔۔ زندگی ان کا ساتھ نہیں دیتی۔۔۔ اور بہت تھوڑے عرصے میں ان کی ساری آرزوؤں کا خون جڑ جاتا ہے۔۔۔ اور بس یہ حقیقت رہ جاتی ہے کہ انسان بے بس ہے۔۔۔ خدا کے ملاوڑ ایک اور طاقت بھی ہے جو بڑی حاسد ہے، جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی۔۔۔ منظر نے اس کہانی میں کسی بہت بڑے موضوع کو نہیں اپنایا ہے۔۔۔ صرف ایک کردار کی ذہنی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے اور اس طرح زندگی کی بعض اہم اور بنیادی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔۔۔ اسی لیے اس کا موضوع دوا نیت سے قریب ہوتے ہوئے بھی دوا نیت سے کوسوں دُور ہے۔۔۔ فرض منظر نے محبت اور دوا نیت کے موضوعات پر جو گفتی کی چند کہانیاں لکھی ہیں ان میں سلطنت اور سستاپی نہیں ہے۔۔۔ وہ کسی بڑے اہم بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہیں۔۔۔ کیونکہ منظر زندگی کے جذباتی اور دوا نیاں پہلوؤں سے کہیں زیادہ ان بے شمار حقیقتوں پر نظر رکھتا ہے جو ہر قسم دم تنگ انسان کے دم کے ساتھ رہتی ہیں۔

منظر انسانی نفسیات کا گہرا ناخن ہے۔ اس کی ہر کہانی کو یہی نفسیاتی شعور حقیقت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس شعور کے سراج دوا نیاں موضوعات تک اس کے یہاں حقیقت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔۔۔ زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی میں اس نے کسی نہ کسی اہم نفسیاتی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔۔۔ بعض افسانے تو اس نے ایسے لکھے ہیں جن کی بنیاد کسی نہ کسی نفسیاتی حقیقت پر استوار ہے لیکن

جو اس نے نفسیاتی حقائق کو نیکو بنا کر نہیں کھسے گئے ہیں اس میں بھی تمام تدریج پر نفسیاتی حقائق کی ترجیحائی نظر آتی ہے۔ زندگی کے حالات اور کاموں کی سرکات و سکنات کو پیش کرتے ہوئے یہ نفسیاتی شعور اپنے شباب پر دکھائی دیتا ہے۔ ”خوشتر میں ایک کوہاں لڑکی سے اپنا ننگ ٹھونڈا کتجیرہ جوڑتا ہے۔ میں نے پھر نئی سائرس کی طرف غور سے دیکھا اور یہاں کرتے ہوئے میری نگاہیں ایک لڑکی کی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ کچھ اس طرح پرکاش کو دھکا سا لگا۔ وہ سنبھل اور فوراً ہی منہ سے لالہ سیب نکال کر میری منہ خراپہ دینی سیسل سے کان میں کچھ کہا۔ اس سیسل نے ٹکلیوں سے میری طرف دیکھا، میرے ماتھے پر سینہ اگیا۔ خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی کسی عورت کو یوں اپنا ننگ طور پر رہنہ نہیں دیکھا تھا جب اپنا ننگ کا فنا نگلی ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے تو وہ سنبھلا سا جاتا ہے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیا ہے اس کی نظریں جو ایک دم غریبی سے دو چار ہو گئی تھیں۔ اپنے آپ کو کیس جیسا بپا بپا ہوتی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی صحت آٹا کا جاؤ۔ جاؤ تم خاناو۔ پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی جیسے تم غلی تھیں تو روزانہ کھوٹنے لگیا ضرورت غلی۔ اندر سے کھو دیا ہوتا، میں پھرتا جاتا۔ لیکن جاؤ۔ تم خاناو۔ کانا مسکرائی۔ تجب تم نے کما خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہوتا ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے، اکنے دو۔“ پھر خوشیا یہ سوچنے لگا ہے اور دل میں کہتا ہے۔ ”بھئی یہ ایمان نہیں ہے تو کیا ہے۔“ میں ایک چھوڑی ننگ و شرنگ تھارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ تم خوشیا ہی تو ہو۔ خوشیا نہ ہوا سلا وہ بتا ہو گیا ہوس کے ہتھ پر وقت، اؤ ٹھنڈا رہ گئے۔ اور بات خوشیا پر ایک خوشی کی کیفیت طاری کر رہی ہے، چنانچہ ایک رات وہ وہاں سے ایک لاکھ بی جاتا ہے۔ اور کانا اس کے پہلو میں ہوتی ہے۔ ایک مرد کی نفسیات کی تصویر کشی یہاں حقیقت سے کتنی بھرور کھینچی گئی ہے۔ اس طرح نعرہ میں کیٹر لال جب بیٹھ سے گایاں سنتا ہے تو اسے بہت برا لگتا ہے لیکن پھر اس کے دل میں اس طرح کے خیالات بھی اُٹھتے ہیں۔ ”اٹاں ہاؤ دیہ سب کھنے کی باتیں ہیں۔ تم نے تو سیٹر سے یوں گایاں نہیں جیسے غلی میٹی بویاں تھیں۔ غلی میٹی بویاں تھیں۔ جڑے مزے دار گھوٹ تھے، پٹر لولہ ہی کسی۔ اب تو میرا بچیا چھوڑ دو اور مزہ کتنا ہوں، دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ لوگ جوڑے تارم سکاھر اُدھر مل چھوڑے ہیں میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھوڑوں گا۔ بھنگوں کی قسم اب مجھے زیادہ تاب نہیں رہی میں ضرور دیوانے کتنے کی طرح سب کو لانا شروع کر دوں گا۔“ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیوانوں کے ساتھ اپنا شرنگا کر مرجاؤں گا۔ مرجاؤں گا، سچ کتا ہوں مرجاؤں گا۔“ یہ مجھے نفسیات جسکست کو آنکھوں کے سامنے دکھاتا کرتی ہے۔

”پٹر ہنگ کی سوگندھی کو دیکھیے اس پر جو کیفیات طاری ہوتی ہیں وہ حقیقت سے کتنی قریب ہیں۔“ سوگندھی دماغ نا عورت تھی لیکن جو مٹی کوئی نرم و نازک بات، کوئی کول بل، اس سے کہنا تو جھٹ بھٹل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گوہر اور عورت کے جسمانی ٹاپ کو اس کا دماغ بالکل فصول گھستا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بڑی طرح قائل تھے۔ وہ ٹھکن پیا جتے تھے۔ ایسی ٹھکن جو نہیں جھنجھوڑ کر۔ انھیں مار کر سلائے پر چھوڑ کر دے۔ ایسی نیند جو ٹھنک کو چھوڑ ہونے کے بعد اُٹے کتنی مزیدار ہوتی ہے۔ وہ بے عروسی جو دم کا کہہ کر بند نہ دھیسے ہو جاسے یہ طاری ہوتی ہے کتنا آغز رہتی ہے۔ سوگندھی ایک طوائف ہے لیکن وہ عورت ہی ہے۔ چنانچہ جب ابی وہ کسی شخص سے محبت کا سلسلہ

سنٹی ہے تو موم ہو جاتی ہے۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کر یہ سب فریب ہے، بھٹوٹ ہے، مٹکاوی ہے۔۔۔ تہرہ زرات کو اس کا پڑا تانا یا ملا تانی اس سے کہا کرتا تھا سو گندمی میں تجھ سے پرہیز کرتا ہوں۔ اور سو گندمی یہ جان بوجھ کر دو بھٹوٹے بولتا ہے۔ زہن موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی، جیسے پکچنگ اس سے پرہیز کیا جا رہا ہے۔۔۔ پرہیز کتنا سندرہول ہے۔ وہ چاہتی تھی اس کو کچھ لگا کر اپنے سارے انگ پر لے لے، اس کی مائل کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے سامنوں میں سرج جائے۔۔۔ یا پھر وہ خود اس کے اندر چل جائے۔ بسٹ مٹکا کو اس کے اندر داخل ہو اور اوپر سے ڈھکن بند کر دے۔۔۔ غرض اس طرح انسانی نفسیات کے ان گنت حقائق غلطی سے اپنے انسانوں میں پیش کیے ہیں۔۔۔ غلط کمال یہ ہے کہ وہاں حسیوں کو نئے زاموں سے دیکھتا ہے۔۔۔ اس کی نگاہیں اس مسئلے میں اس جگہ جا پہنچتی ہیں جہاں عام افراد کی نظروں کا چھونا آسان نہیں ہوتا۔ غلط انسانی نفسیات کو انسانی زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لیے اس میں حقیقت کے بے شمار پہلو دفن ہوتے ہیں۔ اس کی فکر میں نگاہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی انسانی زندگی کی بڑی اہم حقیقتیں بنا دیتی ہے۔ اس کے انسانوں کے یہ پہلو ہیں اس کی حقیقت نگاہی کو سارا دیتے ہیں۔۔۔

یہ نفسیاتی شعبدہ یوں تو منظر کے ہر انسان سے ملتا ہے لیکن بعض انسانے اس نمائے سے بھی کھینچے ہیں جن کا بنیادی موضوع ہی کی کوئی ذکوئی اہم نفسیاتی حقیقت ہے۔ ان میں سے بیشتر انسانی زندگی کے جنسی پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ لیکن ان جنسی پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے غلطی سے انسانی نفسیات کے سب سے اہم اور ذمہ داری حقیقت واضح کی ہے۔۔۔ شرطوں، بلاؤں، چھاپوں اور اسی طرح کے بعض اور انسانے اسی نفسیات جنسی کے مختلف حقائق کو پیش کرتے ہیں۔۔۔ شرطوں، ایک نوجوان لڑکی کی کہانی ہے ہر کسی شادی میں شرکت کی غرض سے آئی ہے اور اپنی سیلیوں کے ساتھ زرات لگا کر رہی ہے۔ وہاں میں دھنوں کے متعلق بے شمار باتیں کرتی ہیں۔ جن سے ان کے جنسی دباؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔۔۔ شرطوں، باتیں کرتے ہوئے بلاؤں پر اپنی سیلی عفت کے نشوون پر اپنے ہونٹ جما دیتی ہے لیکن عفت معترض نہیں ہوتی، خاموش بیٹھ رہتی ہے۔ اور پھر قصور ویر کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر سو جاتی ہیں۔۔۔ شرطوں نے یہاں نوجوان لڑکیوں کے جنسی جذبات کی حقیقت سے جھوٹا ترکانہ کیا ہے۔۔۔ بلاؤں، موتی، ٹیکلہ اور فیض کی کہانی ہے جو بطور کی خنوں سے گودے میں۔ ٹیکلہ ساتھی کی ایک بلاؤں پر پہنچی ہے اور فیض کو دکھاتا ہے۔۔۔ موتی کے داغ میں یہ بلاؤں عجیب و غریب خیالات پیدا کرتا ہے۔۔۔ اور ساتھی کا یہ بلاؤں سیا جا رہا تھا۔ اور موتی کے داغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانگے اڑ رہے تھے۔ جب اسے کرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں ٹیکلہ کی ساتھی کے بلاؤں پر پڑتی ہیں تو اس لڑکی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے۔۔۔ صورت چھو کر ہی نہیں۔ بلکہ اس کی مٹا اور دوشیں داسط پر ہر رنگ ہاتھ پھیرتا رہے۔ اپنے گودے ہاتھ۔۔۔ اس میں ایک نفسیاتی حقیقت پنہاں ہے۔۔۔ چھاپا بھی کم دیش اس طرح کی کہانی ہے۔ گھوٹال کی ران پر چھوٹا شکل آتا ہے۔ وہ اور اس کی بہن اس پر چھاپا لگاتے ہیں۔ لیکن آخر میں توجہ ہوتا ہے کہ تو لڑکی میں اپنے لیے بھی ایک چھاپا تراشتی ہے۔۔۔ اور پھر جو کچھ ہوتا ہے اس کو شرطوں کے الفاظ میں ٹھینے۔۔۔ چھاپا کاٹنے کے بعد اس نے غور و آسا

مرہم نکال کر اس پر پھینکا یا اور گردن جھکا کر اپنے کتے کے منہ کھولے۔ سینے کے دائیں طرف چھوٹا سا اُچار تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلی پر چھوٹا سا مکمل ٹیلہ لٹکا ہوا ہے۔ — ٹھکانے پھا ہے پر چھوٹا تک ماری اور اسے اُٹھنے سے اُچار پر جھار دیا۔ — اس افسانے میں بھی منٹو نے طبع کی نفسیات کو واضح کیا ہے۔ — غرض اس طرح اس نے بہت سے افسانے اس موضوع پر لکھے ہیں۔ — ان افسانوں کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے۔ — لیکن یہ زندگی کے بعض بنیادی نفسیاتی حقائق کو ضرور پیش کرتے ہیں۔ — دوسرے ان حقیقتوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ — منٹو ان حقیقتوں کی پردہ دہی کرتا ہے۔ اس لیے ان افسانوں میں بھی اس کی حقیقت نگاری اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

منٹو نے خالص طبی موضوعات پر جو چند افسانے لکھے ہیں، اور جن پر خاصا جھگڑا ہوا ہے، وہ بھی نفسیاتی حقائق کی ترجمانی کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان افسانوں میں سے اکثر کے موضوعات بڑی حد تک مکمل ہیں لیکن ان میں جگہ جگہ فزکی نفسیات کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ اور اس نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی جو ترجمانی منٹو نے کی ہے، اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ — ”دھواں“ اور ”خندہ گوشت“ منٹو کے ایسے ہی افسانے ہیں۔ — ”دھواں“ کا کوئی خاص اہم موضوع نہیں ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ مسعود ایک اسکولی کالاکار ایک قصائی کو گوشت لے جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ — اس گوشت میں سے اُسے دھواں سا اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے دل میں اس گوشت کو چھونے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اُسے انگلی سے چھوتا ہے اور گوشت کی گرمی اُسے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ — یہ دھواں وہ اپنی ماں اور بہن کلثوم کو مناتا ہے۔ — اس کی بہن پر دھواں کی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ مسعود سے کہتی ہے کہ اس کی کمر میں شدید درد ہو رہا ہے اور وہ مسعود سے کہہ کر بولنا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ دوبارہ جاتا ہے۔ — پھر اس کی بہن کلثوم اپنی سیلی بٹا کے ساتھ ایک پیٹنگ پر دیکھی جاتی ہے۔ — یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں اس افسانے کا موضوع ہیں۔ اس کے موضوع کے سستے پن سے قطع نظر اس میں جگہ جگہ ایسے تعلقات آتے ہیں جن میں گھر سے نفسیاتی حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ — مسعود اور کلثوم کی گفتگو اور کلثوم اور بٹا کی حرکات میں ان حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ — خندہ گوشت کا جو موضوع ہے اس کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ — موضوع اس کا بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ نفسیاتی حقائق اس میں بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ — منٹو نے ان باتوں کو اپنے گھر کے نفسیاتی شعور سے کام لے کر حقیقت کا دلچسپ شعور سے دیا ہے۔ — اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری میں یہ باتیں مساویں ہو جاتی ہیں لیکن ان کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ منٹو کے یہاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں اس نے زندگی کی حقیقتوں کو دیکھا ہے۔ — ان حقیقتوں کی تلاش میں وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کو منٹو کرتا ہے۔ — اس کی ساری تفصیل اور جزئیات کو دیکھتا ہے۔ — یہ جزئیات حقیقتوں کو اجاگر کرنے میں بڑا کام کرتی ہے۔ — اور اس پر منٹو کا مشاہدہ سونے پر ساگر کا لام کرتا ہے چنانچہ اس کی نگاہیں ان جزئیات میں ایسے پہلوؤں کو لگی دیکھ رہی ہیں جن کو دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ — اسی لیے منٹو کے یہاں جزئیات کی حقیقت اور حقیقت کی جزئیات بیک وقت رہنا چاہو دکھاتی ہے۔ مشاہدہ کی تیزی کے سہارے جزئیات کی حقیقت اور

حقیقت کی بڑیا ت جس طرح منظر کے پاس نمایاں ہوتی ہے۔ شادی اور آندو کے کسی اور اساتذہ نگار کے یہاں اس طرح نمایاں ہوتی ہو
 لیکن اس میں منظر کے تخلیق کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ — غلط صوف دیکھتا ہے اور دیکھتے ہوئے اس کی نظریں خارجی منظر پر کی انتہائی کمزوریوں
 تک پہنچتی ہیں اور جب وہ ان کی تفصیل بیان کرتا ہے تو اس میں بے شمار حقیقتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ — اصل میں حقیقتوں کی تلاش ہی منظر
 کو خارجی منظر پر کی تفصیل و جزئیات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ — اور وہ اس کی تمام تر کوشش میں بہت فوٹو کل جاتا ہے۔ — لیکن اس
 کے باوجود ہوتا ہے اسی دنیا میں۔ — منظر کے یہاں خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اس کو دنیا کی باتیں ہیں۔ — اسی عامل کی باتیں ہیں۔ اسی نغما
 کی باتیں ہیں۔ — غمناں باتوں کو بہت نمایاں کر کے پیش کرتا ہے۔ — اور ان باتوں کو نمایاں کر کے پیش کرنے ہی میں اس کے یہاں
 حقیقت کی بڑیا ت اور جزئیات کی حقیقت اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ — گویا اس کی دان پر پھوٹا ہوا منظر تھا، اس کے ہاتھ کے کردار
 کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے پہلی نظر پر شوقم داس تھانیدار منگوت ہاتھ سے تل کی دھار کے نیچے لڑائی لڑتی ہے منظر پر دیکھ اور پڑی تو نہ بڑھائے
 مگر منظر میں سے آگے آگے داس ٹوس رہے تھے۔ — سامنے بائیں میں ایک دھبے کے قریب آگے تھے جو انہوں نے ایک شیشے والے سے
 اس کا چالان کاٹ کر حاصل کیے تھے۔ گویا باپ کی پیٹل رہا تھا اور تل کی مرٹیاں بنا رہا تھا جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لیے
 بائیں میں ٹائے تھے اور چپکے سے ایک آگے آیا ہوا تھا تو بائیں نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوڑ دیا۔ اسے آگے آگے چھوڑ کر
 من میں ڈالتے ہوئے کہا تھا، تیرے شرم تجھے بڑوں کا لٹاؤ کرنا جانے کب آئے گا۔ — اور منظر کے کردار کی بڑیا ت ان جہلوں میں موجود ہے
 منظر کو گلوں کے ہر صبر پر شہ اس کے اندر ہنسنے والے کا حال معلوم تھا۔ مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ پڑی ہندی کی گانے نے صبح سویرے
 ایک بچہ لڑایا ہے اور مادھو کے منگوتے بھائی کی میاں کی ٹوٹ گئی ہے۔ — کا اسطواری اپنا اوچھوڑ کے بال چھڑا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے
 آئینہ کو ٹوٹ گیا۔ اور ایک سیر فوڈو کہہ بیٹھے ناکی کو بطور قیمت دینا پڑے۔ — اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ دو بھلوں پر پرترام اور گنگو کی
 ہرج مہرج ہوتے ہوئے رہ گئی تھی اور سالک رام نے اپنے بچوں کو پاؤں منہوں کر کھائے تھے۔ — حالانکہ وہ بیٹی کے منہ کی کھانہ کران کو چرن
 وال کوئی شے نہ دیکھ جائے۔ — اور ایک فلم کہنی کے عامل کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ — باپوں کی نظریں کی شرمک نام شب
 ہوتی رہی تھی۔ رات کے ٹھکے ہاتھ کے ایئر کنڈیشنر کے کمرے میں جو کہنی کے دل نے اپنے ایک آپ کے لیے خاص طور پر تیار کیا تھا اور
 جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹور اور ایکٹریس سیٹھ کی الی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، موزوں اور کرسیوں پر اوٹھ رہے تھے۔
 اس چوٹی کمرے کے ایک کونے میں ایلی تپائی کے اوپر دس پندرہ پائے کی خالی پیادیاں اونٹنی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا
 غلبہ ندر کرنے کے لیے ان ایکٹریسوں نے لی تھیں۔ ان پیادوں پر سینکڑوں کھینیاں بھینسا رہی تھیں۔ سکرے کے باہر کی ایک بھینسا ہٹ
 سن کر کسی فوڈو کو کسی معلوم ہو تاکہ اندر چلی جائے گا۔ — اور سوگندھی کے عامل کی تصویر اس طرح بنائی ہے۔ — دھوا
 پردہ شگ ہوتی۔ — رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آگے آگے میں دستک کی آواز بھینسا ہٹ میں پڑی تھی۔
 دوا زہ جب دوسرے کھٹکٹھایا گیا تو وہ پر نک کر نظر پڑی۔ — وہ ٹی ٹی ٹی ٹی اور دانتوں کی زخموں میں چھپے ہوئے پھل کی کڑیوں نے
 اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کھٹکٹھایا اور لیسڈار تھا دھوا توئی کے پتے سے اس نے یہ بدبو دار لعاب صاف کیا اور
 آنکھیں ملنے لگی۔ — پٹنگ پردہ اٹکی تھی۔ — ٹھیک کر اس نے پٹنگ کے نیچے دیکھ تو اس کا گنا سوسے ہوئے چیلوں پر ہنسنے کے سوراہا تھا۔

اور خوشترش خشی و شباب کے طوفان، رنگ و بو کی معنوی اس طرح کی ہے۔ سادھیوں کی رضییں سرسبز ہست، کلفت لگی شلواریں کی کھڑکھڑاہٹ اور چٹائیوں کی کھٹکھٹاہٹ، حواسِ حیرنے لگی، تمکنتے ہوئے ٹھنڈوں پر دبا دگرتی ہوئی ہیں، نچھے نچھے سینوں پر زور دے کر نکلتی ہوئی جندا آوازیں، اُن کی زری کے دلوں پر تھرکتی ہوئی لٹکیں، چلتی ہوئی انگلیاں دھڑکتے ہوئے ہیں، پڑھتی ہوئی ہیں اور پھر ان افسردہ لکھنوں کی آہیں ہیں سرگوشیاں :- ”سب کچھ دیکھ کر کیا تھا کہ ان کے پیرے فرس چرس و شباب نے تم سے اپنے صافی نکھو رہا ہے۔“ منٹو کے افسانے اس طرح کی تفصیل و جزئیات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس تفصیل و جزئیات سے اس فضا اور حال کا صحیح نفاذ ہوتا ہے جس میں حقیقتیں پر روشنی پڑتی ہیں۔ اسی بے غٹو کہنے تفصیل و جزئیات زندگی کی ان گنت حقیقتوں کو نکھانے کا ایک وسیلہ اور ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ غٹو نے اپنے ہر افسانے میں تفصیل و جزئیات سے ہی کام لیا ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا۔ منٹو کے یہاں محض خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اس نے حقیقتوں کو اُجاگر کرنے کی بنیاد تفصیل پر نہیں رکھی ہے۔ ان کو جو بہ اور اس دنیائے پیش کردہ ہے۔ لیکن جگہ جگہ حقیقتوں کو واضح کرنے میں حذر و احتیاط کیا ہے، اس میں کھل کی رنگ آمیزی ضرور نظر آتی ہے۔ اس رنگ آمیزی سے منٹو نے حقیقتوں کو نمایاں طور پر پیش کرنے میں بڑا کام لیا ہے۔ اس کے افسانوں پر کھل کی رنگ آمیزی کا مقصد صرف اسلوب کی نگرانی ہی نہیں، بعض بنیادی معاملات کی توضیح و تشریح ہے۔ اسی بے غٹو کی رنگ آمیزی غٹو کے یہاں مقصد نہیں ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس ذریعے سے مختلف حقیقتوں کو واضح کرنے کا مقصد بخیر اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں ایسے ہی مقامات پر حقیقت کا حسن بھی نمایاں ہوتا ہے اور حسن کی حقیقت بھی۔ بلکہ شیلوں کا زیادہ سمجھ ہے کہ جب یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے تو حقیقت حسن بن جاتی ہے اور حسن حقیقت کا دوپ اختیار کر لیتا ہے غٹو کے ہر افسانے میں ایسے مقامات آتے ہیں اور ان کے بنیادی موضوعات میں جو مختلف حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں ان پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ چلے پھرنے کی رنگین کاری کے باعث کئے حسین لیکن حقیقت سے کئے بھرپور ہیں :-

”بھر گئی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے دشمن نے حکماء سے چھوڑا اور اُن کا کیلے پھڑپھڑا پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے یہی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر پھوڑا ہے اور وہ خود بخود جاری ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے ہال رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔“ (دکالی شلواریں)

”شام کا جھپٹا تھا۔ ٹپکی ٹپکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی گھٹی ہوئی تھی جو اس کو ناستے آدمیوں کے دل میں ایسی اداسی شہرہ پر وجود دیتی ہے جو سبیل کر ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ میرے بعد ہر ایک کچلی طاری ہو گئی جب میں نے جوہر کے سندی کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو آلودہ ہوا میں چلتی ہیں جیسے بخاری بخاری برقی سادھیوں ہیں کہ وہ ترس جاتی ہیں۔“ (پریشانی کا سبب)

”ہر شے برصیل دکھائی دیتی تھی جیسے پلوں کے دریاں کے نیچے دلی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی

کیفیت کا حال قیاسی طور پر دیکھتے ہیں کہ پہلے سے پیدا ہوتی ہے۔ (دو حوالہ)
تو دیکھو اس طرح سبھی جیسے کسی نے بندی سے رنجی ہو کرے کا نشان کھول کر مجھے پسینہ آیا ہے۔
(مصری کی دلی)

”اس کے بخارش زور دے تھے نے ہونک ہونک کر باو حوا کرے سے باہر نکل کر دیا بیڑیاں
اُتار کر جب گنا اپنی ٹنڈ ٹنڈ دم بلا آسوندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدوں کے پاس
بچ کر کان چڑھانے لگا تو سوندھی چونکی۔ اس نے اپنے چادروں طرف ایک جوتا نکال
سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ مرثیے
خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے دی ہوئی ریل گاڑی سب ایشیوں پر مسافروں کا ذکر
اب دھج کے ٹیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔“ (جنگ)

”تو جو کی ماں کھڑکی کے ساتھ تھی، خاموش اور نیم روشن مڑک پر پھیلی ہوئی کچھ کو محسوس نہ کر
لگاؤں سے دیکھ رہی تھی، کھڑکی کے اس طرف وہ بے کے گھبر پر ایک وائٹس ویمپر کی سڑی
پہن بھروسہ ستری کی طرح اونگھ رہی تھی۔ سامنے جھلیا کے کی بندھو کاں کے باہر چہرہ تو سب
انگلیشی میں سے کوئلوں کی چنگاریاں خدی پتوں کی طرح پھل پھل کر رہی تھیں۔“
(موم خبی کے آنسو)

”تیرے وائٹس ہاتھ کو ایک اوٹھا ٹیلہ تھا جس کے ڈھلو افوں میں گندم کے ہرے پودے
نہایت ہی دم سرسوا ہٹ پریدہ کر رہے تھے۔ یہ سرسوا ہٹ کانوں کو بہت جلدی معلوم ہوتی
تھی۔ انکھیں بند کر تو یہ معلوم ہوتا کہ تصور کے گوندے قاصدوں پر مکی کنواریاں ریشمی
سارسل پینے جلد پھیر رہی تھی۔“ (موسم کی شہزاد)

”جہاں بیٹھا تھا وہاں دو باتوں، ایک بکرات اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جھمکے تھے۔
دونوں بکرات بولتے تھے، مگر مختلف ماب دھج سے پارسی کی آواز میں دو ٹوٹے کبھی پارسی
ٹوٹے بات کرتا تھا کبھی سوتے ٹوٹے۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا
معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی ڈانٹ ہو رہی ہے۔“ (بانجھ)

”شور شریم بانجھ کے قہر کھتے ہوئے تاروں کی بھنگا رسی پائی پائی ہے۔ آپ یہ نام پکارے
تو ایسا معلوم ہو گا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر ہونے سے گزیر دیا ہے۔“

(طوشو)

”اُس بازار کا راستہ ہم جانتے تھے، جہاں عورتیں لی سکتی ہیں۔ کالی، نیلی، پیلی، لال، اور

جہاں رنگ کی عمر تیں، پتھروں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں گھونٹے دوڑتے چلتے ہیں یہ رنگ سرخ کی عمر تیں ان میں کچے ہوئے پتھروں کے مانند لگی رہتی ہیں۔ آپ نہ بچے ڈھیلے اور چتر مار کر اٹھیں گے۔ (پہچان)

ان اعتبارات میں توئی کی رنگ آمیزی اپنے شباب پر ہے اور اس رنگ آمیزی نے ان میں بلا کاٹھن پیدا کر دیا ہے۔ لیکن یہاں توئی کی رنگ آمیزی مذاق و خواتین ہیئت نہیں رکھتی جتنی کہ وہ حقیقتیں جن کو منظر پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مقصد و شیدہ نظر آتا ہے۔ ان کاٹھن پر لے سکتے ہیں بے جگہ جس برائے حقیقت ہے اور اسی لیے ان میں ہر ایک وقت حقیقت کاٹھن بھی نظر آتا ہے اور جس کی حقیقت بھی!

منظر اس اعتبار سے ایک منظر حقیقت کا ٹک ہے۔ اس میں اس کا کوئی ثنائی نہیں!

اب تک منظر کی حقیقت نگاری پر جو بحث ہوئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منظر کے یہاں حقیقت نگاری کا میدان محدود نہیں ہے۔ اس کے فیم میں اس حقیقت نگاری کے بے شمار پہلو ہیں۔ ان گنت روپ ہیں۔ اور اس کی حقیقت کو دیکھنے والی نگاہیں ان تمام متفرع پہلوؤں کو دیکھتی ہیں۔ یہ سارے مختلف روپ اس کے سامنے آتے ہیں اس نے عام انسان کی زندگی کے حقائق کو بھی دیکھا ہے، سماجی زندگی کے معاملات و مسائل کی حقیقتیں بھی اس کے سامنے آتی ہیں۔ انسانی نفسیات کے تاریخی اور ایب تاریخی دونوں پہلوؤں کے حقائق اس کی نظروں کے سامنے رہے ہیں۔ لیکن ان سب کو پیش کرنے میں وہ خود مایل رہا ہے۔ کیوں کہیں ایب تاریخی نفسیات کو پیش کرتے ہوئے تھوڑی سی احتیاط پسندی اس کے یہاں ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ عام انسانی مسلح سے بچے نہیں گرتا۔ برعکاس اس کے ایسے حقائق پر تو اس کی حقیقت نگاری اپنی انسانی ہمنوا رہتی ہے۔ باوجود کی تاقتہ نہانے اور موزوں اس کے ایسے ہی شاہکار انسانے ہیں۔ بظاہر یہ تینوں کردار دیکھنے میں عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن عجیب دکھانے کے باوجود منظر انسانی انسانوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اور اسی لیے ان کی تمام حرکات و سکنات حقیقت سے اپنی قریب نظر آتی ہے۔ منظر نے ان سب کی حقیقت کے روپ میں دیکھا ہے یہاں میں اسے حقیقت کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ ان حقیقتوں کو کیسے کہیں اس نے حالات و واقعات اور معاملات و مسائل میں بھی تلاش کیا ہے۔ اور اسی لیے اس کے یہاں فضا اور اعمال کے بھی بعض بہت اچھے انسانے ملتے ہیں لیکن حقیقتوں کو دیکھنے کا جو ملکہ اس کے کرداروں میں حاصل ہے، اس کی مثال سارے انڈیا انسانے میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اسی لیے اس کے بہترین انسانے کے کرداروں کے مطالعے پر مشتمل ہیں۔ اور ان انسانوں میں حقیقت نگاری کا کمال نظر آتا ہے۔ بہر حال منظر کے یہاں تنوعات کی حقیقت نگاری اور حقیقت نگاری کے تنوعات ہیں۔ لیکن ان میں ہر چیز مشترک ہے۔ اور وہ بجا ایک انسانی زاویہ نظر!

یہ انسانی زاویہ نظر منظر کی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے۔ اور اسی زاویہ نظر کا یا اثر ہے کہ منظر کے تمام انسانوں میں انسانیت اور انسان دوستی کی ایک ہمہ گیر دوڑی جوتی نظر آتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست (HUMANIST)

ہے اور اس انسان دوستی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کے مختلف مظاہر سے گہری محسوس رکھتا ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے، جو کچھ بھی سوچتا ہے، مشواہی سب کو دیکھنے کا ضیاعی ہے۔ اسی لیے اس کے یہاں عام انسانوں کے جذبات و احساسات، عادات و کیفیات، ان کی آرزوئیں اور تمنائیں، ان کی حسرتیں اور بالوہیں سب کی حقیقت سے بھرپور تصویریں موجود ہیں۔ اس سلسلے کے کسی پہلو کو بھی مشواہی نے چھوڑا نہیں ہے۔ ہر پہلو کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن مشواہی انسانی زندگی اور انسان دوستی صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے۔ وہ سماجی معاملات سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ مشواہی کے یہاں اس حقیقت کا گہرا شعور ہے کہ انسانی زندگی میں فرد ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سماجی معاملات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ فرد بہر حال سماج کا ایک جز ہوتا ہے اور سماجی حالات اس کو ہر اعتبار سے متاثر کرتے ہیں۔ چنانچہ سماجی زندگی کے ایسے معاملات کی ترجمانی جن سے افراد کی زندگی براہ راست یا باواسطہ طور پر متاثر ہوتی ہے، مشواہی نے کی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ان معاملات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے جن زندگی کے غلط نظام ان کو اسے تباہ کر کے مختلف احوال میں فرواں دے رکھتے ہیں اور جن کی وجہ سے انسانی زندگی کا ہر سوکھ سوگم ہو گیا ہے۔ زندگی کو جس سانچے میں ڈھلنا چاہیے تھا نہیں ڈھل سکی ہے۔ اور اس کی رفتار و رفتار کا ہر اندازہ ہوا چاہیے تھا، وہ اسے دھیر نہیں سکتا ہے۔ اس میں گندگی اندکائی ہے۔ اور غشوائی گندگی اور تباہی پر کوڑھ ہے۔ اس پر غصے کے آنسو بہتا ہے۔ اس طرح اس کے تمام پہلو افراد پر روشن ہو جاتے ہیں، لیکن خود مشواہی کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ ان حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے کوئی واضح و محض غلطی مشواہی کے یہاں ہرج و مرج نہیں ہے۔ وہ ان کو دیکھتا اور کہتا ہے۔ اُسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ان حالات کو ٹھیک کس طرح کیا جائے۔ بہتر کس طرح بنایا جائے۔ لیکن اس کی ضروریوں میں ان حالات سے بیزاری ضرور محسوس ہوتی ہے۔ وہ ان سے باہر نکلنے کا احساس دلاتا ہوا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ مشواہی کے یہاں ان حالات کی تنقید نہیں ہے۔ عکاسی ہی عکاسی ہے، ترجمانی ہی ترجمانی ہے۔ اس عکاسی اور ترجمانی میں کہیں کہیں فطرت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اور اس فطرت سے کسی حد تک تنقید کی بھی پوری ہوجاتی ہے۔ زندگی کی ترجمانی اور عکاسی میں دو چیزیں غشواہی میں بھی پیش نظر ہیں۔ ایک فطرتی ذورہ نظر اور دوسرے عام انسانی ہمدردی۔ غشواہی انسانی ارتقا کا تاکی ہے۔ اس لیے انسانی زندگی اور اس کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ ایک فطرتی ذورہ نظر اختیار کرتا ہے۔ اُسے جذبات کے دھارے پر رہنا نہیں آتا۔ اسی لیے اس کے یہاں جذباتیت نام کو بھی پیدا نہیں ہوتی۔ عقل و شعور ہر جگہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان سب کی تان انسانی ہمدردی پر چاکر لگتی ہے۔ یہی باتیں اُسے انسان دوست بناتی ہیں۔ اس انسان دوستی نے اس کی حقیقت نگاری کو زندگی بخشنے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور انسان دوستی سے بڑی حقیقت اس زندگی میں اور کوئی نہیں۔

مشواہی اشتراکی نہیں ہے، اس لیے اس کے یہاں اشتراکی حقیقت نگاری کا وہ تصور نہیں ابھرتا جس کی بنیاد سماجی زندگی کے طبقاتی اور جلدیاتی شعور پر استوار ہوتی ہے۔ مشواہی کے یہاں یہ شعور نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے محدود شعور کی روشنی میں زندگی کی مختلف اور متنوع حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے یہاں اشتراکی اور تنقیدی حقیقت نگاری بھی

لیکن جن حقیقتوں کو اس نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ ہماری عام زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اُن نے اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات و مسائل سے موضوعات منتخب کیے ہیں اور اس سلسلے میں اس کا ذرا بے نظر ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے۔ اس کے افسانوں میں ہر حقیقتیں نظر آتی ہیں وہ اس کے تخیل کی پیداوار نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ فاشن نے خارجی طور پر انہیں سماجی زندگی میں دیکھا ہے۔ اُسے ان کی تلاش و جستجو میں کوئی بڑی کاوش نہیں کرنی پڑی ہے۔ زندگی کے شعید احساس اور حالات کے گہرے شعور نے انہیں اس کے سامنے لا کھڑا کر دیا ہے۔ اس کی فوری اور فوری میں نظریں ان سب پر حاوی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس نے ان حقیقتوں کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کے یہاں جگہ جگہ ان میں سے بعض نئی حقیقتوں کے پیکر ابھرتے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔

اور یہی اس کی حقیقت نگاری ہے !

عبادت بریلوی

سعادت حسن منٹو کی یاد میں

ہرگز منٹو کا تعلق کسی خاص ادبی فرقے (SECT) سے نہ تھا اس لیے اس بات کا اندر نہ محسوس کیا جاتا تھا کہ کیسے ان کی لاش پر کلاسوں کے مختلف ادبی فرقوں کے درمیان لڑائی نہ ہو لیکن غرضی قسمی سے منٹو کی اس وقت موت آئی جبکہ ادب میں مجبور تھا اور سیاسی فضا کسی قسم کے جنگاں کے لیے سازگار نہ تھی۔ پھر بھی مناسب ہے کہ جب ان کے انتقال کی خبر، انتقال کیوں موت کی خبر اور ہونڈی اور شیشی سے لڑائی لگتی تھی اس سے ان کے دل سے لڑ نہیں ہو پاتے تھے، اگرچہ فرقہ پرست قسم کے لوگ مروجہ کے گھر پر اس حقیقت سے بھی لگے لیکن وہ لوگ اتنی دیر میں پہنچے کہ ان کی لاش پر قبضہ کیا جا چکا تھا۔ یہ قبضہ نہ تو انہوں نے کسی فرقے نے کیا تھا اور نہ شرکے رؤسا اور بھانڈے اور حکومت نے بلکہ اس انہوہ کثیر نے جس میں اکثر و بیشتر کے گھر کھڑے سوسائٹی کی نگاہ میں مشتبہ تھے۔ ان میں سے شاید نادر ہی کوئی ایسا تھا جس کا تعلق دولت کی پیداوار سے براہ راست رہا ہو، اور نہ وہ سب کے سب دولت ڈالنے والوں کے لیے سامانِ تفریح و ہم ہنپانے والوں میں سے تھے۔

اکثریت یقیناً انہی لوگوں کی تھی لیکن ان میں جابجا اور جوں کا چھوڑ کر غیر مشتبہ کیریکچر کے لوگ بھی تھے۔ انہی میں ایک مروجی صاحب اور کچھ سکول لوگ بھی تھے جو اپنے مخصوص طبقے کی وجہ سے خواہ مخواہ نمایاں معلوم ہو رہے تھے۔ ہرگز مروجہ مروجی اور سکول دونوں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے اس لیے ان کا جو کچھ پر مشتبہ کیریکچر کے لوگوں کے درمیان گھر بھر مروجی جو بولدی وہ بگنی۔ کیونکہ انہی سی بات پر وہ ان سے مخالفت مول لے کر اپنا بڑا نفس قربان کر کے پڑا مانہ نہ تھے۔ ان کی یہ کاروباری اور اداری کس قدر بڑی تھی اور وہ اپنے متنازعہ میں کس قدر حسرت پرست واقع ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا جبکہ مروجی صاحب نے فغا جازہ کی تیاری میں لاپرواہی اور شائمانہ کریمیں پر کھو دیا۔ وہی گروہ جو چند منٹ پہلے بڑے نفس کا خیال کے خاموش ہو رہا تھا احتجاج پڑا کر آیا۔ مروجی صاحب نے اعتراض کی ذہینیت کو جانب دیا اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا، حضرات میں نے جو ڈرامے اور شائمانہ کریمیں دیے اس کا سبب یہ ہے کہ مروجہ بالخصوص میری ذات سے متعلق اسے کہ وہ غریب کا آواز کا تصور کرتے تھے۔ وہ مذہب کی سمجھ بڑھ یعنی خدمتِ خلق اور اس قسم کے دوسرے اصولِ حسنہ کے خلاف نہ تھے لیکن ان علیوں اور اداؤں کے ضرور مخالفت تھے جن کی کہیں گاہ سے انسان کو شکار کیا جاتا ہے۔ مروجہ کی ایک کہانی صاحب کا ہاتھ تو آپ حضرات نے پڑھی ہی ہوگی۔ میں ہی اس کہانی کا ہیرو یا ویلیں ہوں اور یہ ڈرامے اور شائمانہ کریمیں کے اتارنے پر اتنا احتجاج ہو رہا ہے وہی ہے جسے ایک بار میں مروجہ کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ مروجی کے اس اعتراض پر مشتبہ کیریکچر کے لوگوں کے درمیان اور بھی زیادہ احتجاج بڑھا۔ وہ علانیہ کہنے لگے۔ ہم کبھی بھی ایسے مروجی کے لیے غنا نہیں جو بد بالٹی جو ان ہے۔ اعتراض کی عجیب و غریب ذہینیت مروجی صاحب کے لیے سخت پریشان کن تھی چنانچہ انھوں نے مجمع کو

ایک بار پھر مخاطب کیا حضرات ہمارا تعلق قوم یہود سے نہیں کہ ہر ایک کام کے افتتاح کے لیے کسی مخصوص جہتی کو تلاش کریں اور نہ مرحوم نے کبھی ایسی تلاش کو بنا کر دیکھا۔ وہ قریب سے نزدیک گنہگار آدمی کو سب سے زیادہ ایک کام کا دل بگھنے دیتے اور یہ بات حق پر مبنی ہے جیسے کہ آپ کو اپنے ذاتی تجربے سے بھی علم ہو گا کہ کئی کاروبار میں صرف گنہگار آدمیوں ہی پر تو سب سے زیادہ نیک آدمیوں کو تو بُرائی ہی کی طرف جھکے پایا ہے۔ عمومی صاحب کے اس جملے پر (NO PERSONAL REMARK) کو ایک زبردست شہرہ تھا لیکن عمومی صاحب کی آواز اس پر لی جانا کہ اگرچہ یہ حق ہے آپ کے ذہن میں میری ذات سے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہیں جو غالباً فقہ کی لغو اہمیت سے پیدا ہوئی ہیں، میں نے جو کہہ دیا اس کا مجاز فقر میں موجود ہے، کسی بھی مطلقہ کو اس کا طلاق دینے والا ہو اس وقت تک معتد ثانی میں نہیں لاسکتا ہے جب تک وہ مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے اور وہ دوسرا اسے طلاق نہ دے۔ فرض کیجیے اگر عمومی مطلقہ عورت یعنی چھ ماں کو میں اپنے نکاح میں نہ لانا اور دوسرے ہی دن صبح اپنی مرضی سے اسے طلاق نہ دے دیتا تو پھر جو کی شادی دوبارہ چھ ماں سے کیے نہ ہوگی کیونکہ اس کا امکان بھی پایا جاتا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہو تو وہ چھ ماں کو طلاق دے دیتا۔ میں نے جو کہہ دیا سچ اور چھ ماں کی بھلائی کے لیے کیا۔ اس میں بظاہر میری زندگی ہے ذکر جاتی۔ اس پر ترجیح خاص ہو گیا۔ حالانکہ اعتراض بدباطن پر تھا۔ اور ایسی خاموشی چھا گئی کہ کبھی کسی بھی بدعت پر لوگوں نے اعتراض نہیں کیا۔

جب نماز بخاندان ختم ہو چکی اور پھر عمومی لاش کو قبر میں اتارنے کا وقت آیا تو باوجود ان کے اس منور دل، جی اور لبہ سگھونے خاص طور سے حسرت لہ لگا اور گھر لوگ بھی تھے اور جب یہ دم پڑی ہو چکی اور مرحوم کی لاش منی کے حوالے کی جا چکی تو عمومی صاحب نے اوروں سے درخواست کی کہ وہ مرحوم کے ادنیٰ کارناموں پر روشنی ڈالیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کوئی شخص مرحوم کے الفاظ میں اپنا حرف مطلب نکالنے نہ کرے۔ اس پر آخر یہی حضرات پیچھے ہٹ گئے اور صرف افسانہ نگار حضرات آگے بڑھے۔ اردو کے ایک مشہور افسانہ نگار جنھوں نے اپنی زندگی کے کئی سال منشور کے ساتھ ہی رہے تھے، ان کی شخصیت کو آئینہ دکھانا چاہا۔ لیکن وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ ایک ہی آدھ جملے کے بعد یہ کہہ کر روئے گئے کہ کیا منشور ظالم اور مست تھا افسانہ نگار کے اس ایک جملے نے وہ کام کیا جو غالباً کسی بھی چوڑی تقریر سے ممکن نہ تھا میں نے سوچا کہ ہر شخص کی آنکھوں میں ہنس آگئے اور مرحوم کی شخصیت، اخلاقی اہمیت، گرائی اور دہمندی کی تصویریں کچھ گھٹی، اب ان کی جگہ ایک دوسرے مشہور افسانہ نگار نے افسانہ نگاری کی اپنی اہمیت سے ہٹ کر ان کی افسانہ نگاری کو اپنا موضوع بنایا۔

حضرات منشور کی افسانہ نگاری اس کی شخصیت کا آئینہ ہے اور شخصیت کا یقین خواہ غلط ہو یا صحیح ہم لوگ بالعموم آدمی کے مزاج سے کیا کرتے ہیں۔ حکیم جالینوس کا خیال ہے کہ آدمی کے مزاج میں سودا، اسفرا، بلغم اور خون ان چار اجزاء کے مختلف انواع تناسب کو دخل ہوتا ہے لیکن مرحوم نے اپنی شخصیت سے اس حکم کو بھٹلا دیا۔ ان کے مزاج میں سودا، اسفرا اور خون تو تھا لیکن بلغم بالکل نہ تھا۔ وہ نہ تو زہنی واقع ہوئے تھے اور نہ ہنسوا۔ ان کے افسانوں میں زہنی اور زہنی ہے نہ کہ شہیاد یا حق پر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے افسانوں میں زہنی اس وجہ سے ہے کہ وہ افسانہ نگار کے پہلو کوئی کڑوا گھونٹ آتا رہتے تھے لیکن میں اسے بالکل احمق غلط سمجھتا ہوں۔ آدمی کو دیکھ کر دیکھ کر ہوں۔ نہ تو زہنی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور نہ اس وجہ سے کہ کسی کے آداب میں زہنی

یہی آنکھوں کو کھینچا ہوں، حضرات اس کے افسانوں کے تحت اور ترش ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں سے زیادہ حساس اور زیادہ ذہین و بالغ ہوا تھا۔ اس کا رد عمل اور اس کی گرفت دونوں ہی ہم لوگوں سے زیادہ تیز اور سخت تھیں۔ وہ جس قسم کے سماج میں رہ رہا تھا اس میں صرف عنفوت اور سڑاؤ ہی نہ تھی بلکہ شدید قسم کی جہان بینی اور ذہنی بے بسی بھی تھی۔ بڑے سے بڑے حادثات اس طرح پاس سے گزر جاتے جیسے وہ کسی جوانی بندوق کے دوپٹے سے نظریوں میں غلط ہماری اس بے بسی سے اکٹا کر کسی بھی اصلی بندوق پٹا دینا کرتا اور بالکل ہی سنجیدہ رہتا۔ کیونکہ تو وہ رونے کے لیے منہ آ آ کر نہ ہنسنے کے لیے رلاتا۔ وہ چونکہ کرنا دہی اس کا مقصد ہوتا۔ اس کا مقصد سوسائٹی کی دوئیں کو مسترد کر دینے، یعنی ڈھکے بھر چلنے والے پتے کو روک دینے کا تھا۔ ایسا آدمی حقیقتاً باطنی کنگا تھا۔ لیکن اس کی بغاوت میں نہیں ہے بلکہ ثابت ہونے والا آزاد ہے۔ اس میں خطر نہیں کہ اس قسم کے آدمی کی طوٹ دہی آتے ہیں جس پر بقول اخطاطوں نبوت ضرور تھا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہئے کہ اگر کوٹ سے حمود برآمدی وہی ہوتے ہیں جو اپنے نبوت کو کھنگا دیتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی فونی نہیں ہے کہ عیوب زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے نبوت کو کھنگا دیا تھا۔ وہ صدیوں تک علوم کے قربات پر زندہ رہنے والے ہیچ ہونے کے بجائے مشکف جھوٹ ہونا زندگی کے ان تجربات کے ذریعے نہیں جن کا سادہ سادہ کہ ہم سو جاتے ہیں، بلکہ ان تجربات کے ذریعے جو ہمیں خواب میں بیدار رکھتے ہیں۔ چونکہ کشش کے لیے اس قسم کا میٹرٹل فزائیکل سے ملتا ہے اس لیے کہ اس کی کم مقداری پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور یہ اسی ہی صحت کا نتیجہ ہے کہ فنی کا اپنے آپ کو دہرایا بھی کرتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اپنے آپ کو دہرایا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ہم اسے پکڑ لیں۔ وہ ہر بار اپنے تجربات کے پہلو بدل دیا کرتا۔ منٹو کے اس مشکف جھوٹ کی بنیاد صرف اتنی سی بات پر ہے کہ اگر دنیا کے سارے انسانوں کی کھال یکساں ہے یہ اعتبار و عمل تو ان کی نوع بھی یکساں ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے اسے وہ لوگوں کا تاثرات و اصول بتاتے۔ اگر کھال راحت اور تکلیف کے اصول کی پابند ہے تو نوع بھی یکساں طور پر ٹیک و ہدیکہ تیز کر پابند ہے۔ کیونکہ قرینیت میں کھانا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اس وقت بارخ عین سے نکالا جبکہ ان میں ٹیک و ہدیکہ تیز پیدا ہو کر تھی چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ایک زندہ آدمی کو اس کی زندگی میں اس قدر اصولوں کی کارفرمائی سے بچانا یا جاسکتا ہے وہ اپنے سلیقہ کو غالب کر کے پا لیتے۔ آخر یہ کس قسم کا کلچر ہے۔ یہ کوئی ہی جملہات ہے جس میں اگر کھال راحت و تکلیف کی جواب دہی سے بے نیاز ہو جاتی ہے تو زور ٹیک و ہدیکہ تیز مبالغہ کرتی ہے۔ "کالی طیارہ" سے لے کر کھول دو ٹیک میں جہاں انسان کی زندگی ہموار کر جاتی ہے اور صرف شکر و حمد اور جاتی ہے اسی تمدن اور کلچر پر مبنی ہے۔ اٹلی فٹز ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ منٹو کسی خاص نظام کا نام نہیں لیتا ہے لیکن کیا کافی لاہیں منظر نظام کی طوٹ اشارہ نہیں کرتا ہے۔ منٹو کی کہانیاں اسباب کی طوٹ نہیں بلکہ اثرات کی طوٹ اشارہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر سٹڈی نہیں چلا گیا بلکہ اس بات کا کہ وہ سپریم یا اثرات پیش کرتا ہے اس سے ہمارے کلچر اور تمدن کا مریض ہونا لازمی ثابت ہوتا ہے۔ دہرائی کہانیاں میں آدمی کو آدمی کے خلاف نہیں بلکہ آدمی کو خود اس کی ذات کے خلاف جھڑکاتا ہے۔ اور چونکہ مرحوم کا آدمی ناخواندہ تھا جیسا کہ ہم آپ ہیں اس لیے وہ سپریم کو اس کے حواس کے سے جاتا۔ اس سے بہت سے لوگ چڑ جاتے۔ لیکن چڑنے کا اصل سبب یہ نہ تھا کہ جو چیز اشارہ اور کنایے سے بتلانے کی جہاں سے

وہ جاری ناک میں کیوں ٹھونسے دیتا ہے بلکہ یہ تھا کہ کیوں نہیں وہ غیر محض کی باتیں کرتا ہے، کیوں خیر کی بقا کے لیے شر کی مابیت کو بھی بے نقاب کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس سے خیر کا انکار تاہم جاؤ رہتا ہے۔ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں ہی جڑوں سے بچے ہیں ایک کی جڑ دوسرے سے لگی ہوئی ہے۔ تیر کا شعر ہے۔

اٹھی کیسے جوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہیں تو شرم و اشغیر جوتی ہے حسد کا کتے

اگر خدا کتنے میں ہیں شرم کا ایک پہلو ہے تو پھر بندگی کی خواہش کیوں کی جائے لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم صحت اپنی بندگی ہی پر فخر کرتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ یہ آدمی جس کو فلسفیوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں بڑا فلسفہ ساز ہی ہے۔ اگر ایک طرف وہ آدمی کو شکار کر لے والا فلسفہ گھڑتا ہے تو دوسری طرف شکار ہی کو سپید کرنے والا فلسفہ بھی وہی گھڑ کر لاتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں مرحوم کے پاس کوئی فلسفہ فلسفہ تھا یا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کی ہر کتاب میں شکار ہی کے لیے اشتعال اور سوچنے والے کے لیے تحریک ہوتی۔ اس ایک گڑ کے علاوہ ان کے پاس لٹنے بھڑنے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ نہ تو وہ اپنے افسانوں میں ہمارے شعرا کی طرح تیز و چمکتے، درخشاں ہوتے تھے۔ یہیں بیسار کماؤں دیتے اور نہ ہمارے چاند گزشتہوں کی طرح ہم وزن فقروں کے گنبدِ فطرت میں اچھلتے اور نہ ہمارے کتب باز نظریہ اور مزاحیہ مضمون نگاروں کی طرح فقط اور جملے سے جملے کی پٹیاں نکالتے جاتے۔ وہ اس قدر براہِ راست قلم کے آدمی تھے کہ وہ ان چیزوں کو بھی فرادہ سمجھتے وہ تو موت آؤ شٹ تھے۔ فظوں کے انبار کو چیر کر مقدمہ تک پہنچا جانتے تھے۔ ان کی تشبیہات و استعاروں میں الفاظِ کمال اور حقیقتِ نر اوہ ہے۔ ہمارے بعض نازک مزاج خرفان گوان کے اس کمال سے بھی بڑھتی۔

فاضلِ افسانہ نگاری یہ تقریر اس قدر بے مغز ہو چکی تھی کہ سامعین کے درمیان سخت قسم کی کسمپاشی پیدا ہو گئی۔ لیکن چونکہ معزز ہر شاعر تھا جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری میں چونکہ مزاحیہ کالم کہنے لگا ہے اس لیے اس نے اپنی تقریر کا رخ موڑ دیا۔ "حضرات! آپ گھبراہٹیں نہیں ابھی میں مرحوم کی زندگی سے متعلق خبر سے دارِ باتیں سناؤں گا۔ مرحوم نے ایک بار اردو کے مشہور افسانہ نگار دیو چند مستیا دہی کی وارسی کو شریب سے رنگ دیا اور مصرع پڑھا:

اس دفتر ہے معنی فوقِ شئے نابِ ادبی "

اس پر مجمعِ ادبی برا فروغ ہو گیا اور انہیں بیڑہ چاہیڑا۔ ان کا بیٹنا تھا کہ جب کترے صاحب جنہیں ساری دنیا جیب کترا ہی کہتی، کترے جو کترے اور بغیر مولوی صاحب کی ہجارت کے تقریر کرنے لگے :

تصنیفات بہمنو صاحب کے آرٹ اور زندگی پر بولنے کا حق جیسا مجھے ہے کسی کو نہیں ہے کیونکہ میں انہیں اندر سے جانتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ میں ان کے آرٹ اور زندگی پر وہ خوشی ڈالوں، میں اپنا تعارف کرنا چاہتا ہوں، میں جیب کترا ہوں میں نے ایک جھوٹی کتابی تین بیگم میر زمان کے سینڈ بیگ سے ان کا (LOVE LETTER) اُڑا دیا تھا اور میں نے ہی ایک ریڈیائی ٹیڈ سے میں جلا کو اس کا سینڈ بیگ دیا تھا۔ میرا نام نہ تو کاشفی ہے اور نہ گھانسی، نام اس کو دیا جاتا ہے جس کی کوئی تقاریر ہوتی ہے اور جو کہ میں اپنے خالق کے ہاتھوں اس صفت سے محروم رہا ہوں اس لیے وہ مجھے صحت جیب کترا کہہ کر یاد کرتے اور

شارٹ ٹاکس میں صرف جیک (TACKS) کہہ کر بلایا کرتے جہاں کسی (HYPOCRITE) طرح پوش کو جانتے دیکھا، بولے جیک اس کا چور پاکٹ اور دے۔ مگر چور دوسرا ہوتا ہے کہ میں چٹا پڑ جائے دوسرے کا چور کیا جائے کہو کہ مجھ میں اپنی انفرادیت تو ہے ہی نہیں تو یہ نام غیر مناسب نہ ہوگا۔ منٹو صاحب نے میرے وجود کی اس کمزوری سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے جب بھی انھیں اپنے نظریات کے لیے کوئی دوسرا ذمہ تو مجھے بلا جیتے، اور بات تو آپ حضرات جانتے ہی ہیں کہ منٹو صرف منہ ہی ہوتا ہے بلکہ اصلی صاحب سے بھی ماری ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کی کمزوریاں سلنے آجاتی ہیں اور وہ خود بیک گراؤ میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایک طنز نگار کو برداشت کرنے کے لیے بہت ہی مذہب قسم کی سوسائٹی کی ضرورت ہے جسے آئینہ کوٹھڑا آتا ہی نہ ہو، منٹو صاحب اصل میں اسی پیشے کے آدمی تھے اور اس کی اخلاقیات کو سختی سے بدتے، جس میں آدمی کے دشمن پر طنز کیا جاتا ہے نہ کہ اپنے دشمن پر۔ چنانچہ وہ غالب کو بہت پسند کرتے۔ ایک بار یونی میں نے پوچھا میں نے آپ کی زبان سے کبھی اکبر الہ آبادی کا کوئی مصرع نہیں سنا۔ بولے جیک میں فرسٹ کلاس آدمی کو پسند کرتا ہوں، فرسٹ کلاس آدمی کے پاس کوئی تعصب، کوئی چور پاکٹ نہیں ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی خیر روانی کے استری میں بائیں جانب زپ لگا ہوا چور پاکٹ تھا جہاں سے اکثر ایک ملاجی بولتا رہتا۔ غالب کے فزل میں اس قسم کا کوئی بھی چور پاکٹ نہ تھا۔ اس پر میں نے پوچھا آخر آپ (HYPOCRITE) سے اس تھوڑیوں خفا رہتے ہیں یا بولے تو نہیں جانتا ہے، چور پاکٹ اسٹیک کے ایک ٹکڑا کو کتے ہیں جو زندگی میں اپنا بدل نہیں بلکہ دوسروں کا بدل ادا کرتا رہتا ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی بلکہ دوسروں کی بھی ایچ اور اخلاقی حرمت ماری جاتی ہے۔ میرے گھر کا اس کا صوب دوسروں کو لگتا رہتا ہے اور آٹا اٹلی منہ ہی ہوتا ہے دیکر بڑا۔ چنانچہ میرے سب اسی کا رد عمل تھا۔

حضرات! وہ آپ لوگوں کے درمیان جانتے معنی اچھے آدمیوں کے درمیان جانتے جو اپنے پیشے میں بڑے درمیانی ہیں، یعنی دونوں پارٹوں کا طعنہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی بات سے بالکل سحرست ہیں، کیونکہ وہ اپنے پیشے کو نہ چھپانے پر مجبور ہیں انہیں کہیں سے تال کی آواز سنائی دیتا ہے، منٹو صاحب محنت تک پہنچنے اور سوسائٹی سے اس کے مرض کو خارج کرنے کا بڑا راستہ اختیار کرتے اس پر ان کے بعض دوستوں سے ٹری میٹ رہتی۔ وہ کہتے منظور تم مسئلہ لوگوں کی اخلاقی سرے سے پہلے ہے۔ کیوں نہیں سیاسی، اقتصادی سرے سے پہلے ہے کہ کیوں نہیں طبقات، سیکڑاؤں، تینڑاؤں، اقل اور انقلاب کی شعلوں میں سو جتے ہو؟ اس کے جواب میں منٹو صاحب کہتے "تم لوگ بعض اوقات فوری مقاصد پر اتنا زور دیتے ہو کہ دور کا منصب ایسی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، بعض اوقات نظام پر اتنا زور دیتے ہو کہ آدمی گم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات راستوں پر اتنا زور دیتے ہو کہ مقصد گھوٹ جیتے ہو۔ کیا یہ لیکن نہیں کہ تم لوگ مجھے سکھانے کے بجائے میرے آرٹ کی امپرٹ کو دیکھ سکو، اگر ایک دولت میرے لیے فوہ، فوہ کے غرور پر خود سلی غصہ سے فوہ اہم ہے اور میں اپنے مسائل میں وہ سب چھٹی کرتا ہوں جو کچھ کہہ سکتا ہوں کہتے ہیں نہ کہ وہ سب تاہم یہ جو کہ انھیں کرنا چاہیے تو دوسری طرف مجھ میں ایک اخلاقی حس (SENSE) بھی ہے جہاں کے مثال کے تالے میں میں بھی کے دھانے کو ٹھنڈا رہی نکالتی ہے۔ یہی میرے آرٹ کا وہ اخلاقی پہلو ہے جو کہ تمنا چاہیے میں پایا جاتا ہے۔"

حضرات! منٹو صاحب نے اپنے آرٹ میں بے کوہونے سے کچھ ایسا ملادیا ہے کہ ان کا پردہ ہٹا دیا اور ان کی پیشی آرٹ ہی کی

ہے۔ ذکاوت کا آٹمی پر پختہ یا روایتی پیش بر کردہ گیا ہے۔ منطو صاحب ایک مورٹ اور سٹو دونوں ہی میں مہیا کر دینا کہ علم بڑے فنکار گزرتے ہیں۔ بد نصیب تاجیک کے کلر پر جس نے اپنی زیادہ فزائی اور منج اندوزی کو جس میں ہیں کیا کہ نہیں دیا، جسکی کلر پر ہی دیا آج سے نہیں چکے صدیوں سے علم کیا بنا رہا ہے اور یہ علم اس کے کلر پر اسکی کی تمام صدیوں میں اخلاق پیلوری سے کیا گیا ہے۔ اس کے معنی نہیں کہ سیاست کا پہلو اس سے رنگا نہیں کاتا، کیونکہ ایسا ممکن ہے۔ منطو صاحب اسی کو ٹھانڈا لڑائی میں کے آدمی تھے۔ وہ بالوک، گوگول، زولا، موپسان، ٹاسٹائی، چخوف، گوگول اور یم چند کی روایت کے آدمی تھے، گوگول سے کہ وہ روایت پرست نہ تھے۔

حضرات انسانی مساکی کو دیکھنے کے ہیں دو طریقے ہیں، یا تو انھیں سیاسیات اور اقتصادیات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے یا پھر اخلاقیات کی روشنی میں، ہمارے اوپان دونوں طریق کار کی اثر آفرینی اور دوسری پر بحث و تھیں کر سکتے ہیں، لیکن جو چیز بحث میں لائے کی نہیں ہے وہ یہ کہ ان میں سے کوئی بھی طریق کار واحد طور پر کسی فی کار کے آرٹ کو بنا نہیں کر سکتا ہے۔ یہاں لفظ واحد پرستی اہم ہے، اس کے لیے کچھ اور چیزیں بھی پچا تھیں ہیں پر ہمارے ناقدین برابر روشنی ڈالتے رہتے ہیں، آٹمی ہی بلند ہوگا جو زندہ ہوگا، نہ کہ نفس اور جادہ۔ منطو صاحب کے آرٹ میں وہ ہاں موجود ہے جو کمال کی ایک داخلی وحدت اور سلطنت میں ڈھانپنے اور ایجنزیا ضرورت کو جس سے خطاب کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اس لحاظ سے منطو صاحب ایک بڑے فی کار تھے جو کہ ان کے ہم عصر انسانہ نگار نہیں ہیں۔ خواہ وہ آٹمی میں کھتے ہوں، ہندی میں کھتے ہوں یا انگریزی میں منطو صاحب کو موپسان کے ساتھ ہی ٹھاننا ہوگا۔ لیکن یہ بات اور حوری رہ جائے گی اگر اس میں غلط مرقع میں ان کی انسانہ نگاری کی کچھ تنقید نہ شامی کریں۔ منطو صاحب کی تنقید تجارتی کلر پر (INFERENTIAL) ہے۔ ذکر مبالغہ یا براہ راست، وہ آدمی پر زیادہ اور اس کے گلے میں جو تھیں اس پر کم تر رہتے ہیں یہاں کم کا لفظ ہی کافی رہا ہے ان کی زیادہ تر توجہ اسی بات پر رہتی ہے کہ دیکھنا اس شعلہ کو، اس اوپان، اس ٹھنڈو اور پھر بڑے کرے تجارتی کلر کے کو طو میں چھین کر بھی انسان ہے، اس میں نیکی کا جوہر — بعد ہی اندر لائی کا بندہ زندہ ہے، منطو کا یہ رجحان جو ان کی انسان دوستی کا نشان ہے وہاں تک ہے اس لیے نہیں کہ ایسا نہیں ہوتا ہے ایسا تو اکثر ہی ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ اس سے آدمی کو کو کھوسے لکھنے میں مدد نہیں ملتی ہے۔ یوں تو ہر دم کو نہ تو آنت سے دیکھی ہے (معلوم نہیں یہ کون سا فلسفی ہے) اور نہ کانٹ سے اور نہ کارل مارکس سے اور نہ فروئیڈ سے لیکن ان کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کونس پرگ کے چینائی (CHINAMAN) کی طرح وہ بھی اسی کو شیک کھتے تھے کہ انسان میں اخلاقی حس (SENSE) فطری ہوتی ہے، اب یہ بات دوسری ہے کہ ہر دم اس (METAPHYSICS) کو ٹھنڈا دیا جاتے جاں اس کی توقع وہ چینائی میں نہ کرتا ہر دم کی کہانیوں میں، جو لڑا نائیت ہے ان کی اسی نرالی اراد سے متعلق ہوتی ہے وہ ہر کام غیر متعلق کرتے تھے لیکن وہ اپنی اس ٹھانائیت میں اس قدر زیادہ چھین گئے تھے کہ وہ حضری ذہانت سے زیادہ اور اکتسابی ذہانت سے کم کام لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی ہمارے پہلے پڑے کئے اور انہماکوں میں کم ہی فرق ہے۔ کیونکہ اگر ایک علم سے بے بہرہ ہے تو دوسرا انسانی حیثیت سے علم کے تعلیقی جوہر اور تطبیق سے بے بہرہ ہے، لیکن اس کے معنی نہیں کہ

علم کا یہ کام کیا تھا ہمارے بے باطل ہی بے گاہک ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنے صلہ کی حیثیت کو بھی دیکھنا ہو گا۔ ہمارے یہاں صدیوں سے کتاب و لسان کے عمل سے علیحدہ رہی ہے۔ ہم بقرآن اور مطہرہ و تاکید کو اس زمانے میں بھی پڑھتے رہے ہیں جبکہ ان کی کتاب و لہجہ و نظر و شرح کیسے بنا جا چکا تھا۔ یہیں کچھ دنوں تک سوئی کوئی کتاب پڑھنے والے اپنٹ لگائے والے، دوسروں کے قول احوال پیش کرنے والے، بعض غلط فہمی کو رد و اشت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہی کی غلط باتوں سے ہمیں صحیح باتوں کا علم ہو گا۔ لیکن مرحوم اس قسم کے عقائد کی سلامتی اور نفسیاتی باریکریں میں نہ ہائے، وہ جہاں کہیں کسی آدمی کو دوسرے کا قول پیش کرتے گھنٹے اسے ڈنکا دیتے۔ ممکن ہے یہ سب اس وجہ سے رہا ہو کہ کچھ لوگ انہیں غلط طور سے پڑھنے سے پہلے چند دلوں میں کے منکرین کا نام لے لیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار کبھی شخص نے قرآن کے نام سے بسم اللہ کہہ کر یہ لکھ دیا کہ غلو کی عادت مزے دار ہے۔ اس پر وہ سخت خفا ہوئے، بولے: "جیک توڑ رہا تھا ہی ہے غلو کی عادت کتنی کر کر رہی ہے، وہ تو مرد کا ثبوت بھگائی ہی ہے بھلا وہ مزے دار کیا ہوگی، لیکن میں نے ان کے اس دھنکی و ذلیل پر مزاح تو یہ مذہبی کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں دوسروں کی بات کو رد کر دینے کی بھی عادت ہے۔ یہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی عادت، میری مراد ان کے موافق کدھار سے ہے، نہ تو مزے دار ہے اور نہ کر کر رہی بلکہ وہی ہے جو ان کی ایک کسان کی تحریک کے کہاتے ہیں ہے۔" عادت اور مرد و دونوں ہی کی ایک نقطہ بند تھی۔ لیکن ایسا لگوں ہے: "غلو صاحب پرچھتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک روح کبھی کبھی گھائی پھوڑی جاتی ہے، کیا اس تصور پر کہ اس نے دوسری روح کو اس نکتے پر پہنچے ہیں مدد کی تھی یا نہیں؟ لیکن انہی انصاف کے اس زخم کے بار جو اس کی ماسٹر دوسرے نہیں داتی ہے وہ جتنی دیتی ہے تیسرے بھرے ہوئے دودھ کے برتن کو اور نہ جانے کہ وہ منظر صاحب لے اپنی زندگی میں میں ہی ایک لیرک (Lear) کھلی ہے۔ اس نے نہیں کہاں میں لیریزم کسی سے کم ہے یا یہ کہ ان کے مذہب کا کڑا کرنا و تباہیہ کہ بعض عقائدوں کے کہنے کا انداز ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے پیٹنے میں جہت نہی گویاں پر پوست تھیں جس سے اس میں انتقام کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ وہ کوئی سیاسی آدمی نہ تھے۔ لیکن جب اپنی گوشہ نشینی کے باوجود دوسروں کی سیاست سے مجروح ہو جاتے تو وہ گریباں بھاری گریباں نظر آتے۔ پہلی دفعہ جب انہیں جلیانوالہ باغ میں زخمی کیا گیا تو انہوں نے دو کام نیاں کھیں "تیا فالون" اسی کا وہ عمل تھا۔ دوسری دفعہ جب ششدر میں انہیں غور و خوض میں ڈھکی کیا گیا تو وہ سچے سچ بہت زیادہ زخمی ہو گئے تھے۔ ایک دن بہت ہی رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا: کیا آدمی کو اس وقت تک بھڑکایا جاسکتا ہے، جب تک کہ اس میں جھٹکے کا مادہ نہ ہو؟ میں نے کہا: کتا ستارنا ممکن، اس پر انہوں نے پوچھا: تو چاہیے یا نہ؟ یہ مادہ کیونکر نکلے گا؟ میں نے کہا: ایک طرف سے بند کر دینے میں اور دوسری طرف سے کھول دینے میں۔ انہوں نے منٹ بنانا ہی محاورے میں کہا: "قریباً کاچھ نہیں بلکہ مجموعہ ہے۔" تقریباً ایک سال تک وہ اسی پزیر کو پڑتے رہے کہ ایک گولڈن کے پیٹے میں پھر یہی سست ہوئی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے کسی سادہ لوح نے ان سے حجازی سام کی طرف سے کہانی کہنے کی پیش کر دی، "ماشر لوگوں سے وہ اپنی کہانی کا برابر یہیہ کہتے اور کبھی کبھار رائے دہن بھی لے لیتے لیکن معلوم نہیں اس پیشکش میں کیا تھا کہ وہ سنت بلکہ کھلا گئے۔ ہم چھپنے لگے، آخر اسے اس بات کی بہت کیونکر ہوئی؟ میں نے کہا: دیکھیے مجھ سے جمالی علاقہ تو برتنے نہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری روح کی حفاظت کے لیے جو حصہ دیکھنا چاہا ہے اس میں نفس و فطرت اور نفس و فطرت

کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ حضرات! فورسٹ کو وہ تھے ہی اس پوائنٹ (POINT) پر داخل جت ہو گئے۔ پہلے تو یہ سمجھے کہ شاید میں نے ان پر کوئی حملہ کیا ہے، لیکن انھوں نے فوراً فکر سے کام لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ میں نے ایک معمولی مشاہدے کی بات کہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے وہ جو وہ خطوط کھاسام کر کھٹے سب اسی کا رد عمل تھا۔ یقیناً بالی ووڈ کی ایکٹرئیس کو طلب کرنا کوئی پسندیدہ بات نہ تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی یہ جھنجھلاہٹ کس چیز کا نتیجہ تھی، وہ سوسائٹی میں جائزہ بچوں کو پسند کرتے نہ کہ فطری بچوں کو جو کہ اس وقت جرمی اور جاہان میں شامل رہے ہیں۔ وہ جس قدر بچے تھیں غلط اور ڈیموکریٹک جمہوریت پسند تھے اتنے ہی بچے فورسٹ تھے۔ یہ کہنے کے بعد عجیب کٹرے نے اپنی انگلیوں کے درمیان سے ایک رقمہ نکالا اور ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے حضرات! یہ میری آخری کارستانی ہے، میں نے یہ رقمہ مرحوم کے عجیب کفن سے اڑا دیا ہے۔ سنئے وہ اس میں کیا تحریر کرتے ہیں۔ میں آج بہت افسردہ ہوں۔ پچھلے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا بعد میں یکدم مجھے رجعت پسند بنا دیا گیا ہے اور اب فخری دینے والے سورج رہے ہیں اور پھر یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں اور ختروں پر اپنا فتویٰ دینے والی سرکار مجھے ترقی پسند یقین کرتی ہے۔ میں ایک سرخا ایک کیورسٹ، کبھی کبھی جھنجھلا کر لہجہ پر نفس نگاری کا لہجہ لگا دیتی ہے اور قدر چلا دیتی ہے۔ دوسری طرف یہ سرکار اپنی مطبوعات میں اشتہار دیتی ہے کہ سہلت میں منظر ہمارے ملک کا بہت بڑا ارب اور انسائڈنگ ہے۔ اس کا کلمہ گڈ شے ہنگامی دور میں بھی دواں دواں رہا۔ میرا افسردہ دل روزانہ ہے کہ متلون مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تھوڑے کفن سے ٹانگ دے گی جو میرے داغ عشق کی بہت بڑی تھی یہ ہوگی نہ عجیب کفن،

”حضرت! عجیب کٹرے نے دئے کہ عجیب میں رکھتے رہے کہا کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم لوگ مرحوم کی افسردگی کے دونوں دباؤ کو شامیں؟“

ممتاز حسین

میرا دوست، میرا دشمن!

اڈھلی پیر کی چابی میٹروں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ بیس بھی احتیاط کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہڑا کر گئی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہاں تو وہ نیا آدمی فٹو تھا جس سے میں پہلے رشتے باندھی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاید سے کہا تھوڑا دیر میں چلیں شاید منٹو گھر پہنچے۔ مگر شاید نے میری امیدوں پر پانی پیر دیا۔

”وہ شام کو گھر پر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔“

یہ مجھے سب سے سونے سے ایک تو منٹو، اور وہ بھی جیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے ہی کن کر دیا۔ ایسا بھی کیا۔ مجھے کھا تو نہیں جائے گا! چونکہ دو چرائس کی زبان کی نوک پر ڈنگ ہے۔ میں بجلہ تو ہوں نہیں جو پورنگ ماری کی بیٹھ جاؤں گی۔ چہ چرائی گرو! اور بیٹھیاں ملے کے کہ ہم منزل پر پہنچیں۔ فلیٹ کا اندازہ نہ ہم تھا۔ ڈرائنگ روم تھا کہ میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سینہ اور صاف پٹنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لمبی چندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک کونڈے کی شکل کا انسان آکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

”آہئے آہئے۔“ بڑی خود مریشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ غلو ہمیشہ کرسی پر کھڑا ہوا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا۔ لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھینچ کر اس کا تہ خاصا لمبا نکل آتا تھا۔ اور بعض وقت جب منٹو میں ریٹنگ کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہر ملا معلوم ہوتا تھا جس کے جسم پر کھنڈ کا گڑبہ پابند اور چار ہر کٹ صوری تھی۔

آدمے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کھلاؤ بی، سوچی مریل سی ہوں گی۔ اس نے دانست نکال کر چنٹے ہوئے کہا۔
آدمے میں سمجھتی تھی آپ نہایت دینگ قسم کے گھیر چکے تھے۔ ہوسے بھائی ہوں گے۔ میں نے سوچا رسیدتے چلو کہیں یہ ایک دم نہ پاپٹے پر سے لے۔

اور دوسرے طرح دونوں پوری تندہی سے جٹ کر مٹ کرنے لگے کہ جیسے اسنے مجھے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھانا غلطی ہم دونوں سے ہوا کرتا جو۔ دو تین بار بات اُچھو گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا، لہذا دوسری ملاقات کے لیے اُٹھا۔ مگر کئی گھنٹے ہمارے بیٹھے بیٹھوں کی طرح مختلف موضوعات پر چلے کرتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو میں بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اُٹھتا ہے اور جو ہاں سا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے مٹ اور مٹ نے ہاتھ دھو کر جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک

دوسرے کو بتایت، ادبی قسم کے نغموں میں آتمی جھکی اور کج بحث کر ڈالا۔

نکسائی کے چراغ میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ مونے مونے شیشیوں کے پیچھے پکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی انگلیوں جنہیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مورکے پر ماروا گئے۔ مورکے پر اٹھا نکسوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہوسکا کہ جب بھی میں نے ان انگلیوں کو دیکھا مجھے مورکے پر ماروا گئے۔ شاید رحمت اور گشتی کے ساتھ ساتھ ان میں جیسا ختم شکستگی مجھے مورکے پر ماروں کی یاد دلاتی تھی۔ ان انگلیوں کو دیکھ کر سر دلدل دھب سے رہ گیا۔ انھیں تو میں نے کیس دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ منتظر دکھاتے، ہنسی کے نشور سالتے اور پھر ترس کے عالم میں پتھر لاتے! وہی نازک نازک ہاتھ پر ہر پر کوڑا، بال پکچے توندور گال اور کچھ بے شک سے صاف۔ چپے چپے اچانک خنجر کو چھو لگا اور لکھائے لگا میرا تھا شکنا، بیکانسی تو جانی پہچانی ہی تھی۔ اسے تو میں نے کبھی سے سنا تھا مجھے کوفت ہونے کی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا۔

”یہ بالکل غلط“ اور ہم ہاتھ دھو کر پڑے۔

”آپ کی بھی کد ہی ہیں؟“

”حالت ہے۔“

”دھانڈل ہے بصورت حسن؟“

”آپ مجھے حسن کیوں کہہ رہے ہیں؟“ میں نے لپک کر کہا۔

”بس ارض، علمائیں عموماً کوئی کم کہتا ہوں۔ میں اپنی حسن کو بھی حسن نہیں کہتا؟“

”تو پھر مجھے چلانے کو کہہ رہے ہیں؟“

”نہیں تو توں کیسے جانا آپ نے؟“

”آس ہے کہ میرے بھائی مجھے بیٹھ جلاتے چڑھتے اس مارتے پیٹتے رہے یا پھر کڑکھاتا رہے؟“ منتظر سے ہنسا۔

”تب تو میں غصہ آپ کو کہیں ہی کہوں گا؟“

”آقا یا اور کچھ کہیں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج

کیوں نہیں کرتے؟“

”علاج؟“ ٹیبلٹ کے دے دیتے ہیں تو میں سالانہ ہونے والے کڑکھانوں نے کہا تھا سال بھر میں مزاج اچھے نہیں ٹی۔ جی ہے صحت ظاہر

ہے کہ میں نے مکران کی پیشین گوئی کو اتنا ثابت نہ ہونے دیا۔ اور اب تو میں ٹیبلٹوں کو اتنا بھتا ہوں۔ ان سے تو سرخزم

اور جادو گر کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں؟“

”یہاں آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔“

”کون بزرگ؟“

”میرے بھائی عظیم بیگ، فرس مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر میں عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آتے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیا رہی گئے۔ شاہد جو جاری چھڑیں ایک قنداق پیچھے دیکھ رہے تھے جنوک سے تنگ آچکے تھے۔ ملاو پیچھے پیچھے ایک کی حالت کا لڑکا کھانا کھا رہا تھا۔ منظر نے مجھ سے الماری سے پٹیلیں اوپر اٹھنے نکالنے کو کہا اور خود بڑل سے روٹی لیٹھ پلا گیا۔

”فدا اس برنی سے آچار نکال بیجے۔ منظر نے جڑی سے میز پر کھانا لگا یا اور کڑی پٹیاں کھوں بیٹھ گیا وہی میز جو دم بھر پہلے وہی کارگزاروں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور میز کسی سے ”پٹے آپ“ کے ہم دکان لے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بعد میں گرگرم باہر چلتا رہا۔ محوم پھر کو کھانا کے بغیر اوپر نے کھانا ہوائی دلوں میری دکھتی دگ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت لمبا چار گروہ ڈھائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اُسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر کہ کچھ کھانا کھینے پر افسوس ہے۔ غریب بلی کئی کھانا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم فکر کہہ ڈالا۔ ”میں کھانا“ کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منظر نے فقار تھوڑی ہی دیر میں ”کھانا“ سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ منظر گندی سے گندی اور بیحد سے بیحد بات و منظر سے اس معنویت اور بھولہ پن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ صحت دیتا ہی نہیں۔ اُس کی باتوں پر نہیں آجاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

پہلے وقت اُس نے پھر صنفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر میں بیٹھے رہے اور منظر کو صنفیہ کی دہلے کئی بار ستایا۔
”صنفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”صنفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔“

”آپ اس سٹل کر بہت خوش ہوں گی۔“

”بہت یا فارہی ہے۔ تو اُسے بلا کیوں نہیں لیتے۔“ میں نے کہا۔

”اے۔۔۔۔۔ کیا بھتی اُس کے بغیر سو نہیں سکتا۔ وہ اپنی مصیبت پر اترنے لگا۔

”غیر تو رسولی پر بھی آجاتی ہے۔“ میں نے بات ٹال اور وہ ہنس پڑا۔

”آپ کو صنفیہ سے بہت محبت ہے؟“ میں نے راز داری کے انداز میں پوچھا۔

”محبت؟“ وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اُسے گالی دی ہو۔ مجھے اُس سے قطعی محبت نہیں۔ اُس نے کڑا مزہ بنا کر بڑی بڑی ہتکیاں گھرائیں۔ میں محبت کا ناکئی نہیں۔“

”اے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟“ میں نے مسنوی حیرت سے کہا
”نہیں۔“

”اور آپ کے کبھی گھسوتے بھی نکلے۔ خصوصاً بھی نہیں ہوتی۔ لڑکائی کھانسی تو ضرور ہوتی ہوگی۔“ وہ ہنس پڑا۔

”محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ محبت تو ایک ٹہنی ایسی چوڑی چیز ہے محبت ماں سے بھی ہوتی ہے، بہن اور بیٹی سے

بھی..... پوری سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چہلوں اور ٹوٹ بھڑتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کوئی نیکتا سے محبت ہے، ہاں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔ وہ بیٹے کے خیال پر ایک کرکسی پر اٹھ بٹھا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سا چڑیں چلتا تھا۔ بڑا اثر یہ تھا کہ کشتوں چلتا تھا تو فرش کی دراڑوں میں سے مٹی نکال کر کھایا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا ماننا تھا۔ تمام باپوں کی طرح غصے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

”آپ یقین کیجیے چر سات دن کا تھا کہ میں اُسے اپنے پاس سلاتے دکھا۔ میں اُسے غور سے لے کر نکلتا آتی تھی میرے کاجی نہیں تھا کہ غصہ ادا کر چکے تھے۔ لگا بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ دات کو بس پڑی سوئی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلا دیتا۔ اُسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلانے سے پہلے بیڑی کھون یا سپرٹ سے صاف کر دینا چاہیے۔ نہیں تو بچے کے من میں دانے بوجھاتے ہیں۔ وہ بیڑی سفیدی سے بولا اور میں حیرت سے اُسے دیکھتی رہی کہ کیسا مودا ہے جو بچے پانے میں مشاق ہے۔

”مگر وہ مر گیا۔“ غلطی نے مصنوعی مسرت چہرہ پر لگا کر کہا۔ ”اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔“ مجھے تو اُس نے کیا بتانا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اُس کے پورے سے دھوتا ہوتا۔ لگتا ہو کر وہ ہاتا، مجھ سے کوئی کام نہ ہوتا ہوتا۔ بچہ کا عصمت بس مجھے اُس سے عشق تھا۔“

”چلتے چلتے اُس نے پھر کہا کہ صفیہ اُنے والی ہے بس یہی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے لڑ کر۔“ اور واقعی صفیہ سے لڑ کر یہی خوش ہو گیا۔ غصہ میں ہماری اتنی گھٹ لئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں جو موت اور قتل ہی کہتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو کوئی مروجہ کسر پھر کرتے دیکھ کر منسوب لگیا اور بھنے دینے لگا۔ اُس نے کچھ کمرے کی چوٹی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سنی لی تھیں۔ وہ غریب بچوں کی طرح بولا۔

تو بہ تو میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی گندی باتیں کرتی ہیں؟“ صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

اور آپ سے تو عصمت بس مجھے قطعی امید نہ تھی کہ یوں بھنے کی جا لے عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی شادی کی دات کیسی گندی۔ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا۔ تو بہ ہے۔“ وہ چڑانے لگا۔

میں نے فوراً دنگ لگائی۔ تھوڑے منٹوں میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ بھتی تھی۔ اُسے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندی کیا ہے۔ بچہ کی پیدائش کو یا جس ترین حادثہ ہے اور کتنا پھوس ہی تو بھلا اثر غیب اسکول ہے کیا سمجھتے ہیں آپ کیا کالج میں مجھے بچے دینا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھونچا کر تو بہ کہتے رہے۔ بھنے کی عورتوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔

یہ صفیہ سخت جا ل ہے۔ اب وہ بکھر نہیں سمجھتی ہر بات پر غصہ ٹھوکتی ہے۔ آپ کی تقریروں سے سخت

خفا ہے۔ آپ کوئی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کر کے۔ کہ تو رے میں کتنی جلدی، ارد کی دال کے وہی بڑے.....
اے مشغوب تو رے میں جلدی کہاں پڑتی ہے۔ حقیقہ نے ہیبت اڑھ ہو کر کہا۔

اور منٹو لڑا۔ وہ بےشک تھا کہ جلدی ہر کھانے میں پڑتی چاہیے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر نظم اور نا انصافی ہے یہ تو ایک
راہبوت دوست تھا وہ کبھی اور جلدی ہی کر جائوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ چھاپلوں تھا۔ اور ہم غصہ تھے کہ آپ کا دوست کبھی
اور جلدی چھوڑ کر کچھ پڑتا تھا۔ ہم کسی شرط پر جلدی ڈالنے کو تیار نہیں اور منٹو کو قافی جو نہ پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملنے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے
ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالاصاف جو رہا ہے وہاں میں چھا ڈوس دی جا رہی ہے۔ اور بعض اوقات ہمیں اتنی طویل
اور کبھی دیر جو باتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے ثبوت کی پونیاں اُلجھتی ہیں اور واقعی سوچنے اور کچے کی قوت پر چھانڈو پھر
گئی۔ گردنوں بٹھتے جاتے، اُٹھتے جاتے، بد مزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا۔ مگر منٹو بالکل رواں دانا
ہو جاتا آنکھیں سر پٹھکوں کی طرح تن کر پھول جاتیں۔ منٹے پھڑکنے لگتے، منٹے کڑا کیلہ ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں
شائبہ کو تیار کرتا اور جنگ، ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھر پر صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو جتنا کھیلا جاتا۔ شائد مجھ سے لڑتے کہ
تم میرے دوستوں سے اتنی بد قیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ
میری بہت سے کہ اس کے ہاں جائیں وہ بد قیزی زدنی ہے۔ دیکھ کہ بیٹے کا تو میری اس کی پانی دوستی ختم ہو جائے گی۔

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑی بات کہ دی۔ ممکن ہے وہ منٹو جائے اور ہماری اور مصیبت کی
دوستی بھی ختم ہو جائے جو اب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خود دہری دعوت کی سرحدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔
وہ اپنے دوستوں پر رعب جانے کا بڑا شائق تھا۔ اور اگر ان دوستوں کے سامنے جی کو وہ مطلب کہ چکا ہو کوئی اُس کا مذاق
بنادے تو وہ بُری طرح چڑھایا کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو بچے کے ہیں ایک دوسرے کو کہہ سکتے ہیں مگر
تمام لوگوں کے سامنے ایک دوسرے پر چڑھیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔
لیکن صبح ڈھائی ہوئی اور اتفاق سے شام کو کچھ ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوتا ہی نہ ہو۔

ویسے ہی کھل لے کر باتیں کرتی۔ تھوڑی دیر میں ایک دوسرے سے بڑے اور فرصت سے زیادہ نرمی سے جوتے۔ ہر بات پر ہاں میں
ہاں ملتے۔ مگر میرا جلد ہی اس شخص سے دل اُٹا جاتا اور اُس کا بھی۔ اور پھر ملنے لگتی دونوں طرف سے آتش بازی۔ اور گروہوں
کی سی تندی آ جاتی کبھی لوگ ہم دونوں کو مل کر مزہ مینے لگتے اور ہم پھر مل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی
دلچسپی کے لیے نہ کہ اُن کے لیے۔ میری ہی کو شکست پیدا کرتے۔ منٹو کی یہی رائے تھی کہ گھر پر چلے جتنی اُٹھی سیدھی بحث کریں مگر محفلوں
میں نہیں سوچے بنا کر جانا چاہیے اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہو گا کہ لوگوں کے پھٹکے پھڑکے سے لگا۔ مگر مجھے علم تھا سوچے سے اپنی دغا بازی کا
احساس نہ رہتا اور مورچہ پڑنے کے چھپنے کی طرح پھنکارنے لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہوسکا کہ منٹو اپنی کر سکتا ہے یا بہک کر میتا ہے۔ میں نے اُس کی چال میں لاکھڑا ہٹ یا زبان میں گھلت

نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ چنے ہو تو یہ یقین دلائے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشتر میں نہیں اور جان کو آجاتا تھا۔

”میں آپ سے کچھ کتنا ہوں محنت میں جس بالکل نشتر میں نہیں اور میں آئی پینا چھوڑ سکتا ہوں میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگائیے۔“

”میں شرط نہیں لگاؤں گی کہ یہ کتنا آپ باجائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے۔۔۔۔۔ اور آپ نشتر میں ہیں۔“

کیسا کیسا منظر ثبوت دیتا کہ وہ نشتر میں نہیں اور اس وقت پینا چھوڑ سکتا ہے۔ صورت شرط لگانے کی وجہ سے۔ ایک دن ٹنگ اگر مجھے شرط لگانی پڑی اور شرط شرط ہار گیا۔ میں حیرت لگئی۔ مگر کیا یہ شرط تو واقعی ممکن کوئی رقم مقرر نہ ہوتی تھی۔ اُس کے بعد جب منظر کو بہت چر محنتی اور وہ شرط لگانے پر اڑتا آ اور سوائے شرط لگانے کے کوئی غلامی نظر نہ آتی تو بار کہ مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

منظر کو خود ستانی کی عادت تھی۔ مگر عموماً میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی کسی گھسیٹ دیا کرتا تھا۔ اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا میں کسی کو ادب نہ ملتا۔ خاص طور پر کہ شہنشاہ چند اور دیو نند ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کر دو تو شک اُٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مان لی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو بالکل کٹھنی سامنے لگتا۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی ہم قاتل سمجھتا خاص طور پر ادب کے لیے۔

”لو کس کرتے ہیں یہ لوگ۔“ وہ جمل کر مانتا۔ جس کہتے باجائیں میں اُس کا اُٹا کرتے جاؤ میں لوگ ہر غرض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کمائیاں پڑھتے ہیں اور اُن سے کچھ لکھنے کے بجائے ٹھٹھٹ انداز ہوتے ہیں اور پھر اس طعنت کی یاد پر نام ہو کر اہل قول لکھتے ہیں۔ وہ کبھی اتنا پڑ جاتا کہ میں اُسے تسلی دینے کو کہتی جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اہل قول لکھتے ہیں تو آپ اُن کو جواب کیوں دینے لگتے ہیں۔ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ ہی مجھے گردائے علم کو تو مطمئن نہ کیجیے۔ مگر وہ بھناتا رہتا۔

ایک دن بڑی عجیبہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

”مقدمہ داتا کریں گے۔“

میں نے کہا گوت۔

کہنے لگے۔ ”ہم، یعنی میں اور آپ۔ اُس روز وہ نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ نثر ہے۔ ایسے ادب سے ملک کو پکانا چاہیے اب اس گنجنت سے پوچھو کہ کسی اعلیٰ بات کو کہہ ہے۔ ایک تو وہ اسے کتاب میں چھاپ کر منتشر کر رہا ہے، دوسرے پیسے کہنے کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اُس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کمائیاں چھاپی ہیں اسے روشن دیا رہا ہوں کہ ہر جہان دوسے۔“ پھر نہ جانے بھولی بھال گئے۔

منظر ہی رڈنگ سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شہنی گھبرا کر آتا تھا۔ رفیق غزالی سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی ہر سحر میں ذرا ہی جب اُس کا تذکرہ کیا کہ وہی کا بڑا بدعاش لگتا ہے۔ ایک ایک کر کے چار سبوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رشتہ ایسی نہیں جس کی اُس نے اپنے جوتے پر ننگ نہ گھسوا لی ہو۔“

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھتیجا کا ذکر کرتے ہیں۔ اُس کے عشقوں کے قصے تفصیلاً سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کا کہا۔ میں نے کہا کیا کروں گی لڑک، آپ تو کہتے ہیں لنگھا ہے وہ۔
 کہنے لگے اسے جب ہی تو لڑ رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لنگھا اور بد معاش بڑا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔

میں نے کہا: منظر صاحب لنگھا، شریف، بد معاش یہ آخر کیا آدمی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے بتنا دیجیے اور تجربہ کار مجھے ہیں شاید وہی نہیں؟

”آپ جانتی ہیں؟“ منظر نے بڑا ہی کر کہا۔ ”جی تو آپ کو رفیق سے ملنا پتا چلتا ہوں — بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی حرکت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔“

”میں بھی تو حرکت ہوں؟“ میں نے غور نہ کیا کر کہا۔ اور وہ کہ گیا: ”ہو گیا۔“

”میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔“

”مگر آپ کی بہن بھی تو حرکت ہو سکتی ہے۔ منظر نے قہر لگایا۔

”ہو سکتی ہے ایہ خوب کہا۔ مگر منظر کو ضد ہو گئی۔“ آپ کو اس سے ملنا پڑے گا۔ دیکھیے تو میں؟“

”میں اُسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ میں کبھی نہ عاشق نہ ہوا کرتا۔“

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منظر کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دنیا کے ساقوں عیب کہنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مذہب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بد معاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے کبھی کی کوشش نہ کی یہ منظر کا میدان ہے وہ دنیا کے ٹکرائی گھر سے پہنچنے کی جوتی خلافت میں سے موتی پھل کر نکال لاتا ہے۔ گھر اگر کہنے کا اسے شوق ہے کہ کوئی دنیا کے سوار نے داؤں پلاسے جھوٹے نہیں سنان کی عقل اور فیصلہ پر جھوٹے نہیں۔ وہ ان کی شریف اور پاکیزہ بیویوں کے دل کچھ پر کڑھتا ہے اور کہ شہر میں رہنے والی ہڈی کے دل کے قندس سے اس کا موازنہ کرتا ہے۔ عطر میں ڈوبی جوتی پیش پسند وہی سے میل اور پسینے میں طرانی جوتی گھاسن زیادہ خوشبو دار معلوم ہوتا ہے۔ ”لو میں سلاخ کا جسم ہی جسم ہے۔“ خیمے دیکھیے تو جسم کے اندر جو بھی ہے۔ پیش پرست طبقہ کی چٹھے ہونے اور جو کہ طرح پنکھیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقہ کی صنعت سے ڈھکا حلیت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو جسم اتنے طبعی طور پر جسمانی سوال ہی نہیں کہہ سکتے۔ خوشی کے ذہن میں ضرور وہ طبقہ کے فرق کا خیال تھا اور وہ اُس بحث کو جس کی کوئی پوجا کرے، زمین پر پختے میں ڈھری ہادی محسوس کرتا تھا۔

وہ جیسا کہ چنے بد معاش دو ستوں کے کارنامے غریب سنایا کرتا یا ایک دن میں نے جہانے کو کہہ دیا یہ لوگ جھوٹے ہوتے ہیں۔ اصل میں نہ جہانوں نہ بیویوں سے ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی حرکت کی، اب وہ بڑی کی بد معاش طرح سے مجھے شرمینا لگے۔

” تو سچ کہتے ہو وہ جھینپا دینے والی بات “

” نہیں اب غصہ اتر گیا۔ وہ ہنس کر رہا۔

” اچھا دوستی ہی میں سنی بتائیے وہ کونسی خطرناک بات تھی “

” کچھ نہیں..... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی سوٹی س گالی دے دیتا۔

” بس؟ میں نے نا اُمید ہو کر کہا۔

” یا شاید کس کے جھانپڑا رہا۔ “ نادم ہو کر بولا

” مجھ پر کچھ اتنا نہ ہوتا میں نے ایسی ٹیم ٹیم گالیاں سنیں کہ مد نہیں اور میرے قہقہے کی غماصے دور کے پڑ چکے ہیں مگر پہلی دفعہ

آپ نے محنت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو دغا کچھ ہیں کئی بار۔ اور ہمارا لاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشانی ہو کر میں نے سرچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کروں پھر واپس ملا دو جاؤں۔ دروازہ جب معمول کھلا ہوا تھا جا کر دیکھا تو صف پر نہ پھلائے بیٹھی ہے۔ منٹو ہاتھ میں جھاڑو لیے شاسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے۔ اور ناک پر کتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

” یہ کیا کر رہے ہیں۔ “ میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

” کرکٹ کھیل رہا ہوں۔ “ منٹو نے ٹری ٹری مورچہ ٹکڑی سی پتلیاں گھما کر جواب دیا۔

” یہ بھیجیے! ہم نے سرچا تھا تو آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹھے بیٹھے ہیں۔ میں نے واپس جانے کی

دھمکی دی۔

” آہے! صغیرا! ٹھہریں۔ آؤ آؤ۔ “

” کا ہے کا جھگڑا تھا۔ “ میں نے پوچھا۔

” کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گریہتی و خرو مروں کا کام نہیں۔ میں جیسے تم سے اُچھتے ہیں مجھ سے کئی اُلجھڑے کیوں

نہیں مروں کا کام میں بھی جھاڑو دے سکتا ہوں میں نے بہت روکا تو اور روئے، کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طاق لے لے صغیرا نے ہنس کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے ہی کرکٹ شروع کیا۔ سچ ہی سچ میز پلٹنے کے بجائے میں نے صحت کرنے

کے بجائے وصول ملنے میں جموٹکی اب آپ ارمان نکال لیجیے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے۔ “

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو بڑھل سے برت لانے چلا گیا یعنی ہنڈیا بھارنے چلی گئی۔ برت لاکر منٹو نے قوسیدہ دار

پر مارا کہ توڑی اور پلٹے میں بھر کر سامنے دھک دی اور اکڑی بیٹھ گیا۔

” اور بتائیے۔ “ اُس نے حسبِ محنت کہا۔ ہانڈی کے بھار سے مجھے نذر سہا بگائی آئی۔

آفرین صفیہ کیا مردہ بھاری ہے۔ میں نے تنک بند کر کے کہا۔ غٹھنے پر تنک کو مجھے دیکھا سر سے ہر تنک بڑی بڑی پتیلیاں لگائیں اور چھانگ مار کر جھپٹا۔ بدلتی خانہ میں صفیہ چیختی رہی اور اس نے پھر روٹا پانی پینے لگیں جھونک دیا۔
واپس آکر وہ سہا سہا رساں سے کہیں پر مڑ گیا اور ہر کچرے جھینپ کر کھینس دیا۔

میں چوڑوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آتی تو اسے زور سے ٹانٹا پھر ٹکے شریچے انداز سے بولا۔

”آپ کمریٹھ میں بچے سے؟“ جیسے بچے میرے نہیں خود ان کے بیٹھ ہیں ہوتے ہیں نے فوراً تاز کیا۔ جب صفیہ کے بیٹھ میں بچہ تھا تو اسے بھی لگھاڑے اُبلان کی آتی تھی۔“

”غٹھا صاحب خدا کے لیے دانیوں جیسی باتیں نہ کرو۔“ میں نے پڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

”اُسے واہ۔ اس میں کیا بُرائی ہے۔ اُسے آپ کو کھنٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی میں ابھی کیریاں لاتا ہوں۔“ وہ پک کر نیچے گیا اور کڑتے کے واسطے میں بچوں کی طرح کیریا بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی انفاست سے تنک مری لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر کھسکا اتار دیا۔

”صفیہ اُسے صفیہ۔“ وہ چلایا، صفیہ دھوئیں سے اُٹی آنکھیں اپنل سے پوچھتی ہوئی آئی۔ کیا ہے غٹھا صاحب کتا پلاتے ہو۔“
”اُسے یہ قوت۔ ان کو یہ بیماری ہے۔“ اُس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

”اُنٹ گند کی انتہا ہے۔ جی تو آپ کو کوک فحش لگا رکھتے ہیں۔“ میرے اس بگڑنے پر غٹھا خوب چکا۔ اور بڑی ہڈیوں بھیے مٹھو سے دینے لگا۔

”پیٹ پر زخمی کے تیل کی امش سے گھر وچنے نہیں پڑیں گے۔“

”خار مزہ سب کام تر کھانے سے اُبلان کیا نہیں آتیں۔“

”کھسو پرہ کھانے سے بچے گورا ہو گا اور اسانی سے ہو گا۔“

”ہلے میں برت نہ چھایے گا۔ نئے سوچ جاتے ہیں۔ کیوں صفیہ؟“

”ہٹو غٹھا صاحب کیسی باتیں کرتے ہو۔“ صفیہ کھسیا کر وہ گئی۔

اور جب سہا پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کھانے لگی رہی۔ مگر کچی کو کوک کر غٹھا کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا اور در تنک مجھے اُس کی چھوٹی چھوٹی ظرو میں بتاتا رہا۔ صفیہ کا دل پھسل گیا اور سال کے اندر خداوند غٹھا کی بڑی چٹل پیدا ہو گئی۔ پوتا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا میں فرما گئی تو غٹھا نے مکان بدل دیا تھا۔ ٹھکانہ جو ڈھانڈا کر کے مکان بچتی تو دیکھا ڈھانڈا کر کے میں انگن پرانے پرانے پتہ پر نہ پڑا کر کھلا رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور غیر جوا کا تھا۔ غٹھا نے اس لیے بدل لیا کہ اُس کا فرش گندہ تھلا کی گھٹنوں جی تو پانس لگ جاتی اور مٹی چاٹ جاتی۔ یہاں نکمت مڑے سے فرش پر کیسل کے کی۔ سالانہ نکمت چند ہفتوں کی تھی۔

”مجھے بچے سخت نا پسند ہیں۔ غٹھا بخیندی سے کتا۔ جان کو کھٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے۔ ہر

وقت انہیں کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ تو وہ دودھ کی بوتل دھو کر ٹھنڈے چھانٹا پیر کی پتی تھوڑے سے بڑی بیماری تھی لیکن اس کے ساتھ گرمیوں اور شدید گرمیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر رکھو گی سے بانس ڈال کر اس کے لیے اٹلیاں ڈوڑ کر بچے سے لگاتے کے دامن میں سمیٹ لیتا۔ سچا کو پاٹ پر چٹا کر خشکی ختمی کرتا۔ اور بچوں کا بہت شادی تھا کہ وہ ان کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم طاؤس میں رہتے تھے۔ رات کے کوئی ساٹھ بارہ ہوں گے کہ وہاں سے پروٹسک ہوئی معلوم ہوا سفید سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں۔ میں نے فریادیں کیں۔ بوائے میں نے منع کیا کہ اس حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیے مگر وہ کہاں جھنٹے ہیں۔ منظر مع مذاہبی اور خورشید انور کے آگئے۔

”یہ سفید کرن ہوئی ہے منع کرنے والی۔ ہاتھ میں بوتلی اور گلاس لیے تینوں دوڑے۔ خفا ہونے پر بوتلی کو میک کہا طے ہوا بہت جھوٹے ہیں بوتلی سب بند ہو چکے ہیں، اریل کا وقت گذر گیا۔ کچھ دل پاتے تو خود پکارا کھا لیں پس آنا دال سے دو بخور ملو گی تاکہ میں بیکار کیا لیں گے۔

سفید کوسروں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں ملتے تھے۔ باورچی خانے پر چڑھائی کر دی۔ منظر نما گوندھنے لگے۔ ندی ایسی ٹھیک پر ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو آگ چھیلنے کو دینے لگے جو چھیلنے سے زیادہ بچے کھاتے پر ٹھہرتے اور بچے کی بھی باورچی خانے میں آگئی۔ لوگ جھسکا کر وہ ہیں۔ میچ لگے اور کچے پتے پر اٹھنے پکاتے لگے کھاتے لگے۔ منظر نے آہستہ آہستہ اچھا گوندھا اور ٹھکے سیٹھے سے روٹی پکانی اور پھر جھٹ سے پودے کی چٹنی میں ڈالی۔ کھانا کھا کر وہ لوگ وہیں پھیل کر سو رہے جاتے اگر زبردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا ہوتا۔

یہ زندگی تھی جو منظر کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ حصول آمدنی ہر پینا پلانا ہوا قصے ہوں اور بے لگاریاں ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منظر پر مقررہ جلا دیا۔ منظر کی درخت آؤڑو پائی۔ لاہور میں بھی مملکت آگیا۔ خوب دھومیں اڑائیں۔ اسی ہلانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ ذری کے کھوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منظر کے پیر بہت نادارگ اور سفید تھے۔ پیسے کنول کے پھول، ذری کے پھول بہت چھنے لگے۔

تیسرے پیر بڑے بھڑے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت پھولے نہیں نے کہا۔
 اور میرے پیر اتنے زمانے میں کر لیجئے ان سے شرم آتی ہے۔ مگر ہم نے کئی جوڑے جوڑے خریدے۔
 ”آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں۔ میں نے کہا۔

”بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔
 ”بدن ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں۔ میں نے رائے دی۔
 ”بھرا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ منظر نے چپک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر لکھی جی جڑیں ہوں گی کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہی کہتا۔

”جنت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے زہری کبھڑتے سے جنت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچویں جہی سے جنت ہے۔“

تیز مطلب اس عشق سے سبھرا ایک فوجی کو ایک دو شہرہ سے ہو جاتا ہے ؟

”ہاں..... میں بھگیا۔ منٹو نے دور رانی کے دھندلوں میں کچھ ٹٹول کر سچتے ہوئے خود سے کہا بخیر میں ایک چہرہ ابھی تھی۔“

”پھر آج میں نے داستان کشفہ والی کی طرح ہنکارہ دیا۔“

”پھر کچھ نہیں۔“ وہ ایک دم بچاؤ کے لیے تن گیا۔

”آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں ادا آج آپ شراب سے ہیں۔“

”کون گدھا شراب ہا ہے۔“ منٹو نے واقعی شراب کا کہا..... بڑی شکل سے اس نے بتایا۔

”بس جب وہ مویشی ہانگے کے لیے اپنی کڑی اور اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کشتی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیاڑھا۔ تو ز

ایک کیلے کر پھاڑی پر مار کر لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور اس رات کے اس کے کا منہ اڑا کرتا تھا جب وہ اٹھا اڑ کر کے تو آستیں مرک

ہاتے ہوئے مجھے اس کی سفید کشتی دکھائی دے جائے۔“

”کشتی؟ میں نے جنت سے پوچھا۔“

”ہاں..... میں نے سوائے کشتی کے اس کے جسم کا اور کوئی حقد نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے پکڑے پٹے رہتی تھی اس کے

جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری انگلیں کبھی کی جھلک دیکھنے کے لیے ہلکتی تھیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر ایک دن میں کیل پر لیٹا تھا وہ مجھ سے تھوڑی دُور اکر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ مجھے دکھائی

تھوڑے سے اس کا چہرہ دکھائی ہو گیا۔ اور بلی کچھ بھی نہیں۔ میں مجھے خند ہو گئی میں نے کہا جب تک تم دکھائی دے گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔

وہ زانیہ ہو گئی مگر میں بھی خند پرا ڈھیا۔ اور آخر کو بلی دواؤ کے بعد اس نے منٹو کھول کر تجلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم

گھٹنوں میں منڈ دے لیا۔“

”کیا تھا اس کی تجلی پر؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”مصری کی ٹولی! اس کی گلابی تجلی پر روت کے ٹکڑے کی طرح بڑی جھللا رہی تھی۔“

”پھر آپ نے کیا کیا۔“

”میں دیکھتا رہ گیا۔“ وہ پھر سرج میں ڈوب گیا۔

”پھر؟“

”پھر وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دُور سے پلٹے آئی اور وہ مصری کی ٹولی میری گود میں ٹول کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ

مصری کی ٹولی بہت دُور تک میری قیوس کی عیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اسے دارا میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد جبریتیاں

کہا گئیں۔“

”اور لڑکی۔“

”کونسی لڑکی؟ وہ چڑکا۔“

”وہی جس نے آپ کو مصری کی ٹولی تھادی۔“

”اُسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔“

”کس قدر چُپس چُپسا ہے آپ کا مشق! میں نے نا اُمیدی سے چڑ کر کہا۔ مجھے تو بڑے کسی شعلہ ہلاک قسم کے عشق کی لڑی تھی۔“

”تعلیٰ چُپس چُپسا نہیں۔“ منظر بدلتا۔

”باہل ردی..... تھوڑا سیٹ۔ مرگلا مشق، مصری کی ٹولی کے کرچے آئے۔ بڑا تیر مارا۔“

”تھوڑا کھڑتا۔ اس کے ساتھ سوجاتا۔ ایک حرامی پلاس کی گود میں جھوڑا راج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ٹوٹیکیں مارتا۔“

وہ بگڑا۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مصری کی ٹولی کو مار کر اگر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چُرنے کی چیز ہے۔“

یہ وہی منظر تھا۔ فحش نگار۔ گندہ دہن۔

جس نے کُڑا کھسکی تھی۔

جس نے ٹخنڈا کو شت کھا تھا۔

لیکن مرزا غالب میں جو دھوری عظیم مرزا غالب کی مجبور ہویا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا مگر منظر کے خیالوں کی لاک

ضرور ہے۔ جسے وہ ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھوڑا تضاد

جو منظر کی مختلف کمانوں میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ نیا قانون نکھتا ہے اور دوسری طرف کہتا..... دونوں ہیں

وہ خود کو فریق کر کے نکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار اور وہ جاتا ہے اور وہ اٹھنا لگا کہ وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہماً؟.....

ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ بھارے کے بعد اس کو ٹھکی کے وہاں اس کو ٹھکی میں کیے جانے لگے۔ منظر اس وقت

فلستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ درج سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی اُسے تھی تھی کہ اس کی نظم

اُٹھو دن کا سیاب نہ ہوئی۔ نہ پہلے کیوں وہ فلستان چھوڑ کر شوک کدر کے ساتھ یہی لائیکز چلا گیا نہ اسے شوک کا رست پسند

تھا۔ مگر آج نے نہ جانے اُسے کیا کہ وہ اتھا کہ وہ ایک دم اس کے خلاف ہو گیا۔

بکواس ہے مگر جی۔ فراڈ ہے نہ گناہ وہ تلخی سے کہتا۔

بہی ٹائیکز میں جا کر اُس نے مجھے بھی پکینی میں ایک سال کے لیے سینئر روڈ میٹنٹ میں کام دوادیا اور بہت ہی خوش

عزائم اب ہم دونوں ہی کو کافی لکھیں گے۔ تم کو پُرچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی شوک کدر میر و بس پھر دیکھیے گا۔“

ایک کافی منٹو کی زیر غور تھی۔ اشوک کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اسے جتوڑ کی کافی پسند تھی پھر دل سے اسے ترک کر دیا۔ منٹو کی کافی پسند آئی میرے آنے کے بعد اسے میری کافی پسند آ گئی۔ پھر منٹو کو ناگوار نہ لگتا۔ اب اشوک کا رنے مجھ سے منٹو کی کافی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کافی پر براہ تجویز کو منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکر کی ہونے لگے۔ اور کمال امروہی کھل کی کافی نے کرتے گئے اور اشوک کا کہ وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کافی کھلائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا کہ ادب بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کافی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و تقاریر میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ ہمیں سے جتوڑ۔ تو خود ملتی رہے گی کیونکہ کرکٹ جو چکا ہے لیکن کافی ہماری نہیں بنے گی۔ لہذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کافی ہندی کو نوٹس کی طرف لگ گئیں اور منٹو اشوک کا کہ دوسرے درجہ کی تفسیروں کی تقاریر میں ہندی بنائی جانے لگی۔ مگر منٹو کی کافی رہ گئی انشورون میرا اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کافی کی ادھیڑ لڑائی کرنا کبھی انجام کو نہ لانا کہ کھتا کبھی آغا ذکر انجام بنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آغا پر ختم کرنا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کافی کی کوئی کلی اشوک کا کہ پسند نہ آئی۔ مگر منٹو ہی کہتا۔

”آپ اشوک کی کوئی نگہ نہیں، میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کافی میں منور کام کرے گا۔“

”آپ کی کافی میں اس کا رول و روشنگ نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کوے گا۔ اور منٹو سے پھر رٹائی ہونے لگتی۔ مگر ادبی زبان سے یہاں اپنی فکر چڑی تھی۔ اور وہی ہذا کہ ہندی اور ملتی گئیں۔ منٹو کی کافی رہ گئی۔ منٹو اس کی امید نہ تھی اور اسے بڑی ذہن محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جمیل سمجھتا تھا بے قدری میں جمیل سمجھتا تھا۔ اور ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بڑی بچے اسے پاکستان لانے لگے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا پاکستان میں جمیل مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوششیں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کیا جائے گی۔ میرے جواب پر خیر مجھ سے واقعی بدل ہو گیا۔ اتنی دلیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر وہ کسی حیدرہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا منٹو تختہ نزول ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بدلنے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کافی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور رے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی تنگ محسوس ہوئی۔

پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت قیمتی سالن سے آراستہ۔ ہمیں اس نے پھر بلا دیا تھا۔ ہندی انتہم ہو گئی تھی اور ہم نے آغا شروع کر دی تھی۔ بڑے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے اس کے پھر وہ خط آئے۔ اس نے بلایا تھا، ایک سینما الاٹ کروانے کی امید لائی تھی۔ مجھے خرا کہہ دیا کہ اس کی جنت کا پہلے بھی نہیں تھا۔ مگر اب تو اور بھی مان جانا پڑا۔ مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیے اس بات سے بے خبر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر نہیں کرتا۔ میں نے اسے ہانے سے نہیں دوکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کون گیسٹ رہا ہے۔ پھر شٹ منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھین گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔
ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔
اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ غشو کا ایک خط آیا۔ کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلواوے۔

پھر معلوم ہوا غشو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر دانتور لگے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا۔ بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جیسے ہوئے دہشتگیر جو میں نہ تو دیشو میں اس جیل پھر معلوم ہوا کہ دماغ جیل نکلا اور پاگل خانے میں یا دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن غشو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں کھسا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر کمرچی سے کہہ کر بیٹی بلواوے تو بہت اچھا ہوگا اس کے بعد عرصہ تک کوئی خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر شتا کہ وہ بارہ پاگل خانے پہلے گئے اب غشو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ خدا یا نہ اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو مگر پاگل خانے سے آئے جو قدم پڑا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آئے وہاں لوگوں سے بھی اتنی کوئی خبر نہیں کہ ابی ادب کیا۔ بدلہ دینے لگے ہیں اپنے بڑائے ہر ایک کے پسہ ہائے بیٹھے ہیں۔ اخبار دے لے گا کہ اس سے منسوب کھسا تھا کہ میں جیل میں دو تو سب کا ہاتھ ہیں۔

غشو کا آخری خط آیا جس میں ایک منظر بیان ہے اور کھٹے کو کہا تھا۔ اور بے ساختہ میری غوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی غشو کی لکھوں گی۔

اور آج غشو کے مرنے کے بعد میں کھڑی ہوں غشو کی نہیں عرصہ ہوا میرے اور غشو کے درمیان بہت کچھ چھٹا تھا آج صحت ایک کسک زدہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس بات کی کسک ہے یا کیا اس بات کی مذمت ہے کہ وہ چلا اور میں زندہ ہوں یا میرے بیٹے پر میری قرض جیسا ہو چکا ہے کہ غشو کا کوئی قرضہ یاد نہیں۔ اور اس کا قرضہ بھی کیا غشاہی نا کہ اس نے مجھے ہی کہا تھا۔ مگر بنیں تو کھڑی بن جائیں کہ دم توڑنا دیکھتے ہیں اور کہہ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جلتے ہیں جو نہ دیکھتا ہے نہ ہنستا ہے خاموش مٹتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفحے پر طرح آیا تو یہی ہے۔ جی چاہتا ہے ایک بار سر جو کچھ دیکھو ہی باتیں کر لیں جیسے برسوں میں دیکھنے میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں صرف رات اور پہلوئی کے بچے کو باتیں یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لیے ٹوٹی ہوئی اور میرا نظم خشک ہو جاتا ہے۔ نہ جلتے ان چند سالوں میں ابی پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے غشو کو ہوش کر دیا تب بھی تمہاری جہت اس طوفانی ہستی کا سا دریا نہیں بن کر تھی دی۔ یا تمہارا پسہ کسک کر ڈھال ہو چکا تھا۔ کیا۔ یا تو وہ برس کا مہینہ نکالیں مجھ پر کوہست کر گیا یا تم اب بھی اپنے غشو صاحب کی صفیہ رہیں۔ پاس پڑوس کے مذہب لوگ اور شتا دا جب اُسامی بددی پرانگ جوں پر جاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں۔ ان خاموشی گھسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے پروائی اور دلار دانی سے تمہارے اندر گھسلا کر آتی تھیں۔ دم تو لگٹ جاتا تھا کیا اس نے قلم کی پیاد بھری گود میں دم توڑا یا وہ تمہارا دھبہ ہے خاندان میں ایسا ہی سدا ہوا کیا عجیب اپنے باپ

کو بالکل غفلت شمرنا ہی جتنی غلط ہے۔ اُس نے نہیں تنگدستی اور مذمت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم نہ جانے کہوں اُس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا وہ فلاسفہ سادہ سی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشغلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا اُس نے انہیں سب کی طرح چھپا دیا۔ اُسے خود تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں انھوں کا کرہینک وے بھی تو اُسے لکھیں نہ آتا تھا کہ وہ خاتمہ بھی کر سکتا ہے اور اُس کا قلم یکسی سے گھسٹا رہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آگئیں اور میں سے اپنی خود گھسٹتے ہیں اور انہوں کو دل دل میں گھسٹتے ہیں!..... اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ تو میں یہ اور میں ہی کی حالت نہیں ہمارے وطن کے لاکھوں کوڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ عرب ہوں یا ملک ان کی کسی زندگی ہے اور کمیشن میں انجام جوڑا وہ حساس ہوتے ہیں وہ بالکل ہو جاتے ہیں اور ڈیٹ سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جاننے والی کہوں گے کہ غم کو اس جوں میں میسر بھی ہا تو ہے میرے دامن پر ہی خون کے قطرے نہ دے چھینے ہیں! جو سرت پرانی دیکھ سکتا ہے۔ وہ دنیا جس نے اُسے سہنے دیا میری ہی تو دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل پر بھی مجھے ہی مرنے کی اجازت ہوگی۔ ہر پھر لوگ ماتم کریں گے میرے بچوں کا جو جو ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جیسے کریں گے جسے جی کریں گے اور اُن مجلسوں میں یہ ہم انصرمتی کی وجہ سے کوئی نہ آ سکے گا۔ وقت گزر جائے گا۔ سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔

صحت چٹائی

منشو — میرا دشمن

منشو میرا دشمن کہا جاتا تھا۔ ہم میں خاموشی چھپش رہتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے ہم نے ایک دوسرے کو سخت چڑھیں پہنچائیں۔ کتب پریشانی سے شائع ہونے والے نئے ادب کے سمار کے سلسلے میں سلاوت جس خط کا جو کچھ کوئی چندہ لکھا اُس میں منشو کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی دورانی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے ہوا کیا ہے کہ اگر میں نے منشو کے بارے میں صفوں نہ لکھا تو وہ مجھے بھی نہ بخشنے گا۔ لیکن آج جب منشو اس دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور چندہ نویس دروں کا ہاتھ لیتا ہوں تو کیا انہوں کو اگر ہمارے تعاد کی ابتدا اسی دشمنی سے نہ ہوئی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منشو کی اور میری اُنقوس زمین آسمان کا فرق تھا — دو دکانیں ہی سے دوا یا منقوس کو مار کی دکانوں کے اُپر برج باندھیں جتنے والی جوئے کی محفوں میں شال ہو کا تھا اور اسات کو خوب بھی تلاش ہی کی دیکھتا تھا، اور میں نے کبھی تاش کو باقر نہیں دیکھا اور نہ بلا قوش تھا اور میں نے خراب تو دور رہی، اسکوٹ بھی پہلی بار منقوس میں پیدا جب ہی تھیں برس کا تھا، اُس نے کٹھ گھونیاں ہوا ہوا منقوس ہوا غلامس روڈ — اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے اُدھر جی ٹنگ کر لی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ان کے چپن ہی صداق تینوں کے خلاف سخت نفرت میرے دل میں جھڑی تھی حالہ مختصر نے ان تینوں میدانوں میں جو کار ہائے نمایاں سر انجام دیے، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی اُنقوس دو سلسبیں اس سلسلے میں کچھ بھی کیے بیزاران پر غرور سے سر مندر کر سکتی ہیں۔ اُن کے خیس کا ناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ہم نے جن مصرت میں کچھ کے دی کائے، اُس نے خون کو کچھ ایسا بخود کر دیا کہ آج جب میں سرکٹ یا محبوب کو دیکھا میووب نہیں سمجھتا کبھی محفل کیلئے کاوسل نہیں جوتا رہتا ہی جب ایک اُدھر پیک چڑھا جیتے تھے تو اُنقوس لگاتے تھے کڑی نہ رکھ کھن کے لیے اودھ سال میں جیتے تھے اور انھوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ وہ قتل کے طور پر میں نے دکانیں میں زندگی کا سا افکار تیار کر لیا تھا — اور منشو کو میرے اس زہر اصالیت، پلاننگ، کفایت شعاری اور شعور اوسے نفرت تھی۔ پس اس نفرت کا اظہار اُس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

..... مجھے منشو نے غلت انداز میں کام کرنے کے لیے بھی بلایا تھا میرے بھائی پھنچنے کے دوسرے دن اُسے دیکھ کر کہ ہم وکٹوریہ میں اُسے سامنے بیٹھے گرٹ روڈ کو مارا ہے تھے منشو نے تھوڑی سی پی پی کھی تھی۔ اچانک اُس نے انگریزی میں کہا (I LIKE YOU THOUGH, I HATE YOU)

..... ڈیڑھ سال بعد ہم گلستان کی گلی میں بیٹھے تھے۔ پہنچ کا وقت تھا، منٹو کی زیرِ چھب دستورِ راج مدی میٹھاں دھپا وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ میں بڑی بڑی پانچ یونٹ کے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چلنے کیسے ہندوؤں کے وہاں کو کم سنسیکا اور کپال کر یا۔ یعنی توبہ کی کھڑی کو کوئلے کی رسم کا ذکر چلا تو منٹو نے دانت میں کر کہا۔ ”اشک جب مرے گا تو اس کی کپال کر یا میں کہوں گا۔“

..... میں نے کہی۔ ای۔ ایم۔ ہسپتال میں بیمار پڑا تھا، اکثروں نے وہی کا منٹو کی رات تھا۔ راج مدی میٹھاں مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا۔ ”منٹو کتنا ہے کہ سالہ اس طرح پیسہ نہ چڑھتا تو چار نہ پڑتا۔“

جب گرا منٹو کو جاتے ہوئے خطرے مجھ سے کہا تھا میں تھیں پسند کرتا ہوں، لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے تو میں نے یہاں میں کہا کہ کسی حال میں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے بعض جواب کے لیے جواب دیا تھا، وہ منٹو سے مجھ واصل کسی نفرت نہیں ہوتی۔ ریا منٹو تو اس نفرت کے باوجود جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا میں ابھی طرح جانتا ہوں کہ وہ دونوں گھر سے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے چکر چنے میں منٹو کو بنا دیکھا، بنا جاتے، بنا پڑے اس کے نہایت ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے منٹو کی ایک کہانی خوشیاں ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور راجندر سنگھ بیدی اس زمانے میں ساتھ ساتھ کھانا چاکر تھے تھے۔ وہ کہانی کہتے تو مجھے اگر سنا ہوتا، بخوتے اور میں کہتا تو انھیں جانتا تھا۔ دونوں کے مصروفوں کے افسانوں پر تبادلہ خیالات کرتے اور جیسا کہ نثر خوانی میں ہوتا ہے، اچھادی راہیں خاصی تیز اور سلی ہوتیں۔ بیدی تھے خوشیاں کے بارے میں میری رائے پر بھی۔

میں نے اس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی، ان سے دیکھا تھا، سرگزشت، اس کے نام سے میرے گواہ ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ دوسری افسانوں کے ترجمہ نقل میں بدلے کسی انٹر کی تلاش میں لاہور دیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ یہ میں نہیں جانتا، بہر حال خوشیاں کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں ہی دوا ایک باتیں میں جانتا تھا اور چونکہ کھانا میں نے کوشش، منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، علم میں بھی میں ان سے ٹرا اور وہ اس وقت تک میرے کچھ شواہد سامنے، ڈپٹی، کوئل، تھیں وغیرہ دیکھے جا چکے تھے اور شرم کوئل طبعاً دیکھنے والے سے کمزور تھا تھا، اس لیے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ خوشیاں پڑھتے وقت مجھ میں پہلے ہی سے صنعت کے نہایت تھا۔ خوشیاں مجھے بہت اچھا لگی نہیں لگا۔ حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا اور جو حاصل ہے اور بیدی کی خیال کا منٹو نے موت دہی طرح نبھایا ہے تو میں مجھے اعتراض تھا کہ خوشیاں حقیقتی کردار نہیں بلکہ صنعت کے دماغ کی اختراع ہے میرے ایک دوست اس زمانے میں جانا تھا اس کی میرے کہنے سے اعلان کی رسالت سے مجھے اس کے ادب و تواضع سے خاصی واقفیت تھی۔ چھپے پٹے کی طوائفوں کے جیسی کہ خوشیاں کا کتاب ہے، اعلان کرنا اس سے پہلے ہی کہانی طور پر صنعت جڑ جاتے ہیں، یہ بات میں قصی طور پر جانتا تھا، اسی لیے میرا خیال تھا

کو خوشیا کا کرنا بڑا حقیقی ہے۔ بیدی نے جب خوشیا کے بارے میں میری داسے (جو میں تو اس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے ذہن میں نہیں۔ یوں بھی پھرتے تھے) کہی تھیں۔ کسی چیز پر اتنی جھجھکی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی جو منہ میں آگیا، ابک دیتے تھے، اس لیے میں نے کہا۔ تو کو کوڑھی کی کہانی ہے۔“

میں نے یہ بات کہیں اور مشورہ کیا، لیکن بیدی نہیں سمجھا۔ اور جب کچھ عرصے بعد بیدی مرنے لگا اور وہاں منٹو نے حجر اس وقت آئی، انڈیا ریٹرن ہو کر وہیں آگیا تھا، اپنی عادت کے مطابق اُسے پریشانی کیا تو نہ جانتے کیسے اور نہ جانتے کس سطح پر بیدی نے خوشیاں کئے ہوتے ہیں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلی سے واپس آکر بتدی نے منظر سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے غور تک تمہاری بات پہنچا دی ہے۔
 ہر گز مجھے کسی پر خیال بھی نہ تھا کہ منظر اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے۔ اس لیے میں نے اس اطلاع کو سن کر دیا۔
 ایک شخص نے میں جب کرشن چندر کے بارے میں دلی دیکھو اور شیشیں کیا اور وہاں جلتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا
 احساس ہوا کہ میرا وہ دنیا کی کمانگس پہنچ گیا ہے۔ وہ مسکوں نے میری ملازمت پر اس لیے خوشی کا اظہار کیا کہ وہ منظر کو اپنا بدل ملے گا۔
 یعنی اگرچہ میں اور منظر کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے، لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا احاطہ ہی لیا تھا۔

دہلی میں اپنی لڑکی پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتا چل گیا اور چٹائی میں ایک بڑی تکلیف دہ دردناک شکر چیری زندگی سے غلٹ پا کر آیا تھا، اس لیے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کس سے متاثر ہو کر پاؤں سے گرنے کا دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقع ملے ہی غٹھو کو بچھاؤں تاکہ لوگ محض تماشا دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کیوں تماشا نہیں دیکھیں ایک تو کہ بڑیوں میں وقت غٹھو کا طوطی لیتا تھا، دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے کے لیے اداکار کہتے بیٹھا تھا اس لیے میری کانٹھیں بار بار نہیں برہنیں — ریڈیو کا دفتر میں دنوں علی پور دوڑ کر ایک بڑی کوشش میں تھا۔ تجربے کے لیے اسٹیشن ڈائریکٹر پروگرام ٹائمر کیلئے اور سوڈا ٹریڈنگ کے پاس تھے۔ جیسے ہی کڑوں میں سے جو شادی کوٹلی کے ہاتھ دھو رہے ہوں گے، ان کو میں اداکار، دوسرے میں کوشن اور تعمیر سے من مشابہٹھے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے مجھے چھوٹی یاوہ میں کوشن کے کمرے میں چلیا تھا کوشن غٹھو کے میں جو سڑک کے دوسری طرف ایک کوشن میں واقع تھا، گیا تھا اور میں کوئی فخر کو رہا تھا کہ غٹھو شادی آ یا اور باوجود دھڑکتی بات کر کے اس نے غٹھو شادی کی بات چھڑی۔

”جیسے معلوم ہوتا ہے کہ تھیں میری کہانی خوشیاں پسند نہیں آتی ہجوم ہوا۔“

میں نے اسے اس کی کرشمہ کی ایک منٹریوں چھوڑنے والا نہیں تھا تھیں اس میں کیا پسند نہیں آیا؟ اس نے پوچھا۔
میں نے اسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی علاج کار کی حیثیت سے آیا ہوں میرا لہجہ اگر کئی مقام پر نہیں سمجھنے سے کام کرے
تو مجھے کام کرنے دو، منقول بحث مباحثے میں مت درجہ۔ لگے نام اشارہ دیکھنا چاہتے ہیں، ہم کہیں نہ شائیں

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اُس نے ہاتھ کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے وہی سوال دہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی۔ مجھ پر اس نے کہا۔ کہانی دہرا چکی ہے، لیکن حقیقی نہیں۔

”کیوں جتنی نہیں؟“

تب میں نے اپنا مرض بتایا۔ تیس ایک خیال شوجھاؤ تم نے اپنے آپ کو دلال کے دوپ میں دیکھ کر ہی سورت میں اپنے دماغ کو غلبہ کر دیا۔ جتنی دنیا میں خوشیاں واقعی دلال ہوتا، کتنا اُس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اُسے وہیں دلچرپا بنا — تم نے جو کہ کھادہ ایک سڑکھا کھا شاعر سوچ سکتا ہے، اُن ٹھہر دلالی نہیں؟
کچھ اسی طرح کی بات بڑے اندروں سے میں نے کہی۔ منٹو لمحو بھر کو چپ رہا پھر تھلا کر بولا: ”ہاں ہاں میں وہ دلال ہوں منٹو وہ دلال ہے، انھیں انسانہ فرمی کا علم بھی ہے۔ تم خود کیا گھتے ہو؟“
لیکن اُس وقت کرشن چندر نکلیا مجھے اڈو اتنی واضحی ڈائریکٹر بنے بلایا یا سامنے کیا بڑا، ہر حال وہ نقد میں ختم ہو گیا۔

..... لیکن وہ قسم کبھی ختم نہیں ہوا۔ دلی میں چوتھیں اس کے بعد ہی سوری، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ قبول سکا۔ گزشتہ سال فتوش کے کسی خاص نمبر میں اڈو ایروں کا ایک پیمبریم شائع ہوا تھا، اُس وقت جب اڈو میں کوئی نیا انسان گھے ہوئے اور میرے جو افسانے اڈو میں چھپے بھی وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوئے ہیں، اچھے اظہر برہنہ ہوئے کہ اُسے میں اڈو میرے احباب اور اڈو کے نام تک گھے قبول گھے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا خوشیاں کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے ہر باب کا ذکر کرنا وہ اس پیمبریم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بلی کرشن کی کرشن سے میری شک نہ ہو، میں اپنی میز میں اڈو کو دوسری منزل میں لے گیا، لیکن میری تمام کرشنیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی پیچھے کرتا، اڈو سٹوں میں جانا، منٹو سخت حقارت کی نظر سے گھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

اُن دنوں کی بڑی صاف تصویر مانگ کر دے پر قرض ہے، منٹو ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنے پر آمور تھا، کرشن چندر ڈرامے کا انچارج تھا، میں ہندی صلاح کار تھا اور چونکہ اُس نظام میں ہندی کو، اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک اڈو ڈراموں کی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ اڈو کا ٹائپ رائٹر لے کر منٹو جاتا اور کرشن سے پوچھتا، بلو بھی، کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے؟ موضوع سننے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک سترہ کرشن کو شے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا ذہم تھا اور اس کا اعلان دھڑکا کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈرامہ لکھ سکتا ہے۔ منٹو کے ڈرامہ آرٹسٹ — غلام محمد، نصیر جواہر، ظلم دیکٹر، تلج محمد وغیرہ اسے ٹھوگا لکھ رہے تھے۔ منٹو گھتے گھتے انھیں ڈراما سنایا بھی کرتا تھا وہ بھی کرشن صاحب آپ ٹولہ کے بادشاہ ہیں؟
کتنے سوتے منٹو کے خرب پر چائے اٹھایا کرتے تھے۔ جلدیو اور حسرت صاحب منٹو کا پہنے چائے کا رشتہ تھا۔ اور اڈو اتنی اُس سے اس لیے دیتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار ٹھکرا ملاقات اور براڈا شنگ کے سیکرٹری تھے۔ دیواری شیخو بہر وقت، منٹو صاحب، منٹو صاحب، ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا۔ اپنے کے وقت کبھی اُس

کے اور کبھی کرشن کے کمرے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی۔ اکثر اوقات غلط فہمی کی وجہ سے بات نہ کرنے دیتا میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تھوڑا سا مزاح و ہیلارک حضور پاس کرتا، اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اس کا ساتھ نہ دیتے، مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا: ”کیسے بھائی، تم غم کو کبھا دو۔ وہ مجھے خود بخود تنگ کرتا ہے، میں طرح دے جاتا ہوں۔“

”تم بھی اُسے تنگ کرو۔“ کرشن نے کہا۔ ”میرے بھلنے سے وہ کیا بچے گا۔“

اور اُس دن میں دھڑکیا تو میں نے اسے کہہ دیا کہ اگرچہ میں غم کو پریشان کروں گا، کچھ دن پہلے اُس کی کافی دوا میں شائع ہوئی تھی، کمانی مجھے لے جاتا ہوں۔ غم نے ایک نازک موضوع پر بڑی زبردستی اور نفاس سے افسانہ لکھا تھا، لیکن میں تو شکر کرتا تھا، اوروں کے گھر میں اس دوران میں غم کی امانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا، اس لیے میں نے اپنا طرز عمل طے کر لیا۔ آخرچہ پچ کر میں غم کو لے کر گئے، میں گیا وہ ابھی آکر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا: ”میں نے تمہاری کافی دوا میں ڈھونڈ لی۔“

”کیسی لگی؟“

”اب تم پچھی پر لکھو۔“

غم کو میرا کوئی پورا۔ پھر اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا: ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

میں نے کچھ نہیں کہا، وہ دہی بات دہرا دی۔ تب میں اب تو پچھی پر لکھو۔“

اُس وقت حضرت نے کہا: ”تمہارا غم ختم ہو گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم غم کو کیا افسانہ لکھتے ہو۔ لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا، اس لیے اُس نے کہا: تم کیا جھک مارتے ہو؟ میں نے تمہارے ڈرامے پڑھے ہیں۔“

اُس وقت میرا تجربہ بانی چھپ چکا تھا، اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چرک لگانے کا فن مجھے تو بہا تھا، اس لیے طرح دے کر میں نے کہا: میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لیے میرے ڈراموں کی بات مجھ ڈراما لیکن تم جو ڈراموں کے بارشاد لکھتے ہو، جیسے جھک مارتے ہو، ان میں کبھی طرح جانتا ہوں۔ ”کوڑے میں تم نے آج کے افسانہ ڈراموں کی کافی پڑھ لی ہے۔“ روح کا ناٹک پڑھنے کا پورا تجربہ کر دیا ہے۔ اُس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا، اور حوالہ تک نہیں دیا، میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا۔ لیکن طبع آزمادہ لکھتا ہوں۔ میری ابھی بڑی چیز میری اپنی ہے، کس دوسرے کی پڑائی تو نہیں۔“

غم جھٹکا تھا، لیکن میں وہاں نہیں رکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آگیا۔ غم ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا، لیکن ڈرامہ لکھنا تو غم دہا اس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھا ناٹک شکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا، اُس نے پھر غم سے افسانے کی کہنے کی بات کرنے کی کوشش کی، لیکن میں پھر طرح سے کرک لگایا اور مسٹر ڈرامہ لکھ گیا۔ غم نے مسٹر ڈرامہ میں پچھلایا، لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اسی شام دشواہر محل میں اپنے دوست اور سنوٹی مسٹر دن میں جہاز کے ساتھ غم سے ملنے گیا، اس نے اگر بنا کر غم نے انہیں اپنے افسانوں کا نمونہ دیا، اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ آجک سال اپنے آپ کو کھنکھاتا ہے، اُس کا افسانہ کے فن کی ایجاد کا بھی علم نہیں۔ ادب علیحدہ ہے، اُس نے افسانہ کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا کو اس ہے وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منظر مجھے کالیاں دیتا رہا۔ میں اُپر پڑنے کمرے میں بیٹھا وہ سب منظر دیکھ کر کھٹکنا شائی بڑے خوش تھے۔ اور منظر کیا کہتا ہے، وہ مجھے مائی دیتی بتاتا، بھڑکتے تھے، لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں منہ جاسی رہا کہ جیسے میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ افسوس کرتا رہا کہ بادل غماز تھے وہ سب کرتا چڑ رہا ہے، جس کی دوستوں کو توقع تھی۔

میں منظر کے افسانے پسند کرتا تھا۔ غرض کیا کہ بعد میں نے غلوکے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ نیا تانوی، منظر، منظر، غلوک، فورلوک، انوسم کی شراست، جنگ، ہنتر ڈی کو سٹا، مجھے بہت پسند آئے تھے۔ لیکن جب تک میں دلی میں رہا میں نے کبھی منظر کے سنانے اُس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چنانچہ منظر کی نظر کافی تیز تھی، اس لیے خوشامد کرنے پر وہاں گئے وہ جتنی طور پر خوش ہوتا تھا، لیکن غرضادی کے لیے اُس کے دل میں کوئی حریت نہیں رہتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلی بلانے کے غلوکے مقابل لاکھڑا کیا، لیکن جب بھی ہمیں جھگڑا ہوا، اُس نے جیشہ منظر کی طرف داری کی۔ منظر اس طرف داری کا فائدہ اٹھاتا تھا، لیکن کرشن چندر کے لیے اُس کے دل میں حریت نہ تھی۔ وہ ہمیشہ کالیاں دیتا تھا۔ چنانچہ دونوں غلوکوں کو بروقت غرضادی لوگ گھر سے رہتے تھے، اس لیے میری اس شخصیتی تعریف کو بھی منظر خوشامد پر غلوک کو سے، یہ میری انا کو منظور نہ تھا، میں واسطہ منظر کے دلچسپ افسانوں کا ذکر کچھ نہ کیا، اور اُس کے کردار افسانوں کی تعریف بڑے ذہنوں سے کرتا تو غلوکے خاصی حق پرست رہتی تھی۔

ان دنوں مرزاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی جھٹت اور منظر اس کے علمبردار تھے۔ کرشن چندر کھل کر کہہ دیتے تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کامیابیوں کا ایک نادر لاجبانا تھا جس میں وہ درملان انگیزی اور ترقی پسندانہ طرز میں تعویذی سی عزائی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ غلوکوں کی جھٹت فوضی، ادا، بوریزی کے علاوہ بھی میسوں سال کیوں جوتے ہی اہم ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت ترقی پسندوں کو مرزاں نگاری اور گھٹیا اور بچے کی طرز انھوں کے چرباؤں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے، اسے پھر ایسی واحد موضوع سر جھٹتا تھا۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چرک تہہ سب کچھ نہیں کہتے، اس لیے تعین منظر اور جھٹت دونوں کے ساتھ وہ اپنے کبھی شامل کر لیتا، سے حمد ہوتا ہے۔ ایک دن منظر نے بھی کچھ لای سی ہی پڑا لیگی، تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا۔ لیکن دونوں نے ایک ہی موضوع — یعنی نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی — پر افسانے لکھے۔ منظر نے طے ملاؤں اور میں نے بالائی دونوں افسانے ساقی نوکری کے ایک ہی خبر میں (غالباً کسی سنانا سے میں) چھپے۔ کہاں کہ دونوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اُس سے اُس وقت تک کے کمرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اُس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا اور وہ کافی پسند کیا گیا۔ بلاؤ زائد اہل اُس وقت کے میرے اور منظر کے ٹرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مرزاں فی دوزن افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے، لیکن جہاں بلاؤ کے انجام کی حقیقت کو ہی حقیقت ہے۔ وہاں اہل اہل کے انجام میں نوکری کی مظلومی کے ساتھ سماجی ٹریجڈی بھی نہیں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (SOCIAL REALISM) کا نثر پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو۔ حقیقت یہی ہے کہ اُس کا خاکہ کچھ بے وقت ہی اپنے قلم کو محدود کرنا چاہیے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماجی جاغوز لینا چاہیے۔ یہ بحث طویل ہے اور میں برائے فن اور فن برائے زندگی کے پیر و اس موضوع پر پیش بحث کرتے رہیں گے بہر حال

منٹو کے ساتھ ہونے والی چٹنگ میں میں نے جگلا دلیسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی بڑی تعریف ہوئی، لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ مضبوط سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے دلچسپ قسم کے آدمی تھے لیکن منٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا، ہر خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے طروداغت نہ ہو جن حالات میں اچانک ایک دن منٹو دہلی سے ٹائپ ہو گیا، تقریباً انہیں حالات میں وہ بیسی سے پاکستان ہجاء گیا۔ دہلی سے اُس کے فرار کا باعث میں تھا اور بیٹی سے نفیر افری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خطر خود بھی اُس فرار کا باعث تھا۔ کیونکہ لاٹنی میں جب تک وہ مارا پیلا جاتا تھا، غرض رہتا تھا اور جب دوسرے اُسی کے جہوں کو اس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر ہجاء جاتا تھا۔ بیٹی سے ہجائے کے بارے میں نفیر اجیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:۔

”میں نے بہت غور کیا، کچھ مجھ میں نہ آیا، آخر میں نے اپنے آپ سے کہنا منٹو بھائی ———

آگلی راستہ نہیں ملے گا۔۔۔ کاروٹر روک لو۔۔۔ اور باجو کی گلی سے چلے جاؤ

———— اور میں باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔“

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ افواہ اُڑی تھی کہ اسے غم میں تو کوری ملی گئی ہے لیکن دو سال بعد اُس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بیرونی سے چلا آیا تھا۔۔۔ باجو کی گلی سے ——— آگلی راستہ نہ سفر ہر ——— بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بیٹی چھوڑ گیا۔

پیرے والد زندگی بھر لاتے رہے، گاڑی نہ رکھنے کے بچے کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ لگایا کرتے تھے وہ تھا ——— ”میر قاتم جنگ دائم“۔۔۔ اور وہ اپنے لاگوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لا کا ہو گا، اس لیے وہ سب کو لانے کے طریقے بتا دیتے تھے، سب زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پٹنے سے پٹنا شکل ہے، چٹ، لیکن پٹنے والے کو نہ چھوڑو۔۔۔ میری صحت تو رکھیں ہی سے غراب تھی، اپنے والد یا بھائیوں کی طرح تو میں کیا لاتا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہو گئی اور کشمکش سیات میں جہاں جہاں بھی مکر پڑا ہے، میں نے پٹ کر آخر پٹنے والے کو پیٹ دیا ہے۔

منٹو سے میرا وہ بارہ سا بقیہ پڑا۔ ایک بار دہلی میں اور دوسری بار بیٹی میں۔ دہلی میں میں نے اُسے رُک دے دی لیکن بیٹی میں ہماری چوڑ پڑا ہوا۔

”دوسرا ان کے سلسلے میں ہم میں ہر شٹنگ ہوئی اس کے بعد پیرے اور اُس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے، چونکہ منٹو زور میں تھا اور کوشش اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لیے ڈھال بن جاتا تھا، اس لیے میرا دارا و چھاپڑا تھا۔ لیکن اس

خدا ہی میں اپنے زعم میں غمراہ شدہ سے بھی ہلکا ٹوٹ چکا۔ راشد نرا نظم کہانی کہے جاتے تھے اور غمراہ آزاد نظم سے بڑھتی تھیں۔ دونوں راشد کی غزلوں کا مجموعہ ہوا کہ نام سے شائع ہوا جس پر کوشش چند نے دیباچہ لکھا۔ غمراہ نے دونوں کا مذاق اڑایا۔ اس نے نیل راہیں کے حواصا سے کہہ کر ڈرامہ بھی لکھا جس میں راشد کی غزلوں سے الفاظ لئے کر ان کا مذاق اڑایا۔ لڑکھار آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھیے :-

سجیدہ (شاعر) کہیں آپ نے بھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دہائے ہیں ؟
 حورشن ٹھنڈے ہاتھ..... ۹

سجیدہ عظمیٰ مجھے اپنا غم و دوست کر لینے دو۔ اب بتاؤ کیا تم نے کسی اپنی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دہائے ہیں۔ ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں۔ کسی اپنی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں یوں داخل ہوں جیسے رات کے سسناہ اندھیرے میں کوئی بگڑے ہوئے کھانا کھانے کے عوض مبالغہ فاق کے طور پر اپنی دھم سے لایٹیں باندھے۔ نہیں۔ چاند کی ڈلی جو شام بھرا ہوا صبر آگئے۔ تمہیں آج ہو گیا کیا ہے سجیدہ یہ ٹھنڈی عورت تمہاری زندگی میں کب داخل ہوگی؟

کچھ دن منٹو آزاد شاعری کا انشائیہ کی نادر تشبیہوں کا، جنہی عورت کا، زمستان کی رات کا مذاق اڑاتا رہا، پھر اُس نے کوئی دوسرا موضوع چسوزا دیا۔ بات اُن کی گئی ہو گئی۔ لیکن دانشا سے نہیں بچیں گے۔

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈرامہ لکھا اور اسٹوڈنٹس کے لیے دوبارہ اسٹوڈنٹس اپ شپ ختم ہو کر اپنے گھر سے مل گئے اور کچھ دیر بعد واپس آکر انھوں نے مسودہ واپس کیا۔
 ”کیسا ہے؟“ منٹو نے پوچھا۔

تہنایت چھانٹا تب ہوا ہے۔ راشد نے اس استغناء میں مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو اس کی اپنی چیز تھی۔
اور مشورہ قبول خود گہائی ہو گیا۔ اس کے بعد مشورہ یافتوں راشد اور ان کی نظروں کو گستاخا۔ اپنے کسی دوست سے اس شخص راشد کی نظروں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

ہندی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راکھ کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ غلو اور رشاد میں چلنے کی تھی اور اسلئے میرے بڑوسی بھی تھے اس لیے غلو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔ تاہم مجھے پریشان کرنے میں غلو نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غائب ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ء کے شروع میں انھیں کسن مجھے یاد نہیں، اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ٹائز کر رہا کہ ان کی گیسٹ ہو گئے۔ راشد نے چلے جیٹے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کوشن کی غیر حاضری میں اس کا تیلوٹو لکھ کر دیو بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر وہی کہہ ڈیوٹیشن پر پروگرام اسٹیشنوں میں کوشن سب سے قابل تھا۔ اور باقی بیٹن پروگرام اسٹیشن تھے وہ اپنا شیڈول بدلنے میں کوشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس کا کہنا مانتے تھے پروگرام ٹائز کر سکیں میں وہ توں میں کوشن سے مدد لیتے تھے اس لیے اس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے، اور بہت سی باتیں کوشن پر اب راست لڑ کر لکھ کر منظور کر لیتا تھا۔ راشد

کی محنت میں آخریت کو کافی دخل ہے۔ انصیر نے منظور تھا کہ کرشن اُن کو غور انداز کر جائے۔ اس لیے انھوں نے اُس کو کھنڈ بھر دیا۔ لیکن کرشن کی تبدیلی جس حالات میں ہوئی اور اُس نے اُن کی فوجا مزہ میں اُن کے خلاف کچھ اِن بات لگائے اور کچھ جاری صاحب تک رات کو براہ راست رسولی تھی اس لیے فوراً تیار کر دیا اور اس سے مجھے رنج نہ ہوا اور میں نے رات کو اپنے اُس افسر کا اظہار بھی کیا۔ رات کو میرے کتے تھے کہ میں اُن کی تائید کروں گا، لیکن جب میں نے کرشن کی طرف داری کی تو بار بار اس کے کہم بار کے گھروں میں جتے تھے اور میری بیوی اور بچے با شدمیں بہت اچھے تعلقات تھے اور وہ کامیاب لٹنا تھا۔ رات کو مجھ سے بدظنی ہو گئے۔

راشد پروگرام کی ریکٹر جو گئے اور کرشن پہلے گئے تو منٹوں پہ گہری دُور میں دوسرے پروگرام کی ریکٹر سریندر چوٹیا کو کا نظر آیا۔ اس کے جنہوں پر منٹوں ایک بڑھیا منٹ سے پر زٹ کیا اور وہ اُسے اپنی طرف بلایا۔ اُدھانی چوٹیا مجھ سے خوش تھے اس لیے انھوں نے مجھ سے پروگرام اسسٹنٹ کے بہت تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لیے کہا۔ منٹوں کا ٹوٹا اور شعلیل پر تھا میں نے ہر دُور میں بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح وار سے کہ منٹوں اُس کی دُور سلوں میں سٹوڈیو بھی آتا رہا۔ حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے دُور میں کچھ لیتا تھا۔

اس دوران میں کھنڈ سے ہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا۔ غایت بد صورت، بلبا ڈانگا، چھٹی ٹاک والا نور جان تھا۔ اُدھانی نے صبح اُسے اور مجھ سے کہ میں بگڑا اور اُس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام لے کر کرشن کے کہ میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں سیٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جانا بیٹھا اور اُس دن کام لٹانے لگا لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹوں نے اُس کھنڈی پی۔ اُسے پروگرام اسسٹنٹ کو بگڑا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو بگڑا بھی بہت کچھ تھا کام لیکن اُن کی بات بھی اُسے بھی نہ سمجھی تھی اُس نے راشد سے پوچھا کہ راشد نے بھی اس سے یہی کہا کہ ڈراما رٹسٹ کی سب ذمہ داری تھا وہی ہے۔ داشتک تو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی نرالی جو چاہے وہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا میں کرشن والی کرسی پر بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹوں اُس کھنڈی پی اُسے کے ساتھ آئے۔ میرا دھیان سرور سے میں لگا تھا کہ منٹوں نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تیرے آپ کی کرسی ہے۔ ساتھ ہی اُس نے میرے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ اب دُور آجائیے۔

میں نے نگاہیں اُٹھائیں۔ پتی۔ اُسے کی آنکھوں میں تھک اور منٹوں کی آنکھوں میں ناخوشانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا میں اور اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آجائیے گا۔

اور میں چلا گیا میری آنکھوں کے آگے غصہ کے اسے اندر صبر چھایا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ کھنڈی پی ہے اُن سے مل چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں اُن کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیوں کر کے سیکھیں۔ دراصل اُنھیں یہ بات نہ آتی تھی کہ اُدھانی نے میزبان سے پہلے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہ دیا۔ میں اس کا شافی بھی نہ تھا کہ کیونکہ ایک بار جب جنگل صاحب نے مجھے پی۔ اُسے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اُنھوں سے ہی منٹوں کے سامنے، اُس کی انیمت پر مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اُدھانی کے پاس جاؤں کیونکہ انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ اُدھانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹوں کی ناخوشانہ چمک میرے دل میں دُور تک گھساؤ کی جلی گئی۔ اُسی غصہ میں ایک

لکھے کہ یہ خیال کیا کہ استغناء سے دوں بچھ خود ہی اس پر نہیں آگئی۔ جھٹلایا ہوا اور پائنے کمرے میں جا بیٹھا۔ شوکی انگلیوں کی چمک پھر سامنے آگئی۔ خدا کا وہ ہے اگر منتظر اس کھنوی میں بیٹھے کے ساتھ نہ آیا جوتا اور اس کی انگلیوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سبب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منتظر کو دلی نہ چھوڑتی پڑتی۔

اس وقت کہ میں جا کر میٹھا تو کام کرنا میرے لیے یکسر مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی ہنک کا خیال آنے لگا۔ شاید غصہ آتا، اس کھنوی پیٹنے پر غصہ آتا، لیکن سب سے زیادہ غصہ آتا منتظر اس کی انگلیوں میں جو چمک تھی اس چمک سے چل گیا تھا کہ میری ہنک کرنے والا ذوق پیٹے ہے، اندوشتہ منتظر جہاں میں نے طے کر لیا کہ منتظر اس سازش کا مزہ چکھنا اُن کا میرے غصے کی ایک وہ برہم بھی تھی کہ تجھ دن میں لے کر شہن کی چمک کا کام کیا اس میں منتظر کی کامیابی پر دلویس کیا اور حتیٰ الامکان کو خوشی کی کہ میں اس میں ایک نغمہ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا دلویس ہو کر کچھ پینے کا غصہ اور کچھ تازہ جنگ کا لگاؤ، کام تمام چھوڑ کر میں کنسیا لیتے پڑ لگا اور تجلیوں پر شہن کی دھک کر بیٹھ گیا۔

جانے جہاں میں سے کسی نے مہرشی چاکیہ کے اسٹرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے جہاں اناندا ن اُن سے وابستہ تھا یا کچھ سنے اللہ غم سے اس مہرشی کے کارنامے میں میں کر میں نے اسی کی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہر حال ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آتی میری ہچکچاہٹ سورج کی ترقی اور بھی تری سے کام کرنے لگیں اور تو میں کرنے والے کو، اگر وہ میرے بل کرے یا مجھے ادغا ہے، میں نے کبھی صاف نہیں کیا (اور یہ بات کتنی بھی بری کیوں نہ ہو) اس سے خود اہتمام لیا اور نہ صوف پر مصیبت سے نکلا ہوں، بلکہ ایک دم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پر مجھے محسوس ہوا کہ کھنوی پر دو کام اسسٹنٹ نہایت اہم آوی ہے۔ یہ شیک ہے کہ منتظر نے اسے غم کیا یا لیکن جو منتظر کے کہنے میں آگیا، اس کی حماقت میں کیا شک ہے۔ اس وقت ہندی میں میرا کافی نام تھا اس لیے میرا نام دینا ہوا میں بات نہیں۔ وہ کھنوار جوتا لکھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یوں تھکا نہ بھیجے میں مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ سوچا کہ اس آہی ہی کو آواز دینا چاہئے اور کچھ دیر بعد میں نیچے گیا۔ کھنوی پیٹنے سے سینہ تانے بیٹھی ناک چڑھ گئی، تنہے چلائے، کھنوی کے اپنے قفسے سنار ہاتھ کر کیسے چپ صاحب (جہاں اس وقت کھنوی کے پیشانی کی کرکڑ تھے) سے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اُس نے وہاں کا کام کئے گا یا اور انجام دے دیں اور منتظر اپنی حالت کے خلاف، چپ چاپ پاؤں کرکڑی پر رکھے کھٹنے ہاتھوں میں دہاتے ہمدنی گوش اُس کی ہی ترانیاں سن کر ہاتھ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کسی خود سری مہرشی نہیں کر بیٹھا۔ دونوں نے ایک نظر مجھ سے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منتظر کو چوڑے صاحب کا چہرہ اسی جا کر سے گیا تو میں نے اُن کھنوی حضرت سے کہا۔ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدی ہیں اس پیشانی پر ہندی کے ایک پر دو کام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی۔ اور میں نے اُسے شام کو گھر پر پائے کے لیے مدعو کر دیا۔

میں ان دونوں نہیں جہاں میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی چمک پلا کر میں اس کھنوی آہی کو رچ پرے گیا۔ بادل گھر سے جوئے تھے اور بڑی بلی چھوڑ پڑی تھی وہ لگا آواز پائی تعریفیں کرنا، ہا کرکس

طرح اس نے ڈرامے لکھے اس طرح چب صاحب نے کہا کہ ویسا سکرپٹ (SCRIPT) ہندی میں لکھی نہیں اور کس طرح انھوں نے اس کی سٹڈی کر کے اسے پروگرام اسٹنٹ بنایا میں نے بھی اسے خوب چنگ بچڑھایا، اس کی شخصیت کی تعریف کی، اسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اس نے اپنا بیانیہ جاری کیا تو سب اس سے خوف کھائیں گے، غیبی آرٹسٹ تو دلچسپ سے اچھے کو بوجھنا کہ رکھ دیتے ہیں، میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ بی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈ کاسٹ ہوں انھیں بھی طرح پر ہے، ویٹ (VET) کرے اس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور ویٹ کیے بغیر براڈ کاسٹ نہ ہونے دے گا۔ آپ جب آپ آگئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں میں نے کہا تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سولت کے لیے ہندی رسم الخط میں لکھوں گا باقی تو اردو مسودے ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے میں کروٹ کیا کیجیے، اوریوں بھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجیے، ریکوئٹ خراب ڈرامہ براڈ کاسٹ ہو تو ضروری آپ کی ہوگی اور سٹنٹ میں ڈرامہ آپ ہی کوڑے گی۔ اس پر اس نے اپنی تابیت کے بارے میں یہ علم کو اور بچھایا اور بہت خوش خوش رہا پس جہاں۔

اب شیڈول تو تین میٹھے پہلے میں جانا تھا اور وہ کوش بنا کر گیا تھا۔ میں میٹھے دوسرے میٹھے ڈرامہ لکھتا تھا اور سٹنٹ کے دو تین ڈرامے ہی میٹھے جرتے تھے۔ اگلے ڈرامہ مغربی کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھے یاد ہے) آثار و پلاٹ وغیرہ مجھے سب بخوبی گیا ہے۔ اتفاقاً وہ ہے کہ وہ ڈرامہ بھی غٹو کے ان دنوں لکھے، بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی وہی میں لکھا جاتا تھا۔ دوسرے ہی وہی اس لکھنوی بی۔ اے نے اس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا، میں اسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اسے سننے لگا۔ اس کو زبان وغیرہ یا ڈرامہ وغیرہ کی خاک مجھ کو تھی، ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا۔ کیوں صاحب اس غٹو کی جگہ یہ غٹو ہو تو کیسا ہے؟ اور وہ کہتا۔ ”ہاں ہاں، یہ بہتر ہے۔“ اسی طرح میں لال پھل کی بد سے الفاظ اور مواد سے بدلتا چلا گیا۔ وہ چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے تحت خلافت ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کو کے میں جہاں گیا ہوں میں ان کو نہیں بدلتا یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ضروری ان کی ہو جائے گی، ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اس کی جگہ تین اختتام تحریر کر دیے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اس لکھنوی بی۔ اے نے راشد پر پورا عجب ڈاؤن کیا اس نے غٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے۔ پورا نام ہے۔ اس نے بڑی محنت سے ورٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈ کاسٹ ہو۔ راشد تو غٹو سے پہلے ہی جیل بیٹھے تھے، ان کو اپنا پانا بدل نہ لکھنے کا موقعہ ہاتھ آیا اور انھوں نے وہ چند الفاظ بھی جن پر میں نے لال پھل سے گول دائرے بنا دیے تھے، بدل دیے۔

جب غٹو کو معلوم ہوا کہ اس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈاؤن کر کے کرے میں گیا اور اس نے راشد اور اس لکھنوی بی۔ اے کو یہ نقطہ سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ جو گا تو جتنا ایک نقطہ کہے ہو گا، اور نہ نہیں ہو گا۔ میں اور تو بی لاکہ داگرزی انڈیا کے کرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ انڈیا کے کرے کا رشندانی میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے انڈیا کے کرے میں غٹو کچھ اتنے دور سے پڑا تھا کہ میں ڈر کر رشندانی کے پاس چلا گیا اور جھک کر انڈیا

نکارہ کرنے لگا۔ شاید کہہ رہے تھے کہ انھوں نے خود کو دھڑکڑا رہا ہے اور جو گاؤں انھیں بندھنیوں کے ساتھ ہو گا وہ نہیں ہو گا اور ڈیوی ایٹن (DEVIATIN) یعنی جدول کے انحراف کی دقت داری اُن کی نہیں ہو گی جب ہم باہر والوں کی چیزیں دیکھ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے۔ اور منٹو خیرے میں بندھن کی طرح تھلا رہا تھا اور تقریباً دہائے جوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہو گا تو اسی روپ میں ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔

مجھے منٹو کی اس تھلاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی۔ منٹو نے مجھے بتائی کہ کیا اس دی تھیں، میری ترقی کے راستے میں جو کارٹیں لٹائی تھیں، اُدو کا ٹاپ، دائرہ میرے ہاتھ نیچے جوئے جو چاہیں روپے جھوٹے فلک کر دیو لے گئے تھے اور اُن پر سے مجھے بنایا تھا اور بتایا بھی مجھے ستلایا تھا، اُس سب کا بعد ان چند لمحوں کی اس کی تھلاہٹ میں مجھے مل گیا۔ سناؤی ٹھٹک ٹھٹک، لوہاروی آکر سٹ۔ میں نے من ہی من میں بیجا بی کا ٹھارہ دھرایا اور وہاں اپنے کمرے کی طرف بھرا۔

مجھے یاد نہیں، اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انھوں نے راکش پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ٹائر کر کے کام میں غلطی کہنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے صورتیں واپس آکر کمرے پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں پڑ پھیل کر اٹلیان کی سانس لی۔

لیکن اُس مسرت اور اٹلیان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اداسی کا احساس دل و دماغ پر عماری ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے ٹھوکی تھلاہٹ، اُس کے فوجی صورت، ہتھ پر ڈیڑھ جوتی ٹانگیں، اُس کی باہر کر نکل ہوئی آنکھیں — سب کچھ گھوم گیا — اور اس تھلاہٹ کا باعث میں تھا — میں جو حقیقت سے چاہتا تھا، اُس کے پاس بیٹھا چاہتا تھا، اُس کے انسانوں کا اُس کے نام خاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ تاج تھا — میں جس نے دو ایک مینڈ پٹے اپنے ڈراموں کا دوسرا کمرہ بنی دیا ہے، اُس کے نام منوں کیا تھا۔

خیر وہ کہ ایک منظر میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا؟ اسباب پرے سامنے ہے۔

منٹو کے سامنے

جو مجھے کبھی بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی بہت بُرا

میرے اُس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر ہے اسباب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگس میں ڈرامہ کا عقد پیش ہوا۔ کھنوی بی۔ اے نے دانش کے کئی پروڈس کے تحریری تنقید پیش کی، آل انڈیا ریڈیو وی کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگس میں ہو، لیکن چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا، اگر ڈرامہ نہ ہو تو اُس کی جگہ دوسرا ڈرامہ پیش کیا جائے، اس لیے دانش نے میٹنگس میں وہ بات اٹھائی۔ کھنوی بی۔ اے نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی، سو اُس نے پہلے ہی سے یہ حال منٹو کی تنقید ہوا اور وہ بھی بحری میٹنگس میں، یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔ کھنوی بی۔ اے کی کھٹکے ہاتھ میں اُس نے حق تو بتایا تھا کہ اس اصرار پر باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا تھا۔ مجھے پھر غصہ آگیا اور میں نے کہا کہ ڈرامہ میری منظر ہے جس کی گراں ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے — اور چونکہ سب قطع و برید میں

ملی تھی اس لیے میں نے بڑی صفائی سے اس ٹولے کی کڑی دھواں اُجاگر دیں۔

مجھے اس بار وادیں، منٹو نے کیا کہا، لیکن مختصر میں اُس نے بڑی قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ ٹیکنیک کے ضمن میں میں کچھ نہیں جانتا اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر کھڑے کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز اور میں کہا کہ میں نہیں دس برس تک ٹولہ کھنڈا کھنڈا سکتا ہوں، تم اُوپر میرے کمرے میں آؤ تو تمہیں بتاؤں گا ٹولہ کیسے کھنڈا جاتا ہے اور ٹولہ اور بھی بہتر بنا کر دکھا دوں گا۔

بات بڑھ جاتی، لیکن شور و غصے کا ڈھواں صاحب اپنے کمرے سے آگئے، ملے بڑا کہ ٹولہ صبح شدہ حالت میں ہر گاہ اور ہر گاہ اپنے آؤٹسٹ کا سوال ہے اس لیے جدول سے انحراف نہیں ہوگا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں آکا۔ اُس نے ٹائپسٹ انٹر آٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوسرے کو خورشید صاحب (سکرٹری انلڈ میٹس) چیئر براؤ کا سٹنگ (کافون) آیا کہ منٹو کا ڈراما اگر براؤ کا سٹنگ کرنا مقصود ہے تو منٹو کے کچھ بڑے مسودے کے مطابق لکھا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ٹولہ خورشید صاحب نے ملگا یا تھا اور میرا انہوں نے یہ پرنام بھیجا تھا۔ راشد چونکہ ٹٹلے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈراما بھیج شدہ حالت میں کریں گے اس لیے خورشید صاحب کے ذریعے اُسے کینسل کر دیا تھا)

تیسرے دن بھی منٹو دفتر میں نہیں آیا ٹولہ اُس نے ملگا لیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن اُس کا وہ پہلی چلا گیا ہے اور اسے نظم کہنی میں پانچ سو کی جگہ ملی گئی ہے۔

گراؤٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری اُسے کچھ نہیں ملی تھی اور بیٹنی میں اُسے نامی انکیت ہوتی۔ بڑی کوہ دہلی ہی میں چھوڑا گیا تھا۔ بعد میں فلستان میں اُسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اُس کا دوست قادر بجا کہ اس کی فصل کو بیٹنی لے آیا۔

”وہ قصداً لال کیا بڑا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔“ اہا تک منٹو نے کہا بیٹنی جس طرح مجھے زندہ شدہ چھوٹا تھا، ڈراما کھنڈی پئی۔ ملے پر جگہ منٹو چھوٹا تھا، اسی طرح منٹو کو بھی اُن دونوں کے بچائے بھی چھوٹا تھا، اُس کا ٹولہ میں نے کاٹا ہے یہ بات وہ جان گیا تھا۔

”اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

منٹو چُپ رہا۔

”دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر میں اسی طرح لاٹا ہے تو مجھے فلستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو یا پانچ آدم سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور بیچ بیچ تو کیا کاٹو؟“

”نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہو گا۔“ اس نے انگریزی میں غصہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

اُس دن گھر واپس آکر میں نے صفیہ بھابی سے کہا۔ دیکھیے، منٹو نے مجھے بتائی ہو یا ہے میں انہیں رہا تھا۔ دوبارہ تار دینے پر پھلا کر باہر۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہاں دارہ کا سرورہ منٹو نے مجھے بتائی ہے اور وہی کہ اس واقعہ کو نہیں سمجھتا ہم دونوں میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لیے تماشا بناتے ہیں۔ اب اس نے مجھے بتائی ہو یا ہے تو آپ اسے سمجھا دیجیے مجھے یہاں تنگ نہ کرے۔ کیونکہ وہ تنگ کرے گا تو میں بھی تنگ کروں گا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔“

منٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ دوسری کوئی بات نہیں ہوگی اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہیں کیے لیکن ہاں کر دی۔ لیکن جب بعد میں میں نے سچا تو میں نے لے لیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا موقع ہی نہ دے دوں گا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو اور یہی میں جتنے میرے واقف کار تھے ان سے مل کر میں نے منٹو، اس کے کتا دھرتا شمشاد، سر کرکھی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی میں خاص طور پر ان لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے مجھے یہیں پار اہم باتوں کا پتہ چلا۔

- ۱۔ منٹو کا اس مگرچی راز قدیم کے ساتھ پسندانہ دلائل جیسا ہے جو غلاموں کو کڑے دار مار گئی سے کام لیتے تھے۔
- ۲۔ منٹو ان میں منٹو کا ایک چہرہ راج ہے۔
- ۳۔ جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تحریر کیا تھا تو منٹو نے منٹو میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے۔

۴۔ منٹو ان میں ایک ہی منٹو کو سب کا دارہ نہیں سمجھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو دیکھ کر کے خود سمجھتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے شاہد لطیف اور شمشاد کو منٹو ان چھوٹے بڑے سمجھ کر لیا جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو کو منٹو ان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو نے منٹو کو سمجھا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اس نے ہی مجھے ڈان بھرا جیتا ہے؟ ہے کہ جب منٹو نے مجھے منٹو ان میں کام کرنے کے لیے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جاننے سے انکار کر دیا تھا لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ منٹو کو آؤ اور سیکھو اس کا کرایہ کمپنی دے گی تو چونکہ کوثر شیا کوثر شیا کے لیے بھی جاری تھی، انہیں میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سمی تو بھی کسی سیر ہو جاتے گی۔ لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اُس وقت میں دس تیسے پڑھتا تھا، اس میں مجھے بڑی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر منٹو ہی میری ترغیب کرنی پڑی۔ لیکن اس نیلوی دج میں فرق نہیں پڑا چونکہ اس وقت میں نے ایک نفسیاتی پہلو میں ہے اور خاصا دلچسپ ہے۔ اس لیے میں اس کا ذکر نہ ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لیے کچھ وقت کا ساتھ نہ لگتا تھا۔ ہے اور میں تو دہلی نے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا۔ اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

گورا چارنگ، چنگا چھر پر اجسم، فراخ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور موٹری پر احتیاطاً مینہ سکا ہٹ — منٹو کی یہ پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں میں منتر، نیپا، قانون اور شاید سنسکرتی کو سٹارڈ پٹھ چکا تھا اور اس نے اس نے مجھے بھدا چھپے گئے تھے اور منٹو نے میرے دل میں، ایک حرم کے بجائے ایک ذہنی افسانہ نگار کی حیثیت سے جگر بنایا حتیٰ کہ میں دہلی میں میرے کہنے سے پہلے ہی بااس کے لیے جو پارٹ ڈھول گئے تھے ان سے نجات نہیں لی۔ یہیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریت ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اپنا ناک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن کھننوی تبدیل ہو گیا تھا، اختر آبادیان کو راتھ نے جواب دیا دیا تھا۔ چٹھہ صاحبزادی اور ساجہ بھدی علی غرض، راتھ کی خوشامد میں گئے رہتے تھے اور راتھ جو کہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لیے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق و غریبی تھی۔ یہ شیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھپٹ ہوتی، نرس منٹو کی بھی رہتی تھی، لیکن اچھے سے اچھا کھنن میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا۔ منٹو کے پہنچ جانے کے بعد اس کی اور اس کے افسانوں کی تعریف ذکر کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اسے ڈھیلہ کر دیا۔ منٹو کے پہنچ جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد — شیک سن مجھے یاد نہیں، اس کا افسانہ 'بڑا شائع ہوا' اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اس کے غلامت ایک شور مچا ہو گیا، چودھری غویا احمد نے اس کے بارے میں میری ہی رائے مان لی۔ میں نے بڑی خوب تعریف کی۔ مجھے بڑے کشش سے غرض دہلی میں اس افسانے کی تکنیک پڑھا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تقسیم کو منٹو نے جس چابکدستی سے نوٹس سمویا ہے وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنایا تھا ہوں، جہی میں بھدی کے مشہور افسانہ نگار پٹ پال بھی شامل ہیں اور پٹ پال میری رائے سے متفق ہیں، ہر بھدی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لیے وہ 'نور محمد پٹھ' سے تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اس کے چوڑا کا افسانہ 'ہندی کا فوجی' ہے۔ اہا کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ نگار ادب میں اس کی فکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ لاجبوتی میں حیثیت ہی نہیں کشش کا بھی کمال ہے۔ بہر حال مجھے خیال ہوتا ہے کہ بڑے بارے میں جو خط میری چودھری غویا احمد کو لکھا، اس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اس کا خط اسے انھیں بھیج دیا۔ کیونکہ جب میں پہنچ گیا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رُخ کچھ ڈھیلہ ہو گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر شری قریب پاکستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو نے یہ میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق پہنچ میں ہوتی۔ منٹو اگر شرب ز پینے ہوتا تو دہلی کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ادارہ کے اس مسودے کا ذکر نہ کرتا جس میں نے کانٹ چھانٹ دیا تھا تو میں اسی غرض غمی میں مبتلا رہتا کہ میری طرف سے منٹو کے دل میں جو کجگوت تھی وہ دھل گئی ہے۔ منٹو کو وسیلہ پڑ گیا تھا لیکن وہ اس واقعہ کو زہر میں ڈکھاتا تھا۔ سال بھر پہلے پاکستان میں اس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی اس وقت میں وہاں جانا تو اگر میرا شاہرہ گایا میرا دستخطی کاغذ ہی جانا تو منٹو کو تکلیف ہوتی اس لیے اس نے میری مخالفت کی جس وقت اس نے مجھے بلایا اس وقت

شاہد طیف اور مستوحی طشتان چھوڑ چکے تھے اور منظر کمری کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے اور مستوحی نے بتایا کہ منظر خسار سے دکا مرنے کے پرہیز اٹھا دے گا۔ تم تھوہ ضرور اچسپاؤ گے۔ لیکن خساری جان منظر میں آجائے گی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اُس کے ڈرائے کی چوڑھیاں اڑائیں تھیں اُس کا انتظام لینے کی ترکیب اُس نے یوں نکالی تھی۔ اور چونکہ میں ہاں کر چکا تھا اور دلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے ظلم کی نوکری کر لی ہے اس لیے میں واپس توڑ گیا لیکن میں نے فلستان میں اپنا اٹھائو نقل طے کر لیا۔

میں نے اُس وقت تک کنٹرکٹ پر دستخط نہ کیے جب تک فلستان میں مجھے ایک کمرہ اور ایک میز کرسی نہیں ملی۔ دیر پہلی احتیاط تھی کہ منظر میں اور مجھ میں جھگڑنے کی فورت نہ آئے اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی حق ہوں گے یا یہ مکملے کھسوں گا اور میں ہی ڈاکٹر ملک ڈائریکشن کروں گا۔

میرا پہلا ظلم ضرور تھا اور دوسرا سفر جسے جزائے ڈائریکٹ کیا۔ دعوت پہنچنے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے ہی صورت میں لے کھے اور یوں فلستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منظر کو اس بات کا قطع ضرور ہوا کہ میں نے اُس کی چالی کاٹ دی لیکن میں نے اپنی حالت کو جانتے ہوئے نت جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود اور منظر مجھے ایک چوڑا پنپنا من کا سیاب ہو گیا۔ میرا پہلا ظلم ضرور تھوہ ہاں میں پر کا سیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے شکستہ کے بہترین ڈاکٹر تھے اور مجھے ایک سند بھی ملی تھی۔ میرا دوسرا ظلم سفر ہاں میں آخری پر بھی کا سیاب رہا اور ظاہر ہے کہ میرا ڈاکٹر بھی بڑھ گیا۔ تب اشوک کمار نے اپنا ایک ظلم پر ڈرائس کرنے کی خواہش

ظاہر کی اور کمری مان گئے۔ منظر کے دونوں ظلم تلخ چل رہے تھے اور اشوک کی دودھ سال لینے کے باوجود ناکام رہے تھے۔ اس لیے اشوک کمار میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ سے ایک کمائی کھینچنے کی فرمائش کی۔ میں نے ان کو دو تین پلاٹ، جو میرے ذہن میں تھے، سنائے۔ اشوک نے ایک پسند کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا کھڈاؤں۔ لیکن میں نے کہا کہ کھینچنے سے پہلے ایک شرط وضع کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کمائی کھینچنے کا دو ہزار روپیہ چنگی ہوں گا۔ میں اُس وقت پرانے سات سو کے

قریب تنخواہ پارہا تھا۔ لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہوں، کمائی فرانس کی حیثیت سے نہیں۔ کمائی لکھوں گا تو اُس کا دو ہزار ہوں گا اور ڈاکٹر کی کمائی کے کھاتے میں لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار کمری کا سا تھا لیکن ان دنوں سلسلے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا کہ آپ کو جی سے کہیے۔ لیکن کمری مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کر دیا تب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ جی لال سے کہوں گا۔ آپ بات کر لیجیے گا، لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور کھڈے

ڈالے۔

منظر کو یہ خبر ملی کہ اشوک میرے پاس پہنچا ہے اور میں دو ہزار روپیہ ہانک رہا ہوں تو اُس نے دیا کو ساتھ بلایا۔ دیا اشوک کو اپنے ٹیلٹ پر سے گئے۔ شراب دیا کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی۔ اشوک کمار انھوں نے اُس وقت تک ڈالے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منظر نے ظلم کی کمائی کھنے کا اور دوسرے دن اُس کا صورت ہو جائے گا۔

چونکہ کمائی کوئی تیار نہ تھی اور صورت ہو گیا تھا اس لیے آٹھ دن کے غلغلے کے سلسلے میں کیا کیا دقیق چیش آئیں یہ

ایک انگ لمبی کہانی ہے، لیکن جو کہ منظر نے یہ جانتے ہوئے کہیں نے انگ سے معاوضہ نہ کیا تھا، بغیر معاوضہ کے افسانہ کو دیکھنا غلط کرنا اور ادب سے کہیں بھی آدمی غم نہ لے کر تو اس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مدد میں بھی کچھ معاوضہ لے لیا، اور بھی خاصی سازش کر کے میرا پتہ کاٹ دیا اس لیے مجھے بہت ہنسا۔ فورا اس وقت جب میں افسانہ لکھ کر لکھ کر اشوک کے آگے لگانا چاہتا تھا۔ صحت ہو گیا، مگر مجھ سے خوش نہ تھے اس لیے سو اس کے کہیں زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا، اور کچھ نہ ہو سکتا تھا، یہیں کچھ ہی دن بعد میں نے خٹو سے بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی، آٹھ دن کاٹا، زکیر ملتان کا بیٹا طیف و کامران باقی مقدر بن گیا، کچھ دن ڈاکو گئے تو اشوک ہی کہتا تھا، لیکن چونکہ پانی بڑا قابل اثر ہے تھا اس لیے اس کی بلیقی تھی میں نے پانی کو ساتھ ملا دیا اور اٹھارویں میں چندتہ طور پر رام کا ایک مزاج بدل لے لیا جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک منظر کا بدل تھا، لیکن میں نے اس غبن سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری ٹیک (RETRACT) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اس نے طے کیا کہ یہ بدلہ جو سارے غم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ وہ چندتہ طور پر ام جو کہ ہندی ہوتا تھا، اس لیے چندتہ کے سب ڈاکو میں گھستا تھا غصہ ایک لائق گھستا تو میں چار کر دیتا، خٹو ایک سین گھستا تو میں اس کے دو دیتا۔ مجھے شیخ ایکٹنگ فرسند ہے لیکن غم ایکٹنگ کو غم نامک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن خٹو کو پریشان کرنے کے لیے وہ غصہ کمزور دل میں کرنا رہا اور خٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھ پائی تک کی نسبت اٹھی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ ملتان سے انگ ہوئے اور کچھ اشوک اور اپنا خٹو کے دوست تھے اور خٹوان کے ساتھ بھی ڈاکو نہیں چلا گیا جیسے اشوک نے کہی تھی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا، لیکن خٹو ہاں ایک لمبی کہانی نہ دے سکا جب میں پوچھی تھی سے اور ادا کرتے ہوئے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ خٹو کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کہانی نہ لکھی تھی، لیکن ہم نے کمال اور جونا کی کہانی مکمل کی تھی کا فیصلہ کر لیا۔ خٹو کہہ کر کہ میرے چاہا حال نہ کہ ہم نے کہا کہ اس کے بعد تمہاری والی کہانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سنا۔ دوستت ساؤنڈ رکارڈسٹ واپس آچکا جو خٹو کا دوست تھا) اور بیٹی ٹانگیں کے انگ واپس میں فرقی تھا اور خٹو ایسے گزریں میں غم میں گیا جیسے کبھی اس نے ملتان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا، اور جب اس نے دیکھا کہ آگلی راستہ بند ہے، کارڈ نہیں چلے گی تو وہ باہر کی گلی سے پاکستان چلا گیا اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسایوں پر ملاؤں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹیاں اشوک اور جونا کو لگی تھیں، لیکن سٹوڈیو کو آگ لگا تا اور خود بخود جوتا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاید طبیعت نے بلکہ غم پر جیسی نے خٹو کے بدلہ ہونے کی بڑی وجہ تھی کہ پہلی کہانی غم پر جیسی کی کہی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتہ چلا، خٹو نے پہلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن خٹو کی اس دن چھوڑ دینا اور باری صاحب کی دن چھوڑ دینا میں زمین و آسمان کا فرق ہے، باری صاحب کی دیکھو ٹریٹ میں غائبانہ بڑی کاغذ تھا جبکہ خٹو کی دیکھو ٹریٹ اس کی زبردست انکسنت کے باعث تھی، اور اس کی اسی انکسنت میں اس کی عظمت کا راز سفر ہے، خٹو کو غصہ نہ کرنے سے عاجز نہیں تھا، کہی کے پاس بیٹھ کر ان کی خوشنودی کے لیے خٹو کو غائب کے اشیاء

منانے میں لے دیکھا ہے، املاک میں جتنا ہوں، کمرچی کے سامنے غالب کے شعر پڑھا بیٹس کے آگے میں بجانا ہے۔ اس سے کمرچی کا حکمت کم نہیں ہوئی، اپنے فن میں اس کا کوئی ثانی نہیں لیکن غالب کو کھینا ان کے بس کی بات نہیں، اور پھر نکال کے لاتے جنگل کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر ان کے نزدیک غالب سے بڑا ہے، اشوک اور اوچا کی عقل میں میٹر کو سوتیاد لیٹنے سنانے کو دیکھا ہے، انہی پڑھ ایکٹوں اور صرگ ٹائر ایکٹوں کی عقلوں میں بڑی مرگزی سے کجواں کرتے سنا ہے، جسے شکر کوں میں اور دوسرے بزرگ ہی کا نام جیتے تھے، لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اس کی اتنا کوشش نہیں کی، کیونکہ اول تو یہ کہ وہ ان کو اپنے سے کہیں کمتر سمجھتا، پانچ دوسرے یہ سب لوگ خود منظر کو شکلی سمجھتے ہوں، شرابی سمجھتے ہوں لیکن اول وہ جے کاٹا کھاگ، داسٹر کھیتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اس پیشکش میں جہاں دانش نے رہنے والے اس شخص پر بی۔ اے نے اس کے ڈرامے کی تصدیق کی اور بی بی ٹی کے سٹوڈیو میں جہاں اشوک اور اوچا اس کے کمرچی دوستوں، نے اس کی کافی کے مقابلے میں فقیر باجری اور کمال امروہی کی کامیابیوں میں، منٹکی، انانیت کو زبردست شہس بیچنی اور جب اس کی انانیت کو شہس کی تو سچو وہاں اس کے لیے خطرناک مشکل برپا کیا۔ کوئی بولی کہاں دلا لا این اوقت مصنف ہوتا تو جنگ برداشت کرنا برا بھی وہیں جہاں تھا، لیکن منٹکی انانیت کے لیے وہ جنگ ناقابل برداشت تھی، اور چونکہ پٹ کمرچی دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا، اس لیے وہ فون باری میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی، دوسری بار تو اس کی جان پر راجی، لیکن تکلیف کے غم سے اپنی انانیت کو شہس لکھنے دینا اس نے منظور کیا۔

پارٹی ہر پیشکش پر انارل و انفارمل منٹو شوٹ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا عقل میں کوئی دوسرا وی لوگوں کی قوت مبذول کئے تو وہ بڑی خاصگی سے بغیر کسی کوتاہی کے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو نکلتا ان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں نے کانٹریکٹ ہوا تھا نہ کیے تھے اور میری شرطیں کمرچی نے ابھی منظور کی تھیں اور میں کمرچی کو غالب کے بجائے سادھوی دوا کے قیمت سنایا کرتا تھا، میں نے منٹکی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا، لیکن ایک خاص واقعہ ہے جسے میں قبول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اوائل کا ذکر ہے۔ شیک ہیشہ مجھے یاد نہیں۔ بی بی میں امریکہ دیا انگلستان کا، یہ مجھے یاد نہیں، ایک مشورہ کیڑا تھا، میں نے اس کی کٹر کاسٹ ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ مٹر سائیکل درس میں شامل ہوتا ہے اور اس کی کٹیں کرتا ہے کہ دیکھنے والے شہس کے اسے ٹوٹ پڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر حال بی بی میں وہ ایک دو سٹوڈیو میں گیا۔ اسے ہمارے نئی ٹالے نے اسے انگلستان میں بھیج دیا۔ شام کو نکلتا ان کی کینٹین میں جو کھانے میں غرضی اور جیت کے باہر جس طرف سے کھلی تھی، سڑکی گلیں اور شہس ہر کمرچی، گیان کمرچی، اشوک، داجا چنگر، بریں، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے، چو کھاس یا کیکٹو کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے فلم ریڈیو کی ایسی پیش میں جاتا تھا، اس لیے اسے درہم گئی۔ بڑے کمرچی اٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے، منٹو صاحب محول باسز (BOSSSES) کے ساتھ بیٹھا بقول شہس یا اپنی بزرگ بی بی ان پر سنا لے کر کہا، میں نیپالی بریں وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا، آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے، ہونا سامنے۔ جیسے کسی نے دونوں چٹوں کو کھینچے میں کس کی چٹا کر دیا ہو، بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا، ان کی بیوی بڑی جیسے تھی، ظاہر ہے کہ وہ یہ اور نام کی کشش نے اس خود کو اس شو کے پہلو میں لٹایا تھا۔ ہر حال اس کے آگے آگے داسے ہوا پر نئی ٹال اور کمرچی آئے کینٹین میں ایک بڑی میز بھی تھی اور اس کے ساتھ

چھوٹی چھوٹی میز پر ٹکی عیس۔ بڑی میز مٹاؤں اور کھین کے بائیں کے لیے تھی اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی خیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا۔ ایک منٹو، اشوک اور دپا کے ساتھ فوجی میز پر بیٹھا۔ لیکن ایک تو اس کیلئے کھڑے سفر آئے والے لوگ زیادہ تھے، دوسرے رائے ہلاک کے ساتھ بھی چند مہمان تھے۔ اشوک اور گیان کوہری ہانگوں میں سے تھے۔ کوہری نے دپا اور اشوک کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ دپا اشوک کو چھوٹی میز پر چلنے کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے منٹو کو بھی پاس بلایا۔ دپا اور لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔ اس اور منٹو میں جب مہمان بیٹھ رہے تھے، منٹو چپ چاپ کسک گیا۔ میں یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا: ”کیوں؟“

”چلو چلیں۔“

”کیوں؟“

”سب بکواس ہے۔“

”بیٹھو۔ میں نے کہا تھا کہ اس بکواس کے منظر میں ٹوڑے ٹکڑے بیٹھے ہیں وہاں آدھ ٹکڑے اس کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ہیں۔ لیکن منٹو نہیں رکا، خاموشی سے کھینٹیں سے نکل گیا۔

”مجھے فرشتے ہیں منٹو نے شام پر جو سیکھ لکھا ہے، اُس میں منٹو کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ بلاشبہ میں شام آیا تو اُس کو شہدائے اُستے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی انا کو بار بار چٹکیں ملتی تھیں۔ منٹو کہتا ہے:۔

”شام نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ ہر ایک اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پرالندہ کر دیا۔ اُس سے وعدہ کر کے کرات کو میں اس سے علیحدگی ہو مل میں ملوں گا، چلا گیا۔“

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ زیادہ اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اُس کے ساتھ رہے، اور کچھ نہ تھی، اُس کی انا تھی، اُس کی اس اُلجھیں اور گھٹن کو میں نے اس ہری کی راز انگیزی، ایک منٹو کی آمد پر بھی محسوس کیا۔ کوہری نے جب منٹو کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ ایک سخت اُنا سے ہر گیا اور پھر وہاں بیٹھا اُس کے اپنے شکل ہر گیا۔ منٹو، شام سے ملنے نکلتی ہی گیا، لیکن اس ملاقات کا شریج بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ تھا اور منٹو اور میں چکر دہاں آگیا۔ بدی میں جب وہ شام سے ملا تھا تو کرا شام نہیں، منٹو لوگوں کی توجہ کو ہڑا تھا، کیونکہ ایکٹروں، طرازی کیٹروں میں وہ اپنی تہائیت، لطیف گوئی اور ہنسنے سے منٹو دلوں کی توجہ کو اپنی طرف لگاتے دیکھتا تھا۔ لیکن وہ میری ان دو ملاقاتوں میں اُنکے ہوائے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے جو میں سے شام کو سب جانتے تھے، اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ میں۔ اسی بلور پر روشنی لگے تھے اور میں بھی طرح جانتا تھا۔ اس بات سے منٹو کو جوا چنے آپ کو سب سے بڑا کہتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہوئی

غٹوس طرح پٹینا جانتا تھا، لیکن پٹینا نہیں، چاہتا تھا لیکن پڑنا نہیں، اس طرح مذاق کرنا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی جس اس میں مفقود تھی سو بہت ذکی نہیں تھا، اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسرے بھی ذکی نہیں ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات چیت ہو سکتی ہے، اسے وہ اوجھے وہ کافسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا، لیکن انسان کی یہ عام غالی ہے۔ سائنس دان بھی باغض سے اندھے ہوتے، لیکن اپنے انسانوں میں انھوں نے اس کے خلاف کیا، باقر اک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے، لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انھیں دوسرے پر دینا اور پکائی چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہیے، ہوائی تلے نہ بننے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہیے۔ صفحہ قرعاس پر زندگی کی دلی پہچانی حقیقتوں کو تسلیم نہ کرنا کی پاکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی جبر میں ان حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا تا آج میں یہ سب دلی طرح سمجھتا ہوں، لیکن ان دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا۔

میں جن دنوں دہلی گیا، غٹو کی ایک کافی کا بلا پر چا تھا۔ اس کا نام تھا ترقی پسند۔ پرچا اس کا یوں تھا کہ غٹو نے وہ دیو بند سٹیاءتی اور پیدی پر لکھی تھی، چونکہ پیدی میرے بست نزدیک تھا اس لیے پہل فرصت میں میں نے غٹو کی وہ کافی پڑھ لی، کافی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ مجھے بتایا تھا بات یہ تھی کہ لو کہ گیت گھٹتے گھٹتے سٹیاءتی ایک دم افسانے گھٹتے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے۔ سٹیاءتی کو بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہو۔ دیو بال واپنے گھٹے حیرت و جند شکر پیدی کے ہاں ہماری ہو گے اور صبح شام اسے افسانے سنانے لگے، پیدی اس وقت پست خانہ میں لو کہ تھا اور وہاں پر چھانڈاؤں میں رہتا تھا، دو کہے اس کے پاس تھے، جگر زارہ نہیں تھی، پر سٹیاءتی کی موجودگی میں غلوت کا میٹر آسایوں کی شکل۔ پیدی شام کا تھا، ادا آقا سٹیاءتی ایک افسانہ سنانے کے لیے تیار تھے، میں گھر صوف دانے پتھر بلکہ فصیح چاہتے تھی میں رات کو دیو رہ جاتی۔ سچ اٹھتا تو اسے فصیح شہرہ افسانہ سنانا پڑتا۔ میں نہ پر سٹیاءتی وہاں رہے اور پیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ غٹو کی کافی ترقی پسند کا پلاٹ یہی ہے، صرف آخر میں غٹو نے ذرا افسانوی پرچا دیا ہے کہ یہاں تھی (ترقی پسند میں سٹیاءتی کا بدلہ) اپنے میزبان سے کچھ ایسا پتا ہے، اور اس کے وقت کا ہر لو کہ اس طرح سے قید ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے بیدار کرنے کے لیے جیوٹی خانہ ہی بہتر خیال کرتا ہے۔

کافی پیدی ہے۔ اس میں پٹینا دہلی ہے لیکن غٹو نے اس سے کہیں زیادہ مجھے افسانے گھٹے ہیں مجھے کافی پٹینے میں دلچسپ لگی، لیکن چونکہ پیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ پیدی کے گھر سے سنا ہوا، غٹو نے جگہ کر دیا، اس لیے مجھے گرا کا میرے خیال میں اسے گھٹنے کا تھی پیدی کو تھا، یا پھر غٹو پیدی سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دیکھو یاد میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں، تمہیں لکھنا ہوتا تو میں دیکھوں ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن غٹو نے افسانہ نگار کو (تساہیر کاں خیال آتا تو اسے تسلیم نہ کیا یہی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو گھٹے سے دو دوستوں میں شکر بانی کی دیوا دکھائی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوا نہ دکھائی ہوئی بلکہ انھوں نے غٹو کے خلاف ایک مشترک محاذ قائم کر لیا اور جس طرح غٹو نے اپنی کافی

میں بیدی اور ستیا راجی کے ملاقات و طرار شکل و شبہات اور ذاتی زندگی کا مذاق اڑانا یا تھا، اس طرح اس دنوں نے ہی کہ ایک افسانہ نگار کو غرضکی ذاتی زندگی اور اس کی خاموشیوں کو بھانج کر دیا۔ کہانی ستیا راجی کے نام سے شائع ہوئی انھوں نے ہی لکھی تھی۔ بیدی نے اس پر غرضانی کرتے ہوئے لکھا کہ کہانی یہاں تک کہ روز نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی آڑی نام ہے۔ ”نئے دیوتا“
 آج بھی کیا غرضی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتنا تو فحاشت حسن (یعنی سعادت حسن کا بدل) پتلی کی لکھنا ہر گاہ تو کچھ
 سرور ہے کے پیاس نے لہری آواز ہی سچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شریعہ ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے، اس
 کے اندلے ترقی پسند ادب میں نمایاں ہنگامہ پاتے رہے ہیں۔ پھر تو کوی اس نے کیسے کہی۔ غریبوں پر ظلم اُٹھاتے جلاتے ہیں زندگی
 کی جنگ کی باقی ہے، سرمایہ دارانہ نظام کمزوری کی طرح برابر اپنا جھگڑتا رہا ہے اور غریب کسان خود آپ سے آپ جلتے ہیں پھٹے
 چلے جاتے ہیں۔ ان خیالات کا لبک آج خود غرضی کی طرح اس جلتے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں بارہا دستوں کو دھوٹ دے رہا ہے۔
 ادویوں شروع کرتے ”نئے دیوتا“ کے لکھنے والوں نے فحاشت حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات و سکنات، ملاقات و طرار
 سنے ہیں، مشروب نوشی، چڑچڑاہٹ، امانیت اور سنگ، پرورش، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے طبیعت پر لے میں مذاق
 اڑایا کہ منظر بھلا اُٹھا۔ بعد میں جیسا کہ اس کی علالت تھی، اس نے خود اپنی سنگ اور سٹیل فن کی کشمیر شروع کر دی۔
 ”نئے دیوتا“ کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلی کے ادبی حلقوں میں ایک شور مچا رہا ہو گیا۔ چونکہ غرضی نے اچھے سے اچھے دوست کی
 عزت کسی بھی وقت اُٹا کر دکھا دیتا تھا اور اپنے سامنے کبھی کسی کو کچھ نہ کہتا تھا اس لیے بارہا دستوں کو چھو تو تھا یا دوست اہباب
 جب اکٹھے ہوتے کسی دھمکی پرانے اس کافی کا یا ستیا راجی کا یا بیدی کا ذکر کے آسے میچ لڑتے۔ منشا اس کافی کا ذکر کرتے ہی کس طرح
 پڑ جاتا دُنیا جہاں کا مذاق اڑاتے ہوئے، مذاق کیجے جانے کی طرح سنا رہا جاتا۔ اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

پنج کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کوشن کے کمرے میں اکٹھے ہوئے تھے۔ جنپ ہو رہی تھی۔ کوشن اپنی کوئی پر سر کھائے
 بیٹا سب کی سن رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر کیے۔ گھٹنوں کو بایا ہوں میں دبا کے آگڑی چٹھا تھا۔ راکھ تھوڑی سا
 دوسرے پروگرام اسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرنا سے کھڑے تھے۔ (آخر ایمان اور میرا جی شاید اس وقت دیڈیوں میں نہیں تھے، یا
 شاید تھے، مجھے یاد نہیں) حنیفہ جاوید نیچے دی پر دیلا سے سر جھٹکے، گھٹنے پر ٹانگ رکھے، ادھر بیٹھے، ادھر بیٹھے خاموشی سے سب
 کچھ سن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں ہلنگ تھی، اس لیے کوئی نے ٹرے سے دیڈیوں کے اونچے جیسٹ پر ٹانگیں نیچے
 کو کھلے بیٹھ گیا تھا۔ تب جلتے کس نے اور جانے کیسے ستیا راجی کی بات چیر رہی اور کہ کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔
 دوسرے نے کاٹا، لیکن نئے دیوتا تو اس نے خوب کافی لکھی ہے۔“

”واہ! کوشن نے سراور دیاں ہاتھ ایک ساتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں منٹو سے پار ہوئیں جو ستیا راجی
 کا نام سنتے ہی چوکا ہو بیٹھا تھا اور کوشن کا اُٹھنا ہوا تھا نیچے اُٹھا اور نگاہیں پھر جھٹک لیں۔

بزرگھوڑی کالی کے لہجہ کے سامنے کتہ پرکتے ہوئے منٹو نے کہا: البتہ سب میں وہی بیٹھا رہنا یا غرضی کی تمہیں ہی نکالنا ہوں تو مجھے یہاں ہر سفر پر ہٹ
 دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔“ (آخر سنگ)

اور تب کسی نے منٹو کو بتا دیا کہ، کیا اسے یاد، ستیا رتی کیا کہا کرو یا انسانہ لکھے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔
 بیدی کی تو نہیں، تیسرے نے کیا لکھا تو ستیا رتی ہی کا ہے، بیدی نے اس میں پتے لگائے ہیں اور کافی دور نقشہ ہرگز نہیں ہے۔
 ہم نے سنا فیض کا بھی ہاتھ ہے.....

اور اس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کیے اور سب کی آنکھوں کو جیسے اپنی آواز کی کڑنگی میں ڈال دیا اور اپنی بڑی بڑی نگاہیں
 جیسے گڑھوں سے نکلتے ہوئے کیا۔ بیدی اور فیض کیا، اس میں تاثر کا ہاتھ ہے، ختم کا ہاتھ ہے۔ منت منٹو مستحیروں اور مومن
 منٹو کا ہاتھ ہے، منٹو اذین انہی غرضیں.....

تب مجھے زہانے کیا منٹو، منٹو کو بات ختم کرنے کا موقع دے بغیر میں نے کہا، اپنے بارے میں یاد سب کو غلط فہمی ہوتی ہے
 وہ خیام حال بھر تھا نہ، گورو کشمال کا ایڈیٹر وہ بھی اپنے آپ کا اسٹیٹیشن سمجھتا تھا.....
 میں نے خیام حال کا ذکر کیا تھا کہ وہ مستوں نے منٹو کا فقرہ لکھا، لیکن اس سے پہلے کہ میں بات کرتا یا فقرہ غامض ہوتا، منٹو
 سمجھتا کہ انھوں نے اسے قصہ سے پاگل ہو کر دو تین غلط فہمیوں کے ڈھیلے میں ہی غلط سمجھ لیا۔

کئی دوسرا موقع ہوتا، منٹو مجھے کالی ریتا تو میرے کایک پتھر اس کے منہ پر جمادیتا لیکن لڑنے کی بجائے مذاق کرتے کالی ریتا کہ اسے
 مذاق مذاق میں جوڑ جاتا ہے، لکھ دیتا ہے، دیا ہوا تھا کہ اسے وہ اس میں پتے جاتا ہے، منٹو نے کالیاں دیں تو وہ کالی ریتا سے نہیں
 پے کرشن نہیں ہوتا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا، کیا کرتے ہوئے دوسرے نے منٹو سے اپنے اور قابل پایا۔ بڑا کریم اور تھا
 اور جیسے سے انگریزی میں کہا ڈو نوٹ مائنڈ ایٹ۔ (DO NOT MIND IT)

اس وقت چاہے منٹو اور وہ کالیاں ہی دے لیا تو شاید میں ہاتھ نہ اٹھاتا لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے، منٹو نے کالی دی
 اور میں ہاتھ اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی منہ کھاتا تو سر جھٹکا ہو جاتی۔

فلستان کے زمانے کی بات ہے۔ آٹھ دن کی شورشنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پٹنٹ طوطا رام کا ایک مزار جیڑا دل
 لے لیا تھا چنانچہ دن کو سٹوڈیو نکالی شفقے اور اشوک کمار نے زبردستی پر وہ کشی لے لی تھی اس لیے آٹھ دن کی بیشتر شورشنگ رات کو ہوتی
 منظر رات کو سوٹ پر آئے گا دہری تھا۔ اس کے اشتغال دوسرے تھے لیکن جب سے میں نے سکرٹم پھیلانے شروع کیا تو وہ ان میں بدل لیا تھا
 اور منٹو کے لکھے مکالموں میں دوبدل کرنے لگا تھا تو منٹو کو بھی سیٹ پر نہ لگا تھا۔ رات کو وہ پایا پایا کرتا تھا اور سیٹ پر آتا ہے
 یہ جو شاق گزرتا تھا۔ لیکن میں ان کے مکالموں کو مسخ نہ کروں، اس بات کا اُسے ٹھیکہ اشوک کی کمائی کے سلسلے میں میرے ساتھ
 اس نے جزا دتی کی تھی، اس سے میں بے حد چڑا ہوا تھا، اور اس کو تنگ کرنے کے وہ بے تھا لیکن میری یہ مارت ہے کہ وہ ان میں بھی
 شاذ ہی غلطی اپنے سر پہا ہوں۔ حیرت اس بات کی کہ شمش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر پہا۔ اس موقع پر بھی میں نے منٹو کو
 اتنا چڑا کر دیا کہ وہ بے اختیار ہر گالی دے بیٹھا، لیکن شمشنے والوں کو غلطی اسی کی معلوم ہوتی۔

آٹھ دن کی شورشنگ کے بعد میں یہ بار مرکز کی گئی چلا گیا تھا اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لیے مجھے اس کا اندازہ نہ

اتنا دوسرے کو دات کی شونگ تھی، شادی کا سیٹ تھا۔ مجھے پنڈت کی حیثیت سے سیر کی شادی کرنا تھی اور میں کہیں دھوئی کے
 ننگے بٹنی پر بیٹھ کر بیٹھے، رام نامی دوپٹے لگے میں ڈانے دھر پر پنڈتوں کی گولی کھائے دیدی پر بیٹھا تھا اور سیر کی ماں سے اس پر پٹ
 لیا دوسرا کر دی تھیں، میرا جھگڑا ہوا تھا اس میں کیس فقہا آگیا۔ تو کیا میں جھگڑا کر رہا ہوں۔ یا شاید یہ فقرہ تھا۔ میں ہرگز جھگڑا
 نہیں کر سکتا۔ بہر حال جھگڑا کرنے کا محاورہ غلو نے استعمال کیا تھا، اشوک ہدایت دے رہے تھے۔ غلو پہنچے ہوئے اور چپ چاپ
 ایک طرف بیٹھا سیس غلو سے مروتے ٹک رہا تھا کہ چانک مجھے شونت سُر جی اور جی بنجید کی ہے کہا۔ میں یہ ڈانٹا کہ میں بول سکتا۔
 ”کیوں؟“ اشوک نے پوچھا۔

”جھگڑا کرنا ہنسنا بھرا شید ہے۔ دیدی پر بیٹھا ہوں، دوسروں کا کوٹا، دھرم پرانی برہمن ایسا دیکر کسی نہیں بول سکتا۔
 ”لیکن یہ تو محاورہ ہے۔“ غلو ٹھٹھکا کر اٹھا۔

بست سے ایسے محاورے ہیں جو رٹے سمی خیز ہیں، لیکن شریف لوگ نہیں بولتے، اسی طرح دیدی پر بیٹھا ہوا پنڈت
 یہ ہنسنا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا۔ میں بولا۔

”لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھی نہیں؟“

”جھگڑا کیا ہے، پھیلنے۔ جھگڑا، پھیلنا، اڑنا۔ مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہے، لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں
 بول سکتا۔“

”جنگال کے پنڈت پھیل مارتے ہی نہیں، لکھتے ہی ہیں۔“

”لیکن پنڈت طوطا رام جنگالی نہیں، نہ یہ کافی جنگلیوں کی ہے۔“

”تم کب کس کرتے ہو۔“ غلو جھٹکا اٹھا۔ تمہیں یہ فقرہ بولنا ہو گا۔“

”میں نہیں بول سکتا۔ میں دیدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔“

”میں بھی برہمن ہوں۔“ غلو گر جا۔

”برہمن تمہارے اجداد ہوں۔ اس وقت تو تم یہاں جھگڑا کر رہے ہو۔“

اور غلو نے بے اختیار ہرگز غلو سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ وہ حقیقت دل میں مجھے اُس وقت بھی
 ہنسی آ رہی تھی، لیکن اوپر سے میں بے حد سنجیدہ بننا ہوا تھا اس بات پر غور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرانی پنڈت
 دیدی پر بیٹھ کر ایسا محاورہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت پُر تھکا لیکن جو لوگ نلی ڈنسا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے پُر اعتراض
 وہاں سیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں میں جانتا ہوں کہ اعتراض پُر ہے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں، اس سوال نے اُسے
 ایک دم ذہنی حصار کر دیا، نلی ڈنسا کے نہایت ڈر پرک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ناسک وہاں صورت کرتا ہے۔ دھانک دھانک
 صورتوں کے باوجود آئے دن محاورے ہر تے ہیں نظم نفل ہوتے ہیں اچھا ناسخوارہ اُٹھاتے ہیں، میری بات اشوک اور دوا چاکو

ٹھیک ٹکی غٹو نے گالی دی تو میرا لہجہ اور بھی بھاری ہو گیا اور چونکہ میں بعض مذاق نہ کر دیتا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لیے میں نے کہا کہ کیونکہ منظرہ نہیں پہلو اب نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلو اب نہیں ہو اور تم نے سب کچھ کھوئے تو میں تمہیں اٹھا کر سٹو دیو کے باہر چھینک دوں گا۔

معاذ نے کہہ دیا رنج اختیار کیا کہ اسٹوک کھڑا گئے۔ شوشک رک گئی، انہیں نکر مونی کریم دونوں اٹسے رہے تو شوشک نہ ہو سکے گی اور چارچہ بزدلی کو ڈر چڑھا سکے گی۔ وہ منظر کو باہر لے گئے راشا شاید مجھے لے گئے۔ یہ مجھے یاد نہیں، لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منظر نے میرے ہاتھ کو بہت سے دہلتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، کھڑا گیا، کچھ کھلی دورات کو سیٹ پر نہیں آیا۔ میں نے مکالمے ہی نہیں، منظر تک بدل ڈالے لیکن پھر اس نے میرا راستہ نہیں کاٹا۔

منظر کو گالی دینے کا سبب شوق تھا اس بات کی کہ اس نے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدمی غلط کھلی دے اسلئے والے تو کہا ہی رہتا تھا، لیکن کرشن کبھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا منظر مجھے ہی گالی دیتا تھا جبکہ وہ موصوں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے اور مجھے گالی دی۔ ان دنوں ہم میں تناؤ نسبت کم تھا۔ کبھی نے اسٹوک اور غٹو دونوں کو رک دینے کے لیے منظر کو کچھ مڑا دیا تھا اور اٹھ دن کے لیے اس کا ایک گیسٹ منظر کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی، لیکن غٹو، منظر کو لاواں آنا پسند کرتا تھا، اس لیے وہ ایک گیسٹ مجھ سے کھسکا رہا تھا، ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے، کریڈیٹریاں پڑھتے ہوئے غٹو نے اچانک مجھے ہٹا دیا تو میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد مرحوم نت نئی گالیاں تصنیف کرنے میں لگتا تھے۔ یوں ہی جالندھر گلی خیر خٹہ جس وقت جب تھے ہیں تو بڑی بھاری جھرمک گالیاں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے بھی طرح یاد ہے۔ میں عیش شرم لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا، ماں اپنے سینئر ایڈیٹر جناب ساگر چند گورکھا کے ساتھ دو بعد میں روزنامہ پر تاپ کھڑا ہیز نکال کر حیثیت سے بہت مشہور ہوتے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں کنٹائی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور بڑے سڈو بہا رہا تھا کہ سانس سے میرا دل لپکے گا دوست کونٹ سٹو آجوا دکھائی دیا۔ دور ہی سے اس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا حال پال رہا تھا اور میں اس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اس سے بغلیکے ہو گیا آج یہ بات کچھ خواب کی سی معلوم ہوتی ہے، اور حالانکہ میری بھویا پ بھی مجھے خاصا غیر مذبذب سمجھتی ہے، لیکن جالندھر سے لاہور آنے والے اسے شک تھا اور لاہور کے اسٹاکس میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اگر کھانا صاحب چیراں دھندلے رکھنے دیکھتے رہے۔ جس میں میں نے انہیں سمجایا کہ وہ میرا منظر لٹا دیتا تھا اور جان و سر کے منظر ٹیپے دیوں میں خیر مقدم کی یہ پڑائی رہم ہے..... کاشی منظر میں ایسا بارانہ ہوتا اور ہم دونوں نے ٹکٹکی سے ایک دوسرے کو گالیاں دے سکتے۔ لیکن دفتر کی بیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی، اس میں بے تکلفی نہ تھی، یہ بارانہ تھا، سر پرستی کا خیر جہم سا ہیز بہ تھا مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی نہ دہشتی سے سن لی تو مجھ کو بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے

بامش میں گالی دے نہ سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا: ”دیکھو غلطی تم امت سر کے ہوتو میں جاننا نہ کر سکیں، میں گالیاں دوں گا تو تم باری طبیعت صاف ہو جائے گی۔ دوبارہ تم مجھے کبھی مت کافی دینا۔“
 اور منٹو نے مجھے کچھ کچھ گالی زدوی ناس کی بے پروا جھجھلاہٹ میری کپال کر یا کرنے کی خواہش میں منور ظاہر ہوئی لیکن گالی دو مجھے نہ دے سکا۔

غرض جب گالی دینے پر معافی مانگ لیتا تھا، اتنا مادہ اُس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم اڑتے رہے۔ میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم اڑنے پر مجبور رہے۔ لڑکپن برابر مل کے بیٹھتے ہی تو ایک دوسرے سے نفرت اُٹا، ایک دوسرے کے منہ پر کالٹ کر کشت دینے والے مردوں کی طرح!

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی، ہر دہائی بات نہیں لیکن جلد ہی آنا یا اسیان کھل کر ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تیار ہوا، غٹھنے ملنے کی کوشش کی تو میں تنہا۔ ٹھیک سنی یا نہیں، لیکن کوشش کھنڈر بنا چکا تھا۔ ماڈرن پروگرام ڈاکٹر کشکی کو کسی پر جا رہا ہے تھے، چوڑا صاحب کو بھی غٹھنے بھانسا نہیں تھا، منٹو کو کئی اہستہ کا ساتھ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا، دینے بل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کافی ڈراما یا کہانی کھڑا تھا۔ کوشلیا اندر باہر جی غٹھنے میں کھائے پکائے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر طرک پر سے سخت آواز آئی — ”اشک!“
 ”منٹو! — مجھے خیال آیا — اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ اگر میں اس کے گھر (حسن بلا نگر، کٹھیری گیٹ) میں تین بار بار گیا تھا، لیکن وہ گزشتہ ڈھائی برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا۔ مگر میں تیس چوڑی میں بیٹھ کر کے منٹو کے ساتھ رہتا تھا اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ میرے ہاں تو ٹھہر رہا، وہ کبھی کوشش چند کے ہاں بھی نہ آتا تھا، جو میرے نزدیک رہی رہتے تھے۔ (میرے قلم سے پہلے آیا ہوا تو میں نہیں جانتا،

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ نہ اٹھ کر دوازہ کھولا، کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوئی لیکن یقیناً نہ آیا کہ منٹو ہے۔

”اشک! اگر میری کوشش دیکھی، تو دوسرے چڑچڑی آواز۔“

میں نے اٹھ کر دوازہ کھولا۔ منٹو، صفیہ جانی اور اُن کے ساتھ ایک گورا چٹا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور جیسے ناک نقشے والا نوجوان — تینوں اُٹھائے۔

منٹو نے تعارف کرایا۔ یہ مسعود پرویز ہے، میرزا شہباز میرا دوست، منٹو نے کیا کہا، مجھے یاد نہیں، تم سے ملنا چاہتا تھا۔
 میں نے کہا چلو ملا لیں۔“

میرے پاس اُس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک کٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منو ہر لال بھار گورنمنٹ کالجنز میں لے کمال ہر بانی کے ہم جیسے غریب اوطاقوں کے لیے بارہا کون جیسے ۶۰ کو اڑنا رکھے تھے جس وقت کا ذکر ہے، ارشد ایک نرس ہیں

تیس فرس اور کرنی بلایا خبر کے کدڑ میں رہتے تھے۔ ایک کدو کو لے کر ایک بیٹھے کا تھا۔ بیٹھے کے کدو سے اس نے ایک کڑی بیز کام کرنے کے لیے دیکھ چھوڑی اور بیٹھے کے لیے ایک دوی اور جامع فرش پر بچھا کر رکھی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا: بیٹھو بیٹھو اور کوشیا کو آواز دی کہ دیکھو غنہ اور سفید بھائی آئے ہیں۔ غنہ اور پر توڑ بیٹھ گئے، سفید بھائی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اُس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا جب تک سفید کوشیا کے ساتھ جینک میں نہیں آئیں۔

مجھے اس پیشک کی کوئی بات یاد نہیں۔ بس اس کے کسمو پور کی انگلیوں بڑی خوبصورت تھیں، اُس کا نام نقشہ بھیدو کھن تھا اور میں نے کئی بار زبردہ لگا ہوں سے اُس کی طرف دیکھا تھا اور مر خیال تھا کہ وہ یقیناً غلی و نیاس میں ہر دو کیفیت سے مشور ہو گا۔ شاید وہ اُس وقت کسی غم کمینہ میں لوڑ تھا یا جلفی کی کوشش کر رہا تھا، غنہ اور دھڑکی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تھلا تھلا رہا۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا۔ پورے پچیس پوچھا کہ اس نے کوشی بڑی چیز پڑھی ہے، وہ کب دہلی آیا ہے، کیا کر رہا ہے، کب تک رہے گا؟ بات چیت کو میں نے ذاتی پانچ نہیں دیا، غنہ کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا، بلکہ جب کوشیا کئی قرآن لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا عالم کر رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا، جب میں نشان کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہاں تک کہ اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پروردگار سے ملنا چاہتا تھا اور مٹھاپے شام کے شعلے سے نوشی کو چھوڑ کر اسے عجیبے طالعے پہلا دیا تھا۔ سفید بھائی کوشیا سے ملنا چاہتی ہوں گی، یہ بات میری سمجھ میں آسکتی تھی، سفید کوشیا کو چاہتی تھیں اور کوشیا بھی سفید اور خندوں کی عزت کرتی تھی لیکن غنہ نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاتھ نے کدو کا بھانڈا اُس نے بنایا، اُس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹ کے اس طرح آئے میں، اُس کدو کا اس طرح آواز دینے میں میرے ہاتھ بیٹھے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاتھ آکر وہ مجھ کو کئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ باتوں میں اُس نے بتا بھی دیا کہ وہ اس ٹوٹر برس میں کرشن کے گھر بھی گئی نہیں، زیادہ مجھے اُس کا انداز کسل گیا تھا۔

غلو کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دل پر بادی رہی۔ میں چٹکوا آئی خوں، غنہ بھی آدل درجے کا چٹکدر ہے، لیکن ایک دوسرے کی ہر جگہ کی جانے باری امانیت کے کن تادوں کو چھوڑ دیتی تھی کہ وہ بے ساختہ تہی جلتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کسی پریشانی کھنے کا بہانہ کر رہا تھا، اوپاس ہی دہی پر بیٹھے غنہ اور مستور، سفید بھائی اور کوشیا باتیں کر رہی تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا، جب وہ میرے گھومتے ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ کرنا چاہیے اور چونکہ میں منٹ کے لئے کامیاب مقصد جانتا تھا جیسے اُس نے احساس برتری کے زیر اثر بار کھا تھا، اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ بلا سادہ کام کا بندہ غنہ کو اپنی بندوں سے فائدہ نہ اُترتے دیکھ کر میرے دل میں غم پیدا ہوا، لیکن اُن بندوں سے اُس کا تار لانے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوئی۔

غنہ میرے گھر کی نڈیا۔ دہلی کی انیس بیسی میں بھی نہیں اور اُس نے دہلی چھوڑنا منظور کر لیا لیکن دہلی میں بھی اُن کے غم سے غم

آپ جیسے بڑے انسانہ نگار سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ سب کا جواب آیا، مگر منٹو صاحب کا جواب نہ آیا۔ میں اس بات کو جھٹلایا ہی گئی۔ کچھ روز بعد ایک صاحب نے مجھ سے نہایت بے غلے جہانہ انداز سے سوال فرمایا: آپ نے منٹو کو ملنے کے لیے نہیں نکھا ہے۔ "ان کا جو کچھ اس قدر تیسرا افغانی نہیں مسم کا تھا کہ میرے منہ سے بلا ارادہ نہیں" ٹپک پڑا۔ اپنے مخصوص قسم کے چارہ وادری مائل سے باہر آکر کھلی ہوا تک اپنے اوپر حملہ آور میں گئی تھی۔ میں نہیں پریشانی رہی۔ دہائی منٹو نے قندیلوں پاک کیا کہ میں نے خط اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں اس بات پر بہت چڑچڑائی کہ منٹو صاحب بھی کیسے عجیب آدمی ہیں۔ آخر بڑے آدمیوں سے ملنے والوں کو ہوتا ہی ہے۔ اس میں مجب بات یہ کہ میں جہاں انھوں نے سب سے تذکرہ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد منٹو صاحب سے نہ تقریری ملاقات ہوئی نہ خط و کتابت۔ ادواب، اکوہ جم میں نہیں رہے تو ان کی یہ بات بھی بڑی ہی معلوم ہوتی ہے۔ لاہور آکر میں نے کئی بار انھیں دُور سے دیکھا، مختلف ادبی مجلسوں میں، وہ ہمیشہ اتنے زور و خروش سے کہے ساتھ ان کی زندگی کی ڈھانچا پڑتی۔ بڑی بڑی بیچیں آنکھیں اور بھروسے کے درمیان سٹوٹس جیسے ان کی نظریہ ایسی چیز کی تلاش میں ہوں جسے اور کوئی نہ دیکھ سکے۔ ایک دن وہ ایک ادبی مجلس میں جہاں منٹو صاحب کے فنی کے بارے میں ایک صاحب مضمون پڑھ رہے تھے۔ مجھے کئی صدارت یا صبح الفاظ میں کئی حماقت پر ہنستا پڑا یہ شرف خود اپنی جگہ اجم جیسے پھل تھپتھپ میں چھپ کر بیٹھنے والوں کے لیے بے حد اذیت بخش ہوتا ہے، اس پر وہاں کا فاقی کا احوال اور سب سے بڑا منٹو صاحب کی موجودگی۔ میں نے بہت لوگوں سے سن رکھا تھا کہ منٹو صاحب اپنے فنی پر کسی قسم کی تنقید نہیں کر سکتے۔ اور وہاں تنقید ہی ہو رہی تھی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر اتنا ہی حیرت ہوئی کہ منٹو صاحب تنقید پر تنقید کے دوران میں ایک غلط ٹپک نہ بولے۔ وہ یز پر کنیاں رکھے اپنے چہرے کو زرد باتوں میں لیے بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر بڑی اذیت تھی۔ اور ہر نے دے دے کی عزت ان کی بیچیں آنکھیں یوں جھپٹیں جیسے کچھ پانا چاہتی ہوں۔ لیکن جب بات ختم ہوئی تو یوں ہنستیں جیسے وہاں اپنے مطلب کی بات نہ پائی ہو۔ اس دن منٹو کے اکٹھے بہت سے نقاد کچھ کہے ہیں تھے بھی نہیں اور منٹو صاحب کا چہرہ اس کا شاہد تھا۔ منٹو صاحب کی اس دن کی مضطرب خاموشی سبھی کے لیے حیرت انگیز تھی۔ منٹو صاحب ضبط بھی کر سکتے ہیں، یہ بڑی عجیب بات تھی۔

آخری بار میں نے انھیں ترقی پسند منتقدین کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ جس وقت اپنی بوری صفیہ کے ساتھ آئے، تو کسی مضمون پر تنقید ہو رہی تھی۔ سخت لگی کا زمانہ تھا۔ اور ذرا سے گھٹے ہوئے کمرے میں بغیر کچھ کے بہت سے لوگ چند سو قیروں کی روشنی میں بیٹھے تھے۔ منٹو صاحب آتے ہی اپنے مخصوص انداز سے آستینیں چڑھا کر ادایک پاؤں تھپتھپ کر دھڑکے اور تنقید میں حصہ لینے لگے۔ ان کی حالت بہت خراب تھی۔ بے حد زور واد بول رہے تھے۔ صفیہ کے قریب بیٹھے بیٹھے، مجھے ادیب منٹو کے بجائے موت صفیہ کے شور و سعاد حسن کا خیال آنے لگا۔ صفیہ ان کی صحت کے بارے میں سخت فکر مند تھیں اور بڑی ایوس تھیں۔ لیکن آج جبکہ منٹو صاحب اپنے انسانوں کی طرح اپنا ایک موت کی دوا میں جا کر ختم ہو گئے ہیں تو میں سوچتی ہوں، اب صفیہ کی ایک نگر موت لے لوٹ لی، تو وہ اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ

تہائی میں بیڑ کھینچی ڈھیر سی ٹکڑوں میں تقلا دیتی ہوں گی — غٹو صاحب کے مداحوں کو یہ بات بھی ضرور سوچنا چاہیے۔
مگر سے غٹو صاحب پر مضمون لکھنے کو کہا گیا ہے — مگر ذاتی طور پر اس سے برا اتفاقا سلسلہ رہا ہے۔ میں ابھی تک کسی
کچھ بنا رہی تھی۔ ان کی ذات کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے۔ لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق غٹو صاحب کو دیکھتے اور بھر کتے
— ان باتوں میں خود غٹو صاحب کس حد تک ہوتے تھے میں کیا سمجھ سکتی ہوں — اس لیے ان کی ذات کا مطالعہ
بلکہ چھوڑتی ہوں۔

اب رہا غٹو صاحب کا فن اگر اس کا تجزیہ ہی درکار ہو تو اس میں خدمت کے لیے باقاعدہ نقادوں کی کمی نہیں کہ وہ
وہی لوگ فنی اصطلاحیں برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں سید سے سادے انداز سے لکھی جوتی بات کا شمار تنقید میں تو ہوتا نہیں۔ اس لیے
غٹو صاحب کے فن پر اگر کسی کچھ کہوں تو اس کی وقعت ہی کیا ہو سکتی ہے! غٹو صاحب کے فن پر لکھنے کا بلکہ ناگرمیوں و حوصلوں میں
نئی نئی چند افسانے لکھے ہیں تو یہ قطعی ضروری نہیں کہ جس نے افسانے لکھے ہوں وہ غٹو کے فن پر کوئی عالمانہ رائے بھی دے سکے —
ہاں فنی و عملی دوسری چیز ہے۔ اور میں چند سطروں میں اس رد عمل کو بیان کر کے کی کوشش کروں گی۔ جو غٹو صاحب کے افسانوں سے
میں نے قبول کیا۔

غٹو صاحب حدودِ مرقہ شدیدا افسانہ نگار تھے۔ اگر افسانہ نگاروں کا ان کے فن کے بغیر شریعتیں، شریعتیں اور طبعیت افسانہ نگار
کہنے کی جرات ہو تو غٹو صاحب کو شاید افسانہ نگار کہوں گی۔ غٹو صاحب اپنے دور کے بہت بڑے حقیقت پسند تھے اور ہر اس چیز
کو شدت سے محسوس کرتے تھے جو انہیں کھلتی تھی۔ اور اسی شدت سے اکثر چیزوں کو نظر انداز بھی کر دیتے تھے۔ دیشم کی لمبوں میں اگر
سوٹ کا ایک ننھا سا، لالہ بی نظیر تانا تو وہ اس کے گرد اپنے دو اہل لالہ ایسا جال بنا کرتے تھے کہ ان کی کڑت کی تڑی اور انفاست
— ایک اور افسانہ نگاری کے بہت کم استاد پہنچ سکتے ہیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ غٹو صاحب موضوع کے انتخاب میں تو اتنے شدت پسند تھے مگر موضوع کو اعلیٰ درجہ میں منتقل کرتے
وقت حد درجہ کے باشعور اور متوازن فن کار بن جاتے تھے۔ غٹو افسانہ نگاری کی تکنیک کی پوری تکمیل اور احتیاط سے برتنے کے فن میں
اگر خود کا کوئی دوسرا افسانہ نگار غٹو کے مقابل لایا جاسکتا ہے تو وہ چند دستگیر ہو جائیں۔

غٹو صاحب بے سوچری افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کسی قسم کی مخالفت سے کبھی شکست نہ کھائی، انھوں نے حکومت کی مخالفت
کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے مخالفت پر ہنسنے سے شرم نہیں لیا، اور یوں کی مخالفت پر حقارت بھری نظروں سے معاشرت کے تنہیکہ داروں اور انفاق
کے اجداد داروں کی مخالفت کو شکر ادا کیا اور زندگی کے کسی لمحہ میں کسی سے ہار نہ مانی — یہ خدا، یہ پتھر، یہ کٹر قسم کا نقطہ نظر، فن کار
کو نقصان بھی پہنچاتا ہے کہ وہ غٹو صاحب کی بنیاد پر متنی پر نہیں ہوتی۔ بعض اوقات غٹو بھی نکتہ چینی کی بنیاد پر تھا ہے اور اس قسم
کی نکتہ چینی میں فن کار کے اپنے کام کی چیز بھی نکل آتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ ہر مخالفت کو شکر ادا کر دیا جس پر بدلے
پر مجبور کرنے کے لیے کسی شخصیت کو اپنے اوپر گرد ایک حصار بنا لیا کرتا ہے۔ اور یہ حصار نہ صرف مخالفت کا شکر پھیر دیتا ہے بلکہ اس کا
مشادات اور مصراوات کو بھی محصور کر کے غنڈہائی تازہ ہوا سے محروم کر دیتا ہے — لیکن اگر یہ حصار انھیں اس لیے بنایا گیا ہو

کوئی "لو کہیں اس سے کمتر" ہے کاغذی مجوس نہ کہ ڈالے کی اس قلعہ بندی کا جو ازبیا ہو جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ غٹو صاحب کی انکی خدو ٹری حد تک اسی زمرے میں آتی ہے۔ انھوں نے معاشرت کے چہرے پر داغ دیکھ لیے تھے۔ اور اس لیے وہ معاشرت کے حسی پر ایمان لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کو کھٹلانے سے انکار کرتے تھے اور اخلاق کی اس انوکھی قدر کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے تھے کہ وہ ان کو نظر انداز کر کے معاشرت کے نفس کا قصیدہ کہیں۔ یا پھر وہ ان کو بھی لوہا نہ تھیں حسی قرار دو۔ یہ درست ہے کہ غٹو صاحب آنے والی کیفیتوں سے کچیا کر بلکے مستحکم مزاج بن گئے تھے۔ اس لیے وہ معاشرت اور اخلاق کے انی مشاہدات کا مذاق اڑانے کے لیے شدت پر بھی اترتے تھے۔ لیکن اس انتہا پسندی میں بھی ثنوت کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ البتہ شدت ضرور موجود ہے۔ اور فن میں شدت کوئی عزم نہیں۔ بعض رنگوں کو گلوکار نا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ زندگی کا کوئی بھی رخ سپاٹ نہیں جڑوگا۔ بلکہ غریبہ رنگوں کو فن کا داغ قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی دراصل رنگ کے ہلکے پرن کو بالی سطر گلوکار کہتے ہیں۔

غٹو صاحب سے پہلے بھی طوائف اور بگڑی ہوئی لڑکیاں اور ان کے دلال، اور ادیب ہیں کہیں کہیں غلطوتے ہیں۔ لیکن ان میں (اور اوجان آدا کو الگ رکھنے کے بعد) بہت کم اصلی شعریں تھیں۔ طوائف یا تو نہایت فقر و غصے یا محض سماج کا کوٹھڑا۔ جی پراسب قہقہوں کے آگے بڑھ جاتے۔ دلال بھی جھلک دکھا جاتے، مگر صوف اپنے لباس کی۔ غٹو صاحب کا سیکے بڑا مزہ دینے والا کا زامریہ ہے کہ انھوں نے اور ادیب میں پہلی بار تنیدگی سے، اس کو سے بڑے جتنے کا کٹھن ہونے دیا۔ اور فنی صارف کرنے کے بجائے، اس طبقے کے ساتھ ساتھ نظر آئے۔ وہ قہقہہ ہر تہا ہے جو کچھ ہے، جیسا کچھ ہے اسے نیز لیاں چند نے ٹانگے سامنے لکھ دیتے تھے۔ اور پھر ٹپھنے والے کو اجازت تھی، اور مردانے چاہے تا دم کرے، جو علاج مناسب سمجھے کرے غٹو صاحب کی طوائفیں، بگڑی ہوئی لڑکیاں اور دلال، بدعاش، خنڈے، ہمارے سامنے اپنے حقیقی رنگ میں آتے ہیں۔ اور ہم آسانی سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ بھی انسان ہیں۔ ہماری ہی طرح ان کے بھی طبیعت انسانی احساسات ہیں۔ انھیں بھی دکھ پہنچتے ہیں، ان کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ یہ جنت بھی کر سکتے ہیں اور قربانی بھی دے سکتے ہیں۔ بے روزگاری کا زخم یہ بھی کھلتے ہیں، اور دوسروں کے دھن بھی بگڑ جاتا ہے اور وہ گارہی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکا کہ غٹو صاحب نے ان کو سے بڑے رنگوں کو پہلی بار اور ادیب میں پوری پوری آباد کیا کے ساتھ پیش کیا۔ اسی سلسلے میں غٹو صاحب پر انام رکھا جاتا ہے کہ وہ قربانی پر اترتے تھے۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ قربانی کیا ہے اور کیا نہیں، البتہ تا ضرور کہیں گی کہ آرٹ اور ادیب کے بڑے بڑے شاعرانوں پر بھی یہ انام عاید ہوتا ہے۔ مگر عقد کوئی اتنا تباہ نہ کیا قربانی میں ایک دلکش، ایک بے داغ سی مصورت، ایک رنگ، ایک رنگ، ایک سانپیں ہوتا جو جھلکتی اور فیصل انسانی کی بقا کے عقد میں تسلسل کو تا دم رکھنے کے لیے غفلت کی طوط سے وادیت کیا گیا ہے۔ اب یہ تو محض ضد کی بات ہے کہ کوئی عزم یا عزم دس لوگوں کے ہاں باپ ہی کر بھی لذتیت اور قربانی کے نام سے جھکیں اور اپنے جگر گوشوں کو بخلی جذبات یا کسی قسم کے دوسرے نفس الفدا کا بھجوا دیں۔ گر یہ بحث بھی غٹو صاحب کے مخصوص فن رنگ سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی، کیونکہ غٹو صاحب کو میں جس قدر پڑھ سکی ہوں، دیکھ کر چھوڑ دوں گا۔ اس میں خصوصاً طوائف سے متعلق انسانوں میں، ان کتاب لذت و یا ویسا ہی بننے کی کسا ہٹ کہیں نہیں پائی۔ اب بعداً جنگ کی بروہی کی کر دیکھو۔ مجھے اپنے خلیفہ مبشر پر کوئی ہرئی پڑی ہے۔

ایک گردہ کے گرد رکھے ہوئے غنم نے اس عام انداز کے لیے چاند کے گرد ہائے کی خوبصورت تشبیہ لکھ کر ساری عورتوں کو روں بغیر آئینے کے کپڑے پہن کر سوسکی ترفیض نہیں دی۔ بلکہ تشبیہ دی جس میں تو غنموں کی کمال کے متعلق پر بھی مرنے کی گھناؤنی کمال کی — خدا جانے وہ کس دل گردے کے بزرگ ہیں جنہیں پر بھی مرنے کی کمال دیکھ کر لذت کا دورہ پڑ سکتا ہے — یہاں کاغذ کی طرح سفید، زخا کی شکار، بڑی بڑی کھوئی ہوئی آنکھوں والی سراج کو دیکھیے جو وہاں بیات سے وہ بیات منہ منسی ہو کر توں پر اور پھر بے جان ہو جاتی ہے۔ اور اپنے آپ کو کہنے کے لائق بنانے کے لیے جس دل سحریت کے دم لگاتی ہے — کیا کسی کو یہ انداز آگے بڑھنے کی اجازت دے سکتی ہے — میں نے تو جہاں تک غنم صاحب کے شہور و معروف نثریوں کو دواوں کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی بھی نارمل انسان انھیں پڑھ کر لذت حاصل نہیں کر سکتا بلکہ منسی فعل کے خلافت ایک شدید قسم کی نفرت پیدا ہوتی ہے جو ایک سادہ انسان کے لیے ایک مسئلہ بن سکتی ہے — جس کے خلافت یہ نفرت، اس لیے بھی پیدا ہوئی ہے کہ غنم صاحب ان ایض میں ڈوبے ہوئے کرداروں، پر تشبیہوں اور متعادلوں کا رنگ و روغن نہیں پرتے — یہ سب پت لٹو صاحب کی غنم کے خلافت تھی، اس لیے وہ انہی سپاہی سے ان کی تصویر آرتے کہ وہ مجڑبی ہوئی تصویریں بھی نہیں بلکہ ایسے ڈوٹو بن جاتیں — اس کے ڈوٹو ڈاکٹر حضرت غور سے کہیں تو دیکھیں ان سے لذت اٹھانا عام تو نہیں کا کام نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد غنم صاحب نے اقتصادی اعتبار سے اپنے بدترین دن گزارے۔ یہ عمر یہ زمانہ غنم صاحب کی فنی زندگی اور ہونے والی جنگی کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن انھوں نے کسی ذلت سے ان اقتصادی پریشانیوں نے ان سے ایک ایک دن میں تین تین افسانے لکھوائے — ہمارے مغرب زدہ نقاد جو اپنے ملک کی ہر چیز کو حقیر گردانے کے علوی ہیں، وہاں تین تو کر کیا پورپ اور امریکہ کے ادیبوں نے پچھتر روپے کمانے کے لیے ایک دن میں تین تین افسانے لکھے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہاں کے معمولی سے معمولی ادیب کی ایک کتاب بازاریں آجائے تو وہ بڑی شان سے سال دو سال کچھ لکھ کر، صرف سوچ کر گزارہ کر سکتا ہے — غنم صاحب نے تقسیم سے قبل اپنے اس قلم کے جو تہ پرستوں کو گارے تھے، اور پاکستان آکر بھی وہ انہی جیروں اور جتروں کا سپارہ زندگی قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے — مگر ہمارے ملک میں صرف قلم ذریعہ آمدنی نہیں بن سکتا یہی وجہ ہے کہ چند دہائیوں کی خاطر نہایت گھٹیا قسم کے رسائل میں لکھتے رہے۔ غنم صاحب کو اس زمانے میں کثرت سے لکھنا پڑا۔ اکثر شہر و شہر پر شاید، وہ بیانی کے دوران قیام میں بھی قلم نہ اٹھاتے۔ یا اگر اٹھاتے تو دوسرے انداز سے — مگر وہ ہرگز خود ریات زندگی کی طلب نے ان سے بھی کچھ لکھوا دیا — بہت سے افسانے جو لکھے گئے انھیں بہتر حالات میں شاید قصور اور سوچ کر لکھا جاتا — مگر ان تمام پریشانیوں کے باوجود غنم صاحب کی عظمت سے کوئی منکر ہو گا کہ وہ دانت چکے نہیں ایک وہاں ہی آدیتوں کے دور میں چچا سام کے ایک ناکہ سے نے ان سے تین سو روپے فی افسانہ طے کر لیا، مگر غنم صاحب کی دگ طنز و طعنے اور انھوں نے تین سو روپے (کل) ادب پرانی افسانہ کے بجائے (غالباً) پچیس تیس (دلی)، روپے فی خط کے حساب سے چچا سام کے نام خطوط لکھ ڈالے — غنم صاحب کہیں تک نہ سکے اور نہ ہی کوئی انھیں لکھنے بندوں اپنے حق میں استعمال کر سکا — وہ طبیعت کے گھر سے تھے۔ اس لیے کسی قسم کی پابندی انھیں گوارا نہ تھی۔

آج غمناک صاحب ہم میں نہیں، وہ اپنی انٹس پہاڑی کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن ان کا فن، اسلوب میں ناقابل فرہوش کلانے کی طرح دکھاتا رہے گا۔ غمناک صاحب کے فن اور موضوع پر سینکڑوں اعتراض بھی ہو سکتے ہیں مگر غمناک صاحب کی ایک خصوصیت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا اور وہ خصوصیت تھی، انسانیت دوستی اور زندگی کو صاف دہرے دارغ دیکھنے کا جذبہ جو ان کے فن کا مجموعی تاثر ہے۔ بہت ملکی ہے کہ آپ کو بڑے بارک جیز معلوم ہو، لیکن کیا تاریخ کے دل میں بڑی گھاٹی کے لیے یہ گہری نہیں تھی؟ انسانی سہیل اور گندی ساری بھی ایک جیسی بہت سی کے شکار اور جہان کے لیے باعث کشش ہوتے۔ کیا غمناک صاحب کوئی شخص نفرت کر سکتا ہے۔ کیا سرگندوں کے پیچھے بگنے والی جھولی بھالی لڑکی سے آپ کو محبت نہیں ہو جاتی جیسے ہی نہیں معلوم کہ وہ گناہ کرتی ہے۔ یہ جھڑپی اور انسانیت دوستی کی ہمراہ ایک دو انسانوں تک محدود نہیں بلکہ ان کے زیادہ تمام انسانوں میں محدود ہے۔

یہ انسانیت دوستی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ اور مختلف انسانوں میں نظر آ سکتی ہے۔ اس کے لیے کوئی سا پتھر مقرر نہیں۔ کہ یہاں غالب کو رکھو، یہاں پریم چند کو، یہاں مسعود حسن منٹو نہیں سا سکتے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس انسانیت دوستی پر کوئی سی مہر ثبت ہے۔ دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت دوستی ہے۔ بگیت نہیں انسانیت سے نفرت نہیں، انسان کو فطری اور حیوانی طور سے کیڑا اور ذلیل قرار دینے کی عادت نہیں۔ یہاں پریم چند جی جی، انجیلا اور ایلس نہیں بلکہ یہاں تو یہ جذبہ کارفرما ہے کہ انسان کی ہی بیماری مخلوق ہے۔ یہ طوائف کے بار بار ہیں انکی انسان ہی رہتی ہے۔ انکس کے معاشقہ زخم مندمل ہو جائیں جن کی طرف فن کار اشارہ کر رہا ہے تو یہ دنیا کتنی پیاری اور یہ زندگی کتنی لطیف ہو جائے اور غمناک صاحب کا مجموعی تاثر یہی جیتی جاگتی انسانیت دوستی ہے۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ذرا اتنا سوچیے کہ مسعود حسن منٹو اگر بہتر دنیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کے موضوعات کیا ہوتے۔ اور ان کا جامہ از قلم کیا کیا ہوتا نہ بکھیرتا۔

باجبرہ مسرور

رحمدل دہشت پسند

آبادی کی تقریباً سید پرامتر میں جب پہلا فساد برپا تو میں لاہور میں تھا۔ سعادت بھٹی میں غلاموں نے آزادی کی غرض میں اپنے ہمسایوں کے گھروں کو آگ لگا لگا کر چراغاں کیا۔ اور اس اعلان سے قبل کہ امرتسر کا کشتان میں شامل ہو گیا۔ ہندوستان میں آدھا شہر بجے کا ڈبیر ہو گیا۔ اس جتنی کے نامک کا جب پہلا سینچم برپا تو میری چوری نے کہا کہ باؤ اور جو کچھ دے سکتے ہو آؤ۔ لیکن جب میں امرتسر پہنچا تو میرے عزیزوں نے مجھے پوک فریڈ میں ہی روک دیا یہ مسلمانوں کا پوک تھا اور میرا گھر ہندوؤں کے علاقے میں تھا۔ مجھ سے کہا گیا۔ "وہاں جانا خطرناک ہے۔" اغلب یہی ہے کہ تم رہتے ہو میں دھرمیے جاؤ گے۔ ہاں اگر مسلم لیگ کی دہری آگنی ترشاید کچھ ادھر جانے کا بندوبست ہو سکے۔ لیکن مسلم لیگ کی دہری نہ آئی میں نے اپنے عزیزوں سے پوچھا "کیا کٹر دھرمی مل سکتا ہے جس کا شہادے شیر فروش کی دکان تک باؤں کے آگے ہندوؤں کا راج تھا میں نے یقین دلایا کہ شہادے کی دکان سے ادھر چری رہوں گا۔ ادھر نہیں جاؤں گا۔" کٹر دھرمی مل سکتا ہے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر برلن کا نقشہ پیش کر دیا تھا۔ شہادے کی دکان سے ادھر کوچ دیکھنا کے سامنے بجے کا ایک پلاٹکڑا تھا۔ اس گلی میں منتر کا مکان تھا۔ گلی کے دہانے پر بجے کا ڈبیر مجھے اپنے نامی اور محل کے درمیان آگے بڑھنے کی طرح آؤڑاں نظر آیا جس کے اس پار دیکھنا محال تھا۔ لیکن میرا دوست زندہ تھا۔ دل نے کہا۔ یاد زندہ صحبت باقی۔ میں نے ایسٹ چتر کے اُس انبار کی طرف سے منتر پھیر دیا، جو کچھ دیکھنا کی ناگہندی کیے ہوئے تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا "آؤ چلیں۔ لیکن آج کو میرا دوست ڈنیا میں نہیں ہے۔ بجے کا وہ ڈبیر آپ سے آپ اٹھ گیا ہے۔"

کوچہ دیکھنا ہندوؤں کا محفل تھا۔ سعادت کہا کہ تاکر منٹ کشمیری زبان میں توازد کو کہتے ہیں۔ کشمیر میں ہائے اب وجد کے یہاں دولت توازد سے منمتی تھی اس رعایت سے ہم منتر کلائے۔ میں نے منٹر کے اس دیان کی تصدیق نہیں کی۔ دوستوں کو آدمی کچھ لڑوں اور تھانوں میں نہیں بے بے پیرتا۔ یعنی جس طرح چاہئے وہاں محبوب کے حضور خالی کو کتابی میاںوں کے مطابق مسطروں سے نہیں لپٹتا۔ یہ توازد نے اگر توازد کے ہونٹوں کو شیشہ محبوب سے دیکھا ہوتا تو مستوری کی ڈنیا اپنی حسین ترین مسکراہٹ سے محروم ہو جاتی۔ ہاں تو کوچہ دیکھنا ہندوؤں کا محفل تھا۔ گلی میں قدم رکھتے ہی دھرمیوں کا ہجوم ہونے لگا۔ والد خواجہ حفیظ اللہ وکیل کا مکان تھا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا کنواں تھا۔ اس سے آگے خواجہ عبدالحمید ڈی۔ ایس۔ پی کا مکان۔ اس مکان کے سامنے ایک عربی تھی خواجہ عبدالحمید صاحب کے والد نے کوئی سو سے اوپر ہی عمر پائی ہوگی وہ امرتسر کے بچے بچے کو جانتے تھے۔ انھوں نے جب مجھے پہلی بار سعادت کے یہاں دیکھا تو پوچھا کہس کے بیٹے ہو؟ میں

نے بتایا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اے اے تو تو اپنا بیچ ہے تیرے دوا جب گاؤں سے اٹھ کر شہر آئے تھے۔ تو خرمن شروع شدہ ہی کر لیا تھا مکان۔ ہمارے گھر کے سامنے جو چوٹی ہے۔ نا۔ ٹھنی ٹھنکایا کرتے تھے ہم تمہارے گھر سے۔ اوپر ہو کر کیا زمانہ تھا۔ کیا لوگ تھے۔۔۔۔۔ اس چوٹی کے سامنے شمال کی طرف سعادت کا مکان تھا۔ اس کا ایک دروازہ جنوب کی طرف کھلنا تھا۔ دوسرا مشرق کی طرف۔۔۔۔۔ اور یہی سعادت کے کمرے کا راستہ تھا۔ ٹیوٹری میں میں قدم رکھتے ہی وہیں ہاتھ یہی کروٹ کر دیں وہیں دروازہ کھلے گا۔ نام سے منسوب ہے۔ دروازے کے قریب ہی دروازے کے ساتھ دو کھوکھے رکھ کر کئی پرگٹا اور گتے کے پر ملانی لگیں۔ پھاڑا گیا تھا۔ سامنے شمالی دروازے کے قریب کھوکھے کی میز تھی۔ اس کے دائیں جانب دروازے میں ایک چھوٹی الماری، جو کتابیں الماری میں نہیں سہا سکتی تھیں میز پر دیواروں کے سہارے پڑی دھتیں۔ کتابوں کے علاوہ قلم، دوات، کاغذ، پیسٹیں۔ میز کے بائیں جانب آئینہ تھا جس پر جگت سنگھ کا مجسمہ رکھا تھا۔ مجسمے کے ایک طرف تیل کا ٹیلے سے چھتا اور دوسری طرف پرانی وضع کے ٹیلیفون کا ریسور۔ ایک سیدھا ٹیلیفون سے جب متعدد کوششیں کرنے کے بعد بھی اسے نہ چھو کر نہیں مل سکا تھا تو اس نے یہ کہتے ہوئے ریسور کو کھینچ کر اوپر کوٹ کی چھب میں ڈال دیا تھا کہ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ اس نے خود اپنے لیے بھی کئی بات فرمائی "کاغذ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہی ایک چیز تھی۔ جو اسے نہیں آتی تھی۔ اس کا ظاہر باطن ایک تھا۔ وہ بڑا صاف شہادت آدمی تھا اس اہلی پانڈی کی طرح جو کمرے کی مشرقی کھڑکیوں کے پاس بھی رہتی تھی۔

میں اس کمرے میں پہلی بار کھڑکی میں گیا۔ میں ان دونوں ہندو بھائیوں میں سامنے سٹوڈنٹ تھا۔ ایک روز میں نے اسے کالج کے جنوب مشرقی کمرے میں دیکھا۔ اس نے مشرق و مداروں کی بوسکی کی تھیں یہی دیکھی تھی۔ اور سفید بوسکی کا پانچا بھائیوں میں چل تھی۔ اور تھیں کے اوپر آؤ تھیا سا میٹھن کے مطابق نرم گوشت۔ وہ میرے ایک ہندو بھائی کا دوست پر کال کی تصویر پر آ رہا تھا۔ پر کاش کو دیکھ کر کالج کے تارسی وہاں سینئر بھائی ہندو ایشیئم مہتر چندر ارا کے حال میں مبتلا ہو جاتے اور صراحت اولی کے آکر کی بنا باکیوں سے ایک دوسرے کے سر جوڑنے کو تیار نظر آ کر تے۔ پر کاش کو مشرک کے کمرے میں اتنے قورکھ کر تصویر و صورتوں کو چشم جو نے گھیر دیا۔ میں نے خبر کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کون ہے؟ میں نے اپنے ایک بھائی کا دوست سے پوچھا جواب ملا "یہی ہیں نے یہ نام سن رکھا تھا۔ وہ اپنے سکول۔ ملے اور کالج میں اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ تھی اس کی شراقتیں تھیں۔ غیرتہ ثانی تو اس وقت کو یا پری کو شیشے میں آتار دیا تھا۔ جیسے کچھ غریب وضع قطع کا آدمی نظر آتا۔ میرے وہ بھائی گمان میں ہی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی مستول آدمی بوسکی کا پانچا اور لال وھاری کی ٹھیں گورنا ریٹ سوٹ میں کالج میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے اور قریب سے جاننے کی کوشش نہ کی اور بات آئی گئی ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تصویر کی انڈیا جینٹ کے بیچ میں عاشق علی فوٹو گراف کی دکان پر گیا جس کے نام کاٹن دونوں بہت چرچا تھا۔ اس کے پاس اب سے ایسے کمرے تھے۔ جو ہمارے شہر کے فوٹو گرافوں نے دیکھے بھی نہیں تھے۔ وہ ہمیں کی فلمی دنیا سے بھی گھوم آتا تھا اور اس کے شوکیں میں فلمی تصویریں، روشنیوں اور سائوں کے عجیب و غریب امتزاج سے چمک رہی تھیں۔ کاہلواری پر نسبت اسے اپنے آرٹ کی زیادہ نگہ تھی۔ اس کے سٹوڈیو میں ہالک کی قسملی مانوی عیشت رکھتی تھی چنانچہ وہ

کثر میں تصویریں بھی چھانڈا، مگر جو ایک تو خوشی سے بے جا تھے، لیکن وہ تصویریں کیا ہوئی کہ حضور کا اپنا ہی خوش غم ہو۔ وہ اعلانِ شہرِ پشیمانہ اور اس کا گورنمنٹ کراس کی سپرٹ۔ عاشق علی نے میرے والد کی دو تہیں تصویریں بنائیں اور چھانڈا، لیکن کچھ بات نہیں ہو سکتی۔ بات بنانے کے لیے وقت درکار تھا۔ اس لیے یہ سوا اکثر وہاں پھیرا رہتا رہتا میں شادی سے میری ملاقات ہوئی۔ کیسے رکاش کی تصویر کیسے آئی۔ میں نے پوچھا، جواب ملا، ”نعم ہی کب بھی کیمرے میں۔“

ہماری یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوئی گئی۔ وہ مار میں ٹیڑخ کی ٹانگوں پر رہتا تھا اور میں گارڈ کے سبب اس کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا جس مقام پر میں اب پہنچا تھا وہ اسے چار برس پہلے چھوڑ آیا تھا۔ وہ سنی ۱۳۹۱ء میں پیدا ہوا تھا اور اس سنی ۱۳۹۶ء میں غیر ملکی شادی کی کوشش ان کے دو غلوک احوال غالباً حبشائی کو دونوں میں قریب سے قریب تر لے آئی۔ غالب نے کہا تھا کہ

”ذکر اس پری دوش کا اور پھر بیاں اپنا“

”بن گیا رقیب آخبر جو تھا ازناں اپنا“

لیکن کبھی ولید بھی ہوتا ہے گزوک اس پری دوش کا رقیبوں کو ازناں بنا دیتا ہے۔ غلو سے اپنی دوستی کے پیر میں گزوکا دلہا اور اس میں ٹیڑخ کا احسان مند ہوں۔ ان کی تصویروں کی کشش مجھے سبلی بار کوڑ دیکھان میں لے گئی۔ آبی ڈس سے اتر کے غاسٹے، انکھ جھپکتے میں لے ہو گئے۔

سعادت کی میز کے پاس اماری میں رنگ رنگ کے فلمی رسالوں کے انبار لگے تھے۔ اس نے اپنا یہ ذخیرہ میرے سامنے چاندنی پر بچھا دیا اور کہا جو قسمی تصویر چاہو لے سکتے ہو۔

مجھے نے حیدر چیدہ تصویروں کو فریم کر دینا شروع کیا۔ فریم کے لیے اُن دنوں ہائیڈرولک میسر بھی بنایا ہوا تھا۔ فلمی قسم کی فوٹو گرافی کی طرح اسے بھی عاشق علی نے امرتسر میں دودھ دیا۔ ہمارا شوق اس کا جیتا جاگتا اشتہار تھا۔ ہائیڈرولک پینٹنگ اس پر کوڑک کی گزٹ۔ نتیجہ آپ خود دیکھ کر سمجھ لیں۔ لیکن یہ عشق ہمیں بہت مشکل دہرا تھا چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ خود ہائیڈرولک کریں گے۔ مگر گزٹ اب بھی مثالی تھی۔ فزوک سوچی کر میٹل پینٹر (PASTEL PAPER) آزانا چاہیے۔ تجربہ کامیاب رہا۔

سعادت کے والد کا ان دنوں انتقال ہو چکا تھا میں نے انھیں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ایک بڑی سی تصویر بنگلے سنگھ ہار میں ڈیڑخ اور جون کو فوٹو کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی۔ بند لار کا کوٹ سر پر کھڑی وضع کی گڑائی۔ خوشنصیبی فادرسی بڑی بڑی خوشنصیبی آنکھیں۔ یوں لگتا جیسے ہمارے مشاغل کو استہانہ نہایت دیگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید ان کی غصہ آلود نگاہوں کی زد سے بچنے کے لیے ہی سعادت بھاگ کر ایک بار بھی پلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ میزکس میں غلج سرد ہا تھا۔ کہا کرتا تھا میں بھی اٹھ بیٹھے بڑے سخت لگے آدمی تھے۔ ”سعادت کی بہن بتا رہی تھیں تھان غلط ہوتی تھی اس کی میاں بی کے لڑ سے چوٹ لگ اڑا۔ ہا تھا ایک دڑکٹھے پر۔ میاں بی آگئے اتنے میں — چھت سے کوڑ پڑا یہ برابر کے کٹھے پر چوٹ آئی۔ لیکن کیا مجال ہے تو ہی سب کی جوت۔ وہ میزکس اور رسالوں کا کبھی قافی نہیں تھا۔ رقم کی اچھا کرنے والوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ زندگی بھر چنگ اڑا مارا۔

اور اس طرح کو نہ رہا۔ ایسے میں کئی بار وہ لوگوں کے سروں پر بھی ان گرا لوگ مٹھائے جھٹائے، لگا لیاں دیں، تھاقوں کو مدد کے لیے پکارا۔ لیکن منٹو نے کہا مجھے بھی تنگ آؤںے کا حق ہے۔ آسان کی دستبرد پر کسی کا جہاد نہیں۔ جو مجھے گرانے کی کوشش کرے گا میں اس کے سر پہ گود جاؤں گا جو میرے تنگ پر کاغذی "پھینکے گا میں اس کی کھوپڑی پر مٹی کی اڑیٹ اڑوں گا۔ معاشرے کے اس کھیل کے انداز میں اس نے متعدد وجوہیں کھائیں۔ لیکن دم کی درخواست بھی اس کی زبان پر نہ آئی۔ وہ وہاں طلب تھا فریاد کی تے سے اس کے بے نا آشنا تھے۔

اس کے والد مصنف تھے۔ انھوں نے دو شکاریاں کیں۔ سعادت کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھی مصنف صاحب نے اپنی پہلی اہلیہ کی اولاد کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم وادان کی اولاد — سعادت اور اس کی بڑی بہن ناسرہ اقبال کے لیے کچھ باقی بچا تلخ یادوں کے سوا۔ منٹو کی تحریروں میں ہی کڑوا ہٹ گلی ہوئی ہے۔ جیسے منڈ کی گڑیوں میں یکایک کوئن کا ٹکڑا اٹھائے۔ یہ مٹی کتنی دیر پاتی اس کا ناز و منور کی موت سے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ آؤں کا دوسرا باپ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے انصاف نہ کر سکا۔ اخلاق کے ٹھیکے دار اسے طریر کچھروں میں ایسے کے کہ طریق انرس ہے افش نگار ہے، یہ منی باتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ انھوں نے کبھی نہ سوچا کہ مرد و زن کے تعلقات اگر ناپاک ہیں تو حضرت آدم جب پہلے عاشقین تھے انھوں بالشتا لیکن منٹو کے ہاں منی مٹھو تھا ہی کہاں اس نے قوم کی گویاں کبھی نہیں چھپی اس کی زبان میں کوئن تو شردھی کو کرس نہیں تھی اس کا سر نہ کڑا تھا۔ کہہ ہٹ کے احساس کو کھنڈ کرنے کے لیے اس نے اور کڑا ہٹ اپنے اندر اندر لی۔ بول کو نہ لگایا۔

جاں لب پہ آئی تو بھی زہ شیریں بھرا دہاں

از میں کو مٹی منجم حیراں چشیدہ ہوں

دو سال سے وہ بے تحاشی پانی رہا تھا۔ وہ ہر وقت مدح و شریف رہتا تھا۔ شراب سے اس کا ہجر چھلنی ہو چکا تھا۔ سٹشٹ کے اوائل میں وہ مرتے مرتے پھاٹا کڑوں نے اسے مجزہ سمجھا اور کہا، سالو یا دو سال اور — اگر اب بھی زچھوڑی تو — لیکن اس نے پھر ہوش کو نہ لگایا۔ گلاس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کی تمکلی ہوئی نوحہ کو سب سے سافرنک ناما ستر بھی بہت نظر آیا اپنے اور اہدیت کے درمیان وہ بطور کارہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ رہ گزرد میٹ کا تھا کہ خورا ہی جس پر معاشرے نے قدیم قدم پر سنگباری کی تھی جلد پھل اس منزل پر پہنچا چکا تھا۔ جہاں وہ کو نوبت سنگت کے نام سے نہیں بلایا جاتا جہاں چائیں نہیں ہوئیں پتروں کے سوداگر نہیں ہوتے۔ ۱۸۰ جنوری ششٹ کی صبح کو اس کی حیثیت یکایک بگڑ گئی۔ لیکن وہ ہسپتال تک بھی نہ پہنچ سکا اسے خون کی تہ آئی یہ کرس کارٹ سے رات سے ہی ہسپتال لے آئی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ صلیب کے صلیب میں جیا اور صلیب کے سایہ میں جہاں ٹھہری۔ مٹی ششٹ میں کراچی سے پشاور آتے وقت جب میں اس سے ملے گیا تو منظر ہجر کے لیے مجھے بھی نہ پہچان سکا مجھے دیکھ کر وہ چٹکے پڑا اس کی آنکھوں سے پتھر پڑا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں خشک گیا مانتے میں اس کی پس نے کہا۔ سعادت! ستید آوا ہے۔ اس کا چرو ایک آٹھا اور انھیں چرکیں غلام کی دیکھ رہی تھیں یکایک میرے چہرے پر آواز میں — آواز — خوبرہ..... میری نظریں گلاس پر گولگیں۔ وہ کچھ گیا میں کیا سوچ رہا ہوں۔ لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ٹیک ہے

یاد رہے شیک ہے۔ بلکہ اس مت کے بارے میں اس کی پہلی پہلی کتابی انکھیں ملکہ کر رہی تھیں کہ تو بھی نام ہی گیا! اس کی گفت سے بھال کر تو میں نے پناہ لی ہے۔ تجھ سے مجھے بہتر سلوک کی توقع تھی۔

اس کی بڑی بڑی بی بیوں انکھوں میں بلا کاٹھن تھا ایک زمانے میں اسے پنجاب کی دیہاتی بوبیاں بیچ کرے کا شوق ہوا تھا۔ جنہیں وہ اپنے جانے والوں کے ساتھ کھڑ دھرا یا کرتا۔ اس کے مقابلے میں باقی سب شاعری فرماتے تھے۔ انکھوں کی تعریف میں یہ شعور اس نے کس کس کو نہیں سنایا ہو گا۔

گورونگ نے شرقی انکھیں گھنڈ وچ تیسہ کیتیاں

اس کی اپنی آنکھوں میں بھی میں ہی خرابی کیفیت تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے تھپے وہ دھند میں بیٹھ کر ہوتی بھیٹیلیں دکھائی دیتیں جس کی تڑپ نہ جانے کتنی سرتوں کے سینے کو نہ تھے۔ وہ عمر بھر اس محبت اور ہمدردی کی جستجو کرتی رہیں جس سے وہ بچپن میں محروم ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خلوص اور دعاؤں کی قدردانی بھی اس کی کافی نہ کر سکے۔

بھگت ملکہ کے بٹ کے سامنے آدیں اور تصویر کی انکھیں پھر پھر پیچھے ہٹتی جھڑپتھیں۔ انکی انکھیں نگاہوں کے سایے میں پھر بڑی مصروفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر موضوع غفلت بدل چکا ہے۔ فلمی ستاروں کی بجائے ادب و انقلاب زور بحث ہیں۔ گھر سے سالوں سے رنگ کا ایک بھاری آؤنی کارلائیل اور گیتھ کے انداز تحریر میں غفلت کر رہا ہے۔ تین فوجیوں کے ساتھ جوتے چمڑے کی تاثیر سخی کے شاہد ہیں۔ گھر سے کی انکھوں کی تعریفوں کی بجائے واقفیت اور اسٹاٹسٹس، مارکس، اینٹن، ٹراٹسکی، اشتاں اور گور کی کے تذکرہ سے گونج رہی ہے۔ اس بزرگ کا نام باری (علیگ) ہے۔ اس کے بریل کے نام سلامت حسن جی جی جی اور ابو سعید قریشی۔

باری صاحب سے مجھے پہلی ملاقات یاد نہیں رہی۔ اس وقت وہ تھکا ہوا تھا۔ جیسے میں انہیں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ ہرمال یہ شرط سے ملاقات سے بعد کی بات ہے۔ ان سے ہمارا اتفاق علم ادب اور ادب الوطنی سے اتفاق تھا۔ فلمی رسالوں کی جگہ اب ہم کتابیں خریدتے تھے۔ مگر تصویروں کی کامیابی پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکلانے کے بارے میں سوچتے۔ بدست پسندی کی داستانوں میں ہمیں ملحق آنا مستند حکمرانوں کا تختہ اٹھنے والوں کے آئینوں میں ہمیں پتا عکس نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنی جھڑپتھیں میں اس طرح کی کہوں کی بار بار پھر بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر نوٹس ڈرے۔ انہیں بدادہ انگلستان تک دھکیلتے ہوئے لگے۔ مارج بوج کی طرح قید کر دیا۔ تاکہ پھر دنیا کو تخت و تاج نہ کر سکیں اور غفلت ان ملک کے لاندل آفتاب کو تاج کے پرانے پرچے کی طرح گردش سے نکال دیتا۔ انقلابات روس و فرانس کی داستانیں بچوں کی کہانیاں بن گئیں۔ سنو آس زمانے کے بارے میں لکھتا ہے:-

آب سوچا جاتے تو اس زمانے کی یہ سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں لیکن اس وقت یہ کھلونے ہی عظیم الجثہ اور قوی ہو چکی تھے۔ ان سے بچہ ڈانا اگر کسی دیو سے فرود آنا ہی نہ تھا۔ ہمارے غلط صاحب یعنی باری صاحب اگر نڈل نہ ہوتے تو یہ دنیا ہم

چاہوں اس زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بھلانے کے عزم میں پچاسی پانچے ہوئے اور
اگر کسی غریب سہارے میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جواب غلوں دل سے
کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رخ کا بھی صحیح علم نہ تھا۔

باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کھا لیتے تو ڈرتے۔ چہتے
کہ تو زندہ نکل آئے۔ حالانکہ ناقوں کے زمانے میں بھی ان کے جسم کا یہ حقہ ٹھٹھا رہا۔ زیادہ تر بینیں
بھل گئے تھے کہ ان کے دل پر اس کا اثر پڑے گا۔ حالانکہ ان کے جسم کے اسی رکن عضو ان
کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی بڑی شہداء تو ان کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے اور شلے کی آواز میں
نزد ہر جاتے تھے۔ — اختر کی ادیب باری تمام عمر اپنی زندگی کی جلی اور خفی سرخیاں جھا آ
رہا۔ لیکن وہ ان کے نیچے وہ مصنفین نہ لکھ سکا۔ جس کے ذوق میں پرورش پاتے تھے۔
(باری صاحب از غلو۔ مجبورہ گئے فرشتے)

اگر باراد شہر بزدل نہ ہوتا تو دارالاحمر کے آتشخان برکے ہوئے بھگت سنگھ کے ٹہٹ کے سلیے میں چار دیسے بچے کھیل رہے
تھے جن کے مجھے ڈانٹن، ادب سہیری، دینری، ایٹن اور راشکی کی گیلری میں کھڑے ہوتے۔

لیکن بناوٹ کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی، وہی زندہ سکی۔ باپ کی بے مٹی بجائیوں کی بے
اعتنائی اور مزیدوں کی تمام غلطی سے جو شعلہ بھڑکا تھا، زمانے کے حوادث نے اُسے ہوا دی۔ اور وہ محاشرے کے ایک خود راہ
شہیدوں کو چاٹنے لگا۔ اس کے قلم کی روشنائی لاوا میں کریمہ نکل جی لوگوں کے گھر اس کے راستے میں آئے وہ پیچ آٹھے۔ انہوں نے تاننا
کہ وہ کے لیے پکارا۔ وہ بے ادراختی کے ناز پر گلیہ کو حرکت میں لائے۔ لیکن لاوا نہ ٹوکا، آگ نہ بجھی۔ حتیٰ کہ اس کی حدت میں اس
کی اپنی زندگی کے سوتے بھی شعلہ ہو گئے۔ وہ اہل نشان پہاڑ اپ خاموش پڑا۔ اس کی آگ سے ڈرنے والے اب اس کے
دامن میں پھول لگا رہے ہیں۔ لاوے کی مٹی بہت ندر غز ہوئی ہے۔

منٹو پرست کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ آج ہر کوئی اس کا شناسا ہے۔ ہر ایک کو اس کی دوا یک باتیں
خود یاد ہیں۔ ہر کوئی اس سے اپنی پہلی ملاقات کا حال لکھ رہا ہے۔ اس کی شخصیت اور ذہن کو نفسیاتی اور جالباتی کسوٹیوں پر پرکھا
جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے اس کی خود پسندی پر دو صفحے سیاہ کر دیے ہیں۔ ایک نے اس کا موازنہ موپاساں سے کیا ہے۔ ایک
اور بزرگ نے اسے سمرٹ کا تیرہ دیا ہے۔ ان تعزیتی تقریروں میں حیف ظہور شیاردی کے ہاں مجھے بہت غلوں نظر آیا ہے۔
گھٹتا ہے :-

”منٹو کی زندگی موت اور اس کے فن کے بہترین ترجمان، اس کے محبوب شاعر غالب
کے یہ اشعار ہیں :-

جزوہ گشتہ ندیم اثر سنی خیالی ہر قدر ہر طلب گاری انسان رقم

سازہ نگار نہ اندھیر طاقت کرم
تا سبکدوشی میں رخ کوئی نہ کشد
نظم نقد یہ گنجینہ دہائی زور
خفیہ نے آگے بل کر رکھا ہے۔

اس نے اپنی تاریخ وفات کی فرمائش کی تھی۔ آج میں اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔
چوں سعادت نرمانت ہی گشت حیات
خود ایں مصرع گایہ زغالب آہ
آتش از شکوہ عالم کھان رفتم
شکوہ چاہی دیا مگر ز سیدان رفتم
۶
۱۳۶۸ + ۶ = ۱۳۷۴ھ

دینی لوگ علم سے وطن بھڑکا کاری کے پر سہ تانہ کرنا رہا۔ ان میں ایک سید پر سہ مذہب کا بھی تھا۔ ہمارے ملک میں پارسوں کے بھی باپ بستے ہیں۔ بیانات ناب بزرگ جن کی شری دار حیدروں، دولتی چھروں، مقدس دستاروں، بے درخ عبائوں اور قدروں نگہ بوں کو دیکھ کر خلیطان بھی سو پ بھڑنا بھول جاتے۔ غرض عقیدہ و عوام ان کے دلام فریب میں اس بڑی طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ بل نہیں سکتے یہ دلوں کی سراویں چوری کرتے ہیں۔ راگہ کا سونا بٹکتے ہیں۔ ان کی ناک بالا علاج مریضوں کا علاج ہے۔ ان کے میڈیکل اسٹاکس و پیسجے بے مدد کاروں کو روزی دواتے ہیں۔ ان کی دکانوں پر جب کے تحفہ فروخت ہوتے ہیں جن سے مشکل عجب نام ہوں۔ ان کے کالے علم سے دشمنی زیر ہوں اور مقتدے جیتے جا رہے۔ یہ بانجھ کو بچے دیں اور کنواریوں کے اسیب آئیں۔ غرض کا صاحب کرامات (مجموعہ اشراک کے کنارے) بھی ایک ایسا ہی بزرگ ہے جو ایک سادہ لوح کسان کو جو جلد بازی میں اپنی پیری چھاتاں کو طلاق دے چکا ہے۔ لیکن اب اُسے دوبارہ بسانا پڑتا ہے۔ صاحب کرامات اُسے بل دے کر پچھلے اس کی کنواری بیٹی بیٹیاں اور پھر اس کی بیوی چھاتاں (دوئی کی ماں) کو نشتر پا کر اپنے جلال کی آگ بجھاتا ہے۔ اس کے کندھے پر زور و مال ہے (جو بھی لوگ تھوڑے تھے ہیں) اس کی قال لال، کھموں میں سرسے کی تحریر ہے۔ خود زور شد بزرگ۔ بسے بسے پٹے۔ ان کے اور ڈاڑھی کے بال کچھڑی..... ہاتھ میں چاندی کی مشر و لاصعا..... مولوی صاحب نے بیٹیاں کو اپنے پاس بٹھاکر اس کی بیٹھائی خرم لی۔ اس نے اُٹھنا چاہا۔ گران کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اُسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور توجہ سے کہا۔ چودھری تیری بیٹی کا نصیب ہاگ اُٹھا۔ لیکن اس روز بیٹیاں کا نصیب اس پر گیا۔ یہی چھاتاں؟ وہ مطلق ہے اور مولوی صاحب فراتے ہیں تبیب کوئی انکی رنجی پیری کو طلاق دے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور پھر اس کو اپنے گھر میں انا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پچھلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے۔ پھر جانا ہے۔ ہم نے خود کے حضور راگہ کر دیا مائگی کر لیں کوئی سزا نہ دی جائے۔..... مگر چودھری کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ ارشاد ہمزاد کا طوط سے جو مولوی صاحب سے ہم کلام ہے، تو ہم اس کی محبت کا اتھی دینا چاہتے ہیں۔ ایک دن کے لیے تو اس سے نکاح کر لے۔ دوسرے طلاق دے کر تو ہم کے واسے کر دے..... مولوی صاحب نے کٹھنی بند کر دی۔ اور چھاتاں سے کہا۔ تم آج کی رات میری بیوی ہو..... صبح جاتے وقت مولوی صاحب اپنی دارمیں اور

کی داکٹر میں پٹی ہوئی محبت کی چنگاروں میں چٹن چٹن کرنا ہی کا غلوئی تجربہ رہا۔ تاکہ دوسرے و تھپو کے پلے کی باری ہوئی دوسری اپنا سینہ گرم کر سکیں۔ سراج کی سرودھری۔ بچہ اندک کی اداں آنکھوں اور شانہ کے سرکرت کے آلبے میں اسی آگ کی چنگاریاں پریشیدہ ہیں۔ سڑک کے کنارے کے چھوٹے تن پر رہنے والے مہمان کی خاطر دیاں پڑھیں ہیں۔ اسی اسی دیکھی آگ سے گرم ہیں۔ وہ اپنے پھولے ہوئے سرے بیٹھیں ہیں۔ اگلی چھپائے ہوئے ہے..... وہ خود ہی اسی پلے کا شکار تھا۔ اس نے پرتھوئیس (PROMETHEUS) کی طرح دیوتاؤں کے آئینے کی آگ چرائی۔ اس بڑم کی پاؤں میں اسے چٹان یا نذرہ دیا گیا اور محاسب کے گھر میں اس کا بگڑ چنے لگے۔ آگ کی سبب بڑا کٹا ہوا ہے۔ غلو کا نقشہ وہاں اسی آگ سے روشن ہے۔ لیکن اس کے اوپر جھلک، منگھ کا بے گیت کیا کر رہا ہے؟ — تحریک و تخلیق کو شاید ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

نثر کی تخلیقی کلاظوں کی ابتداء رحوں سے ہوئی۔ پہلا تجربہ جہاں تک مجھے یاد ہے، ایک پراسرار طویل افسانہ دست بردہ بھوت تھا۔ اپنی قسم کا پہلا اور آخری تجربہ اور تجربہ تھا۔ باری صاحب تاریخ و حاشیات کے طالب علم تھے۔ انھیں انسانی ادب سے کچھ ایسا شغف نہیں تھا، مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو اپنے بڑے کی پہچان نہ بنا سکتے۔ فوری تسلیم نے دھوکا اور دارالاحرام میں وکٹریز کو، لاڈلہن کو، گور کی بیچریت، پرتھوئیس، سڑک، گڑگول، دستورو کی، اندر آیت، اسکرویلڈ اور مہاساں کی کتابیں نظر کرنے لگیں۔ داکٹر سیرجو کی باری صاحب کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا نادرست تھا۔ ہم نے اس کی تصانیف، فلوڈ سے منگوا لیں اور انھیں دسی کتابوں کی طرح پڑھا۔ باری صاحب چاہتے تھے کہ اس کی (LES MISERABLE) کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اس کی شہامت و کجگو کہنت نہ ہوئی۔ منٹو نے البتہ سرگزشت امیر کے عنوان سے (LAST DAYS OF A CONDEMNED) کا ترجمہ کر دیا۔ یہ کتاب نرئے موت کے خلاف پیموش احتجاج ہے۔ صنف صاحب کا چھوٹا بیٹا بڑا انسانی کے غفلت احتجاج کرتا ہے۔ اسکرویلڈ کی دیر کا ترجمہ بھی اسی دھوکے کا رنگارنگ ہے۔ منٹو نے باری صاحب کے بارے میں اپنے مضمون میں اس کتاب کی شہامت کا مفصل ذکر کیا ہے۔ — یہ ڈرامہ دوس کے مذہب پسندوں اور فریجیوں کی سرگرمیوں سے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ امر قمر میں ان دونوں اگر کوئی ہوائی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو آپ دم کر دیا جاتا۔ پچھلے تجربہ اس کے شہار شری کی دیواروں پر نظر آئے اور لوگوں کو مستند حکمرانوں کے عبرت ناک انجام۔ دوس کے لگی کوچوں میں عدائے انتقام کی خبری گئی اور گزشتہ کے تہوہنوں میں آخری کیل کا ناگیا تو کوچہ و کیلا میں جھلک منگھ اور دت کے ان جیلوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ ہمارے قمر کے لگی کوچوں میں اسکو کا نامک کیلین چاہتے تھے اور ہندوستان میں انگریز کی شہنشاہت کے خاتمے کے خواب و رکھ رہے تھے۔ لیکن خراجہ عبدالمجید صاحب ریٹائرڈ ڈی۔ ایس۔ پی نے پولیس کے سفید پوشوں کو یہ کہہ کر گولٹا دیا کہ یہ تو بچے ہیں میاں۔ جاؤ اپنا کام کرو اور بلا لگئی ہیں۔ داکٹر سیرجو ہوں کہ اگر پولیس نے بچوں کے پاس کیل کا پانی ملائی تھی تھی سے تعاقب کیا ہوتا تو منٹو میں جھلک منگھ بٹنے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کا افسانہ نماشا (مجموعہ نثر کے نسلے) انہی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس میں شلالہ کے ایشل لہ کے جھلکے کو ایک بچے کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ اس کا سیر و خود منٹو ہے۔ اس وقت وہ کوئی ساٹھ برس کا تھا۔ ان لوگوں کی بے اعتنائی نے اس بچے کو بڑا ہونے سے روک دیا۔ بچوں کی بے اعتنائی کیا کہم تھی کہ وہ دھرا کا رخ

کرتا۔ اس کے علاوہ اُسے پٹے ہوئے راستوں سے نفرت تھی۔ لیڈروں کی خود مرضی سے یہ نفرت اور بڑھ گئی وہ خلوس کا بھوکا تھا۔ لیکن ان لوگوں میں خلوس کہاں تھا۔ وہ بیچ آٹھا ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ۔

ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضا بگاڑ رہے ہیں۔ یہ نام نہاد لیڈر اپنی اپنی جگہ میں ایک ملک ضد لگی دباؤ پھرتے ہیں جس میں یہ لوگوں کی جیسے کٹر کٹر پیسے جمع کرتے ہیں..... ان کے ہر سانس میں آپ ریا کاری اور دغا بازی کا بعض محسوس کرتے ہیں، جسے جیسے جلوس نکال کر منوں بھاری ہاتھوں کے نیچے دب کو چوراہوں پر طویل طویل تقریروں کے گھوٹیلے الفاظ کیسے کر یہ نام نہاد رہنما اپنے لیے راستہ بناتے ہیں۔ جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے..... یہ لوگ چندے اکٹھے کرتے ہیں، مگر کیا انھوں نے آج ملک بے کاری کا بل پیش کیا ہے..... یہ لوگ جن کی روح مفلکوی، دباؤ، وابستہ، زبان مفلوج اور تقدیر شل ہیں۔ ملک و ملت کی رہبری کیسے کر سکتے ہیں..... ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں، صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمرؓ کا سادہ اخلاق رکھتا ہو جس کے سینہ میں آنا ترک کا سپارہ جذبہ ہو.....
(مفلوکے مفلوکے مفلوکے)

یہ مضمون جیسا کہ اس کی تاریخ اشاعت سے ظاہر ہے، آنادی سے بہت پہلے لکھا گیا اور منشویک زندگی میں مبینی کے پہلے قور کی پیداوار ہے۔ دارالاحمر کے زمانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسے پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ سیاست اور لیڈروں کی دنیا کے بارے میں اس کا کیا رد عمل تھا اسی مجبور میں آجے جمل کر اس نے اپنا خیال اور واضح کر دیا ہے۔

”سیاست سے مجھے کوئی لمبھی نہیں۔ لیڈروں اور دغ فروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دغ فروشگی دونوں چلے ہیں بغیر کتا ہے کہ سیاست سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاڑی میں کو سینما سے۔ گاڑی میں ہی سینما نہیں دیکھتے زمین خنار نہیں پڑھتا۔ اصل میں ہم دونوں مفلکی کرتے ہیں۔ گاڑی میں ہی کو فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں۔“

(دیا تیں، منشویک کے مضامین)

بادی، انظر میں یہ چند سطور شوخی تحریر ہیں اور بس۔ وہ حقیقت گاڑی میں اور فلوں کا بھند لیڈروں میں ذہنی توازن اور (SENSE OF HUMOUR) کے فقدان کے نشان ہیں گاڑی میں ہی اور فلم محض علامتیں۔ سعادت نے اپنے خاص منشوی انداز میں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کو بے نقاب کرنے کا کام لیا ہے۔ تضاد کو جاننا منظر کی خاص نیکی ہے۔ منشوی

کا اہر تھا۔

قریبی بیٹی تھا، جہاں کا لکڑس نے استعارہ شراب کا قانون پاس کر کے ان بڑا ہندوؤں کو
بیکار کر دیا تھا۔ تازی نکالتے تھے وہی عروس ابلا دقتی جس کے گھونگھٹ کا ایک ہتھ
چوری ہے اور دوسرا کھوڑے ٹاٹ کا۔ وہی ایسی جہاں اُپر تلخی اور نیچی خرمیورست
علاقوں کے تختوں میں غٹ پاتھوں پر بڑا ہندو خفوق رات کو سو رہا ہے۔

مسلم ایک مسجد ہے۔ کالکٹس مندر ہے۔ کالکٹس سوراخ چاہتی ہے۔ مسلم ایک بھی۔
لیکن دونوں مل جل کر کام نہیں کر سکتے..... ان کے خون کا ملاپ سرسوں اور مردوں
میں ہو گا۔ (باتیں)

ایسے میں سیاسیات سے اس کی برعکس تقدیر بات تھی۔ لیکن میں امرتسر سے بھی پہنچ گیا۔ جلیانوالہ باغ کے شہر
میں اسکو کا مشغول اپنے اشتہار کے جہڑی ٹوٹ گیا۔ اس کی سین سینری پر بے پلٹے ڈاڑھ کے گھر میں منتقل ہو گئے اور بعد میں کباڑ
کے بیواؤں کے ایک کتب فروش نے خریدے۔ ڈنگلوں، مویشیوں کے سیلوں، غشیات کے شیکوں، عصمت فروشوں اور اس طرح
کے دوسرے کھیل تماشوں کی طرح کتاب چھاپنا بھی ایک تماشہ تھا۔ لاریہ کتاب (ویرا) تو پہنچ کا لانا ملک تھا جس کے بچے فلسف
ضروری تھا۔ لیکن لائسنس نہ ملا اور پوڈیو سر بیگ گیا۔ باری صاحب غائب تھے، انھیں اس نامک کا انجام بھی یاد نہیں رہا
تھا۔ وہ بھٹول گئے تھے کہ (PICTURE OF DORIAN GRAY) کا مصنف دہشت پسندی سے اتنا ہی دور تھا جتنے
گاندھی جی سینا سے نامک کے انتقام پر دیا آسکر وائیٹ کی بیرونی وہی نچر سے وہ ناروے کے سینے میں گھونپنے کے لیے
لائی تھی۔ اپنے سینے میں گھونپ لیتی ہے۔ اسے ناروے سے عشق تھا۔ محبت نجاتیاب برائی۔ مرض مزید بگڑا گیا۔
لیکن تماشہ بھی ختم نہیں ہوا۔ پچھلے کاکھیل ابھی جاری ہے۔ پندرہ دن غائب رہنے کے بعد ویرا کے پڑاؤ پر ستر
باری صاحب پھر نمودار ہوئے۔ اب کے ایک ہفتہ دار اخبار کے ایڈیٹر پبلشر کے ایک آپ میں۔ اخبار کا اتم غلطی تھا۔ یوں
حکم ہوا کہ فوراً کام شروع کیا جائے تاکہ اخبار کی شاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔ منٹو کا اساتذہ تماشہ خلق کے پہلے شمارے میں شامل
تھا۔ میں نے بھی اپنی دانست میں ایک بڑا انقلاب انگیز مضمون لکھا تھا۔ جس میں جذباتیت کی خام کاری بدجہد اتم موجود
تھی۔ اور سرایہ دار کو خوب موئے موئے تفرس و مترب افغانوں کو سسایا تھا۔ یہ مضمون آؤم کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ منٹو
نے بھی اسے لڑکے اپنے اساتذہ کے مصنف کا اعلان نہ کیا۔ باری صاحب نے یوگ اور لکڑس کے بارے میں اپنے خاص
نچیبانہ انداز میں کچھ لکھا۔ جیسے میں شاید آج بھی نہ سمجھ سکوں۔ مگر وہ ہمارے پروردگار تھے جن کے روحانی فیض نے ہیں اپنے
تمام ہم عمروں سے ممتاز و تیز کر دیا تھا۔ اور تو اور ہمارے پروفیسر بھی جن میں فیض احمد فیض اور صاحبزادہ عموداظر جیسے لوگ
بھی شامل تھے، ہیں ادب و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسے ہیں ہمارے استاد باری کو کوئی بے معنی اور بے صورت

بات کیونکر کر سکتا تھا۔ اس مضمون کا مطلب کسی کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ اتنا ضرور ہو گا کہ اس کے نام سے پولیس کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ کتنی ترقی! آپ نے پہلے ہی شمارے کے بعد مالی مشکلات میں مبتلا ہو چکا تھا اور باری صاحب کا اخباری دنیا میں انقلاب بپا کرنے کا خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔

بارتی صاحب بڑے بڑے منصوبے بناتے اور انہیں چائے کی پیالی میں گھول کر پی جلتے۔ وہ عیبِ غریب خواب دیکھا کرتے۔ وہ کہا کرتے کہ بھڑے انقلاب کو چلا دینے کے لیے قید ہونا ضروری ہے۔ لیکن سہولت کہا کرتا تھا۔ باری صاحب آپ کو اس کرتے ہیں۔ آپ وہاں دو دن زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن باری صاحب کا خواب ضبط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ تم دیکھ لینا وہ دن خدا نہیں جب تم مجھ سے جیل میں ملنے آیا کرو گے۔“ جیل میں وہ اپنی ڈھاری کھنا پاتے تھے۔ چنانچہ ہلکے گلابی۔ اچھے رنگ اچھی طرح یاد نہیں۔ رنگ کا نہایت ہی عمدہ کاغذ کے کٹھن کے بہترین جلد ساز سے کائے علی چڑھے کی ایک ڈھاری بنوائی گئی۔ اس کے پہلے حق پرستی سلاخوں والے صافانے کی ایک کٹنگ نہایت انصاف سے چھپائی گئی۔ اس تصویر کے اوپر کا سب سے اوپر زندگی کا عنوان نہایت ہی عمدہ خط میں لکھوا گیا۔

اشتر کی ادیب باری بہت بڑا دماغ پسند تھا!

اس کے پہلے اپنے گورو کی طرح مارکس اور اننگلڈ کا چھانڈ لکھنے کے۔ اور پرستی کا یہ وظیفہ ان کی سبک اور نازک دھڑوں کے لیے بہت حاصل تھا۔ اس کی انفرادیت، اجتماعیت سے گھبراتی نہیں کر سکتی تھی۔ غلو کی آنا، بھوم کا خدا نہیں مان سکتی تھی۔ غرا، انجی کی خزاں اچھی دھڑ تھی۔

ابوسعید قریشی

منٹو ماموں کی موت

کبھی کسی میں سوچتا ہوں کہ منٹو ماموں میاں صاحب کے قبرستان سے اٹھ کر گھر چلے آئے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیات نامی کے معجزے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف آنا کہوں گا۔ ”منٹو صاحب آپ نے آج تک جتنی غمزدارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غمزدارانہ حرکت آپ کی موت تھی۔“

بہاول پور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا سٹیمپ بورڈ تھا اور میں ڈرننگ سٹیلڈیر میں بیٹھا طالع یا جاس کو بیچ کا چشمہ دیکھا حالانکہ میں نے اس سے پہلے کبھی اس سے نہیں ملا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ڈرننگ کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح مسدود حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے بے قرار نہیں ہو گیا بلکہ مجھ میں شدید براؤننگ پیدا ہو گئی۔ مجھے منٹو ماموں پرستانی شدید غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے پوری بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس حرج کر سکتے ہیں؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور جب میں پورا توہم آوارہ سے غیر معمولی آشوش نکلا تو میں نے پوچھا کہ اس انتقال پر جواب تھا گھر پر؟ اس جواب کے لیے براؤننگ میں نے کہا کہ میں نے تو اس کا جواب دیا تھا کہ میں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے ہمراہ غور نہ ہوئے ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ کسی تنگے پر کسی ریتورین میں کسی پبلشر کے دفتر میں بیٹھ کر بیٹھے یا کسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اچانک موت آگئی ہو۔۔۔۔۔

جب میں اپنی جگہ پر واپس آیا تو بیچ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے کے لیے ساتھیوں کے ساتھ ملا تھا ان سے پوچھا کہ کیا بات تھی۔ میں نے ایک کانفرنس پر جملہ گھر واپس آیا تو نے مسدود حسن منٹو کی آخری آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔“

منٹو ماموں کو آؤٹ دینے کے لیے اس بات سے کئی بار پابلیش کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار اپنی ستر و کردی گئی تھی۔ اب ان کی بچہ اور نانا نانا ڈول (نگلیں ختم ہو گئی تھیں) وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی حلیف ٹیم کی طرح ہوشیار اور مختار کھلاڑی نہیں بن سکتے تھے جسے وہ لاہور کے تیسرے سٹوڈیو میں کھیلتے ہوتے دیکھنے کے لیے ہمدرد شائق تھے۔ اس کا علم مجھے ان کی موت کے چوبیس گھنٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ وہ حقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے انھوں نے ایک ریتورین میں اپنے دوستوں سے کہا تھا حامد جلال کو واپس آ جانے دو میں اس کے ساتھ سٹوڈیو میں حلیف کا کھیل دیکھنے جاؤں گا۔“

ان کی دوسری خواہش اس بے یار و مدعا حرکت کی موت پر ناساز گھنے کی تھی جس کی برہنہ شاہ گجرات میں حرک کے کارڈ پائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس حرکت اور اس کی نشی سہی گئی کہ اس کے دل سے سے اٹھایا گیا اور نصف درجی کے قریب ہوں پرستوں نے اپنی سب سے زیادہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کوکڑائی مروی ہیں ان کے ہنگام سے نکل

کر بھاگی تو اس کے جسم پر ہاس کا ایک سار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں اس بیٹے نے نجد کر دینے والی سواری میں دم توڑ دیا۔ اس واقعہ سے منٹو ہاموں میں یہ حدیث قائم ہو گئی تھی۔ اسی روز شام کو گھوڑات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے اور انھوں نے سارڈن کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں خود اشتعال اور بے جاں پیدا ہوا ہوگا اور یہ خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ہاموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لیا ہوگا جہاں کے لیے مملکت ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزارنے کے بعد گھوڑا پس آئے، تھوڑی دیر بعد انھیں خوشی کی تھی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جہاں کے قریب ہی کھڑا تھا، خوشی کی صابروں کی طرف انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ کوپان کی پیک ہے انھوں نے اسے یہ یاد دہرایا کہ وہ اس گاڑی سے ڈر کر نہ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے حسب معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر میں کسی کو درم گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات غلط ہوئی ہے۔ کیونکہ میرے اڑنے کے منٹو ہاموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے خود منٹو ہاموں کو بھی اس کے متعلق کوئی فکرمش نہ ہوئی ہو۔ یہی وہ گھروالوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے۔ کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا بچہ پھر تھا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اٹھا کر بتایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سائنٹ نتائج ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بچہ پھٹ گیا ہے۔ ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورت حال کا حق تہمتا تھا یہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو بلوایا اور انھیں موت کے منہ سے نکلنے کی بدو بد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید علامتوں کے بعد وہ ضعیف یا ہو چکے تھے۔ اس لیے کسی کو خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ موت چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انھیں آؤٹ دینے کے لیے اسپاڑ کی انگلی اسی وقت سے نشان میں بلند ہوئی شروع ہو گئی تھی۔ جب منٹو ہاموں کو خوشی کی پہل تے آئی تھی۔

منٹو ہاموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے میری اعزاء نگاہ کا ہلکا سا فرق ہو گا۔ انھیں خوشی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آگیا ہے۔ ڈاکٹر کے تجویز وغیرہ نگاہ کے گھٹن ڈیڑھ بعد تک وہ ایس نہیں مورتے تھے۔ لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت نکالت معمول نہیں سمجھ لی۔ ان کی مرض برابر ڈیڑھ گئی اور درود میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی تہ بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ان کا کمر نے تجویز پیش کی کہ منٹو ہاموں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت منٹو ہاموں کے جوش و محاسن بالکل بجاتے اور ہسپتال کا نام نہ تھے۔ وہ بلبل اٹھے اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں سکون سے ٹہرا رہنے دو۔

گھر کی عورتوں کے لیے یہ منظر ناگوار برداشت تھا۔ انھوں نے خود اس مرض کو دیکھ کر منٹو ہاموں کو اشتعال برکے اور انھوں نے غضبناک آواز میں کہا۔ بڑا بڑ کوئی دوا یا تہ یہ کہہ کر انھوں نے اپنا منہ منکالی سے بند کر لیا۔

منٹو کا یہ اصل زہب تھا جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اُسے مڑا ہوا دیکھیں۔ منٹو ہاموں میں ہرگز غضب نہ ہوتا تھا۔ معلوم نہیں وہ اپنے خفاپ سے

ناراض تھے یا شرب سے۔ جو ان کی قبل از وقت موت کی ذمہ داری تھی۔

دیسوئس آنے سے پہلے موت ایک یاد دہاؤ انھوں نے اپنے منہ سے رنٹائی بٹائی۔ انھوں نے کتا مجھے ٹری سر دی لگ رہی ہے۔ اتنی سر دی شاید قبر میں بھی نہیں گئے گی۔ میرے اوپر اور رنٹائیاں مثال دوں کچھ اور توقف کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ انھوں نے آہستہ سے کہا: "میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے چمے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے لگا کر تھوڑی سی دوسکی منگا دو....."

شراب کے لیے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لیے ایک پورا منگایا گیا۔ انھوں نے توکل کو ٹری عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے: "میرے لیے دو پیگ بنا دو" اور کہتے ہوئے دوا اور شہرہ نقلی دوا کے باعث وہ کانپ سے اٹھے۔

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت بھی اپنے لیے رقم کا کوئی شاہجہ مزبور نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آچکا ہے لیکن ایک بار بھی اس کا ایک ٹکے کے لیے بھی انھوں نے اپنے اوپر چند باتیں نہیں ملاری ہوئے دی۔ انھوں نے اپنے بچوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ ننگام واپس یا وصیت کے کبھی کاکی نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لیے زندگی اور موت کے دو مابین حدفاصل بہت ہی بھم اور غیر واضح ہوتی ہے اور یہی جزا بھی چاہیے کہ چونکہ ان کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی جانے کا یقین ہو جاتا ہے وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ جتنے بولتے رہتے ہیں۔ جنت کرتے رہتے ہیں۔

بستر مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سرا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم سفر بھی بننے لگے تھے جس پر جسمانی فوج کسی صورت میں ممکن نہیں ہے جس طرح موت کے آگے کوئی انسان پیش نہیں پاسکتا۔ اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہوتے تھے۔ لیکن ان کی فطرت پر کد ہمیشہ سے باطنیہ تھی اس لیے انھوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انھیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں بھی گول نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے جہاں کوئی انھیں متاثر نہ دیکھ سکے جہاں کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔

ان سے کم دے کا ادنیٰ شاید ایک ڈولہائی موت کا اہتمام کرنا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا پھر چاکریں اس پر مضامین لکھے جائیں اور اس کے اعزاء و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی غرور میں تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن مرنے سے پہلے وہ منتقل ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا۔ لیکن منٹو ماموں یہ کار نہیں تھے۔ انھوں نے اس خواہش کا سختی سے مقابلہ کیا۔ ان کی موت کے وقت صرف ایک پلوٹو لائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منتظر۔ لیکن اس کا تاڑہ بھی مرکزی کردار کو پہنچ سکتا تھا کہ کوئی اس کو صحیح مضمون موت وہی کچھ سکتا تھا۔

یہ اس وقت محدود مرنے کا مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کی ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے۔ اور کچھ

مشکل بھی تھا کیونکہ انھیں صرف آتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کمانی نہ بھرنے میں اپنے سر کو ثبات میں جنبش دیتا اور شراب کا آخری جام انھیں پیئے کوہے دیتا۔ صرف یہی ایک جملہ ہر بات واضح کر دینے کے لیے کمانی ہوتا۔ سانپ اور انسان کی کمانی صرف اتنی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے منہ کے لیے کے باوجود ایک ڈہریا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں اُتار دیا، تو اس نے بھی سانپ کو پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر پیٹک دیا۔ ایمبولنس جیسے ہی دورانے پر آنکھری ہوئی انھوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چھوڑے کی ان کے منہ میں ڈال دی گئی۔ لیکن ایک قطرہ شکل سے ان کے منہ سے نیچے اُتر سکا جو کہ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے جوش و خروش کو کھوئے تھے۔ انھیں اسی حالت میں ایمبولنس میں لٹا دیا گیا۔ ایمبولنس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لیے اندر گئے تو منٹروا میں مچکے تھے۔ دوبارہ جوش میں آئے بغیر راستے ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

حامد جلال

منٹو کی موت

منٹو کی موت پر مجھے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا کیونکہ کچھ دنوں پہلے ہی سے میں نے یہ بڑی خبر سننے کے لیے جی کڑا کر رکھا تھا۔ مرنے والی زندگی کے آخری دنوں میں اُس کی کیفیت پر کمرے میں کس کے اُس تماشاگر کی سی ہر گئی تھی جو ٹکڑے بہت جلدی پر تیار پر پہننے کا خوف ناک کھیل دکھاتے دکھاتے تھک چکا ہو۔ اور ہر ٹکڑے کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ منٹو منٹو تھا کہ وہ کبھی نہیں گرے گا، مگر اُس کے ہاتھوں میں لڑکشی پیدا ہو گئی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ شخص کھیل رہا ہے اور کھیل منفریب ختم ہوا چاہتا ہے۔ منٹو زبان سے خواہ کچھ بھی کہتا رہا جو حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کھیل سے اُٹا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس سے غافل یا جائے۔ فحش نگاری کے سلسلے میں کراچی میں اُس پر جو آخری مقدمہ چلا، اُس کی کارروائی چند ہی ٹکڑوں میں ختم ہو گئی۔ منٹو نے نہ اپنی طاقت میں کوئی دھواں دھار تقریر کی، اور نہ تلافی پیشوں سے جنگا مری برپا کر یا۔ یہاں تک کہ احتجاج میں ایک لفظ بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ چپکے سے جہانم ادا کیا اور گھر کی ماہ لی۔

وہ مقدمہ بازی ہی سے نہیں ادب سے بھی بلکہ زندگی سے بھی اُٹا گیا تھا۔ وہ گھر میں بندھنوں، سماج کے دکھ دکھاؤ اور عام ڈیوٹی علاقے سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔ گراؤ کا وہ درجہ ہے کہ کمرہ دار انسان خود کشی کر لیا کرتے ہیں، مگر منٹو کارما سہا دم نہم آڑے آ گیا۔ اُس نے خود کشی نہیں کی۔ یہ اہم بات ہے کہ اُس نے اپنے کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو انجام کار خود کشی ہی کا مترادف بنا۔

ادب کے متعلق یہ حکم لگانا کہ کوئی چیز زندہ رہے گی اور کوئی مٹ جائے گی، بہت مشکل ہے۔ مگر منٹو کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک باقی کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا اور اُس کے کردار کے بغیر اس دور کی داستان ادب مکمل نہ ہو سکے گی۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ اُس کے ہم نوروں کو باوجود بسیار نویسی اور شہرت کے حاصل نہیں ہو سکا۔

منٹو نے آخری تحریر کے لیے جو بنیاد کی وہ سب ادبوں کے لیے، خواہ وہ کسی گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بہت خاکہ و مندرجات ہوئی ہے۔ اس سے ایک تو ادب پر احتساب کی گرفت اتنی کڑی نہیں رہی، جتنی کہ پہلے تھی، دوسرے کھٹے دالے چاہے کڑے چے کا ادب ہی کیوں نہ ہو پیش کر دے ہوں، مگر جہاں تک فن کے ساتھ غلوں اور صداقت برتنے کا تعلق ہے، وہ پہلے سے کہیں نڈا اور بے باک نظر آتے ہیں۔

منٹو کی ایک اور خصوصیت جو اُس سے دوسرے ادبوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ تھی کہ اُس نے ہر کبھی سیکنڈ ہنڈال

(SECOND FIDDLE) بجنے یعنی کسی کے ماتحت محض شگفتہ کا فرض ادا کرنے کی کوشش نہیں کی یہی وجہ ہے کہ اس نے خود کو کسی جماعت یا گروہ کے ساتھ منسلک نہ ہونے دیا۔ وہ اپنا راگ، بلکہ ریاست جیسا بھی وہ تھا، ایکلا ہی اپنا رہا۔ اُس کو نہ کسی کی اعانت کی ضرورت تھی نہ پردا۔ یہی وہ بے نیاز تھی جس نے زندگی میں اور ادب میں اس کے بہت سے مخالفت پیدا کر دیے تھے، مگر ان کی مخالفت اُس قبول عام کے سامنے مروج نہایت ہوئی، جو اپنی زندگی میں اُسے حاصل ہو گیا تھا اور جس میں آج اُس کے مرنے کے بعد اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

غلام عباس

منٹو کا ایک خط

داروم، السلام علیکم

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں لیکن میں تمہیں خبریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول میرے لیے نیا تھا، بہر حال اُس ماحول سے یقیناً بتر ہے جس میں میں نے ۴۲ برس تک بھلک ماری تھی — وہاں جب تک رہا سہی پہ لکھتا رہا۔

جب سے یہاں آ کر ہوں، نہ صغیر نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نکلت، ازربت اور نصرت میں سے کسی نے، وہذا اکثر یہ ہوتا تھا، آٹا، غلا، چنے، لادو، غلا، چنے، لادو، نصیب تو علم ہے کہ مجھے کئی چیزوں سے بے انتہا محبت تھی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی فرمائش پر بھی تلک نہ تھی کہ بنا پر پوری نہیں کر پا آ تھا تو غوں کے آسور دیا کر آ تھا، حتیٰ کہ بعض محسوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ کچھ کی ساگرہ تھی اور زیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا، قدرت تو مجھے ایسے انسان کش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی لیکن میں نے خود ایسے دوساں اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے جنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہاں جب تک وہاں رہا، آپ لوگوں ہی کھنوں میں گھلتا رہا۔ نہ صرت گھلتا رہا بلکہ بہتہ بہتہ مصدم ہی ہو رہا تھا میں بھی تمہارے ڈنگھوں اور غنوں کو اس لیے رقم کر آیا ہوں تاکہ آئے غلا نہیں تم سب کو منظم کی حیثیت سے یاد رکھ سکیں۔

میں یہاں ہر وقت یہی ڈمکایا کرتا ہوں کہ زندگی میرے تمام مصلحتوں اور غنوں کو مہلک نصیب ہو۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر کرتے دیکھی تھی، وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی، جب بھی کو وہاں سے آتا پڑا، تو نہ جانتے وہ کمرے چلے جاتا آپ کے تمام کھنے والوں سے تعلقات ہیں، جولاہوں میں موجود ہیں، اُن سے زبان کی کڑیں، جولاہوں سے باہر ہیں، انہیں بندرہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب میری بچوں سمیت میرے پاس آجائیں، میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں اس لیے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

نولمنے نے زبیری تھکی اور دوسرے اہل قلم کی تمہیں علم ہے، اگر ہم لوگ تمہارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے، منہ ہے، اکثر ظلماءوں سے ملاقات رہتی ہے، سب میری ہی طرح شہوے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمہارے غنائی، بابا کی شان میں ایسی ایسی جریات سپرد قلم کی ہیں کہ جب تک کہ کچھ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تمام لیا

جائے۔ سُنی ہی نہیں جاسکتی، اگر وہ چنچپ گئیں تو قصارے ہاں کے بعض سرسبز سے سر بازار ملیں گے۔
 بہر حال تجربات کا وہ تجربہ چنچپ بھی خالص نئی تھیں اس کا ایک نسخہ منور بھیجی گئے۔ نقوش میں اُس کا تبصرہ کر دینا۔
 قصارے ہاں کے ادیب اور قصارے ٹروسی ملک کے ادیب پھنچنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی میڈیوں والہ سبت
 کیے بیٹھے ہیں۔ وہ سراسر محنت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی میڈیوں کے پیٹ میں تو صحت سے خوش فہمی ملی تانے سے رہی ہے۔
 قصارے ہاں کی سیاست تو بڑی وطن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی دُزر ہے تو کالی جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا
 اور ساتھی غدار وطن بھی، تو آٹا کانا دُزر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر سرے سے حجاب چنچپ قصارے ہاں کی سیاست کے ہاتھ میں لٹک کر رہتے ہیں تو
 یقیناً بدنامیوں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تھیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے سہت ناشی کے غرم میں چلے تھے۔ ملائیکوں نے کوئی فٹن خیر نہیں لکھی
 تھی اس ضمن میں مجھ پر کیا حکم نہیں ڈھانڈے گئے تھے کبھی وارنٹ نکلتے کبھی گرفتار نہ ہوا۔ کبھی دوستوں سے اوصاف مانگ کر جواز
 ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ ادا کا نوہ لکھا تھا اگر میں کچھ دن اوروں میں رہ جاتا تو بہت نامن تھا مجھ پر قتل، شاکہ دہنی
 اور دُنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیے جاتے جہاں ناکارہ گناہوں کی مندرجہ ہو، وہاں کوئی سحر رہے۔

اگر حکومت کے خطاب سے بچ جائیں تو غدار بھی نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے خود بھلا
 ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے خود بھلا گئے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو گھڑے ہوئے افسانہ نویس اور گھڑے
 ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب گھڑی کی قوت سے محروم ہوتے ہیں، تو خیر میں غلطیوں جانتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا
 واسطے کا پروا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ نظم یا نثر میں لے کر بیٹھتے ہیں تو واقعی بھلی چیزیں سو سو عجیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان
 حضرات کو اپنی تحریر کے عجیب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان بے تحاشا گھنے پڑھوں سے بچانا، ایسا نہ ہو کہ میرے
 موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے نظم نیز کہیں اور میرے فن کی وہ فحش کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب بھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے، اُس کا اٹا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے
 سوا بھلا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے
 ان تینوں نقطوں کا صحیح استعمال کر لیا تو مجھ جیسے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اہل فکر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے اہل مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریر میں نہ تو اڑن پیدا ہو گا اور نہ حاکمیت کے
 ساتھ خلوص، جب فن کار کے دل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا۔ تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا، اس پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔
 یہاں شراب طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجیے، شراب طہور نوش کر لیجیے قصارے ہاں تو بڑی تھوڑا کلاس قسم کی شراب

نہ نقادوں کے ہاتھ میں منظر کے جوئیہات ہیں۔ مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترسیم کرنے کا حق بھی
 نہیں۔ (محمد طفیل)

ملتی تھی اور اُس بگر پاش شرب کے لیے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذیل تک ہوا دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ جبر جاتا تھا۔ احباب نہ موڑ دیتے تھے۔ دست تک چھوڑ کر انجان ہی جلتے تھے۔ اگر کسی سے ملے بیٹھ رہ جاتی تو وہ میرے منہ پر چھوٹی تھیں کیا کھا کر گستاخا کر میری جیب میں وحید تک نہیں ہے۔ حاکم کر میں جاتا تھا کہ اس کی جیب میں وحید چھوڑا تھے۔ وہ پچے ہیں کہ مجھے اس خازن خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں نے شرب کا نہ خراب اس لیے کہا ہے کہ اس کی بنا پر کئی بار خازن میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ چڑھے۔ یہاں بھٹی راکیاں ہیں وہ سب ہزاروں برس پانی ہیں۔ لیکن ان کھنڈوں کا جسم اور بائیس تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کو غلطی سماعت ہے۔ اس لیے کہ تم اس مسئلے میں نہ چند واقعہ ہوتے ہو تعادری چندیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پر وقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے کہ تعادری ہاں کی لاکیاں ان کے سامنے بالکل کھاس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمالی اور لڑکے تھی ہیں کہ تعادری ان کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اس کثرت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جاہزی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر اپنی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے غرض مند نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ میرے مقابلہ میں کا کوئی تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پیشاں کیا۔ بڑا بچتی باز ہے۔ کہنے لگا تو تو میرا چر ہے۔ میرے شعروں سے تو نے اپنے انساؤں کے خضار چٹنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ تو مجھے تو میرے شعروں کو دھڑکا اور میں کٹھی لسی کی کو میرے بارے میں جو غلطی کافی تھی۔ اس میں پہلے میری شکوگزاری کے انہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ اٹھی میری کزیریاں گھڑا کے رکھ دیں کہیں بڑا وہ تھا۔ ہنڈی باز تھا۔ جڑا کھینچتا تھا۔ اور اُس کی پادش میں چیل تک ہو گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

تھیں علم ہے کہ میں تمام کھنے دعوں میں صرٹ غالب ہی کو تو جاتا تھا۔ جب اس نے بھی مجھ سے ایسی لسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا صحت ہو سادت میں منظر تعادری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان۔ میری اتنی نزادتی کے باوجود گاڑی چھینتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ چلتے ہیں۔ اور بٹتے ہیں میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری انا پیدا ہو جاتی ہے تو غالب کہتا ہے میں تم سے بڑا انسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگا تھا۔ اور میں اُس سے کہتا ہوں شعر کہنا کو کسا کمال ہے مرزا صاحب۔ میری تو مڑکی ہر ہر سطح میں ایک شعر کا پودہ غزل کی غزل پنہاں ہو جاتی ہے۔ — بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کاظم اُسے بھی سچا اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

پچاسام کا وہ بہ تو تعادری ہاں دن دونی رات چو گئی تو کی کر رہا ہے۔ مبارک ہو! جڑوں کی عزت نہ وہ کافی پہلے ہے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں ہیں کہ تم اپنی سختی سی جان میں خطرہ میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر بھی سنی ہے کہ اب تو تعادری ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں۔ اور ہم سب انہوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے

اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی آہ آسانی بھی نہیں، ورنہ پچھتاؤ گے۔ حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے ملا دیوں میں دکھ دیا ہے۔

معصیت یہ ہے کہ میں یہاں سے چھاپاسم کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُس سے اپنی حدود میں رہنے کا انتظام ضرور کرتا۔ دُعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد یہاں تک آکر تقاری جان چھوٹے میں تو ان سے نفٹ ہی لوں گا۔ فراد کو فراد بھی پہنچاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی منسا ہے کہ جب سے یہاں آکر ہوں۔ تمہارے ہاں میرا اسوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہو گیا۔ اس لیے کہ جب تک میں وہاں رہا، سب نے مل جل کر مجھے پہنے ہاں سے دور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی لڑکچھ اپنی مرضی سے آگیا ہوں۔ تو ریلو پر اس ناچیز کی تشددی کے اعلانات کیوں کیے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریلو پر واسے ہیں جو مجھے پہنے ہاں تاک تک مصافحہ نہیں کرنے دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار دے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی ماتم کیوں کر رہے ہیں۔ ان کا بھیرے سے ساتھ یوسف کے بھائیوں جیسا سلوک تھا۔ ان حالات میں تمہیں اپنے اس منانقاہہ موت پر شرم آنی چاہیگا۔ یہاں میرے کچھ تعداد ان پیدا ہو گئے ہیں۔ اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے بارے میں اپنی سماجی رپورٹ پیش کروں، یہ فریضہ میرے سپرد اس لیے جڑا تھا کہ اسی کے خیال کے مطابق کچھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ٹوٹ کر مخالفت بھی کی ہے اور اس کا جو مبالغہ اندہی اندہ چل رہا تھا اُس کا بھی کچھ چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو دارلحی نہ منڈوانے کا دستور ہے وہ بعض استعینق قسم کی طبیعتوں پر لگاؤ گزرتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہوتی چاہیے کہ جس کا دل چاہے دارلحی رکھے جس کا دل نہ چاہے نہ رکھے۔ انتہی ڈرے حاکم کے سامنے تاکہ کر دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، ظاہری کا ٹھہر نہ تھا۔ تمہارے ہاں ایسی کوئی کھری بات کہہ دینا تو میری زبان گدھی سے نکلا دی جاتی۔

اطلاعات عرض ہے۔ یہاں میری کتاب گننے فرشتے کافی پسند کی گئی ہے۔ ہر کے قومی پیری پیری جڑوں کا خیال رکھنا۔

نیکسار

سعادت حسن منٹر

۲۰ مارچ ۱۹۵۵ء

محمد طفیل

منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط

میرے اور منٹو مرحوم کے تعلقات کی کہانی اٹھارہ برس پر پچھلی ہوئی ہے اور اس دوران میں منٹو نے اگر مجھے ایک سطر کا بھی خط لکھا ہے تو میں نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مجھے منٹو کی شخصیت سے بھی پیار تھا اور اس کے فحشے بھی عقیدت تھی اور ایک ادیب کے خطوط میں اس کی شخصیت اور اس کے فن کی جھلکیاں پکڑا س طرح یکجا ہو کر رہ جاتی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا (مجھے جتنی نصیر انور نے بتایا ہے کہ جن دنوں میں نے دس سالہ منٹو میلن میں منٹو کے نام ایک کھلی جھٹی گھسی تھی تو منٹو نے اس جھٹی کو پٹے سے بغیر ایک سطر میرے ان خطوط کا بتائی نکالا جو میں نے گزشتہ دس برس میں اسے لکھے تھے انہیں ایک ایک حکم کے ذریعہ تلاش کر دیا)۔

شعبہ ۱۹۳۷ میں انٹرنیٹ پر مرحوم کے توسط سے ہمارا اقدار ہوا اور چار برس کی خد و کتابت سلمہ ہمارے درمیان خلوص کا ایک ایسا دوستہ قائم کر دیا جس کے بارے میں منٹو کو شک و شبہ نہ تھا۔ یہ طور نگاہ ہا کہ اگر کسی ہم دونوں کی ملاقات ہو گئی تو یہ دوستہ ٹوٹ جائے گا۔ میری بکھرے ربات نہیں آتی تھی کہ منٹو اس انداز سے کیوں سوچتا ہے۔ شاید میرے خطوط سے اس نے زندگی اور اخلاق سے متعلق میرے نظریات کا اندازہ لگایا ہو اور اسے محسوس ہوا کہ ہم ایک ہی راہ پر گویا۔ — ستانی راہوں پر بھی نہیں چل سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب (منٹو منٹو) منٹو بھائی سے دہلی آیا اور مجھے ملتان سے دہلی بلا جیجا تو مجھے اس کے وہ تمام خطوط یاد آئے جس میں اس نے ہماری ملاقات کی خطبات کی کاغذ شہ ظاہر کیا تھا۔ میں دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر آ کر ہواڑے تاکنے والے کو رختی منزل کا پتہ بتایا تو وہ مسکراتے دکھائیے شخص میری بڑی سی گھیبے دار شلوار اور میرے اس کوٹ کے نظارے سے غفلت بردار رہا ہے جسے اگرچہ چٹکری پر پہننے کے لیے تیار کیا گیا ہے لیکن جسے میں نے شلوار پر دکھا رکھا ہے۔ ان دنوں میری صحت پہلو انوں کیسی تھی اور کو کچھ تھوڑا قسم کا آدنی تھا اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہے اس جسمانی تعامل نفس کے پیچھے پڑوں میں اور کشش پیدا کیا ہو۔ مگر کو کچھ ان کی مسکراہٹ کا راز اس وقت کھل گیا جب ہم اپنی منزل کے قریب پہنچے۔

میں دہلی میں پہلے بار آیا تھا اس لیے کو کچھ ان کے رحم و کرم پر تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کو کچھ ان کوئی غنڈہ ہے اور میرے اچھے اچھے ہم وطنوں کی طرح ہا کہ اس بازار میں اس کا لگا ہے جہاں ہر طرف ہار و نیم ہج رہے ہیں۔ بکھرے بالوں کا لپ اسٹیک سے چھپے ہوئے ہونٹوں کی چھاؤں چھا رہی ہے۔ خواتین کٹر گھون اور دیوچوں میں لڑیں جیسے نبرد اپنی جہاں پر اور کٹھی کے کھلاڑی اپنے دوستوں کے کندھوں پر بیٹھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک کھلے جڑوں کے ٹھکے اندے سے بھرتے اور ہان کی بیکس اور مچھائے ہوئے پھول بکھڑے ہیں اور کو کچھ ان کہہ رہا ہے کہ کوں میاں کیا آپ دلی میں پہلے بار آئے

ہیں؟ یہ چاؤڑی ہے۔ آپ نے چاؤڑی بازار جانے کو کہا تھا تاہم کہاں اُترے گئے گا؟

منٹو نے مجھے چاؤڑی بازار ہی کا پتہ لکھا تھا اور میں حیران تھا کہ کیا پنڈت کے بارام کو در سالہ نمودر کے دفتر کے لیے ساری دقتی میں چاؤڑی سے بستر کوئی جگہ نہیں مل سکی، لیکن اب لوگوں سے اس دفتر کا پتہ پتہ چھپتے ہوئے جھپک محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ تیاں یہاں رسالوں کے دفتر کہاں، یہاں تو دوسرے دفتر کھلے ہیں۔ تو میں سوئے جھینپ جانے کے اور کیا کر سکوں گا۔ میں نے سوچا کھاری باؤلی میں رسالہ ساقی کا دفتر ہے۔ وہیں بچتے ہیں مگر اچانک نمودر کا لہڑا نظر آگیا اور میں تانگے سے اتر کر اندر چلا گیا۔

میں نے منٹو کو پہچان لیا۔ وہ روبرو سے ٹائم ٹیکل میں سے اس گاڑی کا وقت دیکھ رہا تھا جس سے اتر کر میں چاؤڑی میں پہنچ چکا تھا۔ منٹو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ عام جسمانی صحت پر مبنی سی قلمی لکڑاٹھکوں میں چپک اور انگلیت میں سنوہاں تھا۔ شام کو چھ بجے دہلی کے ایک اشراف خانہ میں سنا ہال کی چوتھی منزل پر بندید اعظم منتقل کر دیے گئے، جہاں میں نے ایک مرشد ادیب کھانڈیکر کی قلمی کہانی "تھرم قہنہ" کے مطالعے اور انگلیت کھانا شروع کیے اور منٹو نے ان مکالموں اور گفتگو کو ٹائپ کرنے کا کام سنبھال لیا۔ دن بھر یہ تعلیقی اور تخلیقی کام کرتے اور شام کو نیچے بازار میں چلے جاتے، منٹو شراب پیتا اور میں پوٹو پیس کھاتا۔ دو تین دن کے بعد اس نے کہا: "تعامت کرنا احمد ندیم قاسمی، قلم بری شراب کے مقابلے میں آؤں گی یہ کڑی نہیں کھاتے ہوئے بھلے نہیں لگ سکتے۔ اور دوسرے دن اس نے کہا کہ تمہاری قلمی کہانے کے لیے شاید لطیف کو بران، دونوں علی گڑھ اور نونو دشتی میں ایم اے کے طالب علم تھا دہلی بلایا اور ہم سنا ہال کی چوتھی منزل پر دس بارہ روز تک مقیم رہے۔

میں اس دوران میں سوچتا رہا کہ آخر منٹو محض میری خاطر اپنی محنت کھوں کر رہا ہے۔ کہانی کھانڈیکر کی ہے، مکالموں اور گفتگو کا معاوضہ مجھے ملے گا مگر منٹو کیوں دن بھر بیٹھا دھڑوں منٹو ٹائپ کر ڈالتا ہے بلکہ اکثر قلمی تخلیق کے سلسلے میں میری مدد بخانی کرتا ہے اور بعض جیسے سین قمراس نے خود ہی لکھ کر ٹائپ کر ڈالے ہیں۔ یہ عجیب ہے کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے مگر نکل دیتا ہے کہ مجھے حیثیت سب اسپیکر بکری صوف ساٹھے بستر روپے پانچ تھپے میں گریں گی تو یہ جانتا ہوں کہ منٹو اپنی کے بہت دوزخ معصوم کی ادارت کا حق انھوں نے صرف پر پاس روپے پانچ کی صورت میں حاصل کرنا ہے۔ پھر وہ کوٹا بند ہے جس نے منٹو کو اپنی سے دہلی لا کر اسے میری خاطر اذیت و حسد مشقت پر مجبور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبات اس لیے لوث محسوس کا تھا جو منٹو کی اور میری افتاد و بیچ میں واحد قدر مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دوسرے سے پیارا اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کے سوا ہم اپنی اپنی زندگی کی بیشتر سرگرمیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے، جہاں کہ اس واضح اختلاف کے باوجود ہمارے دو استاد تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے شکایتیں ضرور تھیں اور ان شکایتوں کا حل ادا طمانی اظہار ہی ہوتا رہا۔ مگر ہم جب بھی ایک دوسرے سے ملے میل وصل گیا اور ہم آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کے منٹو اور نونو ہم ملے۔

منٹو سے میری دوسری ملاقات اس سے لگے سال ہوئی۔ وہ بمبئی کو چھوڑ کر مستقل طور سے دہلی آ گیا تھا۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور نکلسن روڈ پر بس بلڈ ٹانگ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان دنوں دہلی ریڈیو سٹیشن میں

اُردو کے بہت سے ادیب اور شاعر جمع تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت شاید غور سیکشن سے متعلق تھے۔ ان کے علاوہ کرنی چندرا میراجی، چندر ناتھ اشک اور بی۔ ایم۔ سادھ بھی موجود تھے۔ اُردو شاعری کے نئے دھاتات کے نمائندہ شعرا کوثر لودالوں نے دہلی کا اقبال انشیرم جوم اس محفل کے صدر بنے اور شکرانے محفل میں فیض احمد فیض، حبیب اللہ جری، راشدہ میراجی، مجاہد تصنیف حسین خالد، دیباک مرحوم، روش صدیقی اور سائر نکلائی کے ناموں کے علاوہ اپنا نام یاد کروایا ہے۔ شکرانہ فن ان دنوں انتہائی وسیع پیمانہ پر صحت بھی بری نہیں تھی۔ طبیعت میں شرمیلی اور بے باکی تو ہمیشہ سے تھی لیکن ان دنوں اس شخصیت کے یہ پہلو بھی اپنے عروج پر تھے۔ ایک دن اچانک بولا۔ آؤ، آؤ، آؤ، فنا حیف صاحب کو چھڑیں۔ پھر وہ بھری محفل میں حیف صاحب کے پاس گیا اور نہایت ادب سے بولا۔ شاہنشاہ اسلام کے ایک شعر کے سلسلے میں آپ سے استفادہ کرنا ہے۔ بہت گرا شعر ہے۔ آپ نے فلسفے کا کوئی نمونہ نظم فرمایا ہے۔ میں نے ہزار ہا سرا اور پڑھے کئے دوستوں سے بھی مشورہ کیا مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ آپ کا وہ شعر ہے۔

یہ دلا جو کہ بھیجا ہے وہ دلا کی جو کہ بھیجی ہے

یہ پیہر کا بیٹا ہے وہ پیہر کی بیٹی ہے

ساری محفل کشت زعفران بن گئی اور حیف صاحب بھی مسکرا کر ٹال گئے۔

پھر ایک دن منو نے مولانا چراغ حسن حسرت کو چیلر نے کا پر دو گرام ہٹایا مولانا شاید میراجی کے کمرے میں تھے۔ کرنی، اشک اور میں منو کے ہمراہ ان کے پاس پہنچے اور منو نے بیٹھتے ہی علامہ اقبال پر برستا شروع کر دیا۔ بانگ درا کے پہلے حصے نے آگے کے اقبال کو میں شاعر کے بجائے مولانا سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بھی کوئی شاعری ہے کہ فلسفے کے نظریات کو نیز کسی مقصد کے نظم کہتے جاؤ اور ہر نظریے کے گوشے کے کالر میں خودی کا پھول سماتے چرو۔ پہلے تو مولانا حسرت صاحب نے اقبال کی عبارت میں چند نہایت خوبصورت باتیں کہیں مگر انھیں منو کے توروں سے اس کی نیت کا جلد ہی پتہ چل گیا اور انھوں نے اسی اسی شگفتہ چنگیاں مینا شروع کہیں کہ منو کی تجویز کے مطابق ہم وہاں سے سوچنا بھاگ آئے۔

میں چند روز منو ہی کے ہاں رہا۔ منو کے گھر میں مجھے سلیقہ، صفائی اور سادگی کا وہ معیار نظر آیا جو بڑے بڑے گھوڑوں میں بھی محض ذوق الطیف کی کمی کے باعث غائب ہوتا ہے۔ منو کے کھنڈے والے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بھجارت، فٹ ڈیزائنڈ ڈومچے ڈیسک میں منو کے مسرورے بند بوتے۔ اتنی ہی بلندی پر منو کا لانا پ داٹر دکھاتا تھا کہ میں نہایت سلیقے سے ایک بے سیلف سیدھی رتبیں اور گورا چٹا منو سفید براق لباس پہنے وہاں بیٹھا کھتا اور ٹاپ کرتا نظر آتا۔ وہ اپنی خراب کی بوتلی کو بھی اس ڈیسک کے نیچے چھپاتا تھا۔ اس لیے کہ ان دنوں منو کی بڑی بہن اس کے ہاں مقیم تھیں اور منو کہتا تھا کہ اس پر غصہ نہیں سے ڈرتا ہوں اور پھر آج کل کے بچے اتنے تر ہیں کہ انھیں جبر با سمجھا دیا جائے کہ اس بوتل میں تیل بھرا ہے۔ وہ بھٹی بیٹی آنکھوں سے اُسے گھنورے جائیں گے۔ سوان سے بھی چھپانا پڑتا ہے۔ وہی صفت توجہ اُس نے دیکھا ہے کہیں چھوڑ نہیں سکتا تو اس نے ایک بیچارہ مقرر کر دیا ہے اور اس بیچارے سے میری سیری نہیں ہوتی۔ سو یہ فرادہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

منو کے مکان کی اس نہایت خوبصورت سادگی سے مجھے حیرت کا ایک اور اہم یاد آ گیا ہے۔ منو میرے پاس آیا۔ ہم

ڈرائنگ روم میں بیٹھے چند منٹ تک باتیں کرتے رہے کہ اچانک اس نے چونک کر کہا معلوم ہوتا ہے اس کمرے میں تازہ تازہ سفیدی ہوئی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ سفیدی کو میں ایک ہفتہ ہی گزرا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ تم شاعر ہو کر ایسی عجیب سی سفیدی کو برداشت کیجے بیٹھے ہو۔ میں نے اُسے اطمینان دہی کہ سفیدی خود میں سے کی ہے۔ اس لیے عدم برداشت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر مجھے اپنے گھر سے گیا اور اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بولا۔ سفیدی اس کے کتے چس آتیسری رت پر خود منوٹے مجھے وہیں بلا بھیجا۔ خواہ اور کتنی چند نے یہاں کے نام سے ایک فلمی کہانی فلمی تھی اور مجھے اس کے گیت لکھنا تھے۔ مجھے کوئی ایک مہینہ منوٹ کے ہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں منوٹے مجھ سے ریڈیو کے لیے ایک طویل آڈیو ریفریف منوٹ لڑا۔ اُسے بھی لکھوائے۔ انہریت کے مسئلے میں ریڈیو کے حکام سے خوب مذاہیاں کیں۔ پھر جب مجھے غامض منوٹ کے نام دیا گیا تو مجھے چاندنی چک میں لے گیا۔ وہاں اُس نے ایک امرتھی وکانڈا سے میرے لیے تیلوں اور کوٹوں کے کپڑے خریدے۔ وہ تین دنوں میں میرے پاس تیار ہو گیا اور یوں میں نے زندگی میں پہلی بار تیلوں یعنی اورٹائی لگائی۔

پرو تھی ملاقات نو تو پر قد سے کے مسئلے میں ہوئی جب منوٹ یعنی میں تھا اور میں ادب لطیف لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ پانچ برس ملاقات اندر کی ناراضی میں بعض اتفاق سے ہوئی۔ جب میں سربراہ کے خلاف ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا اور خود مستقل طور سے لاہور آ گیا تھا چند دنوں کے بعد وہ پشاور میں میرے پاس پہنچا اور وہاں چندہ میں روز تقیم رہا۔ چار سے نظر لاتی اختلاف کی ابتدا وہیں سے ہوئی۔

ہم دن بھر ایڈیٹر شیشن میں گزارتے، شام کو منوٹ کسی نہ کسی شخص کو اپنے ساتھ لے آتا اور پھر شراب کے گھر پہنچتے۔ ادب میں حقیقت اور میں پر یکٹیں پر منوٹ ہنر کو ان تمام مقدمات پر عبور حاصل تھا جو دنیا کے ٹرے ٹرے مالک میں مختلف ادیبوں پر عریانی کے الزام میں چلائے گئے۔ وہ ان مصنفین اور ان کی تحریروں کی شالیں دیتا اور اُس وقت اس کی زبان اتنی تیز ہوتی کہ اس پر ایک غلغلہ اور متحرکادھوکا ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا تاہم لاشانی نے موبیاں کے کسی افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر موبیاں کو اپنی نگلی سے روٹی کو مناتے ہوتے دکھاتا تھا تو کیا اتنا کہ دنیا کافی نہیں تھا کہ وہ خدا ہی تھی۔ یا پہلے یہ بھی کہ دیکھیے کہ وہ نہا چکی تو اس کے جسم پر پانی کے بے شمار قطرے تھے وہ گئے۔ لیکن موبیاں کو یہ ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ پانی کے ان قطروں کا رنگ ہر روٹی کے جسم کی رنگت کی طرح جگہ جگہ لگائی تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں لذت کی ابتدا ہوئی ہے۔ اور یہی من کر منوٹ جھڑک اُٹھا۔ جو لا تم کیا جانو عورت کے جسم کے راز۔ تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم نے تو شراب تک نہیں چمکی۔ تم تو اُس روز چاؤڑی میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راج ہنسوں کے جرم میں کسی گھس آئے۔ تم کیا بدلو موبیاں نے قطروں کی رنگت کا اظہار کروں ضروری تھا۔ اگر وہ رنگت کا ذکر کرتا تو یہ عورت کسی چٹنی چٹنی اور سپاٹ لگتی۔ ان لگاری قطروں ہی نے تو اُسے زندگی کی شگفتگی دی ہے۔ تم کہناؤں کی کہانیاں لکھتے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ تم کہناؤں عورتوں کی نفسیات کو بھی سمجھ سکو۔ عورت پر لکھتے وقت عورت ہی جانا پڑتا ہے۔ اور کبھی تم تخلیق کے لحاظ سے عورت بنے ہو۔ تمہیں کبھی کسی نے چھیڑا ہے؟ کبھی کسی نے کسی نے تمہارے جسم پر ہاتھ رکھا ہے؟ کوئی کبھی تمہاری محسوس کی ہے؟ تمہارے اعصاب بھی اس آہنی لمس کے

مضرب سے بھی جھنجھٹائے ہیں، سو میری جان بے لاشانی ہو گئی تھی اسی طرح گاندھی چنبرہ آزما تھا مگر کیا تھا سارے خیال میں اس نے اپنی رائے کرشنا کے ننگے پاؤں پر لکھتے ہوئے وہ کیفیت محسوس نہیں کی ہوگی جو مرہاسا نے اپنی سیروش کے سہم پر لپٹی کے گلابی قطرے دیکھنے میں محسوس کی؟ سنا احمد خیریم کا قاسمی بات یہ ہے کہ تم ادب کے فوری خواجہ اور مرہاسا کے وزیر داخلہ ہیں۔ ہماری اپنی اپنی باتیں اور اپنی منزلیں ہیں نہ ذمہ منظرین نہ مکتبہ بے لاشانی ملاشانی ہے اور مرہاسا میں مرہاسا ہے۔ اور میرے خیال میں میں نے ایک پبلک زیادہ چڑھایا ہے، چلادب سربانی۔

ان دنوں میں نے تیرہ کر یا کر منظر سے اس کے بعض افسانوں کے طریقوں کی حیرانی کی حقیقت تسلیم کلاں میں چنے جھاڑوں کے پیچھے چڑ گیا اور آخر ایک روز منظر ایسی سطح کلائی پیا تر آجاس کلاں میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اُسے وہیں پشاور میں بہت زیادہ شراب پینے سے روکا تو وہ تنگ آکر بولا تیر میرا پیرا پیرا غریب معاملہ ہے اور تم میرے دوست خیر برگر میں نے تمہیں اپنے غیر کی سجد کا امام مقرر نہیں کیا۔

دوسرے ہی دن اُسے اپنے اس غریب رت فقرے کی حقیقی احساس ہو گیا کیونکہ اس کی باتوں اور تمہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے منارہا ہے۔ پھر یہاں لاہور میں جب ہمارے درمیان بیٹوں تنگ کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک دن میرے پاس آیا۔ مجھے اپنے کمرے گیا اور اندھا صوفی کرشنا سے لے کر ۱۹۳۲ء تک کی تمام باتوں کو اپنی تفصیل سے دہرانا رہا کہ میں اس کی بے پناہ یادداشت پر حیران ہو گیا۔ پھر وہ بولا تیر باتیں ٹوٹ کر میری جان، شاید چند دنوں بعد تمہیں یہ مرحوم منٹو کی یاد میں کھنڈا پڑیں تیرہ سن کر میں خلاف معمول آپ سے باہر ہو گیا اور میں نے یہ سوچے بغیر کہ منٹو کتنے ہیں بے گناہ شروع کیا۔ اگر آپ کو میری دوستی اتنی عزیز ہے تو پھر آپ کو شراب چھوڑنی پڑے گی۔ آپ تو باگوں کی طرح پیتے ہیں کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں گھر میں آپ ہی رہے ہیں اس میں گنت پٹی بھی رہتی ہے۔ یہ وہی پٹی ہے جس کی ایک نہایت ساری تصویر آپ نے بیٹی سے مجھے بھیجی تھی اور جو میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ آپ تو اب کے وزیر داخلہ ہیں لیکن کیا آپ گنت کے اس داخلی رد عمل کو بھی سے محسوس نہیں کر سکتے جو چند برس کے بعد آپ کو اس کیفیت میں دیکھ کر اُس کے ذہن پر مارا ہوگا؟ ہمارا گراں آپ کو اس بات کا احساس نہیں تو آپ اپنے آپ کو ادب کے وزیر بنے ننگے ان کا کیسے کیونکہ جو ادب صرف اپنے اندر بند رہتا ہے۔ اور منٹو نے کہا کہ اس فراڈ کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔ اور اس کے بارے میں مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی ذات کے تحولات میں دخل دینے کا مجھے کوئی دور دراز کا بھی حق حاصل نہیں۔ میں خفا ہوئے بغیر یہ آیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کل ہوش میں آکر ان باتوں پر کھینٹے گا۔ مگر وہ نہیں کھینٹا یا بلکہ چند روز بعد سوراخ ملاقات ہوئی اور میں نے شکایت کی تو معلوم ہوا کہ اس روز جو کچھ اس نے کہا تھا وہ حرف آخر تھا۔ اور وہ نشتے کی نہیں، ہوش کی باتیں تھیں۔

تب میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس دور میں میں گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی مگر حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ منٹو کو اپنی اہم پسندیدوں میں میری رفاقت گوارا ہے اور نہ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ ختم ہوتے

دیکھوں اور کہ نہ لوگوں میں نے بولی کروں کیا تھا۔

کتاب مجھے پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے بڑی دلکھائی تھی۔ میں اس کا پروردگار بن کر کیوں نہ بیٹھ گیا۔ میں اس کی جڑیاں اور گایاں تک ہستا مگرا سے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا۔ اسی صدم میں اس کے گھرانے کے افراد اور اس کے خدینک نفس دوست میرا ساتھ دیتے۔ اور ہم سب مل کر قوم کی اس تباہی کو تھیلنا بدبو پونے سے پہاڑیٹھ اور منٹو نے ایک بار مجھے یہ بھی تو گھماتا تھا کہ مجھے آپ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ سو اب دوا تم میرے سپرد ہو گئے ہیں۔ ایک منٹو کا اور دوسرا اپنی عورت نفس کے تحفظ کے ڈھونڈ نکلا۔

آج میں منٹو کے چند خطوط ایک حکیم فی ٹار کی ایک شایستہ بیماری یادگار کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ منٹو کے کوئی ایک مخط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۹ء تک کے منٹو کی شایستہ کی جھلکیاں جمع ہیں۔ میں انہیں کتابی صورت میں بھی بچانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور ان کے حقوق منٹو ہی کے نام محفوظ ہوں گے، مگر یہ سب خود فرمایاں اور جی بھلا ہے ہیں کیونکہ یہ میں کسی وقت بھی میرے غیر سے نہیں نکال سکتی کہ میں نے اور میرے جیسے کتنے کم جت اور شکست خوردہ خیر خواہوں نے منٹو کو زندگی کے ورانے میں یوں اکیلا چھوڑ دیا تھا کہ

نے ہاتھ پاگ پر سے نہ ہاتھ رکھا اب میں

(۲)

معرفت بہت روزہ سماج
۳ پیر خان اسٹریٹ بمبئی ۴۰
۱۰ مئی ۱۹۳۷ء

ملاؤ مکرم

وعلیکم السلام۔ آپ کا ادریش نامہ اس سے قبل میں آپ کی خدمت میں ایک خط روانہ کر چکا ہوں مایہ ہے وصول نہ پایا ہو گا۔
نامک سے واپس پر میں دستور سے ملٹھ ہو گیا تھا اور یہ بات کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کے متعلق میں کچھ کہوں یا سنوں۔ ایک
دستور سے میرے تعلقات دوستانہ ہیں۔ ملٹھ ہوئے پر بھی میں ان کے قریب ہوں۔ یہ میری حقیقت ہے۔

آپ کی اسٹوری میں سب سے بڑی غامی ہے کہ وہ ٹکلی نہیں۔ وہ ٹکلی کس طرح نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے
کئی صفحات درکار ہیں اور میرے خیال ہے کہ یہ صفحات لکھ کر بھی میں آپ کو اپنا تذہ بطریق جس نہ سمجھا سکوں گا۔ شاید میں اس سے قبل
عرض کر چکا ہوں کہ ٹکلی خسانہ نگاری کو کہنے کے لیے اسٹوری برتری استاد ہے۔ آپ پرشے پر غلوں کو بغور دیکھ کر بھی کچھ بہت حاصل کر سکتے
ہیں مگر پھر بھی سینا ہال میں چند خصوصی نقطوں پر روشنی ڈالتے دلا کر ہر دن پانا بیجے۔

آپ اچھے افسانے لکھ سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے آپ کے بے گناہ سے ہو گیا تھا۔ مجھے بہت کم افسانہ یاد ہے جس میں مگر
آپ کا بیے گناہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ چند معمولی خامیوں کے باعث آپ کا بہترین افسانہ تھا۔
گو میں خود حوصلہ ہاں تاد تھا ہوں مگر میری استعداد ہے کہ آپ ہرگز حوصلہ نہ ہاں۔

مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں ماس لیے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دلی میں
میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کمزوریوں کے باعث مجھے کئی حد سے اٹھانے
پڑے ہیں۔ میں اسی تلخ حقیقت کے پیش نظر شاید آپ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی رائے مرتب نہ کریں۔

میں یہی میں پچاس روپیہ ہارواں گا یا ہوں اور بے حد فغول خرچ ہوں۔ مگر آپ یہاں بے اثر تو میرا خیال ہے کہ ہم
دونوں گزر سکیں گے۔ میں اپنی فغول خرچیاں بند کر سکتا ہوں۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا کامل احساس ہے، اس لیے کہ میں ان
مجبوریوں سے خود گزر چکا ہوں۔ میں آپ کو کوئی روانہ کر دیتا اور وہ نہ کر سکتا تھا، اس لیے کہ اچھی اٹھ لکھ دے ہوئے میرے پاس پانچ
سودے تھے اور اب یہ حالت ہے کہ صرف بیس روپے باقی ہیں۔ مجھے کتابیں خریدنے اور دوسری روپے زیادہ کرنے کا خطہ ہے
اور میں اس سے نطف اٹھا تا ہوں۔ خیر از مذکر رہے تو دوسرے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا سکتے ہیں مگر یہ بات

یاد رکھیے کہ آپ بری زندگی کی دھوپ چھاؤں میں رہنا ہو گا میرے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ہم دونوں رہ سکتے ہیں کھانے کو لے نئے مگر آپ کو کتابیں پڑھنے کے لیے مل جایا کریں گی اور اگر آپ کوشش کریں گے تو بہت ممکن ہے کہ ابھی اچھی کتابوں کے ساتھ اچھے اچھے کھانے بھی مل جائیں۔ اگر میرا آپ کا کھانا ہوا انسان کوئی ظلم نہیں کرے تو دو تین مہینے عیش میں گزار سکتے ہیں۔ کیسے کیا راہ وہ ہے؟

”سناج تمہارے چہ نہیں۔ یہ پرچہ دراصل میرے ایک عزیز دوست یہاں سے نکال رہے پہلی بلور شائع ہو گئی ہے، آپ کے پاس بھی پہنچ جائے گی۔

آپ کی نظم میں نے ہزاروں میں پڑھی ہے۔ افسوس ہے کہ نہ مجھے شعر چڑھنا آتا ہے اور نہ میں اُن کو (APPRECIATE) کر سکتا ہوں۔ چونکہ آپ نے بھی جہاں سے یہ یقیناً ابھی ہوئی۔ شغل کے متعلق رائے عاید کا شکریہ۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

۱۴۔ راجہ فی محمد پورہ

کلیر روڈ بی بی عث

نوبر شہزادہ

براہ کرم

و علیکم السلام۔ آپ کا افسانہ کتنی اور تصویر کا شکریہ۔ آپ کو واقعی اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔

”نومانی کے انستہ آپ نے پسند کیا۔ شکریہ۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ اسے پسند کریں گے میں نے اس کو کھتے وقت انسانی کوشش کی تھی کہ کوئی غلط فہمی نہ پھیلے اور جیسا کہ آپ نے اپنی رائے میں لکھا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں۔

جہاں سے ادبی مسائل صحیح ادب کے تحمل نہیں ہو سکتے، اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا۔

چندی دینا استروں اور نیک دل بیروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اب ایسی داستانیں نغزل میں کیوں نہ لکھی جوت کا دل کھول کر بتا جائے جو اپنے چنی چنے انوش سے نکل کر کسی دوسرے مرد کی نغزل گمارہی ہو اور اس کا چنی کرے میں بیٹھا سب کچھ ایسے دیکھ رہا ہو گویا کچھ ہوسری نہیں رہا۔

زندگی کو اُس شکل میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ وہ جیسی تھی، یا جیسے ہوگی اور یا جیسے ہونی چاہیے۔
”ذوالی قمر“ میں کیا آپ نے تو کمالی کھو دیے ”پڑھا۔ اُس کے متعلق آپ کی کارائے ہے۔

آپ کے گیت خوب ہیں خاص کر جو گی سوگی والا۔ اس میں ایک مصرع ہے۔ تو کیا جانے کس کی خاطر۔ اگر کس کی خاطر کے بجائے کس کے کا دل ہو جائے تو میرا خیال ہے کہ آپ کے گیت میں خاطر کا تیز اثر نکل جائے گا۔ مجھے آپ کے افسانے کا انتظار ہے گا۔

میری صحت اب قدرے اچھی ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ میں نے نظم کے لیے ایک افسانہ تحریر کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ افسانہ لکھ کر رک گیا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے مطالعہ کے لیے بھیج دوں، شاید آپ کوئی دلتے دے سکیں۔

شکسار

سعادت حسن منٹو

۱۷۔ اٹلی کی صحیرہ

کلینر روڈ۔ بمبئی ۷۰

۳۰۔ جنوری ۱۹۵۷ء

برادر کرم

و علیکم السلام جس روز آپ کا خط ملا میرا دل بہت اچھا تھا۔ آپ کے تعریفی الفاظ سے مجھے نواہ ہو گیا۔ میں لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ میں اپنی تعریف سے خوش نہیں ہوتا لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے افسانوں کی تعریف کی تو اللہ میں غور سا ہو گیا۔ مگر کسی سے کیئے گا نہیں کہ مجھ میں یہ کمزوری ہے۔

کل رات سے میرا دل ٹھیک نہیں طبیعت پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب و غریب مکان سی ملاری ہے۔ میں اس اضمحلال کا سبب جانتا ہوں مگر اس سبب کے پیچھے اتنی چیزیں کارفرما ہیں کہ میں فرداً فرداً ان پر غور نہیں کر سکتا اور اجتماعی صورت میں یہ ایک دُشمنی معلوم ہوتی ہیں۔ میں دراصل آج کل اس جگہ پہنچا ہوں جہاں یقیناً افسانہ نگاری میں تیز نہیں ہو سکتی۔ جہاں آپ سمجھتے تھے جلی ہیں اور نہیں بھی سمجھتے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کی ساری کی ساری عقل میں چلی آئی ہے اور بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم باقی کے جسم پر چڑھ کر بیٹھ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا (COMPLEX) ہے جو فکروں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اس سے دلچ اور دلچ کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس ایک ایسا سوچ بورت آجائے جس سے میں سب خواہشوں و شہنیوں پر یاد کو سکوں جس وقت چاہوں گھسپ اندھیرا کروں اور جس وقت چاہوں روشنی کا سیلاب بہا دوں۔ کیا ایسی چیز مل جائے گی؟ — کچھ کہا نہیں جاسکتا

کچھ بھی مجھے اطمینان نصیب نہیں ہے۔ میں کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہر شے میں مجھے ایک کئی سی محسوس ہوتی ہے
میں خود اپنے آپ کو ناقص سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ ہوں، جو کچھ کر
اندھے اور نہیں ہونا چاہیے اس کے بجائے کچھ اور ہی ہونا چاہیے۔

عشق و محبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہزادہ نعت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہزادہ سے الگ کر کے میں دیکھتا
ہوں کہ وہ چشمہ کی ایک صورتی رہ جاتی ہے۔ مگر یہ ٹھیک بات نہیں، میں جانتا ہوں، نہیں میں جانتا چاہتا ہوں کہ پھر آؤ کیا ہے؟
— کیا ہونا چاہیے؟ — اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہو گا؟

لیکن میں غور توں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا ہے۔ عورت
کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہو سکتا — کس قدر افسوسناک چیز ہے کہ غور توں کے بارے
میں ہم کو کبھی ہم آہنی کے بارے میں کوئی دانے قائم نہیں کر سکتے۔ محنت ہے اسے ملک پر غور توں کو ہم سے ملنے کے لیے روکنا
..... مگر..... مگر کیا ہے؟ — کچھ بھی نہیں! — سب بکواس ہے۔

آپ کے عزیز کی ناگہانی موت سے بہت صدمہ ہوا۔ خدا آپ کو صبر عطا فرمائے۔
آپ سے ملنے کو بہت ہی چاہتا ہے۔ اگر ہو سکے تو اس خط کا جواب جلد بخود دیجیے گا۔
(MUD) میں نے لکھ لیا ہے۔ مگر کالہ لکھنا باقی ہے جو درمیں لکھا جائے گا۔ آج گزشتہ اپنے افسانوں کی ترتیب میں
مشغول ہوں۔ کتابت شروع ہے۔

فیض صاحب آپ کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ وہ آپ کی نگاہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انہیں
طور پر اس کا ڈیزائن بناتے ہیں۔ تازہ پرچے میں آپ نے آپ کی نظم کو شیت خوبئی سے (ILLUSTRATE) کیا ہے۔

ادب لطیف میں آپ کا منظوم مکالمہ پڑھا۔ بہت خوب ہے۔ آئندہ پرچے میں اس پر ریویو شائع ہو رہا ہے۔
یہ راجندر سنگھ صاحب بیدی کوں ہیں؟ — یہ بھی مٹی کے ڈھیلے معلوم ہوتے ہیں خوب لکھتے ہیں، ان کے افسانے
آپ غور سے پڑھا کریں۔ ادب لطیف کو آپ اور بیدی صاحب پر نازاں ہونا چاہیے۔

دفتر میں کمال اتما ترک فیر کی ایک کاپی بھی نہیں بچی۔ بہر حال آپ کے لیے بڑی مشکل سے ایک پرچہ حاصل کیا گیا ہے
جو کل بھیج دیا جائے گا۔ دفتری کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ آپ کے پرچے کا پکٹنگ احتیاط سے کیا کرے۔
خیر صاحب اور غلط آپ کو آداب عرض کرتے ہیں۔ یہاں ہم سب لوگ آپ کی باتیں کیا کرتے ہیں۔
افسانہ ضرور بھیجیے گا۔

”جہانوں کے تازہ پرچے میں (دفتری) میں یہ آئینہ پڑھ کر اپنی راستے سے آگاہ فرمائیے گا۔
میں بخیریت ہوں۔ امید ہے کہ آپ بھی بصحت ہوں گے۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

۱۰۔ راجہ لعل علی خاں
کلیئر سڈ ہسپتال
۱۲ فروری ۱۹۵۷ء

میرزا ذبیحہ

محبت نامہ ملا۔ خیرلوں کا شکریہ۔ میں اس کے آگے ہی قسم کے چند اور رسمی الفاظ لکھنے والا تھا کہ آپ کے خط کی درج ذیل سطر پر نظر پڑی۔

کبھی کبھی خیال آ آجے کہ کیوں نہ اپنی زندگی کو بد پرہیزوں کی نذر کر دوں۔ میں اپنی زندگی کا سچا معتبر بد پرہیزوں کی نذر کر چکا ہوں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے پرہیز نہیں کیا۔ اب تو یہ وقت آ گیا ہے کہ بد پرہیز لفظ ہی میری دلکھتری سے غائب ہو گیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر بد پرہیز میں گزاری جائے تو بھی قید ہے، اگر بد پرہیزوں میں گزاری جائے تو بھی قید۔ کسی نامی طرح ہیں اس آونی جراب کے دھاگے کا ایک سرا پکا کر اُسے اُدھڑتے جانا ہے، اُدھڑ میں اپنا کام اُدھڑ سے زیادہ کر چکا ہوں۔ باقی آہستہ آہستہ کروں گا۔ اس لیے میں بہت جلد مزہ نہیں چاہتا۔ جس روز مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کیا ہوں تو موت کو بڑھانے میں کوئی پس و پیش نہ کروں گا۔

میرزا زندگی ایک دیوار ہے جس کا پستر میں ناخنوں سے کھرتار پڑتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام ریشیں پرانہ کر دوں، ابھی یہ بچوں آ آجے کہ اس بچے کے ڈھیر پر ایک نئی طارٹ کھڑی کر دوں۔ اسی اوجھڑ میں نگار پڑتا ہوں۔ دماغ بوقت کام کرنے کے باعث پتہ نہ رہتا ہے، میرا مارا دل دھڑ دھڑات ایک ڈگری زیادہ ہے جس سے آپ میری اندرونی تپش کا اندازہ رکھ سکتے ہیں۔

میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر نقابست، — وہ مستقل تھکاوٹ جو میرے اوپر عادی رہتی ہے کچھ کرنے نہیں دیتی۔ اگر مجھے تھوڑا سا سکون بھی حاصل ہو تو میں وہ کچھ لکھ دیتا ہوں جو رسات کے پتنگوں کے ماتہ اڑتے رہتے ہیں مگر..... اگر اگر..... کرتے ہی کسی روز مراؤں گا اور آپ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں گے منظر کیا!..... منظر تو مر گیا ہے..... مگر انفس اس بات کا ہے کہ منظر کے وہ خیالات بھی مجاہدیں گے جو اُس کے دماغ میں محفوظ ہیں۔

اگر کوئی صاحب میرے ساتھ مدد مکی کی کہ وہ میرے دماغ میں سے سارے خیالات نکال کر ایک بوتلی میں ڈال دیں گے تو منظر آج مرے گا تو وہ ہے۔ منظر، منظر کے لیے غذا نہیں ہے..... مگر اس سے کسی کو کیا؟ — منظر ہے کیا بلا؟ — چھوڑیے اس فضول قہقہے کو — آئیے کوئی اور بات کریں۔

کوشن چند صاحب خوب لکھتے ہیں۔ ہالوں، ادبی دنیا وغیرہ میں ان کے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

آپ کا افسانہ پڑھا۔ بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ آپ کا فقرہ مجھے بہت پسند آیا۔

اُس کے دل سے آواز آئی اُس سے شہر ہونے لگا کہ شاید آپ لکھنے میں یہ آواز سن لی ہے۔

اچھے اس انسان میں مجھے حیرت کا رنگ نظر آیا۔ تازہ پرچے میں چھپ جائے گا۔ آپ اسی طرح کبھی کبھی اپنا افسانہ بھی دیا کرتے ہیں۔
آپ نے ستر لپٹ لیا۔ شکر ہے!

درفتن صاحب آپ کی ایک غزل اس بیٹے لکھ کر دے گا۔ اٹری ستر میں آپ کا نام دیکھا تھا۔
امید ہے کہ آپ بخیر رہتے ہوں گے۔

غزل صاحب اور نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔
غناکار
سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایف بی پی

کلکتہ روڈ بھی

۲۶ جون ۱۹۷۷ء

پیادہ سے خیر

تھارے دونوں خط ملے۔ سوج رہا ہوں کہ تم میں اتنا انعام کیوں ہے؟ میں ڈرتا ہوں۔ اندر سے میں رہنے والا زیادہ تیز روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں دیکھتا۔ تھارے خط مجھے ڈراتا ہے۔ کیا کروں، مگر نہ مننے کے ساتھ مجھ میں بھیجیں آتا جاتا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میں گھٹنوں کے بل چلوں گا اور تسلا تسلا کے باتیں کروں گا۔ وہ کہہ چکے ہیں میں سکون رہا ہوں۔ زندگی کے سارے میں گذر رہا ہوں اُس پر نظر کرنے کا دیر سے پاس فرصت نہیں تھی ایشیائی آتے ہیں جن پر میری زندگی کی لکڑی ٹھرتی ہے۔ مگر میں تھکاوٹ سے چڑ سفر کے آغاز ہی سے تنگ آ رہا ہوں اور بورڈ ہی پر ہو سکتا جس سے مجھے ایشیائی کا نام معلوم ہو جائے۔ عجیب حالت ہے، کچھ گھر میں نہیں آتا۔ آدھ گھر میں آئے گی کیسے جب کہ مجھے کی فرصت ہی نہیں۔

کرشن چندر کہتے ہیں اُن کے لیے نیا انسان کھوں۔ جی چاہتا ہے اُن کو اپنا تازہ نوٹ لکھ کر بھیج دوں۔ انگوٹوں والے اُسے دیکھ کر کئی نئے انسانے چھو لیں گے۔

تم نے بہت تاکید کی ہے کہ تم نے نئے زاویے کے لیے کچھ نئے مضامین لکھوں۔ مجھ سے بڑھ کر تو نیا انسانہ نگاری بالکل بکواس ہے جس کے عوض صرف شکر ملے۔ میرا ڈاکٹر سب روز مجھے دوا بھیجتا ہے شکر ہے کہ عوارہ رو پلے ہی آتا ہے۔ کل اُس نے ایک دوا پر دوا میں بھیج دیا تھا اس لیے کہ اُس میں کھٹکنا ہٹ کم تھی۔ خیال تھا کہ کل انسانہ شروع کروں گا مگر اس کم کھٹکنا ہٹ والے عوارہ کے استعمال پر دیکھا تو میری سب کھٹکنا ہٹ غائب ہو گئی۔

بہر حال انسانہ لکھ دوں گا اس لیے کہ تھادی سفارش ہے اور کرشن چندر سے بھی مجھے پیار ہے۔ کرشن چندر صاحب کو اتنا نڈر لکھ دے کہ میری ماں مر گئی ہے اُس کا نام کرنے کے لیے مجھے جو فرصت مل سکتی ہے وہ میں اُن کے حوالے کر دوں گا۔

کتبہ آندو والوں نے وہ دوا لکھا کہ وہ دس جون کو ۱۵ روپے میں سے پہلی قسط پچاس روپے کی پیکیج کی گرا ب تک

منتظر ہوں — مجھے اس تاثر نے ہی ہوئی پانوی کی آمد کا شدید انتظار ہے۔ دیکھیے وہ بھر پر کب کم کرتے ہیں۔
 تاحضیٰ جی کا فیصلہ کمشنر بھیجا تھا مگر واپس کیا۔ اب وہ ملی بھیجا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آئے ہے۔ حیدر آباد والوں نے تو ابھی
 تک رسید سے مطلع نہیں کیا ہے کلکٹ پر جولائی میں ایک ہو گیا ہے۔ تاحضیٰ جی کا فیصلہ اگست میں ہو گا۔ دس دنوں بعد سے
 براڈ کاسٹ ہوں گے،

طبیعت بہت ادا اس رہتی ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ کروں — یہ کچھ کیا ہے؟ — سرچ رہا ہوں۔
 اس وقت کرا لام صاحب کے گھر میں بیٹھا ہوں۔ بادشہ مورہی۔ چلت جی سلام کھاتے ہیں۔ وہ کچھ غصہ بھی لکھیں گے۔
 صغیر صحبت ہے۔ آداب عرض کرتی ہے۔ اس وقت سائے بیٹھی پچھنے کے لیے ٹوہر بنا رہی ہے۔
 میں بہت دکھی ہوں۔

(۱) کلکٹ پر ۲۳ جولائی کو مجھے سے براڈ کاسٹ ہو گا اس کا تقی الخدوت میں دوپے لے گا۔ خواجہ عمیر الدین کے نام
 سے نشر ہو گا۔

(۲) کتبہ اُمدوا والوں نے آج، ۵ دوپے مئی اُمدو کے ذریعے بھیج دیے ہیں۔
 خاکسار
 سعادت حسن منٹو

دہلی
 ۲۱ جولائی ۱۹۵۷ء

برادر عزیز

اسلام علیکم۔ آپ کا محبت نامہ مل گیا تھا۔ انیسویں کس دوا میں میری طبیعت نامانہ تھی۔ پرسوں سے پھر شدت کا درد
 ہو رہا ہے۔ اہل حالت اس قدر غراب ہے کہ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں کے سول سرجن کے زیر علاج ہوں۔ وہ کہتا ہے ہسپتال
 میں داخل ہو جاؤ مگر ادھر چھٹیاں ملتی ہیں تو تنخواہ نہیں ملتی۔ عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ایک صوفی کاشی کی ہمدی مجھے
 یہاں میسر ہے مگر کیا کی ہمدی کیا کر سکتی ہے۔

آپ کا خط ملنے ہی میں نے مجھے کھو دیا تھا۔ وہاں سے آج جواب آیا ہے۔ انھوں نے چند روپے بھیجے ہیں، باقی پندرہ
 روپے اگلے مہینے بھیجیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہاں بھی مشکلات پیدا ہو گئی ہوں گی۔ سوچتا ہوں یہ پندرہ میں خرچ کروں اور آپ کو کچھ نہ بچوں
 اگلے مہینے جب پندرہ آئیں تو کٹھے تیس روپے کر دوں گا۔ کیا خیال ہے آپ کا۔

مجھے انیسویں ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکا۔ میں خوشگام طور پر غصے میں ہوا ہوں۔ اس کا نقل ثبوت میں نے آپ کو لکھے
 دیا ہے۔ یہ معلوم کرے تو غصہ ہوئی کہ آپ نے فکر پوک پسند کیا۔ میں حالات کے باعث آپ کا کوئی کامزدہ انسانہ نہیں پڑھ سکا۔
 حقیر مجھے گئی ہوئی تھی، اب واپس آگئی ہے۔ آپ کو سلام کھواتی ہے۔

خط کھینچتے ہا کریں۔ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔

جواب آل انٹرنیٹ کے پتے سے دیجیے گا۔ یہاں خط مجھے آسانی سے مل جاتا ہے۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۶۔ ایڈنی جیمز

کیلنڈر ڈی جی

۲۱ فروری ۲۰۰۸ء

پیادے ندیم

مجھے سعادت کر دینا بھائی۔ میں سخت شرمندہ تھا اسی لیے خط نہ لکھ سکا۔ تمہارے گیت منگوائے، مگر یہاں وہ صاحب
ای غائب ہو گئے جو لینا چاہتے تھے۔ ناچار دفتر میں چھاپنا پڑا۔ میری تعظیم سعادت کرو دینا۔ میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔
یہاں ہر روز تمہاری باتیں ہوتی ہیں۔ صوفی کہتی ہے کہ ندیم بھائی کو یہاں اپنے خیر بلا کر بھیجیں سوچتا ہوں۔ شہادت
ادھمکت بھی یہی چاہتی ہیں۔ میں نے تمہیں خط بلکہ تاریخ بھیج دیا ہوتا گا۔ ادھر اس کم قیمت کا نسخہ ملے گا۔ صوفی نے دھڑکے رکھ لیا اور یہ بات کھٹائی
میں پڑ گئی۔

ہاں تم یہ لکھو کہ لاہور میں تمہارے گھر سے کی کیا صورت ہے۔ مجھے تمہاری بہت فکر ہوتی ہے۔ خدا و دوں جلد لائے۔
جب تم تم دونوں ایک جگہ رہ سکیں۔

ہاں یعنی، وہ تم نے ماہنامہ حضور کے لیے جو مضمون شروع کیا تھا بھجوا رہی نہیں۔ پہلا نمبر شائع ہونے میں اب بس کچھ دیر
نہیں۔ خدا کے واسطے اپنا مضمون دیکھ کر شاید گھبرائیں۔ اگرچہ چند تازہ غزلوں یا نغموں کے ہمراہ تو ابھی دوا دے مجھے ممنون کرو۔
تمہارے مضمون اور تمہاری غزل کے بغیر پروجیکٹ ختم نہیں ہو گا۔ اس نمبر میں تم اپنے تمام دوستوں کو پکارو گے۔

غیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔

مضمون اور غزلیں جلد بھیجیں۔

صوفیہ سلام کھنکھاتی ہے۔

تمہارا بھائی

سعادت

۱۵۔ ایلزبتھ
کلیر ڈو۔ بھی
۱۰ مئی ۱۹۳۷ء

میریم بیٹیا

آپ کا جنت نامہ ملا۔ مجھے آپ کے غلوں پر نہ پہلے کسی شک تھا اور نہ اب ہے۔ اگر میرے دل میں ذرا برا برسل بھی آپ کی طرف سے موجود ہوتا مجھ سے پہلے آپ کو شاید اس کا علم ہو جاتا۔ میرے دل کی کوئی بات بھی نہیں رہ سکتی اور نہ میں کسی بات کو چھپانا چاہتا ہوں۔

چند روز ہوئے جبکہ صغیرہ مستحالت پر پڑی تھی، دیوندر ستیا رتنی کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے اس کو گالیاں دیں۔ میرے دل میں اس کے متعلق جو خیالات بھی تھے ان کا انکار کر دیا اور اس سے کھلے غلوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس نے اس کے بعد کمال ڈھٹائی سے دوسری مرتبہ پھر فون کیا۔ میں نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا بلکہ اس کی اس ڈھٹائی نے مجھے اور متفق کر دیا۔ اگر وہ جاباب میں مجھے گالیاں دیتا اور اس مجھے کا جواب دیتا جو میں نے اس پر کیا تھا تو بہت ممکن ہے میں خود اس کے پاس جا کر اپنے یہاں سماں شہر ایسا مصفیقہ نے فون پر میری تمام باتیں سنیں، مجھے بھلا بُرا کہا، لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں دل میں نفرت رکھتے ہوئے زبان پر پیار و محبت کے الفاظ نہیں لا سکتا۔

یہ واقعہ سن کر اس نے یہ بیان کیا کہ اگر مجھے آپ سے کوئی شکایت ہوتی تو میں نے بے کھٹکے اس کا انکار کر دیا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ اب میری دماغی حالت میں بہت بڑا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ سینکڑوں چیزیں بیک وقت سوچنے سے میں انفرادی کے عالم میں رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں میں کوئی قابلِ توجہ چیز نہیں لکھ سکا۔

بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ کچھ لکھوں پتی کہ میں کھڑی نہیں سکتا۔ دراصل میں اپنے اندر وہ بات ڈھونڈ رہا ہوں جو مجھے کرنا ہے۔ اگر مجھے یہ کچھ کرنا ہے جو میں اب تک کر چکا ہوں تو یہ کچھ بھی نہیں یعنی کوئی بڑا کام نہیں ساگر مجھے ایسے ہی انسان نے لکھنا ہیں تو پھر ایک خاص لاغور عمل مرتب کروں گا اور اس کے مطابق کام کروں گا۔ یہ لاغور خودی کی کیا ضروری ہے۔

مگر چھوڑیئے اس قصے کو۔

آپ نے مجھے جلاز جلاز بھیجے ہیں۔ میں نے آپ کے یہ پیشہ کوشش کی ہے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ مصیبت یہ ہے کہ میری کوششوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز حائل ہوتی رہی ہے۔ خدا کے کراپ نہ ہو۔

کہانی کے چند مناظر اور بھیج رہا ہوں۔ اس میں ٹائپ کی بے شمار غلطیاں ہیں مگر آپ فوراً مجھ سے گے یہ خیال ہے کہ ان میں ایک رگت کی ضرورت ہے۔ وہ آپ لکھ دیں۔

یہ گیت بھی خاص طور پر اچھا ہونا چاہیے۔ آپ منظر کو ایک دوبار پڑھیں اور غور کریں تو آپ مطلب کی چیز لکھ

سکیں گے۔ سوال و جواب بذاتی قسم کے ہیں (SITUATION) کے ساتھ چسپاں ہو جائیں۔ یاد رکھیے کہ چسپا ایک کوئی مخلوق کا عورت ہے اس کو سہارے کی ضرورت ہے لیکن یہ خطہ بھی لائق ہے کہ نمکین ہے یہ سہارا جواب نہ دے جائے اور وہ زیادہ گرا نیوں میں خرق ہو جائے۔ محبت میں غلو کر کاٹھا کر جسم کے ساتھ اس کی روح بھی مخلوق ہو جائے۔ دوسری طرف شکر کو لائق نہ دانا چاہیے کہ وہ ایسا نثار آدمی ہے۔ یہ مضمون آسان اور بذاتی فطرتوں میں اگر آپ نے باندھ دیا تو سمجھ لیے کہ آپ غلطی کی گت تھکنے کا گڑ پائے۔

صغیر آپ کے غلوں کی بہت شکر گزار ہے۔ اب اس کی طبیعت ابھی ہے۔ سلام عرض کرتی ہے۔
جونی منظور کا نام چسپا میں آپ کو نئے پتے سے بھیج دوں گا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔
کوشن چند منٹوں کی ہو کر یہاں بیٹے کو اتھا دو دو زندہ کر پڑ چلا گیا جہاں وہ ایک فلم کی پیش ملازم ہو گیا ہے۔
آپ کا رشتہ ڈلفاؤنل گیا ہے۔ گیتوں اور کہانی کے تعلق پر کھوں گا۔

شاہکار
سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈیٹری مجسٹریٹ

کلیئر روڈ، ممبئی ۴۰

ستمبر ۱۹۷۲ء

یار سے نہیں

تم اپنے دل میں خدا ہائے کیا سمجھتے ہو کہ مجھے کیا ہو گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ عرصے سے بہت ہی قسمت ہو گیا ہوں۔ کئی بار دل چاہا ہے کہ تمہیں خط لکھوں، بہت ہی مختصر خط لکھوں مگر کھنے سے طبیعت اچاٹ سی ہو گئی ہے جانے کیوں؟
تمہارے انعام پر مجھے ناز ہے میری جان۔ خدا کے لیے دل میں کہی اس خیال کو بگڑ دینا کہ میں تمہیں قبول کیا ہوں۔
تمہاری یاد سے میرا دل حشر بھر رہا ہے۔ اور میں ہمیشہ اسے موتی کی تاک میں رہتا ہوں کہ ہم تم اکٹھے رہ سکیں۔
تمہاری حالات بہت افسوسناک ہے مگر یہ اور بھی زیادہ افسوسناک بات ہے کہ میں اب کسی کی حالت کے ڈکھو کو محسوس نہیں کر سکتا۔ شاید اس لیے کہ میں خود کو مافی اوردو مافی طور پر غلیل رہتا ہوں۔ افسوس میرے حال پر رحم کرے۔
میں اس کوشش میں ہوں کہ تمہیں یہاں بلاؤں۔ ڈھاکہ و کراچی اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں۔
شاہد طبیعت نے تمہاری حالت کا سنا تو اسے بہت ڈکھ ہو رہا ہے کہ وہ تمہیں سلام لکھتا ہے اور تمہاری صحت کے لیے ڈھاکہ کرتا ہے۔
صغیر پچھلے دنوں بہت بیمار رہی ہے مگر اب خدا کے فضل سے بصحت ہے، تمہیں سلام عرض کرتی ہے۔

میں آنکھیں غمتاں تیں نوکر ہوں جہاں شاد و لطیف ملازم ہے۔ صبح ساڑھے دس بجے جاتا ہوں اور رات کو گیارہ بجے لوٹتا ہوں۔ عجب زندگی ہے۔

”پھول اخبار میں تم کیا کرتے ہو؟ اسے چھوڑ دو اور یہاں چلے آؤ۔ مجھے اُمید ہے کہ تم یہاں لاہور سے زیادہ کامیادار گئے افسوس تو ہے کہ تم نے آج تک میری نہیں مانی۔

میری صحت اچھی تو نہیں لیکن ٹھیک ہے، یعنی سینے کا دروازا کچھ عرصے سے نہیں کھولا۔
امید ہے کہ تم اب بخیریت ہو گے۔ اپنی صحت سے فوراً مطلع کرو۔
ہمیشہ تمھارا

سعادت حسن منٹو

افسانہ لٹریچر۔ بمبئی

اکتوبر ۱۹۵۷ء

پیارے ندیم
میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ تو مجھ سے اتنی قربت کریں اور میں آپ کے خطوں کا جواب بھی نہ دے سکوں کچھ کچھ میں نہیں آتا کہ کیا غلطی کر دیں۔ سوائس کس کے کہ میں بے حد شست اور کال ہو گیا ہوں۔

جس روز آپ کے دوست جمیل نے کمرے پاس آئے میں اپنے مقدمے کی پریشانیوں میں غرق تھا۔ یہ کجنت میری لال نہایت ہی ادبیات انسان ہے۔ اس نے مقدمے میں وقت برابر دلچسپی نہیں لی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ صفائی کا کافی گواہ پیش نہیں ہوا اور فیصلے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ ۲۰ اکتوبر کو مناظر عدالت ہونا تھا مگر میں بیمار ہوں۔ نو میر کے وسط میں اگر کوئی تاریخ لی گئی تو چلا جاؤں گا۔ میرا پروگرام یہی ہے کہ لاہور پہنچ کر آپ سے ملوں، کیونکہ آپ کے دوست کی زبان سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نو میر سے لاہور آنے والے ہیں۔

یہ سب کو غرضی ہوئی کہ اب پہلے سے آپ کی صحت بہتر ہے۔ خدا آپ کو تندرست رکھے۔
بھروسہ نہیں آتا کہ کیا ہو گیا ہے۔ خط لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بیکار کی جسمانی مشقت کر رہا ہوں کیا ہی اچھا ہوتا اگر آدمی لکھے بغیر اپنے خیالات دوسرے تک پہنچا سکتا۔

لاہور آکر آپ سے مستقبل باتیں ہوں گی اور وہیں مجھ کو مستقبل کے متعلق کوئی پروگرام بھی سونپیں گے۔ اصل میں اس پریم نے میری زندگی کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر قسم کے مستقبل کے متعلق کیا سوچیں گے۔ میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ حال اور مستقبل اب بالکل بے معنی سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال دیکھیے جو کیا سوچتے ہیں۔

میں نے ابھی تک کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔ ارادہ ہے کہ ساتھی کے لیے ایک انشاء لکھوں۔ بدقسمت طور سے صحت ندامت ہے کہ میں نے اتنی دیر آپ کو خط نہیں لکھا۔ یہ خط میں اُسی کے اجازت پر لکھ رہا ہوں۔ پوسٹ کرنے کا ذرا س

یا ہے۔

خدا آپ کو ہر اے شے سے آپ کے اخلاص کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

آپ کا بھائی

سعادت

احمد ندیم قاسمی

شخصیات نمبر

اچانک کے تاثرات

(ابتدائیہ)

فحشیات، خبیث چور، مری و ایکس برسی کی محنتوں کا حاصل تھا پڑھے لکھوں کی شہادی میں جب دایم گواہ کے لیے لایا تو وہ اور بچے داد سے اس کا استقبال نہرا — — — نہیں داد سے چھٹا اور نہ بیدا سے آندوہ خاطر نہوا جنھیں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی، میں کا جیش کی طرح شکر گزار رہتا ہوں اور اپنی ذاتی تعلقاتوں کی بنا پر خواجہ بھگت سے اپنی سجدہ دی پیدا ہوئی۔

میں نے اعلان کیا تھا کہ منظر نمبر کے بعد شخصیات غیر حصہ دوم، شائع کروں گا۔ یہ وعدہ ایسا نہ ہو سکے گا۔ ایک قریب آئے دن ہی نمبر نکال نکال کر نکال رہا ہوں۔ دوسرے حصہ دوم کے لیے میں نے اپنی حالت کے مطابق پھر ایسا دیا جو آپ پر دو گرام بنا لیا ہے کہ اسے کسی صورت میں بھی جلد پیش نہیں کر سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ اس نمبر کے بعد اس موضوع پر (حتیٰ الامکان) کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔ جس نامور اہل علم پر لکھنے والے موجود ہیں ان سے شخصی نوعیت کے مضامین لکھواؤں اور جن پر اس نوع کا کوئی لکھنے والا نہیں ہے ان سے سماجی اعلائے مضامین لکھوا کر دوسرے حصہ کو ابتدا سے اب تک مکمل کر دوں۔

شخصیات نیز سے متعلق چند کفر مغراہوں کی آراء ان کو ان کی اجازت سے پیش کر رہا ہوں :-

یا اے اللہ

تسلیم آپ کی شکایت۔ بجائے آپ کے لیے ریلے پر رائے ظاہر نہیں کی۔ یہ لوٹ کی لوٹ اکٹھے سات سو سٹھے، خدا کی پناہ اسے رسالہ کو سنو کہتا ہے۔ یہ تو بلا لڑائی ہے۔ اس پر انہما رکھئے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیتیں اور ان پر لکھنے والوں کی شخصیتیں اور پھر ان لکھنے والوں کی شخصیتیں اور ان پر لکھنے والے ایک ملوہ ہے۔ یہ نہر حقیقت کا ماحول شخصیت

ہے جو دلوں یا دل ہے گا اور لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈ کریں گے۔
آپ کا ہر لکھی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر ایسا چھانکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں مگر آواز نمبر شخصیات کا سب پر سبقت لے گیا ہے۔

عبدالغنی

نیاز شجوری

تیسیم آپ نے سالہر پر سبذ فرمایا خوش برقی۔ لیکن جس وقت نقوش کے سالانہ کا خیال آتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے۔ کہاں شخصیات نے جس کا نظم قرآن سے بھی زیادہ ہے اور کہاں علماء اسلام نے جس کی عمری درود و شریف کی کتاب سے بھی ضمانت میں کم ہے۔ جس وقت میں مرتقا ہوں کہ آپ نے اپنے سالانہ کی ترتیب میں کتنی روحانی اور ذہنی کوفت برداشت کی ہوگی تو سالانہ سے زیادہ آپ کے صبر و تحمل کی یاد دینے کو ہی چاہتا ہے شخصیات نے ہر سادہ کے نگاہ میں تبصرہ ضرور شائع ہوگا۔

نیاز

عبدالحمید سالک

نقوش کا شخصیات نمونہ کے ادبی سالوں کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں دکھتا۔ شخصیات کی تعداد ان کی بکثرتی دہائیوں کی ضمانت اس کی جسین طاقت غرض ہر چیز طفیل صاحب کی غرض ذوقی ان کی بے پناہ محنت اور اولوالعزمی کا پتہ دیتی ہے۔ بلاشبہ قابل ذکر شخصیتوں کا ذکر مذکورہ خدمت ہو گیا۔ لیکن ادب و شعر کی تمام شخصیتوں کا ایک جملہ میں اس طرح جمع کرنا کوئی بھی نہ سمجھوٹ کے قریب قریب حال ہے اور طفیل صاحب آخر انسان ہی ہیں۔ کوئی مافوق الانسان ہستی تو نہیں ہیں۔ یہ نمونہ روز بان کے آئندہ نمونہ بن کے لیے قابل قدر ماخذ کا کام دے گا۔ اس لیے کہ اوپر شعراء کا اہم تو بہ وقت دستیاب ہو سکتا ہے۔ ان کی شخصیتوں کی زندگی کے مختلف معلومات آسانی سے نہیں مل سکتیں۔ اس نمونہ نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ یہ طفیل صاحب کا بہت بڑا کام ہے۔ اس کی نقد کرنا بڑے درجے کی مشکل ہے۔

سالک

امتیاز علی عرشی (راہپوری)

کرمی التیسیم رسالہ نقوش کا شخصیات نمونہ اس گراں اور صفحے کا ولی شکر ہے تو ہی فرمائیے میں نے اس نمونہ کو بیل بار دیکھا آخر تیر میں رہ گیا۔ اور جب اسے پڑھو یا تو دہشت طاری ہو گئی۔ اشد اشد اتنی شخصیتوں کے متعلق ایسی دلچسپ اور مفید معلومات اتنی کم مدت میں آپ نے جمع کی کہ پیش کر دیں اسے اپنی کرامت یا معجزہ تو کہہ سکتا ہوں سہی و کوشش کا نتیجہ کہ اس کی غیر معمولی اہمیت کو کم کرنا پسند نہیں کرتا۔ ان ادبی و علمی شخصیتوں میں سے جو میں سے صرف ملاقات محال ہے ان کے بارے میں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں انہیں اب تک زیادہ نہیں جانتا تھا اور جو کچھ جانتا تھا وہ اس سے بڑے میں کہیں کم تھا جو اب معلوم ہوا ہے۔ میں نے اپنے بچوں سے کہا ہے کہ اس رسالے کو محفوظ کر لو اور وقتاً فوقتاً اس کے مضامین

پڑھا کر پھر بڑھے سے زیادہ تمھارے لیے یہ کارآمد ہے میری دفعتاً ہے کہ آپ اس کے دوسرے حصے کو خود اور جلد شائع فرمائیے۔ یہ اولیٰ و سرتی ہر دو کتابوں سے بڑی کامیاب اور مفید کوشش ہے اور بچکانہانہ لکھے پڑھا جائے گا۔ اس مجموعے کی اہمیت برابر بڑھتی ہی جائے گی۔ بعید نہیں کہ یہ مضامین آپ کو آئندہ کتابی شکل میں بھی چھاپنا پڑیں۔ یہی اس کے سہی ہیں۔ سبحان اللہ! کتنے سہجہ، کیسے علم افزا، کس درجہ عقل افزا! کس قدر تقویہ آموز!!

مگر نقوش میرے دماغ پر اپنا نقش چھاتا ہے تو ہے حمت! مگر ہوں حققت غور نہ چندہ ادا کروں گا وہ نہ تھا لیجیوں گا۔ ہاں ارمائے ترقی و علم و حمت جس قدر کہیں کر سکتا ہوں۔ والسلام مع الاکرام۔ حقیر

انتیاز علی عرشی

رشید احمد صدیقی:

مفتی، تسلیم نقوش کا شخصیات نہ بہت اچھا نکلا۔ اسنے بڑے پرکار پروگرام کیا جائے گا تھا ہے اس میں کہیں نہ کہیں ایک اور نقص بھی درآ جا جائے گا لیکن اُن فوائد کو دیکھتے ہوئے جو اس سب سے آلودہ دان فتنہ کو کچھ دلوں تک پہنچائیں گے اس فائدے کے گراں بہا ہونے میں شبہ نہیں۔ آلودہ کے خدمت گزاروں کے بارہ میں بڑی مفید، دلچسپ اور مستند باتیں لکھی کر دی گئی ہیں اور آپ اس خدمت اور کارنامہ پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے آپ کے طرفہ رخ انہیں ہوں گے۔

خیر طلب:

رشید احمد صدیقی

مالک رام:

کرم بندہ جناب محمد طفیل صاحب! آداب و تہنات میں نے آپ کا شخصیات نہ دیکھا ہے چشم بکھولہ! اشاد اللہ اگرچہ بعض ایسے مضامین شامل ہو گئے ہیں جو چھوڑے جاسکتے تھے لیکن جو کام آپ نے کیا ہے اس کی قدر آلودہ زبان کا آنے والا مترج کرے گا۔

بعض زلفہ شخصیتیں ایسی ہیں جن پر رکھو اے کی خدمت ہے۔ اطہر پاؤں دی، دل شاہ جہاں پوری پر رکھو اے مڑوٹا میں ایک اور اضافہ فرمائیے، بخش پر شاہ گول، اور بنگلی تباہوں کا ابھی چند دن ہوئے ان سے متعلق ایک مضمون مولانا عبد اللہ دریا بادی نے اپنے ہفت روزہ اخبار صدقہ جدید میں لکھا تھا۔

بہر حال جو کام آپ نے کیا ہے اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔ والسلام خاکسار

مالک رام

سید اعشام حسین:

براہم طفیل صاحب! تسلیم نقوش کے خاص نہر کی حد کس طرح دور میں کو بھی حیرت کرتا ہوں کہ آپ نے یہ سات سو مضمون کا رسا کو کس طرح شائع کیا، مضامین کس طرح حاصل کیے۔ یہ برابر ادب کی تاریخ میں اپنی مثال

آپ ہے۔
مضامین کے متعلق اس وقت یہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک جتنے پڑھے ہیں ان میں سے اکثر پسندائے مفصل
تفصیل تو اسی وقت ہو سکے گی جب تمام مضامین پڑھ لیے جائیں گے۔
میری ہمت برابر خراب رہتی ہے اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں نہیں کر سکتا

مخلص؛
انتظام حسین

سید مسعود حسن رضوی:

کرمی اتسليم نفقوش شخصیات نمبر و سول جوا۔ ولی شکریہ قبول فرمائیے۔ سالوں کے خاص نگار ہی کرتے ہیں
آپ بھی نکال چکے ہیں لیکن مجھے انسانی ادب سے زیادہ معلوماتی ادب سے دلچسپی ہے اور آپ نے شخصیات نمبر ۱ مفید
اور مستند معلومات کا کتابخانہ آخر فرہم کر دیا ہے کہ اگر اپنی حالت پر تکیا کرنا دست برد تو کر سکتا ہوں کہ ادب کا ہر جہاں دم
آپ کا احسان مند ہو گا اور اس نکال قدر تہذکرہ ادب کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔ اس نعمت کا خاص نمبر نکالنے کے لیے
آپ کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی اس کا قہور اسلام آباد مجھے اس طرح ہوا کہ مرتبہ حضرت نگار نگار کھنڈی پر مضمون حاصل کرنے
کے لیے کتنے خط آپ نے مجھے لکھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب رسالہ چھپ کر ملے گا تو آپ نے جتنی محنت کی تھی
اس سے زیادہ محنت ہوئی ہوگی۔ آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دینا تو دیکھی چیز ہوگی میرے غلوں کا اتفاق ہے کہ
اپنے احسان مندی کے جذبات کا بدیہ پیش کروں۔ والسلام
دعاگو:

سید مسعود حسن رضوی

کرشن چندر:

برادر! اتسليم۔ آپ کا شخصیات نمبر بہت خوب رہا۔ ابھی پڑھنا شروع کیا ہے۔ فراق، مجنوں، عشق، نیم جہاں اور
تسليم پڑھنا میں پڑھ رہے ہیں۔ مستقل دسے بعد میں لکھوں گا۔ اس وقت تو اس تاریخی کام کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے
آپ کا: کرشن چند

ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

عزیزی فیصل صاحب! نفقوش کا شخصیات نمبر کئی لحاظ سے قابلِ تہد ہے اور آپ سختی مبارکباد دیں۔ اس شمارے
میں خاصی احوال کے ادیبوں کے نئی حالات و ذاتی خصوصیات سے مستقبل کے ادبی مآخذ کو ایسا مواد بھی مل جائے گا
جو ابھی تک دستیاب نہ تھا اور جو نفسیاتی مطالعہ کے لیے بے حد مفید ثابت ہو گا۔ ان امور میں ہر تعلیم یافتہ والوں
کے لیے یہ شمارہ چھوڑنا سوا کتب خانہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ مضمون نگاروں کو درد بردہ پھینا پڑے گا۔ ایک ہی
جگہ بہت کچھ حالات مل جائیں گے۔ میں ابھی تک پورا نمبر نہیں پڑھ سکا، اس لیے کہ آدلی تو اس کی ضمانت دے رہی ہے
کہ بلدی مقرر نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ میں ادیبوں کا ذکر اس نمبر میں آیا ہے ان میں بہت سے جانے پہچانے ہیں۔

دورانِ مطالعہ میں کبھی کبھی یہ غور کرنا پڑتا ہے کہ مضمون نگار فلاں ادیب کے بارے میں ذاتی تاثرات سے مغلوب ہو کر یہ کچھ لکھ رہا ہے اور واقعی ہے۔ کہیں کہیں اختلافِ رائے سے بھی مجھے یہ لگتا پڑتا ہے۔

لہذا آپ کا یہ فضا بھی نہیں کہ انسانے کی طرح اس نیکو لوگ بغیر غور کیے پڑھ کر ختم کر دیں۔ بہر حال کچھ اور سے کچھ اور سے ٹھہر جائیں۔ جگہ جگہ حیثیت سے سارا بہت پسند آ رہا ہے۔ کہیں کہیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ مضامین لکھنے والے حالات و واقعات کو اپنی تودرخ یا اتفاق یا سوانح نگار کے لحاظ سے نہیں دیکھ سکے۔ ادیب کو مروج کچھ کہ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کچھ ایسے بھی لکھنے والے اس نمبر میں نظر آئے جو درپردہ اپنی تعریف چاہتے ہیں۔ بار بار اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاش آپ اعلان کر دیتے کہ اگر مروج ملے تو ایسے مضمون نگاروں کو بھی نقوش میں کبھی جگہ دی جائے گی۔ ان پر بھی مستقل مضمون کوئی لکھو وے گا تو شاید ایسے مضمون نگار بچے ہیں جو کردارِ میان میں اپنی تعریف ذکر کرتے یا کم کرتے۔ اسی طرح کچھ ایسے بھی مضمون نگار اس شمارہ میں ہیں جو اپنی طرزِ تحریر کو نمایاں کرنے کی دُعا میں زیرِ بحث ادیب کے حالات و زمین نہیں دیکھ سکتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ یہ نکر ہے کہ اصل ادیب کے حالات و واقعات سامنے نہ آ سکیں۔ لوگ میری طرزِ تحریر کے قافی ہو جائیں۔ بہرِ خلاصہ اس کے بہن و لوگوں نے سید سے سادے انداز میں ادیبوں کے حالات تخلیق کر دیے ہیں وہ اس منشا کو پورا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں جس کے لیے یہ نمبر نکالا گیا ہے

دُعا گو

اعجاز

معین الدین احمد ندوی:

مکرمی اسلام علیکم نقوش کا شخصیاتِ نمبر معمول ہوا۔ اس کو دیکھنے سے پہلے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنا کامیاب ہوگا۔ آپ نے ایک بڑا کام انجام دیا۔ طبقات و تراجمِ مسلمانوں کا خاص فن ہے جس کے ذریعہ انھوں نے مختلف اصنافِ علوم کے ہزاروں اصحابِ کمال کے حالات محفوظ کر دیے۔ مگر اردو میں اس کی بڑی کمی تھی۔ اس لیے آپ نے یہ نمبر نکال کر ایک بڑی کمی پوری کی اور نہایت مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یہ نمبر آئندہ نورِ زمین کے لیے بڑا کارآمد ہوگا۔ ابتر اس میں بعض ناموں کا اندراج کشتِ قلم ہے۔ بہر حال یہ اپنا پناہِ فوق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک نمبر میں اردو کے تمام اصحابِ قلم کا احاطہ ممکن نہ تھا۔ امید ہے کہ اس میں جو اہم و ضروری شخصیتیں چھوٹ گئی ہیں۔ ان کے حالات دوسرے نمبر میں آجائیں گے۔ اس طرح دو فنونِ نمبر کی کاررو کے مجیدہ تصنیفی دُور سے لے کر اس زمانہ تک کے اصحابِ قلم کا جامع تذکرہ مرتب ہو جائے گا۔ والسلام۔

معین الدین احمد ندوی

ایس۔ اے رحمن (چیف جسٹس)

مکرمی اسلام علیکم نقوش کا شخصیاتِ نمبر لا۔ نقوش کی روشِ خبر شگافی کے مترادف ہے۔ ہو سکتا ہے

ہے کہ آپ کے انتخاب شخصیات سے اختلاف ہو لیکن جو خیال اس فیہر کا محرک بنا ہے نہایت قابلِ قدر ہے۔ اتنی اپنی
 شخصیات ذوقِ صاف کثافت کا یکساں کرنا میری نظریں اُنکے ادب کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ آپ نے ادیبوں کو
 دوام بخشنے کی ترکیب سے نقوش کو بھی حیدۂ عالم پر ثبت کر دیا ہے۔

طالبِ فریت

مخلص دایں اے سخن

خواجہ احمد فاروقی:

محبتِ کرم! شخصیاتِ نمبر ۱۱ دیکھ کر ہی خوش ہو گیا۔ یہ آپ نے بڑا کام کیا جو بغیر فریاد کے سے عوامِ استقلال کے
 ممکن نہ تھا۔ یہ خشک مضامین کا مجموعہ نہیں۔ اس میں وہ لطفت ہے جو افسانہ میں ہوتا ہے اور وہ بھی
 افسانہ آں شبے کہ بایاد گزشت

ریاض کی زبان میں سے

بامِ شب وصال اُٹھنے پر کیا کیا نہ

وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الہی محرز ہو

یہ موادِ اردو کے حصار کے لیے بہت مفید ہو گا۔ بڑا اچھا ہو کہ آپ شرکی اس داستان کو ضمیر میں مکمل کر دیں تاہم بہت سی اہم
 شخصیاتیں رہ گئیں۔ ٹی اکٹر صاحبیں، خواجہ غلام السیدی، کاظمی عبد الغفار — تیار جیسے رہنما بانی پر آپ نے ایک
 زاہد مبالغہ جاتی سے مضمون کیوں کھوایا؟ تصویریں بھی بہت کم ہیں۔

آپ کا:

خواجہ احمد فاروقی

غلام عباس:

برادرِ طفیل صاحب! اسلام علیکم۔ نقوش کو دیکھ کر خوشی ہوئی مگر یہ کہ بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صحت مند توانا
 کے بجائے مرنے والے کام لیں معلوم ہوتا ہے۔

میراجی، قیص، تاثیر و تیار فتح پوری سے متعلق مضامین اور خاص طور پر حامد جلال کا اسکے شعرا میں حدودِ جہ
 ولادہ زہد کا سیلاب ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے ابھی اور کچھ نہیں پڑھا۔ پرچے میں عسکری، راشد، عزیز احمد، احمد علی، اشک
 و فریم کی عدم موجودگی بری طرح کشمکش ہے جسے کئی مضمین بھی پورا نہیں کر سکتے اور یہ پرچہ پیش ہوا مواد گرجے راہِ روی کی جگہ
 مثال ہے۔ جلال

خاکسار:

غلام عباس

آغا محمد اشرف:

کرمی طفیل صاحب! اسلام علیکم۔ شخصیاتِ نبر کی کامیابی پر شکر ہے و مبارک باد قول کیجیے۔ آج تک اردو زبان میں اس
 شان سے کسی سلسلے نے خاص نثر نہیں لکھا تھا۔ مضامین کے اعتبار سے نبر اور ادب کی اہمیت کو بڑھا رہا ہے۔
 خاکسار: (آغا محمد اشرف)

شاد عارفی

عزیز فیض صاحب السلام علیکم شخصیاتِ نیر کے متعلق یہ لکھ کر میں کہا جا سکتا ہے وہ اس کی خبروں کا حامل نہیں کر سکتا۔ ایک عامیاد سی بات تو یہ ہے کہ جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی مگر اس طرح وہ نہ کہہ سکا جو مجھے کتنا تھا۔ اس لیے کہ میں غالب مرحوم سے شہرہ کے بغیر جو کچھ کہتا ہوں وہ مجھے خود نہیں چلتا۔ جب معاملہ میرا پہنچ جاتا ہے تو غریب سے مضامین خیال میں آنے لگتے ہیں اور میں انھیں روں قلمبند کرنے لگتا ہوں جیسے کہ ان کا تعلق میری ذات سے ہو یہ غالب مرحوم نے ہی تو کہا تھا۔

حریف مطلب شکل نہیں فسونِ نیاز و ما میں خضر کو دیتا ہوں، معطر دواز

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ فصولِ بات پر بھی اعتراض کی جا سکتی ہے۔ اب اگر میں نقوش کو فصولِ ان لوں اور اسے دوازٹی ٹوکی دیا میں دوں تو اس کے کہ یہی معنی ہوں گے کہ جو کچھ نقوش کو پہلے سے حاصل ہے اس پر طبع آزمائی کی کر کے میں نے کوئی مفید اضافہ نہیں کیا۔ ارتقا اگر واقعی کوئی چیز ہے تو اسے نقوش کے بغیر میں دیکھا جا سکتا ہے، کئی پہچتے ہمارے سامنے ہوا کرتے ہیں۔ مگر اس قدر آہستہ آہستہ دیکھی چال سے ان کی بالیدگی اور فروغِ خط نہیں کھینچا جا سکتا۔ لیکن نقوش کا امالی اس شعر یا دور قلمبند فوہرائی سے مٹا جاتا ہے جو تنگ دوش کے شوق میں کئی کئی میٹر عیاں اولادنگ کو چھپتے پر چھو رہا ہو کسی ٹکسے پر ٹانے اور عیاش شاعر کے اس شعر سے بھی نقوش کے حالات و سکنات چھپ جاتے جیسی مصعوری کی جا سکتی ہے کہ

وہ چال چلنے میں چلبلاہٹ کال کیس ہے نظر کریں

کہاں کا اور چھا کہاں کا چھا خیال کس کو تھم کی جا کا

اس کے بعد میں غلطوہ رہ جاتا ہے کہ میں تیرے جو بی چھٹ نہ چے۔ ادب پر اسے ادب دے میرے اس فقرے پر کہیں مجھے نہ کوئے کیس کیونکر جیسی جھوٹے قوامی تاک میں لے رہے ہیں کہ کوئی جو بی چھٹ نہ چے تو وہ اسے اندھیرے میں ڈھٹے لگیں اس لیے آپ کو میرا کبیرہ مشہور یہ ہے کہ آپ اپنے نقوش کے گرد میں تعویذ ڈال دیں تاکہ وہ ٹھٹھے اٹھتے جڑوں کے گھساواں، سوراہیں۔

نیاز مند:

شاد عارفی

حجاب امتیاز علی:

عزیز فیض صاحب تسلیم ہوں کہ اس نوعیت کا نیرِ تب کرنے کی خوب شہرہ ہے۔ اس خوش ذوقی اور انجی محنت کا دوسرے جیسے آپ خالی سدِ شائش ہیں۔ بہت دلچسپ اور دیدہ زیب نمبر ہے۔ میری ولی مبارک باد قبول کیجیے۔ شاید یہ نمبر درجی و نفس اور برصغیر ہو جائے اگر بعض شخصیتوں پر کئی کئی صفحوں نگاہوں سے طبع آزمائی کی فراہم کی جاتی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی نظر اور اپنا اپنا خیال ہو گا۔ پھر تو ناظرین کو ایک ہی شخصیت میں کس قدر متنوع کی کئی رنگینیاں نظر آئیں گی۔

اندھ بھی واضح ہو سکتا کہ بعد سے سوانح نگاری کیونکر تخلیقی اغراض اختیار کرتی جاتی ہے۔

میں نقوش کا شخصیات فہرہ پر محکم پڑ جاتی اور محفوظ ہوتی رہی کہ اچانک میری نظر سے ایک مضمون کی چند لہریں سلور گزریں جنہیں پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ **۱۹۵۹ء** میں اس قسم کی ناشائستہ بات کسی تعلیم یافتہ شخص کے قلم سے نکل کر نقوش جیسے ترقی پسند اور معیاری رسالے میں شائع ہو سکتی ہے وہ یہ کہ صفر ۳۳ کی ساتویں سطریں میں ایک مضمون نگار نے لکھا ہے کہ شاید اس دور سے عورتوں کو ناقص المثل کہا گیا ہے۔ نادان مضمون نگار نے یہ جملہ کچھ اس بے نیازی اور جرأت سے لکھا ہے جیسے ان کی عمر، یہ مزد و محنت کی ذمہ داری پر سرچا کرتے گزرتی ہے۔

حجاب اختیار علی

نکرتونسوی:

پیارے طفیل! تمہارا شخصیات فہرہ مل گیا۔ دیکھتے ہی ڈر بھی آیا اور سچا بھی۔ نہ جانتے تھا کہ ادب میں طوفان برپا کرنے پر کیوں مائل ہوتے جا رہے ہو۔ یہاں جس نے بھی یہ فہرہ دیکھا، طعنائی ہوئی نظریں ڈالیں۔ یہ نظریں تمہاری اسس پر دھنکشی کی عظمت کا گریباں مرض اخلاقیات کر رہی تھیں۔

گھوٹا کیا ادا دے ہیں ؟

نکرتونسوی

ابن انشا:

برادر طفیل! صاحب! سلام! شخصیات فہرہ کے متعلق میں نے مخدوم مولوی عبدالحق سے پوچھا تھا کہ آپ کے زمانے میں یا اب سے پہلے اس زبان میں ایسی چیزیں شائع ہوتی تھیں ؟ انہوں نے اس پر آپ کی محنت اور سلیقے کی دہائی حقیقت یہ ہے کہ یہ ہے بھی بڑا کام میں نے نقوش پر موافق و مخالف ریویو دیکھے ہیں۔ تنقیدات کے متعلق اختلاف رائے کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ آپ نے جن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے ان میں سے بعض کے نام واقعی کھٹکتے ہیں خود کاغذی جہل و غفلت ہوں یا تجار، عدم ہوں یا سبوت، بخراں میں سے سب کی نہیں تو بعضوں کی تنقادی آپ دوسرے فہرہ میں کر دیں گے۔ لیکن جن لوگوں کو زبردستی آپ نے شخصیت بنا دیا ہے ان کو نکالنے کے لیے بھی آپ کوئی انک فہرہ چاہیں گے ؟ قرۃ العین نے بہت اچھا لکھا ہے کہ شخصیت تو بامولانا سرودھی کی ہے یا بیگم رحمتا لیاقت علی خاں کی، لیکن وہ مذاق کی بات ہے آپ کو اس معاملے میں قصوری سی محنت برتنی چاہیے تھی۔ ہر سال میں ایڈیٹر اور اس کے مہول کے چھپائی جاتا ہوں انسان ہر کام میں اتنی سی مجبوری یا خرابی تو رہتی ہی ہے۔ بہر صورت یہ بہت بڑا کام تھا اور آپ ہی کے کرنے کا۔ واقعی حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

ابن انشا

نادر شاہ بخاری:

طفیل! بھیا! شخصیات فہرہ بڑا موقع ہے اور آپ کا ایسا کارنامہ ہے جو مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں

بعض مضامین تو بے پناہ ہیں لیکن مجھے حامد جلال اور ایس فیض کے خاکے بہت پسند آئے۔ اس نمبر کا دوسرا حصہ شائع کرنے کا جو آپ نے ارادہ کیا ہے اس سے بہت سی دیکھائیاں رہن ہو گئی ہیں اور اس نمبر پر جو نقوش بے بہت اعتراف داد ہو سکتے تھے ان کی اب گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ موقع ہے اس نمبر میں جو کی رہ گئی ہے۔ دوسرے نمبر میں آپ اسے پورا کرنے کی غلط خاص طور سے ترجیح دیں گے۔ مثلاً ایک بڑی کی قومی ہے کہ سرحد کی ادبی شخصیات کے ذکر سے یہ نمبر محروم رہ گیا ہے۔

نقص :
فارغ بخاری

جیلانی بانو:

مکرمی !
”نقوش“ کا شخصیات نمبر ملا، شکریہ !

آپ کے حوصلوں کی داد دینا تو چھوٹا سا بڑی بات لگتی ہے۔ لیکن کچھ ذکر کرنا ہی پڑے گا۔ یہ نمبر اتنا مکمل ہے کہ اس میں ٹھونڈ سے سے بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ البتہ چند نام نظر نہیں آتے جو ایک طرح سے کافی کم ہیں۔ لیکن حصہ دوم میں یہ کمی بھی پوری ہو جی جائے گی۔ شخصیات میں جو دلچسپی ہے وہ اس نمبر کو اور دلچسپ بنا رہی ہے اس کے علاوہ یہ نمبر اتنا بڑا ادبی سرمایہ ہے جو ہمیشہ نقادوں کے پیش نظر رہے گا۔ ادھر چند برسوں میں نقوش نے ادوار و ادب میں وہ کام کیا ہے جس نے اسے نقوش با اعداد بنا دیا ہے۔ ترتیب اور خوبصورتی بھی بے مثال ہے۔ لیکن ٹائٹل اتنا اچھا نہیں جتنا مکمل غزلی پر کا تھا۔

جیلانی بانو

مختار صدیقی:

شخصیات نمبر شائع کر کے نقوش نے ہر حلقہ میں بھٹک کر رہیں کھول دی ہیں۔ افسانہ، غزل وغیرہ پر دور دورہ خدمات کے اعتبار سے مخدوم نمبر شائع کرنے میں نقوش پہلے ہی سے ادوار و ادب میں اختیار و حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اب کے نقوش نے اس صدی بلکہ گزشتہ صدی کے دلچسپ آخر کی ملی اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں ذاتی حالات اور ان کے شخصوں خاکوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام اپنی جگہ بڑا اہم ہے۔ دلچسپ اور مفید ہے۔ اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آ سکتی ہیں نقوش کا یہ شمار بالواسطہ طور پر ان کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

شخصیات کا مروجہ فی نسب بے حد نازک اور کٹھن موضوع ہے۔ ویسے تو ہر شخص کی شخصیت میں دلچسپی کے رنگارنگ پہلو ملتی ہوتے ہیں اور ان پہلوؤں میں ٹکراتوں کے سامان تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ تاہم بڑی بڑی ملی اور ادبی شخصیتوں کے تحریری کارناموں کا مطالعہ ہی یہ جاننے کی خواہش پیدا کرتا ہے کہ وہ لوگ جو شعروادب یا علمی تحریروں میں اپنے بلند مرتبہ ہیں، بحیثیت انسان کے کیا کچھ ہوں گے اور کیسے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ عام انسانوں کی سطح سے اتنی بلند یا کم سے کم مختلف لوگوں کی شخصیت کو افغانوں نے جاگ کرنا اور ان کی شخصیتوں کا پرکھ کر ان پر جو پر جائزہ لینا ہے حد مشکل کام ہے۔ اس کے لیے گہری نظر، بے لاک رائے، موضوع کے ساتھ گہری واقفیت اور پھر ہمدردی کے علاوہ انسان شناسی کا گہرا سلیقہ درکار ہے۔ شخص خاک کھینچنے کے لیے اس شخصیت کے دل و دماغ سے گہری واقفیت ہی کافی نہیں بلکہ وہ قیدہ وادی بھی چاہیے جو انسان کو صاحب نظر کہلاتی ہے۔ شخصیت نگاری ہی نہیں کہ زیر نظر شخصیت کے ذاتی سوانح، اس کی علمی اور ادبی اہمیت کا رانوں اور زندگی میں اس کے عام رکھ رکھاؤ یا عام چلن کا تذکرہ کر دیا جائے۔ علمی اور ادبی شخصیتیں نفسیاتی اعتبار سے بے حد پیچیدہ شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ان میں عام انسانوں کی گزروں اور اونچوچوں کے پردوں کے نیچے بہت کچھ نہاں ہوتا ہے۔ ان کی مخصوص ذہنی تحریکات، دماغی میسجات، واقعات اور مقامات کا رد عمل، ان کی زندگی کے شادمانی، اور تقریبات، غرض ان کا ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ان کی شخصیت کا ایک کسب و کار ہوتا ہے جس کی آئینہ داری لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ ظاہر و باطن کے اس متوازن تذکرے کو ہی ایک اچھا شخص خاک نگار دریا جاسکتا ہے۔

نقوش کا شخصیات پر اس لحاظ سے ضرور متبادل قدر ہے کہ ہمارے ادب میں شخصیت نگاری پر بہت کم مواد موجود ہے۔ شخصیتوں کے علمی چہرے، ان کے علمی خاصائص اور ان کے کردار پر ہمارے قدیم تذکروں میں تو آلاش و آتش کی کچھ چیزیں ملیں گی۔ البتہ اس سلسلے میں آپ حیات نے بڑی کوشش کی ہے۔ ویسے خاصاً شخصیت نگاری پر اردو میں چند ہی چیزیں ملتی تھیں۔ ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون "مروی نذیر احمد" کی کافی کچھ مری کچھ ان کی زبانی "مروی عبدالقی" کی کتاب اور میرے چند مضمون "شیدا احمد صوفی" کا شاہکار "گنج ہائے گراں" مایہ اور بعض متفرق مضامین اور شرکت تھانوی کی "شیش محل" "توہم و دیدہ" "آرماں حسن حسرت" اور "گنجے فرشتے" از سعادت حسن منٹو خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مغربی ادب میں شخصیت نگار کی پرکائی اعلیٰ پائے کی تصانیف ملتی ہیں اور ان میں ملکی شریکی پرچم، ایسے جی کارڈنر، جارج ساروا، آئسے ہوروا جیسے ہیں۔ انسانی شہرت کے لوگ ہی نہیں جنہوں نے اس فن کو انسانی بلندوں پر پہنچایا ہے۔

ہمارے ادب کے کاہل باب شخصیت نگاروں میں سید پروفسر شیدا احمد صوفی اور شرکت تھانوی میں نقوش کے اس نثری شخصیت نگار اور موضوع سخن دونوں حقیقتوں سے مرہوم ہیں۔ ویسے بڑے بڑے نامور لوگوں پر بڑے بڑے نامور ادبی علم اور صاحب قلم لوگوں نے لکھا ہے۔ ان کے علاوہ چند ایسے ہی شخصیت نگار ہیں جو ادب میں جانے پہچانے نہیں اور دلچسپ موضوع سخن کے یا تو رشتہ دار ہیں، مثلاً: بلکم اخلاق حسین جنہوں نے اپنے بزرگ والد چودھری محمد علی دودھوی پر مضمون لکھا ہے یا اپنے موضوع سخن کے ساتھ گہرے تعلقات رکھتے ہیں۔ مثلاً ابوالخیر مودودی صاحب جنہوں نے نیاز فتح پوری جیسی دلچسپ اور متنازعہ قسم کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے۔

کل ۸۸ کے ایک جگہ شخصیتیں ہیں جو اس شیش محل میں ہیں وہ جھلکیاں ان کے علاوہ ہیں جو شرکت تھانوی کے قابل قدر مضمون "مکتوب کی چند ادبی شخصیتیں"، شاہد احمد علوی کے مضمون "دل کی چند ادبی شخصیتیں" اور پروفسر عبدعلی عابد کے مضمون "لاہور کی

چند ادبی شخصیتیں اور ان کی چند ادبی شخصیتیں، از قلم مرقدہ قطب انسا۔ باشی میں جبر و کبریا۔ شخصیتوں کے اس شمار میں مرقدہ مولانا محمد حسین آزاد بھی اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید عظیم آبادی، جلال کھنوی، استاد تاریخ، امیر سنیاتی، رتن ناتھ مرقدہ، پنڈت چکبست، مترو جہاں آبادی، دیانا زئی، نجم، نوب، فیہ حسین، خیالی، درخشاں دشت، اکبر الہادی، جیلرز، قیاس صاحب، اکبر الہادی، اور ایسے کئی نامور لوگوں کو زیر جانے کیوں جبر و کبریا ہے۔

یہ تو بزرگوں کا حال تھا اس صدی کے اوائل اور وسط کے بعض اہم لوگوں مثلاً غرضی محمد نواز جیسٹس شاہ دین ہاروی کا بھی نام نظر نہیں آتا۔ مسلمان موروں میں کئی لوگوں کے علاوہ ان میں راشد اور اوپنٹ ہاتھ اشک و فرود کا نام بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ ان شخصیتوں میں غالباً سب سے کمزور وہ تھے جن جو پرانے حالاتوں نے اپنے نامور اور بڑے دوستوں کی شخصیت کے خیمے میں ایک استغنا سمور و ترقی کا مطالعہ سے ممتاز معنی کے متعلق جو بڑا بھروسہ ہے عدل اور نہایت پاکہستی سے معنی کے کردار کے بنیادی تضاد۔ ان کی جبروت طاعتی اور ساری خوبیوں اور ان کی کمزوریوں پر چا دی ہے کہ اس پر یہ گفت شناسائی اور ترقی یافتہ ملت کا غالباً سب سے افسوسناک مظاہرہ محمد خاطر صاحب کا مضمون شفیق الرحمن ہے جس میں شمس الرحمن سے اپنی تحریک کی دوستی کے تذکرے ہیں۔ ان کی فوجی زندگی کا ذکر ہے۔ ان کی فاکٹری اور کھیلوں سے شغف کی طرف اشارے ہیں اور ان باتوں کا تذکرہ ہے جو یار لڑگوں نے محمد خالد کو کبھی شلوار تباہی جوں کی جس کا تحریر میں لانے کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان میں سب سے بڑی کو تلاش کر کے خالد صاحب خود اپنے نام کی تشریح جاتے ہیں کیونکہ ان باتوں سے شفیق الرحمن کی شخصیت کا کوئی اہم پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ نزاہت سے زیادہ (اور یہ باتیں رکھنا ان کی جائیں) یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک کھلے سے اور ایسے فوجیوں کی طرف کچھ دلچسپی نہ ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس مضمون کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ آخر میں خالد صاحب نے شفیق الرحمن کو اپنے فن اور مضمون نگاری کے بارے میں مشورے بھی دیے ہیں اور کچھ امیدیں بھی ان کے مستقبل سے وابستہ کی ہیں۔ شخصیت نگاری سے اس کا جو واسطہ ہے وہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر شخصیت نگاری بن ہے تو پھر ہندو نامور و ادیبوں کا مطالعہ اور ہندو تہذیب نگاری اور اخلاق جلالی بھی شخصیت نگاری کے شائبہ کار ہیں۔

یہ سب اس شمارے میں شخصیت نگاری کے نودہ نمونے بھی موجود ہیں اور ان کی طرح کہ ان میں مل، احمد، اہلی، اور علی شخصیتوں کے خالص انیس ذکر اور اور ان کے ظاہر و باطن کی نہایت خوبصورت تصویر سامنے پہنچاتی ہے جس کے اہلی اور علی کا ناموں شک ہی عام تھا، لیکن بلکہ اکثر جسے بڑے لوگوں کی، سادگی پر ہی ہے، اس کی شناسی کچھ تو وہ نہایت مختصر جملہ کیا ہیں جو لاہور، گھنٹہ، دہلی اور حیدرآباد دکن کی نامور شخصیتوں پر سید، حاکم، مہار، شکر، تھانوی، شاہد احمد، دہلوی اور مختصر قطب، انشا، اہلی، گریبان کی ہیں۔ ان میں سب سے خوبصورت اور گلاب شکر، شکر، تھانوی کا مضمون، گھنٹہ کی چند اہلی شخصیتیں ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر شاکرانی پر ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون ایک گوشہ نشین مگر عمدہ نثری شخصیت کی نہایت کامیاب عکاسی ہے۔ مزید، پروفیسر علی عباس حسینی کا مضمون ڈاکٹر مولوی عبدالحق پر بہت بری طرحی اور ڈاکٹر ذاکر حسین پر بھی اکثر سید عاچ حسین عابد کا مضمون اور شاہد احمد دہلوی کا لکھا جی خاکہ، عظیم، یک چٹائی، عنایت اللہ، حرم کے کتا، شامت سید احمد

کے متعلق بھی مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

بحرئی طور پر نقوش کا یہ نمبرس نمائندہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر ہمارے ادب میں یہ پہلی کوشش ہے۔ اس میں جواری اور نوازن کی ہونے والی ہے اسے نقوش نمائندہ میں بڑی مددگار دور کیا جاسکتا ہے۔

ممتاز سید

اختتامیہ

- ۱) شخصیات نمبر اردو رسائل کی تاریخ میں جاودانی حیثیت رکھتا ہے۔
- ۲) شخصیات نمبر بیش بہا مواد مگر بے رالہ روی کی عمدہ مثال ہے۔
- ۳) شخصیات نمبر کی قدر آفے والا دور کرتے نگار۔
- ۴) شخصیات نمبر اردو ادب کی انسانیکلو پیڈیا ہے۔
- ۵) شخصیات نمبر جاسیدری کی بہترین مثال ہے۔
- ۶) شخصیات نمبر کی قدر نہ کرنا پرے درجہ کی سنگدلی ہے۔
- ۷) نقوش ابوالرسائل ہے

وغیرہ وغیرہ :